عالمگیر

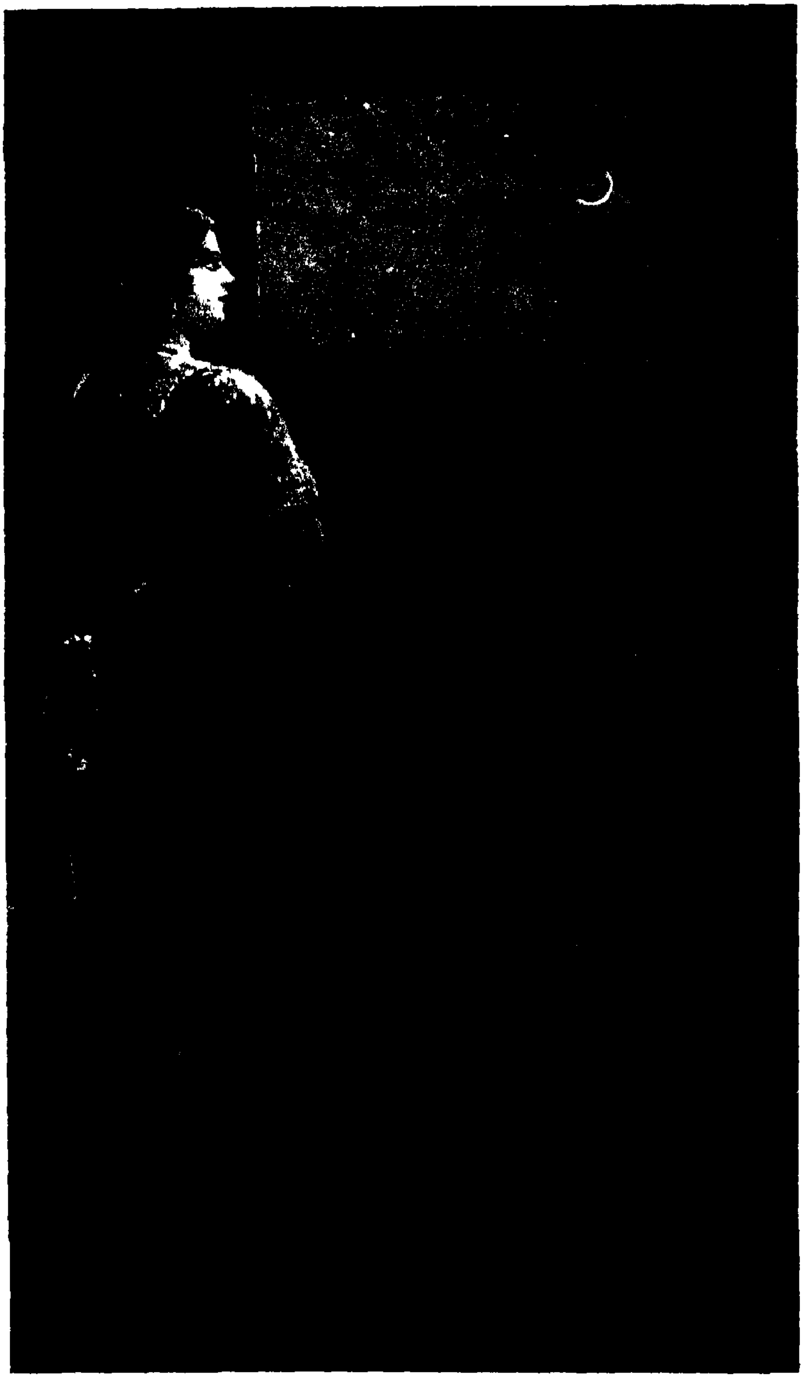
عید نمبر

لاہور



Price Re. 1-0-0


ASGHAR ALI MOHAMMED ALI
LUCKNOW
(AND BRANCHES)
THE ONLY OLDEST
AND LARGEST FIRM
OF INDIAN PERFUME
MANUFACTURING
اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ
ٹیلیفون نمبر ۱۳۶



جسدکوڑی ہلال

PRINTERS ANARKALI LAHORE

تاریخ اشاعت عید نمبر ۱۳۴۹ھ

از حامد حسن قادری

۲۶

ہے اردوئے معلی کو جو حیاتِ جاوداں
غیر فانی عید نمبر ہے عالمگیر

سنِ تاریخ کسی نے جو پوچھی نقش کو
نقشِ ثانی عید نمبر ہے عالمگیر

۱۳۴۹ھ

"کتبہ جمیل احمد خوشنویس کاتب رسالہ ہذا"

فہرست تصاویر

عالمگیر
عید نمبر

حافظ محمد عالم پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا!

مُلاحظات

آپ کے عالمگیر کا عید نمبر جس ترتیب اور وقت کی ناقابل بیان قلت میں شائع ہوا ہے، اس کا اندازہ اگرچہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں لگا سکتا، تاہم ناظرین کرام بھی اس کا احساس [illegible] کریں گے اگر ابھی [illegible] دسمبر میں عالمگیر کا ایک ضخیم خاص نمبر شائع ہو چکا ہے اور اس کے بعد [illegible] عید نمبر کا! تمام اس قدر حوصلہ شکن اور پریشان کن ہو سکتا ہے اور پھر رمضان المبارک کی بعض [illegible] مصروفیتیں جو [illegible] کے مخصوص ہیں ان سب مصروفیتوں پر مستزاد

فالحمد للہ علیٰ ذالک

بہرحال خدائے بزرگ و برتر کا شکر ہے کہ [illegible] پریشانیوں کے ان ہجوم کے باوجود عید نمبر وقت پر شائع ہو رہا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میں اس کی بروقت اشاعت کو فضل ایزدی سمجھتا ہوں، ورنہ میری اور میری کوششوں کی کیا حقیقت ہے

من آنم کہ من دانم

میں ان تمام حضرات کا بصمیم قلب شکر گزار ہوں جنہوں نے عالمگیر نوازی [illegible] خوبصورت مضامین و تصاویر سے عالمگیر کے عید نمبر کو کامیاب بنانے کے لیے میری مدد کی، یہ واقعہ ہے کہ ان سب حضرات کو میرے شکریہ کی ضرورت نہیں، ان کی بے پناہ نوازشیں "تمام سطحی باتوں سے مستغنی ہیں" انہیں عالمگیر سے ایک نسبت ہے اور ایسی نسبت جو انہیں ہمیشہ عالمگیر نوازی پر آمادہ رکھتی ہے، اور ان کی اس قابل قدر محبت کا حقیقی معاوضہ میں شکریہ سے ادا نہیں ہو سکتا، یقین جانئے کہ یہ واقعہ ہے، اور اس میں خوشامد اور تملق کو قطعاً دخل نہیں بلکہ یہ [illegible] جذبات کے ماتحت ادا ہوئے ہیں۔

تصاویر۔ عید نمبر کی سہ رنگی تصاویر [illegible] عید سے متعلق ہیں، یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ ایسے تنگ وقت میں عید سے متعلق ایسی اچھی تصویریں حاصل ہو گئیں، افسوس ہے کہ عالمگیر کے [illegible] جناب حضرت حکیم فقیر محمد صاحب چشتی مدظلہ بھی اپنی ناقابل بیان مصروفیتوں کے سبب کوئی تصویر تیار نہ کر سکے، [illegible] متعدد تصاویر تیار ہیں لیکن مرضا کی کثرت ان کی تکمیل میں سد راہ ہے، پنڈت جی بھی حضرت ممدوح کے زیر علاج ہیں، پچھلے دنوں تو [illegible] میں مبتلا تھے، لیکن اب شاید مصروفیت کے مرض میں مبتلا ہیں، لیکن اس کا علاج غالباً حکیم صاحب قبلہ [illegible] اس مرض کے دفعیہ کی کبھی کوشش نہ فرمائیں گے، اس لئے کہ وہ تو دل سے چاہتے ہیں کہ آپ [illegible] عالمگیر کو بالکل ہی بھول جائیں، گل پھینکے ہیں غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی [illegible] خدا نے چاہا تو جون میں شائع ہونے والے سالانہ نمبر میں دیگر بہترین تصاویر کے علاوہ پنڈت جی کی بھی ایک دو تصویریں ضرور ہوں گی۔

مسٹر چیٹرجی ایک مشہور بنگالی ماہر فن آرٹسٹ، مسٹر پادی، اور مسٹر تاتاری دہلوی پہلی مرتبہ بزم عالمگیر میں شریک ہو رہے ہیں، اور خدا نے چاہا تو آئندہ ہمیشہ شریک ہوتے رہیں گے، ہر سہ حضرات کے نتائج فن بصورت تصاویر علیحدہ علیحدہ عید نمبر میں موجود ہیں، ناظرین ملاحظہ فرما کر داد دیں، میں تینوں حضرات کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوا متوقع ہوں، کہ آئندہ بھی ان نوازشوں کا سلسلہ جاری رہے،

منشی عبد المجید صاحب "پروین رقم" ایک جوان صالح اور ملک کے مایہ ناز خوشنویس ہیں، باعتبار فن وہ خطاطی کے بہت زیادہ ماہر ہیں، ملک بھر میں جو شہرت ان کو حاصل ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے خوشنویس کو حاصل ہو، ناظرین عالمگیر یہ سنکر مسرور و متعجب ہونگے، کہ منشی صاحب نے حضرت حکیم صاحب قبلہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، اب ناظرین کرام خود اندازہ فرمالیں کہ حکیم صاحب قبلہ خود اس فن میں کس قدر مہارت تامہ رکھتے ہوں گے،

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

عید نمبر میں منشی عبد المجید صاحب پروین رقم کا ایک قطعہ بھی شائع کیا جا رہا ہے جو انہوں نے خاص طور پر عالمگیر کے عید نمبر کیلئے لکھا ہے،

میں اپنے عزیز دوست مسٹر نصرت اردی کا ممنون ہوں، کہ انکی تحریک سے ملک کے مشہور آرٹسٹ مسٹر پادی شریک بزم عالمگیر ہوئے، آپ کا ایک دلچسپ افسانہ "عید پر عید" بھی عید نمبر میں شریک اشاعت ہے،

عید نمبر میں تقریباً ان تمام حضرات کے مضامین ہیں، جو ہمیشہ عالمگیر میں لکھتے ہیں، البتہ مسٹر حسن عزیز صاحب جاوید کا افسانہ "ملاقات" عید نمبر کی تکمیل کے بعد موصول ہوا، جو شریک نہ ہو سکا، آئندہ نمبر میں انشاء اللہ تعالیٰ شائع ہو جائے گا،

(حافظ) **محمد عالم** عفی عنہ)

منیجر صاحب رسالہ عالمگیر کی جانب سے اس عید نمبر میں علامہ ابن القیم کی ایک نہایت دلچسپ اور اہم تصنیف کتاب التقدیر کا خاص رعایتی اعلان صرف خریداران عالمگیر کے لیئے شائع ہوا ہے، عالمگیر کے ناظرین کو اس خاص رعایت سے ضرور فائدہ حاصل کرنا چاہئے، اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اردو جانتا ہے، عربی زبان سے اردو میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا ہے، **حجم پونے آٹھ سو صفحات** اور اتنی بڑی کتاب اس نہایت معمولی اور برائے نام قیمت میں مفت کے برابر ہے، کتاب تقریباً دو ہزار کی تعداد میں موجود ہے، اس لئے عالمگیر کے ہزارہا ناظرین میں سے صرف وہی اس کو حاصل کر سکیں گے، جو سب سے پہلی فرصت میں اسکی خریداری کے لئے فرمائش بھیجیں گے، ورنہ بعد کو کسی قیمت پر بھی یہ دستیاب نہ ہو سکے گی،

(حافظ) **محمد عالم** عفی عنہ

ارشاداتِ عالمگیر

نتیجۂ فکر استاذ السلطان جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مدظلہ جانشین امیر مینائی لکھنوی

خیالِ ابروئے قاتل میں تڑپے دل جگر برسوں
وہ بسمل ہوں کہ ہم نے زیرِ خنجر کی بسر برسوں

ہنسے تھے ایک دن زخمِ جگر اس کا یہ پھل پایا
لہو روتی رہی ناسور بن کر چشمِ تر برسوں

ہزاروں میں یہی دو آشنا ثابت قدم نکلے
نہ بھولوں درد دل ٹھہرا رہا دردِ جگر برسوں

بہت دشوار ہے معشوق کا ہموار ہو جانا
وہ ملتے ہیں مگر ملتی نہیں ان کی نظر برسوں

طلب ہر روز کی ساقی مجھے محجوب کرتی ہے
پلا دے آج وہ ساغر رہے جس کا اثر برسوں

ترے ارمان کو ہم نے بڑے نازوں سے پالا ہے
جگر کھاتا رہا پیتا رہا خونِ جگر برسوں

ترے چھپنے پہ بھی ہم نے مزے دیدار کے لوٹے
تصور میں رہی صورت تری پیشِ نظر برسوں

مئے گلرنگ ہے گلزار ہے یاروں کا مجمع ہے
یہی جلسے رہیں یارب یہی شام و سحر برسوں

جو دلکش ہے مرے مضمون جلیل اس کا یہ باعث ہے
کہ دل میں رہ چکا ہے اک بتِ جادو نظر برسوں

بادۂ کوثر

از حضرت کوثر خیرآبادی مرحوم ارشد تلامذہ خدائے سخن حضرت امیر مینائی رح

رہے ہیں خانۂ دل میں بہت ناز آفریں برسوں
خدا کی شان کعبے میں رہے ہیں بت مکیں برسوں

تہ شمشیر وقت ذبح کس حسرت سے دیکھا ہے
نہ بھولے گی تجھے ظالم نگاہ واپسیں برسوں

عجب انداز سے قاتل کی گردن پر چھری پھیری
دہان زخم سے نکلی صدائے آفریں برسوں

مٹایا ہے لکھا تقدیر کا سجدوں کے حیلے سے
بت بے رحم کی چوکھٹ پہ رگڑی ہے جبیں برسوں

لہو روئے بہت دن الفت دست حنائی میں
شب فرقت میں آنکھوں سے نہ سرکی آستیں برسوں

اٹھیگا نوح کا طوفان اشک چشم گریاں سے
جھما جھم خون برسائیگی میری آستیں برسوں

مرے پہلو سے لاکھوں حسرتیں سر پیٹتے نکلیں
لپٹ کر تیر سے رویا دل اندوہگیں برسوں

گنہ گاران الفت مر کے بھی راحت نہ پائینگے
برنگ آسیا پیسے گی مرقد کی زمیں برسوں

ہماری ڈھیر پر میلہ رہیگا نامرادوں کا
مجاور بن کے بیٹھیں گے لحد پر نازنیں برسوں

سوال وصل پر تیوری چڑھا کر ذبح کر ڈالا
لٹائیگی مجھے ظالم تری چین جبیں برسوں

ہماری قبر پر جھمگٹ رہیگا خوبرویوں کا
رہیں گے چلہ کش کوثر حسین و مہ جبیں برسوں

۲۹ رمضان کی شام

پلا ساقیا بادۂ بے خوف و بیم
ھُوَاللّٰہُ وَارِثُ عَلِیٌّ کَرِیْمٌ

اسی مے کو تو راہ اطہر بنا
اسی جام کو حوضِ کوثر بنا

بڑا ظرف کر دے مجھے بے نظیر
کہ رَبِّیْ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

شفق میں سرِ بامِ چرخِ کہن
ابھی جگمگاتی ہے کچھ کچھ کرن

بسیروں کو جانے لگے وہ طیور
اندھیرا ابھی چھانے لگا دُور دُور

سُنہری ہوئیں حوض کی چادریں
وہ اُڑنے لگیں سر پہ چمگادڑیں

کھڑے ہیں وہ کوٹھوں پہ اربابِ دیں
لگائے ہوئے آنکھ پر دُوربیں

اُفق کی طرف غور سے بار بار
نظر کر رہا ہے ہر اک روزہ دار

چڑھے تھے مساجد پہ جو اھلِ صوم
پکارے خلائق کو وہ فخرِ قوم

مبارک ہو اے طالبانِ وصال
دکھاتا ہے وہ تیغِ ابروِ ھلال

یہ سُنکر ہوئے شاد پیر و جواں
مُسرت کا ہر سمت چھایا سماں

مہِ نو ہوا جلوہ گر دھر میں
وہ بجنے لگیں نوبتیں شہر میں

سلامی کی آواز آنے لگی۔
شہانے کی دُھن کیا رجھانے لگی

مہِ نو کی خاطر بہت دیر تک
بچھائے رہا سُرخ اطلس فلک

دکانوں پہ وہ لمپ جلنے لگے
ستارے بھی دو اِک نکلنے لگے

ہلال اپنی کشتی پہ ہو کر سوار
اُترنے لگا بحرِ قلزم کے پار

فریضے سے فارغ ہوئے پاکباز
اُٹھانے لگا چرخ بھی جانماز

مساجد سے گھر کو چلے خاص و عام
مہِ نو نے جُھک کر کیا وہ سلام

وہ پہنچے مکاں پر صغار و کبار
وہ کھا پی کے فارغ ہوئے روزہ دار

علیٰ قدرِ حیثیت اھلِ دول
سجانے لگے اپنے اپنے محل!

(بنیظیر شاہ)

(مرسلہ نصرت آروی)

افسانہ

چاند پر چاند

افسانہ

از مولانا شاکر صاحب ناطقی کانپوری

نصرت زمانی بیگم تیموری نسل اور اُس مغل خاندان کی ایک پسماندہ شہزادی تھیں جن کو زمانہ کے بے درد ہاتھوں نے بُری طرح مٹایا ہے نصرت بیگم ایک اسّی نوّے سال کی ضعیفہ ہو کر غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار وگیر میں پورے خاندان کو اپنی آنکھوں سے تباہ و برباد ہوتے دیکھ چکی تھیں۔ اور جس طرح چکی کے دو پاٹوں میں سے بعض وقت آٹے کے ساتھ کوئی تنہا گیہوں بغیر پسے گر پڑتا ہے۔ اسی طرح حُسن اتفاق سے کسی طرح نصرت بیگم معہ اپنی گود کی بچی عشرت بیگم کے زندہ بچ گئیں۔ نصرت بیگم اپنے کنبہ کے عروج و زوال کی داستان جن لفظوں میں بیان کرتی تھیں سننے تو نہیں دیکھا کہ کوئی سخت دل انسان بھی جوشِ گریہ کو ضبط کر سکا ہو۔

نصرت زمانی بیگم خالص تیموری النسل شاہزادی تھیں غدر کے زمانہ میں اپنے شوہر جان کے خوف سے تمام اہل و عیال کو لیکر دہلی سے نکلے اور قریب کے کسی گاؤں میں اپنے ایک دوست زمیندار کے یہاں جا کر ٹھہر گئے۔ اس خیال سے کہ ہنگامہ فرو ہو تو دہلی واپس چلے جائیں گے لیکن ایسے گئے کہ پھر دہلی لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا۔

نصرت بیگم اپنی دو سال کی بچی عشرت کو بغل میں داب کر اُس سیل حوادث کے تھپیڑے کھاتی ہوئیں نہ معلوم کتنے دنوں میں اور کس صورت سے لکھنؤ پہونچ گئیں۔ یہاں اُن کے ایک دور کے رشتہ دار مرزا فریدالدین رہتے تھے جو کہ دو سال قبل ہی دہلی کی آئندہ تباہی کو دل کی آنکھوں سے دیکھ کر پیٹ پر پتھر باندھے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ اگرچہ مرزا نے غریب الوطنی میں اپنی شاہزادگی چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن جس طرح پتھر رگڑ کھانے سے آگ دیجاتا ہے مرزا کی مغلئی بھی ظاہر ہو کر رہی۔ اور ایک رئیس نے اُن کو تیس روپیہ ماہوار پر اپنے یہاں مصاحبت میں رکھ لیا۔

نصرت بیگم جس وقت لکھنؤ پہونچیں ہیں تو نہ ایک وقت کے کھانے کو پاس تھا نہ تن پر کپڑا درست تھا۔ بیچارے مرزا فریدالدین نے جس طرح کہ حقیقی بہن کے ساتھ سلوک کرتے ہیں نصرت بیگم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اپنے مقدور بھر خورد نوش اور لباس کا انتظام کر دیا۔ نصرت بیگم اگرچہ چار بچوں کی ماں تھیں لیکن ابھی جوان تھیں زمانہ کی حالت دیکھتے ہوئے مرزا نے کئی مرتبہ بیگم کا عندیہ لیا کہ ذرا بھی ان کا منشا معلوم ہو تو کسی شریف آدمی سے ان کا عقد کر دیا جائے۔ لیکن وہ اس پر کسی طرح رضامند نہ ہوئیں۔

مثل اور مغل شہزادیوں کے وہ صرف پڑھی لکھی ہی نہ تھیں بلکہ ان کو ایسی دستکاریاں آتی تھیں کہ مرزا کے ذرا سے سہارے پر انہوں نے اپنی اور اپنی بچی عشرت کے اخراجات کا انتظام کر لیا۔

مرزا فریدالدین کے گھر میں بھی علاوہ بیوی کے دو بچے تھے ایک لڑکا پانچ سال کا اور ایک لڑکی سہ سال کی عشرت رفتہ رفتہ ان لوگوں سے مانوس ہو گئی۔ مرزا کی بیوی نصرت بیگم کی عزّت کرتی تھیں الغرض یہ تیموری کنبہ غریب الوطنی میں معمولی طور سے زندگی کے دن گذارنے لگا۔

— ✣ — ✣ — ✣ —

(۲)

دن گزرتے دیر نہیں لگتی نصرت بیگم کو لکھنؤ آئے پندرہ سال گزر گئے بچے جوان ہو گئے جس طرح مرزا فریدالدین اب بڑے میاں کہہ کر پکارے جاتے تھے اسی طرح نصرت زمانی بیگم کا بھی بوڑھوں میں شمار تھا۔ ادھر مرزا کے صاحبزادے سکندر بخت ماشاء اللہ اب بیس سال کے وجیہ و شکیل نوجوان تھے۔ اُدھر نصرت بیگم کی صاحبزادی عشرت بیگم نے بھی اب سترھویں سال پر قدم رکھا تھا ایک تیموری نسل کی شاہزادی کو کیسا ہونا چاہئے عشرت بیگم اس سوال کا مجسم جواب تھی کمی صرف اسقدر تھی کہ بوجہ افلاس و مصیبت کے جیسی تعلیم ایک شاہزادی کی ہونا چاہئے تھی اس درجہ پر نہ ہو سکی۔ بس ایک نصرت بیگم کا دم تھا وہی معلم تھیں اور وہی اتالیق بھی بہرحال عشرت بیگم موجودہ حالات میں بھی ہزاروں ہم عمروں میں ہر حیثیت سے فرد تھی۔ یہی حال بیچارے سکندر بخت کا تھا مرزا فریدالدین ان کو اپنی خاندانی وجاہت کے عشر عشیر بھی تعلیم نہ دلا سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود سخت کوشش اور سفارشوں کے کوئی معقول ملازمت نہ مل سکی۔ مرزا عدالت کلکٹری کی اہلمدی پر قناعت کرنا پڑی۔

اب مرزا کو اپنے صاحبزادے سکندر کی شادی کی نہایت فکر تھی اور غریب نصرت بیگم تو عشرت کی جوانی دیکھ کر اس فکر میں گھلی جاتی تھیں۔ مرزا کو اپنی حالت دیکھتے ہوئے جرأت نہ ہوتی تھی کہ نصرت بیگم کو سکندر کا پیغام دیں بالکل اسی طرح نصرت بیگم کو بھی پس و پیش تھا۔ اول تو لڑکی کا معاملہ دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ خدا جانے مرزا مجھ ایسی غریب بیوہ کی لڑکی کو پسند بھی کرتے ہیں یا نہیں نہ یہاں چار آدمیوں کو جوڑنے کی استعداد ہے نہ جہیز دینے کی حیثیت ہے۔ یا اللہ تو مجھ غریب بیوہ کی عزت رکھ لے۔ بوڑھی نصرت بیگم اگرچہ مصیبتیں اٹھاتے اٹھاتے خوگر ہو گئیں تھیں لیکن اس موقع پر وہ جوشِ گریہ کو ضبط نہ کر سکیں۔ دل بھر آیا اور رونے لگیں۔ مرزا کی بیوی نے نصرت بیگم کے گریہ کی آواز سنی تو اپنے شوہر سے کہا۔

اجی سنتے ہو یہ آج آپا نصرت بیچاری نہ معلوم کیوں رو رہی ہیں ذرا آپ ہی جا کر دریافت کریں تو شاید کچھ دل کا حال ظاہر کر دیں یہ سُنکر مرزا فریدالدین کھڑکی سے نصرت بیگم کے پاس پہونچ گئے اور آپا تسلیم کہہ کر بیٹھ گئے۔

نصرت بیگم نے دوپٹہ سے آنسو پونچھ کر مرزا کے سلام کا جواب دیا اور کہا بھیا سب خیریت ہے آج کئی روز کے بعد تمہاری صورت دکھائی دی

مرزا - نہیں آپا ابھی کل ہی تو میں آپ کو دتی کا خط سنانے آیا تھا۔ آپا آج آپ مجھے سب دن سے زیادہ غمزدہ دکھائی دیتی ہیں ہمیشہ تو آپ ہم لوگوں کو صبر و رضا کے مسائل سنایا کرتی تھیں آج میں خود آپکی آنکھیں اشک آلود دیکھتا ہوں۔ بتائیے میری معزز بہن آخر وہ کونسی نئی مصیبت ہے جس نے آپ کو اشکباری پر مجبور کر دیا۔

مرزا کی باتوں سے نصرت بیگم کا دل پھر اُمنڈ آیا اور وہ رونے لگیں اب مرزا کا اصرار اس درجہ پر پہونچ گیا کہ نصرت بیگم حال کہنے پر مجبور ہو گئیں

نصرت بیگم - بھیا مجھے تو اب جینے کی خوشی ہے اور نہ مرنے کا غم۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ صبح سے شام تک پیٹ بھرنے کو مل جاتا ہے لیکن بھیا عشرت کو دیکھ دیکھ کر ہر وقت میرا دل فکر مند رہتا ہے نہ جوان لڑکی کو بٹھا سکتی ہوں اور نہ شادی کرنے کی استطاعت ہے۔ تو آخر یہ بڑا کس طرح پار ہو بھیا تم جانتے ہو مجھے سانس کا عارضہ ہے خدا جانے کس وقت یہ سانس رک جائے اور میری بچی عشرت ....

جوشِ گریہ سے آواز رُک گئی۔

مرزا - ہائیں ہائیں آپا یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے ذرا حواس درست کیجئے تو میں آپکی بات کا جواب دوں۔ میرے خیال میں سکندر اور عشرت کا عمر کے لحاظ سے جوڑ مناسب ہے اگر آپ سکندر کو غلامی میں قبول کر لیں تو دونوں کے لئے سہولت اور آسانی ہے آپ میری حالت سے واقف ہیں آپ کا حال مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے ذات پات پوچھنا نہیں۔ سکندر نے آپ کے گود میں پرورش پائی ہے اگر آپ اس رشتہ کو پسند کر لیں تو میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر جائے۔

نصرت بیگم نے مرزا فریدالدین کی باتوں کو دل کے کانوں سے سنا اور اپنے خاص بزرگانہ انداز میں کہنے لگیں۔

نصرت بیگم - بھیا فرید تمہارے سلوک اور احسانات کا بدلہ اس دنیا میں تو مجھ سے غیر ممکن ہے جس طرح تم نے ایک مدت تک میرے ساتھ

برادرانہ برتاؤ کیا ہے اس کا اجر تم کو خدا سے ملیگا عشرت بے باپ کی بچی ہے اس کے سر پہ ہاتھ رکھو گے تو اللہ تعالےٰ تمہارے بچوں کو خوش و خرم رکھے گا۔ رہا عقد کا معاملہ تو بھیا جس طرح سکندر تمہارا بچہ ہے اُسی طرح عشرت کے بھی تم مالک ہو میری حالت جو کچھ ہے ظاہر ہے جب چاہو دو بول پڑھوا دو۔ مجھے اس میں کوئی عذر نہیں ہے۔

گفتگو ختم ہوگئی مرزا چلے گئے نصرت بیگم کو اب کچھ اطمینان ہوا۔ آخر چند روز کے بعد دس پانچ آدمیوں کی مختصر صحبت میں نہایت سادگی سے سکندر بخت اور عشرت زمانی بیگم کا عقد ہوگیا بوڑھی نصرت بیگم نے اپنی اکلوتی بچی عشرت کو جس طرح رخصت کیا اُس کی مثال اس زمانے میں ملنا مشکل ہے۔

(۳)

گردش لیل و نہار نے دن سے مہینے مہینوں سے سال بنادئے دس سال کی طویل مدت میں سینکڑوں انقلاب آئے اور گذر گئے بیچارے مرزا فریدالدین چند روز بیمار رہ کر انتقال کر گئے سکندر بخت اس عرصہ میں تین بچوں کے باپ ہوگئے عشرت بیگم کے تین بچے ایک لڑکا اور دو ننھی بچیاں اپنی خاندانی روائت کے مطابق بالکل مہ و اور شہاب تھے اب اس کنبہ کا بار تنہا غریب سکندر بخت کے سر پر تھا جس میں نصرت بیگم ملا کر چھوٹے بڑے آٹھ آدمی تھے پچیس تیس روپیہ کی ملازمت دست غیب سے پر ہیز ایسی حالت میں اور اس قلیل آمدنی میں جس طرح اس شاہی خاندان کی پرورش ہوتی ہوگی ظاہر ہے۔

نصرت بیگم اور سکندر کی والدہ کو مرزا فریدالدین کے انتقال کا حد سے زیادہ صدمہ ہوا۔ نصرت بیگم تو اب واقعی عمر طبیعی کو پہونچ چکی تھیں۔ لیکن سکندر کی والدہ کو اس جانکاہ صدمہ نے قبل از وقت ضعیف کر دیا۔ اور وہ بھی اب دوسری نصرت بیگم نظر آتی تھیں گھر کا سب کام بچوں کا رکھ رکھاؤ والدہ اور ساس دونوں ضعیفوں کی خدمت بھی اب تنہا غریب عشرت بیگم کے ذمہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں یہی زمانہ ہوتا ہے جس کو کسوٹی کہنا چاہیئے اور یہی نازک موقع ہے جس کو شرافت کا معیار کہنا چاہیئے۔ الغرض عشرت بیگم نے اس ازدواجی زندگی میں کسی طرح بھی اپنے کو سکندر سے کمزور نہ ثابت ہونے دیا اور یہ سب نتیجہ تھا نصرت بیگم کی تعلیم و تربیت کا مصیبت جب آتی ہے تو دم نہیں لینے دیتی بیچارے سکندر کے لئے موجودہ پریشانیاں کیا کم تھیں کہ اس پہ مزید براں یہ طرہ ہوا کہ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ پراگندہ روزی پراگندہ دل ایک شخص جس کی آمدنی بمشکل گذر کیلئے کافی ہوتی ہو دو چار مہینے کی بیکاری نے اس پر کیا کیا ستم ڈھائے ہوں گے۔

یہ زمانہ اس تیموری کنبہ کے لئے سخت امتحان کا زمانہ تھا اول تو ان غریبوں کے پاس زیور اور اثاث البیت ہی کیا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا اُس کو بیچکر کھا گئے بیچارے سکندر صبح سے شام تک فکر معاش میں تمام شہر کا چکر لگاتے نہ کہیں دس روپیہ کی ملازمت ملتی اور نہ کہیں چار آنہ کی مزدوری لگتی۔ مرزا بیچارے صبح کے بھوکے پیاسے جب شام کو ناکام گھر واپس آتے اور بچے ابا جانی ابا جانی کہہ کر پیروں سے لپٹ جاتے تو ان کا کلیجہ شق ہو جاتا۔ لیکن ایسی ناکام حالت میں نصرت بیگم کے تسلی دہ الفاظ بہت کچھ مرہم کا کام دیتے وہ پیغمبروں اور بزرگوں کے واقعات ایسے لطیف پیرایہ میں بیان کرتیں کہ دوسرے دن کے لئے غریب سکندر اپنی امید کی دنیا قائم کر کے پڑ رہتے۔

۴

آج مرزا سکندر بخت خلاف معمول جلد مکان لوٹ آئے اور وہ بھی اس شان سے کہ ایک مزدور پہ غلہ وغیرہ لدا ہوا اور آپ ہاتھ میں ترکاری گوشت وغیرہ رومال میں لئے ہوئے آتے ہی والدہ اور نصرت بیگم کو سلام کیا اور کہا امی جان آج تو ہم نے ملازمت کر لی دونوں بوڑھیوں نے بیک زبان الحمدللہ کہا اور دعائیں دیں مزدور کو رخصت کر کے جب سکندر اطمینان سے بیٹھے تو نصرت بیگم نے پوچھا۔

نصرت بیگم۔ بیٹا خدا کے فضل سے کہاں ملازمت لگی ہے کیا کام ہے اور کیا تنخواہ ملے گی اور وہ کون اللہ کا نیک بندہ ہے جس نے ہم لوگوں کی حالت پہ رحم کر کے کچھ پیشگی بھی دیدیا۔

سکندر۔ امی جان اب آپ سے کیا چھپاؤں بیٹے عراق جانیوالی فوج میں ملازمت کر لی ہے ۵۳ روپیہ مہینہ اور لباس خوراک سفر خرچ طے ہوا ہے۔ سال میں ایک مہینہ کی رخصت بھی مل سکے گی۔

لیکن دوسال سے قبل گھر آنا نہ ہوسکیگا۔ پچیس روپیہ مہینہ میں نے نورچشم اختر کے نام لکھا دیا ہے جو آپ کو ہر مہینے کی دوسری تاریخ کو ملجایا کریں گے۔ دس روپیہ ہم کو عراق میں ملا کریں گے۔ غنیمت ہے کہ کچھ روز کے لئے گذر کی صورت نکل آئی۔

امی جان میں تو اس نامراد زندگی سے عاجز آگیا ہوں آپ ہی فرمائیے کہ ایسے نازک وقت میں اس فوجی ملازمت کو بھی جواب دیدوں تو کیا بچوں کو بھوکوں مار ڈالوں۔ امی جان ہم سپاہی کی اولاد ہیں ہمارے بزرگوں پر اس سے زیادہ خراب وقت پڑے ہیں اور انہوں نے اس کڑی منزل کو نہایت جوانمردی سے طے کیا اور آخر منزل کامرانی تک پہونچ گئے تاریخی واقعات مجھ سے زیادہ آپ جانتی ہیں۔ برادر بھائیوں ہمارے کون تھے؟ اگرچہ حکومت نہیں رہی لیکن اس کو کیا کیاجائے کہ رگوں میں ابھی تک وہی گرم خون دوڑ رہا ہے سکندر کی اس تقریر نے عورتوں کو بدحواس کردیا۔ سکندر کے میدان جنگ میں جانے کے بعد ان لوگوں کی جو کچھ حالت ہونے والی ہے اس کا اندازہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ اور تو کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ سکندر کی تقریر کا جواب دیتیں لیکن بوڑھی نصرت بیگم نے جو کچھ ان سے ہوسکا سب کی ترجمانی کی ....

....

....

.... بہت کچھ نشیب و فراز سمجھائے تنہائی اور ننھے بچوں کا خیال دلایا لیکن تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا اب اسکا واپس ہونا امر محال تھا۔ آخرکار ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں سکندر بخت سب سے رخصت ہوکر کراچی اور وہاں سے جہاز پر بیٹھ کر بصرہ روانہ ہوگئے رخصت کے وقت ان سب کی جو کچھ حالت ہوگی اُس کا اندازہ ناظرین کی طبیعت پر چھوڑا جاتا ہے۔ خصوصاً سکندر کی بیوی عشرت بیگم کا مایوسانہ انداز دل کے ٹکڑے کئے دیتا تھا اور اس کے خوردسال بچوں کا سکندر کے گلے میں باہیں ڈال کر یہ کہنا کہ اباجانی ہم تو آپ کو لڑائی پر نہ جانے دینگے قیامت کا سین تھا۔ لیکن جوانمرد سکندر کا کلیجہ تھا کہ وہ ان تمام صبر آزما موقعوں سے جس طرح ہوسکا بچ کر نکل گیا۔

(۵)

ایک مثل ہے کہ خوشی کا وقت جلد ختم ہوجاتا ہے اور مصیبت کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں یہ مثل اس وقت ان غریبوں پر بالکل صادق آتی تھی۔ سکندر کو عراق گئے دوسال ہوگئے اس درمیان میں اکثر سکندر کے خطوط آتے رہے جس سے خیریت معلوم ہوتی رہی اور پچیس روپیہ تو ہر مہینے ملجاتے تھے مرزا فریدالدین مرحوم کے ایک خاص دوست منشی تصدق حسین نہ صرف تنخواہ کے روپیہ لادیتے تھے بلکہ روزمرہ بچار سے صبح کو آکر آواز دیتے اور روزمرہ کی ضروری چیزیں بازار سے لاکر دیدیا کرتے تھے۔

دوسال گذرنے پر اب امید ہوچلی تھی کہ سکندر مکان واپس ہونگے۔ نصرت بیگم کہا کرتی تھیں کہ میرا بچہ خیریت سے گھر آجائے تو اب ہرگز نہ جانے دوں گی۔ حسب معمول جب صبح کو منشی تصدق حسین دروازہ پر آئے تو انہوں نے بچوں سے کہا کہ ذرا بڑی بیگم کو میرا سلام کہدینا اور کہنا کہ تکلیف کرکے دروازہ تک آجائیں نصرت بیگم دروازہ پر پہونچیں منشی تصدق حسین کو دعائیں دیں اور کہا خیریت ہے بیٹا کہو کیا کام ہے تصدق حسین۔ بیگم صاحبہ آج بڑی منحوس خبر سننے میں آئی ہے پہلے لوگوں کے زبانی سُنا پھر اخبار میں دیکھا۔ آخر تصدیق کے لئے چھاؤنی گیا جس دفتر سے مرزا سکندر کا تقرر ہوا تھا وہاں کے آفیسر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ عراق میں جس مقام پر جنگ ہورہی تھی اُس کو انگریزوں سے ترکوں نے فتح کرلیا مقتولوں اور قیدیوں میں بڑے بڑے افسروں کا نام ہے لاپتہ لوگوں کی بھی فہرست بہت طویل ہے جس میں سکندر کا بھی نام شامل ہے۔

تصدق حسین کی گفتگو بجلی بنکر نصرت بیگم کے دل پر گری اور اُن کو بجائے کھڑا رہنے کے زمین پر بٹھا دیا ہزار صبر کی کوشش کرتی ہیں لیکن انجام کی ایسی مُہیب صورت اُن کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے کہ وہ بے اختیار ہوجاتی ہیں۔ اب نصرت بیگم کی غیر معمولی حالت کو سکندر کی والدہ اور عشرت نے دیکھا ایک سکنڈ میں گھر کے سب چھوٹے بڑے ممبر نصرت بیگم کے گرد جمع تھے اور استفسار حال کے لئے اصرار کر رہے تھے نصرت بیگم

اس وقت سخت پس و پیش میں تھیں نہ اُن سے اصل حال ظاہر کیا جاتا تھا۔ اور نہ چھپاتے بن پڑتا تھا آخر انہوں نے دل پر جبر کر کے مختصر لفظوں میں منشی تصدق حسین کا بیان دُہرا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ خدا پر بھروسہ رکھو وہ بڑا مسبب الاسباب ہے وہ عالم الغیب ہے اُس کو ہم لوگوں کی بے بسی اور بے کسی کا علم ہے وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ انشاء اللہ سکندر آئیں گے اور جلد آئیں گے۔ لاپتہ ہونے سے کیا ہوتا ہے بچو تم اپنے ابا جانی کی واپسی کے لئے اللہ سے دعا کرو معصوموں کی دعا وہ ضرور سنتا ہے اتنا کہہ کر نصرت بیگم سجدے میں گر گئیں۔

(۶)

تلا العمارہ کے ترکی کیمپ میں آج غیر معمولی چہل پہل ہے افسر اور سپاہی ہر شخص فتح کے نشہ میں سرشار نظر آتا ہے۔ لیکن ایک نوجوان ترکی پاشا اپنے خیمے میں کاغذات اور نقشۂ جنگ کے معائنہ میں اب بھی مصروف ہے۔ ایک نوجوان شخص اور اسقدر متین و سنجیدہ؟ ایسے خاص موقع پر جذبات کو قابو میں رکھنا ایک غیر معمولی انسان ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اسی عالم میں دو سپاہی ایک جوان شخص کو پکڑ کر لائے۔ اور پاشا کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ پاشا کے دریافت کرنے پر اُن لوگوں نے کہا کہ حضور یہ ہندوستانی شخص دشمن کا جاسوس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم نے اس کو ترکی کیمپ کے قریب گھومتے ہوئے پکڑا ہے۔ اب پاشا نے اپنی روشن اور تیز نگاہیں جوان قیدی پر ڈالدیں۔ سپاہیوں کو باہر جانے کا اشارہ کر کے جوان کو سامنے رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا چند وقفہ میں اپنے سکریٹری کو ضروری احکام دیکر اب پاشا جوان قیدی کی طرف متوجہ ہوا

پاشا (فارسی میں) ہاں سپاہی تم کون ہو کیا نام ہے اور ترکی کیمپ کے قریب گشت کرنے سے تمہاری کیا غرض تھی اگر تم بالکل صحیح اپنے حالات اور ارادہ سے مجھے آگاہ کر دو گے۔ تو یقین جانو خواہ تم نے کیسا ہی جرم کیا ہو گا میں تمہیں معاف کر دوں گا کیونکہ ایک ترک ہمیشہ انتقام سے معافی کو بہتر جانتا ہے۔

جوان (فارسی میں) حضور پاشا میں اپنی حالت کیا بیان کروں۔ بدنام کنندۂ نکونامے چند) میں بھی ترکی النسل اور خاندان تیموریہ کا ایک بدقسمت فرد ہوں میری حالت کے برعکس میرا نام مرزا اسکندر بخت ہے وطن مالوف دہلی ہے اور اس وقت بحالت مجبوری لکھنؤ (اودھ) کا باشندہ ہوں۔

حضور پاشا ہماری تاریخ بہت عبرتناک ہے حکومت کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کی معاشرتی زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ انتہا یہ ہے کہ پیٹ کو روٹی میسر ہے اور نہ تن کو کپڑا۔ حضور پاشا وہ کون سی مجبوری تھی جس نے مجھے باوجود یہ جانتے ہوئے کہ اپنے بھائیوں پر بندوق اُٹھانا پڑے گی۔ اس فوجی بھرتی پر مجبور کر دیا۔ آہ ضعیفوں کی بھوک اور بچوں کا فاقہ .... بس معزز پاشا مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا یہاں تک پہونچکر سکندر کی آواز جوش گریہ سے رُک گئی اور وہ خاموش ہو گیا نوجوان پاشا پر سکندر کی اس درد آمیز تقریر نے ضرورت سے زیادہ اثر کیا اور اس نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ اچھا بتاؤ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔

سکندر۔ سب سے پہلے میری یہ درخواست ہے کہ آپ مجھے اپنی حفاظت میں لیلیں خواہ ایک قیدی کی حیثیت سے خواہ آزاد انسان کی حالت میں۔ دوسرے یہ کہ مجھے اہل و عیال سے چھوٹے ہوئے دو سال گذر چکے ہیں اب میں وطن جانے کے لئے نہایت بے چین ہوں اور اس بات کو میں حضور پاشا کے فیاضانہ طرز عمل پر چھوڑتا ہوں کہ میرے لئے جو مناسب ہو وہ صورت اختیار فرمائیں لیکن مجھے میرے وطن پہونچا دیں پاشا نے امداد کا وعدہ کر لیا اور سکندر کو ایک خاص خیمہ میں ہندوستانی ڈاکٹر کے ہمراہ قیام کی اجازت دیدی۔

(۷)

شریف اور سنگدل پاشا نے سکندر کے ساتھ خاص طور پر ہمدردانہ سلوک کیا برٹش آفیسر سے سکندر کی رخصت منظور کرائی۔ ایک معقول رقم الاؤنس کی برٹش حکومت سے اور اُس نے اپنی طرف سے بھی ایک رقم کا اضافہ کر کے یہ تمام کاغذات معہ

پاسپورٹ کے جس وقت سکندر بخت کے پاس پہنچے اُس کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی اور وہ ایک خاص جذبہ کے ماتحت پاشا کے خیمہ کی طرف دوڑا راستہ میں پاشا کو آتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار اُس کے قدموں پر گر پڑا۔ پاشا نے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور چند محبت آمیز جملے کہہ کر سکندر کو رخصت کر دیا۔

اب سکندر کو اپنے گھر کی دُھن تھی اور بال بچوں سے ملنے کا اشتیاق۔ رمضان المبارک کی پانچ تاریخ تھی جب وہ تنہا بمارہ سے اونٹ پر بیٹھکر بصرہ کو روانہ ہوا بصرہ وہ ایسے وقت پہونچا کہ کراچی جانے والا جہاز تیار تھا۔ سکندر جس روز جہاز سے کراچی کے بندرگاہ پر اُترا تو عید میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ بندرگاہ سے باہر آتے ہی اُس نے اپنی آمد کا ٹیلیگراف منشی تصدق حسین کے نام روانہ کر دیا۔ اگرچہ اس کے جہاز کے ساتھی اُسے مجبور کر رہے تھے کہ دو روز کراچی میں ٹھہر کر تکان سفر دور کیا جائے۔ لیکن سکندر کو یہ آرزو تھی کہ پر لگ جائیں اور وہ اڑکر جلد از جلد لکھنؤ پہنچ جائے۔ اُس نے کراچی سے لکھنؤ تک کا سفر جس خاص جذبہ کے ماتحت ختم کیا اُس کا ضبط تحریر میں آنا مشکل ہے۔

آسمان پر ہلالِ عید نمودار ہو چکا تھا وہ چاند جو اپنے اندر ایک ایسی برقی قوت رکھتا ہے جو ہر گھر کے لوگوں کے دلوں کو گرما دیتا ہے۔۔

سکندر کے گھر میں بھی عید کا چاند دیکھا گیا لیکن آہ کس طرح۔ بچے چاند دیکھ کر کہتے ہیں بی اماں نانی جان تو کہتی تھیں تمہارے ابا جانی آج آجائیں گے لیکن وہ نہیں آئے۔

اللہ امی سچ سچ بتا دو کیا واقعی ابا جانی آنیوالے ہیں بھئی اب تو ہم اللہ میاں سے دعا کرتے ہیں کہ یہ چاند آج لوٹ جائے کل جب ہمارے ابا جانی آجائیں تو نکلے۔

ننھی سلیمہ ابھی یہ دلخراش جملے پوری طرح ادا بھی نہ کرنے پائی تھی کہ دروازہ سے آواز آئی" ننھی بیگم چاند کو واپس نہ کرو تمہارے ابا جانی آ گئے ہیں اور اس آواز کے ساتھ سکندر بخت مکان میں داخل ہو گئے۔ نصرت بیگم لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھیں اور دونو ہاتھوں سے سکندر کی بلائیں لیکر کہا" دنیا ایک چاند دیکھ رہی ہے میرے گھر میں دو چاند نظر آتے ہیں"۔ یہ چاند جس طرح ہمارے لئے خوشی کا پیغام لایا ہے۔ مولا میرے دنیا کو ایسی ہی خوشی کی

عید مبارک ہو"

"تیرا تحفہ"

(بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کا ایک دلکش نغمہ)

میرے لئے صندلی شربت مت لاؤ!

میرے محبوب! مجھے وہ خاک پا جمع کر لینے دے جسے تو نے شرفِ خرام بخشا ہے وہ ذرات خاک میرے لئے زیرۂ گل ہیں!

مجھے قند و شکر کے سرد و شیریں مرصع پیالے درکار نہیں —— تیرے ہاتھ سے مس کئے ہوئے جام سفالی کا ایک قطرہ میرے لئے "اولمپس" کی شراب اُلوہیت سے زیادہ ہے!

تیرے خوانِ کرم کے ریزے میرے لئے لذیذ ترین طعام ہیں۔ مجھے کنول کے اس ہار کی ضرورت نہیں جس میں "شبنم در آغوش" پھول گندھے ہوئے ہیں اور جنہیں صبح کے چاند نے بیدار کیا ہے!

میرا رحشی سینہ تیرے نقوش پا سے ایک ایسی سرمدی مسرت محسوس کرتا ہے —— ایک ایسی تسکین جو "خوابِ حیات" کی لذتوں سے زیادہ ہے۔

میرے لئے سمندروں کی تہہ سے نادر الوجود موتی مت لاؤ!

مجھے گوشہ ہائے عالم کے ناممکن الحصول جواہر درکار نہیں!

میرے محبوب! میرے مجھے آگے یہ سب سیم و زر ہیچ ہیں —— غمولیہ تیرے ایام رفتہ کا سوگ اور گرم گرم آنسوؤں کا راز میرے لئے تیرا بہترین تحفہ ہے!

—:— (مترجمہ ظفر قریشی دہلوی)

صبح عید کی لطافتیں

چلے کہ صدق کل فی کل حین
الکرامات نور مبین ہ

چھپا دی کہ بیشک ہے تو ای وجیہ
کتاب قدیم ولاریب فیہ

نہیں مستی عشق بارای حسین
حملت وما دام انی امین

بسر ہو گئی لو شب انتظار
تجلی رحمت ہوئی آشکار

نجوم فلک جھلملانے لگے
چراغ سحر ٹمٹمانے لگے

قریب آ گئی صبح روشن نفس
اٹھے خوابگاہوں سے اہل ہوس

وہ ٹھنڈی ہوا اور تاروں کی چھاؤں
نزول صفا کا وہ پیارا سماں

وہ شہنا میں سحر کی دہن دلفریب
شہانی سے وہ شادیانی کی زیب

کھچے کس لئے دل نہ ہر تان پر
کرے کر رہی ہے اثر جان پر

شہانی صدا ہوش کھونے لگی
ستاروں کو وحشت سی ہونے لگی

بھری آہ ہوئی شب نے بھی چوکڑی
ہرن ہو گیا نشۂ خواب بھی

عیاں ہو گیا فرق بحر و سراب
روانی دکھانے لگی موج آب

وہ بوٹوں میں کلیاں چٹکنے لگیں
وہ شاخوں پہ چڑیاں چہکنے لگیں

وہ شبنم نے چھڑکا چمن پر گلاب
نہ رہ جائے تا کوئی سرگرم خواب

نسیم سحر گل کھلانے لگی
فضائے چمن رنگ لانے لگی!

حسین ہاتھ منہ اٹھ کے دھونے لگے
صفائی کے سامان ہونے لگے

چلے ہندو اشنان کو سوئے گنگ
وہ پہنچے کلیسا میں اہل فرنگ

وہ پو پھٹتے ہی والصبح پڑھنے لگی
صفا دمبدم اور بڑھنے لگی

پڑے تھے جو پژمردہ طفل نبات
ہوا شیر صبح ان کو آب حیات

ضیا آسماں سے اترنے لگی
نظر دور تک کام کرنے لگی

اٹھا ہر طرف شور مرغ سحر
پڑی چوب نقارۂ صبح پر

وہ اللہ اکبر کی آئی صدا
نہا دھو کے مسجد چلے پارسا

وہ مینا پہاڑی وہ کاکا توا
ہوئے آ کے شاخوں پہ نغمہ سرا

عنادل گلستاں میں گانے لگے
طیور سحر دل لبھانے لگے

ہوئی آسماں پر وہ سرخی نمود
بنا کان شنجرف چرخ کبود

شعاعیں دکھانے لگیں وہ جھلک
ہوئی زعفرانی بساط فلک

شفق میں بسنتی کرن ضو فشاں
گلے مل رہی ہیں بہار و خزاں

وہ زردی ذری او گہری ہوئی
پہاڑوں کی چوٹی سنہری ہوئی

مطلا ہوا گنبد ہر شجر
برسنے لگا ہر طرف آب زر

جھپکنے لگی چشم برنا و پیر
وہ چمکا سر تخت مہر منیر

سوئے بزم شاہنشہ دادگر
روانہ ہوئے لوگ با کر و فر

ادا کر کے رسم رکوع و سجود
پڑھا سب نے اس شاہ دیں پر درود

(بلنظیر شاہ)

منتخبہ نصرت آروی

عالمگیر عید نمبر کیلئے

ہلالِ عید

از حضرت اکبر حیدری

حقوق محفوظ

حقوق محفوظ

حضرت اکبر حیدری نے اپنی مخصوص طرز بدیع میں یہ تخلیقی نظم خاص عید نمبر کیلئے عنایت فرمائی ہے جو اپنے رنگ کی کامیاب اور قابل تقلید لطیف و دلکش نظم ہے ناظرین کرام کے ذوق و نظر کے لحاظ سے ہم اسکو پیش کرتے ہیں مسرور ہیں۔ مدیر

(۱)

اہلِ دل۔ اہلِ نظر میں کشمکش پیدا ہوئی   ایک تھا صرف محبت ایک تھا محو جمال
ایک کہتا تھا کہ "دُنیا حُسن پر شیدا ہوئی   ایک کہتا تھا "محبت کا ہے دنیا کو خیال

الغرض ہر شخص اپنی رائے کا مختار تھا
متفق دونوں کا ہو جانا بہت دشوار تھا

اہلِ دل اہلِ نظر میں ہو رہی تھی گفتگو   اور حُسن و عشق دونوں گوش بر آواز تھے
اس کو زعم خود نمائی اس کو پاس آبرو   اضطراب آگیں ادا تھی مضطرب انداز تھے

عشق نے گردن جھکا کر حُسن کی تعظیم کی
لیکن اسکے فیصلہ میں حُسن نے ترمیم کی

حُسن کے انداز میں تھا خود نمائی کا غرور   عشق بیکس و مسجود تھا۔ اور سراپا گوش تھا
حُسنِ برہم درحقیقت تھا حریفِ برقِ طور   عشق کچھ مسحور تھا۔ خاموش تھا بیہوش تھا

حُسن اس بیہوش کو ٹھکرا کے آگے بڑھ گیا
عشق کی افتادگی سے آسمان پر چڑھ گیا

(۲)

محفلِ نطق و نظر پر چھائی تھی افسردگی   بزمِ دنیا منتظر تھی اِک نئی آواز کی
ہر طرف پھیلی ہوئی تھی مضمحل پژمردگی   جستجو تھی نغمۂ پر سوز کو اک ساز کی

ذرہ ذرہ بزم ہستی کا سراپا گوش تھا!
دور بیں نظروں میں اک ہنگامۂ خاموش تھا

حسن اب تک محوِ آرائش تھا بزم ناز میں ڈھل رہا تھا نور کے سانچے میں جسمِ نازنیں
زندگی گویا مچی ہر جنبش میں ہر انداز میں جلوہ آما تھی پسِ پردہ شعاعِ آتشیں

ذرہ ذرہ میں نہاں تھی زندگیٔ بے ثبات
شرق سے تا غرب تھی آتش بجاں کل کائنات

عشق جو اب تک خیال و خواب کی دنیا میں تھا خوب واقف تھا وہ بزمِ ناز کے آداب سے
جانتا تھا، حسن ہنگامہ طلب کا مدعا کچھ سمجھ کر۔ سوچ کر۔ اُٹھا خیال و خواب سے

ہر دلِ پُر شوق میں مسکن بنا کر رہ گیا
منتظر دنیا کی نظروں میں سما کر رہ گیا

(۳)

اُسطرف اک آفتاب مضمحل تھا جلوہ گر لیلیٰ شب نے اُٹھایا اسطرف رُخ سے نقاب
رفتہ رفتہ ہو گیا تاریکیوں میں یہ اثر ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملتی تھی شعاعِ آفتاب

ایک کیفیت سی دنیا میں ہویدا ہو گئی
ہلکی ہلکی روشنی میں شام پیدا ہو گئی

دامنِ مغرب سے نکلی ایک تیغ آتشیں حسن خوں آشام اپنے رنگ میں ظاہر ہوا
دید کے قابل تھی بیشک یہ ادائے شرمگیں اک عروسانہ حیا سے جب ہلالِ نو اُٹھا

منتظر نظروں نے فوراً کر دیا اعلانِ عشق!
مژدہ باد اے حسن برہم زندہ باد اے جانِ عشق

یہ ہلالِ نو کے جلوے تھے کہ پیغامِ نشاط اہلِ دل۔ اہلِ نظر۔ دونوں نہ تھے اب ہوش میں
اس طرف دنیا و مافیہا تھی محوِ انبساط اس طرف عشرتِ حیا تھی میری آغوش میں

عشق میری ہر نظر میں کامیابِ دید تھا
حسن برہم میرے پہلو میں ہلالِ عید تھا

ایک دلآویز مزاحیہ مضمون!

عید کی صبح

عالمگیر کے عید نمبر کیلئے

میاں "ناکارہ" حیدرآبادی کے قلم سے

آہ! کیا کہوں؟ ستم رسیدہ ہوں، مظلوم ہوں، فلک کا ستایا ہوا ہوں۔ ہلالِ عید دوسروں کے لئے پیامِ مسرت لاتا ہے۔ مگر میں عید سے، عید کی نماز سے، بلکہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔ عجب نہیں اگر اگلی عید تک کوئی خبرِ وحشت اثر میرے متعلق سننے میں آئے۔ کمرے کی چھت اچھی ہے۔ صرف ایک مضبوط رسی کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ خدا بھلا کرے شیخ صاحب کا کہ انہی کی ذاتِ بابرکات نے مجھے اب مجبور کر دیا ہے کہ میں آنے والی عید سے پہلے اپنی مصیبتوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دوں اور کسی کی گود خالی کر جاؤں۔ اب آپ لوگوں کو میری فقط ایک استدعا ہے۔ اسے وصیت ہی سمجھئے۔ خدا کے لئے کوئی یہ مضمون شیخ صاحب کو پڑھ کر سنائے۔ درد انگیز آواز سے پڑھا جائے تو بہتر ہے، تاکہ شیخ جی اس سے متاثر ہو سکیں۔ تکلیف تو بیشک ہوگی مگر ثواب بھی بے حساب ہوگا۔

دوست کس کے نہیں ہوتے؟ مگر شیخ صاحب جیسا دوست اگر کسی کو مل جائے تو پھر اس کو کسی اور دوست کی تمنا نہیں ہوتی۔ نہیں معلوم وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جبکہ میں پہلی دفعہ شیخ سے ملا۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ دوست واقعی ان کے حق میں رحمت ہے یا زحمت۔ بڑے بڑے فلسفی متفقہ طور پر دوست کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تکلیف میں ہو تو دوست کو چاہئے کہ اس کی مدد کرے۔ اور اگر قرض کی ضرورت ہو تو روپیہ فراہم کرے اور پھر واپس نہ مانگے۔ اور اگر خوانخواستہ مصیبت میں مبتلا ہو تو ڈر کر بھاگ نہ جائے۔ وغیرہ وغیرہ مگر شیخ جی اپنے دوستوں کا دل دکھانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں، اور وہ جانتے ہیں کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ جانتے ہیں۔ کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ عید کی نماز پڑھنے کے لئے ان کے ساتھ عیدگاہ جانا میدانِ جنگ کے برابر ہے یہ سمجھ کر میں عید سے ایک دن پہلے ان کے گھر جانے کا نام بھول کر بھی نہیں لیتا۔ مگر برا ہو اوندھی تقدیر کا کہ خود شیخ صاحب بہ نفسِ نفیس میرے گھر تک تشریف لانے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں۔ میں اندر سے کہلا بھیجتا ہوں کہ "میاں باہر گئے ہوئے ہیں۔" مگر شیخ صاحب کا جواب آتا ہے کہ "اچھا۔ میں دیوان خانہ میں انتظار کرتا ہوں۔" چار و ناچار باہر جاتا ہوں اور کہتا ہوں "معاف کرنا بھئی۔ میں اندر ہی تھا۔ دلپسند نے مجھے نہیں دیکھا" کہتے ہیں "کوئی مضائقہ نہیں۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ کل آٹھ بجے عیدگاہ جانا ہے۔ چلو گے نا؟" میں اول تو حیلے حوالے کرتا ہوں مگر آخر بھلا آدمی مجبور ہے وعدہ لیکر ہی رخصت ہوتا ہے۔

دوسرے روز نئی ٹوپی نئی شیروانی نیا جوتہ پہن کر حسبِ وعدہ شیخ صاحب کے دولت خانہ جانے کے ارادہ سے نکل پڑتا ہوں اور آٹھ بجے سے پہلے ہی ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوا نظر آتا ہوں۔ جب کوئی جواب نہیں ملتا تو کھٹکھٹانے کے عمل کو دہراتا ہوں۔ اب کے بھی جواب خاموشی ہوتی ہے تو جھنجھلا کر اپنا غصہ اور زورِ بازو غریب دروازہ پر صرف کرتا ہوں۔ جواب ندارد۔ اب تو واقعی میں جلال میں آکر ہاتھ کے ساتھ گلے کا بھی برمحل استعمال کرتا ہوں اور صدا بلند کرتا ہوں "شیخ صاحب!—— (وقفہ) —— شیخ صاحب!!—— دوسرا وقفہ —— شیخ صاحب!!!" بالکل اسی طرح جیسے عدالت میں چپڑاسی

مدمی اور مدمی علیہ کو پکارتا ہے۔ میری یہ صدا اگرچہ فقیروں کی صدا کو مات دے رہی ہوتی ہے مگر پھر بھی نقارخانے میں طوطی کی آواز کے مصداق ہوتی ہے۔ کوئی جواب نہیں ملتا میری زبان سے بے ساختہ "لاحول ولا" نکل جاتا ہے۔ یکایک ایک خیال میرے دل میں آتا ہے۔ کہیں شیخ صاحب میرا انتظار کرکے میرے گھر تو نہیں چلے گئے؟ کوئی آواز میرے کان میں کہتی ہے "ممکن ہے۔ بہت ممکن ہے"۔ میں سوچتا ہوں کہ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ فوراً ہی رنگ واپس جانا چاہئے۔ دس قدم بھی نہیں چلنے پاتا ہوں۔ کہ پیچھے سے آواز آتی ہے "ٹھہریئے ٹھہریئے!" مڑکر دیکھتا ہوں۔ یہ نہیں کہتا کہ میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ شیخ صاحب کا ملازم چھوکرا کہہ رہا ہوتا ہے کہ "میاں حمام میں ہیں۔ آپ کو ٹھہرنے کے لئے کہا ہے۔ پانچ منٹ کے اندر آتے ہیں"۔ میں کہتا ہوں "ابھی حمام میں ہیں؟ آٹھ بج کر اڑھائی منٹ ہو گئے۔ اور عیدگاہ میں نماز ٹھیک دس بجے شروع ہوتی ہے۔ اور ساڑھے تین میل کا سفر ابھی باقی ہے۔ افسوس، اس نامراد شیخ کی کاہلی نہیں معلوم کب جاتی ہے؟" اور ایک سرد آہ کھینچتا ہوں۔ چھوکرا دیوان خانہ کھولتا ہے۔ اور میں داخل ہوتا ہوں اور حکم دیتا ہوں "جاؤ میاں سے کہہ دو کہ اگر وہ پانچ منٹ میں نہیں آئے تو وہ یہاں میری بجائے میرے کپڑوں کے عطر کی بو کے سوا اور کچھ نہ پائیں گے"۔ وہ چلا جاتا ہے تو میز کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں

اس دیوان خانہ میں تقریباً ہر روز میں آیا کرتا ہوں۔ اس لئے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرہ کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ کوئی رسالہ اُٹھا لیتا ہوں اور غزلیں پڑھنے لگتا ہوں۔ نظر تو رسالہ پر ہوتی ہے مگر دل شیخ کے غسل خانے میں ہوتا ہے۔ پانچ بلکہ دس منٹ گذر جاتے ہیں۔ اب ہی کہیں کا! رسالہ پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور ہاتھ پیچھے کئے ہوئے کمرہ میں ٹہلتا ہوں۔ اور سوچتا ہوں کہ آخر ہمارے مسلمان یہ جو تباہ اور مفلس ہیں اس کے کیا اسباب ہیں؟ جب کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی تو پھر آکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں اور اخبار اُٹھا کر اشتہارات اس امید میں پڑھنے لگتا ہوں کہ شاید کوئی ایسی دوا کا اشتہار نظر پڑے جس کو میں بلاخوف وخطر شیخ کو . . . . دے سکوں تاکہ اس کمبخت کی کاہلی دور ہو جائے۔ جب کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دیتی تو حکیموں کو برا بھلا کہتے ہوئے اخبار رکھ کر شیخ صاحب کا ایک فلک شگاف نعرہ مارتا ہوں۔ اندر سے آواز آتی ہے "آیا بھئی۔ ابھی آیا۔ کپڑے پہن رہا ہوں"۔ میں کہتا ہوں "ایسی تیسی تیری اور تیرے کپڑے پہننے کی!" گو یہ میں اپنے دل میں کہتا ہوں۔ گھڑی پر نظر ڈالتا ہوں تو ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں۔ عیدگاہ میں نماز ٹھیک دس بجے شروع ہوتی ہے اور ابھی ساڑھے تین میل کا سفر باقی ہے۔ بےقرار ہو کر ٹہلنے اور کوئی غزل گنگنانا شروع کرتا ہوں۔ نہایت دردناک نغمے میرے حلق سے نکلتے ہیں لیکن سننے والا کوئی نہیں ہوتا ——— غرضکہ کوئی عاشق شاید اپنے محبوب کے انتظار میں اتنا بےچین نہ ہوتا ہوگا جتنا میں اسوقت ہوتا ہوں۔

پونے نو کے قریب شیخ جی عجب بدحواسی کے عالم میں ہانپتے کانپتے منہ پونچھتے ہوئے برآمد ہوتے ہیں اور کہتے ہیں "بھئی معاف کرنا۔ تمہیں بڑی زحمت ہوئی۔ چلو چلو"۔ میں ابھی اپنے خیالات اس ناپاک ہستی کے متعلق ظاہر کرنے کے لئے گویا پر تول ہی رہا ہوتا ہوں کہ وہ غیب سے پھر اندر غائب ہو جاتا ہے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر اور دانت پیس پیس کر رہ جاتا ہوں۔ پردہ کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کا پیچھا کرتا ہوا اندر ہو جاتا اور پھر اس کا گلا اپنے آہنی پنجہ میں لیکر ——— مگر وہ پھر "چلو بھئی چلو۔ دیر کاہے کی ہے؟" کہتا ہوا ایک بھونچال کی طرح آتا ہے۔ اور پھر "ارے! استغفراللہ!" کہہ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر بلوہ ہو گیا ہے۔ اور شیخ جی چیخ چیخ کر احکام صادر فرمارہے ہیں۔

جب غصہ انتہا کو پہونچتا ہے تو انسان پر ایک قسم کا سکون طاری ہو جاتا ہے۔ اس لئے جب شیخ صاحب اپنی شیروانی کے بٹن لگاتے ہوئے پھر نمودار ہوتے ہیں تو میں سکون اور سکوت کی حالت میں کرسی پر بیٹھا ہوتا ہوں۔ مجھے اس کی کامل توقع ہوتی ہے کہ وہ پھر ایک بار زنان خانہ میں ضرور جائیں گے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب اندر جانے کا عزم بالجزم کر چکے ہیں۔ کہتے ہیں "اُٹھو بھئی اُٹھو۔ بڑی دیر ہو گئی۔ خدا بچائے ایسے کمبخت مکان سے ——— !" اس پر میں اضافہ کرتا ہوں "اور ایسے کمبخت مکین سے!" اور باہر نکلتا ہوں۔

پانچ دس قدم چلنے کے بعد میں مڑتا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ ـــــ کچھ نہیں دیکھتا ہوں۔ مطلع اور راستہ بالکل صاف ہوتا ہے اور شیخ صاحب ـــــ خدا معلوم زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ چونکہ یہ نظریئے ناممکن ہوتے ہیں اور ناقابل اعتبار۔ اس لئے ان کو مجبوراً رد کردینا پڑتا ہے۔ اتنے میں شیخ صاحب مکان سے یوں نکلتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے تیر کمان سے چھوٹتا ہے "چلو بھئی چلو۔ ٹھہرو مت۔ سگریٹ کیس لینا بھول گیا تھا۔ جلدی کوئی ٹانگہ ٹھیکالو۔"

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ٹانگہ پر لدے عید گاہ کی طرف سفر کررہے ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب میں جہاں دوسری بہت سی برائیاں ہیں وہاں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ کم سخن ہیں۔ اور قاعدہ بھی ہے کہ جب ایک شخص ایک دوسرے نااہل کی دوستی سے بیزار رہتا ہے تو اسکو زیادہ باتیں کرنے کی تمنا نہیں ہوتی۔ بہت دیر تک کوئی بات نہیں ہوتی ہے آخر میں پوچھتا ہوں کہ "کیوں نماز کا طریقہ یاد ہے؟" وہ چونک کر کہتے ہیں؟ "نہیں تو۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ بالکل بھول گیا۔ مختصر طور پر کہہ ڈالو" میں دو دو تین تین بار ایک شفیق استاد کی طرح انہیں سمجھاتا ہوں کہ ایسا کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں۔ تب کہیں جاکر مجھے چین آتا ہے۔

عیدگاہ پہونچکر ہم دونوں ایک جگہ جاکر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ ہجوم میں گم نہ ہو جائیں۔ نماز شروع ہوتی ہے اور ختم بھی ہو جاتی ہے۔ شیخ صاحب نماز میں غلطیاں بھی کرتے ہیں اور مجھے اپنی محنت یوں اکارت جاتے دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ ہم پیش امام سے اتنی دور ہوتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ خطبہ کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ جب سب لوگ ہاتھ اٹھاتے ہیں تو میں بھی خشوع وخضوع سے دعا کرتا ہوں کہ خدایا! یہ ہمارے شیخ جی کو نیک ہدایت اور نیک توفیق دے۔ ان کو اپنے دوستوں کی عزت وقدر کرنا سکھا ورنہ مجھے موت دیدے تاکہ کوئی جھگڑا ہی نہ رہے ـــــ"

ادھر دعا ختم ہوتی ہے اور ادھر میں اپنے باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر نہایت گرم جوشی سے شیخ سے معانقہ کرنے کی غرض سے اٹھنے والا ہی ہوتا ہوں کہ لوگوں کی ریل پیل اور دھکم دھکا میں کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہوں۔ جب ذرا سنبھلتا ہوں تو پہلے شیخ صاحب کو ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ مگر اس وضع قطع کا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ گھبرا کر چاروں طرف تلاش کرتا ہوں۔ مگر اس بھیڑ بھاڑ میں بھلے آدمی کا پتہ نہیں لگتا۔ تشویش بڑھتی جاتی ہے اور میں دھکے کھاتا ہوا ادھر سے ادھر اس کو ڈھونڈتے پھرتا ہوں۔ آنکھیں چندھیا چندھیا کر اور عینک صاف کرکرکے دیکھتا ہوں مگر سب بے سود۔ حد درجہ پریشان ہوکر کھنکار کھنکار کر شیخ کا نام لیکر پکارتا ہوں جیسے کوئی گائے اپنی بچھڑے کو پکار رہی ہو۔ جب یہ گلو خراش محنت بھی کارگر نہیں ہوتی تو سوچتا ہوں اب کیا کرنا چاہئے۔ محلہ والوں سے اتفاقاً مڈبھیڑ ہوتی ہے تو ان سے پوچھتا ہوں کہ شیخ صاحب کہیں نظر آئے تو نہیں؟ کوئی نفی میں جواب دیتا ہے اور کوئی شمال کی طرف انگلی اٹھا دیتا ہے۔ بس فوراً اس طرف بھاگتا ہوں۔ اس وقت مجھے نہ چہرے پر سے پسینہ پونچھنے کا خیال آتا ہے اور نہ ٹوپی کو سیدھا رکھنے کی دھن ہوتی ہے۔ بس ایک خیال ہوتا ہے۔ اس گمشدہ گدھے کی تلاش اور ملنے کے بعد دل کی بھڑاس اس پر نکالنے کی آرزو۔

جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت تھک جاتا ہوں اور وہ بدبخت نہیں ملتا تو سوچتا ہوں کہ پھاٹک پر چل کر کھڑا ہو جانا چاہئے۔ وہاں اسکا مل جانا یقینی ہے۔ پھاٹک پر فقیروں سے ذرا ہٹ کر انتظار میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اب آتا ہے کہ اب آتا ہے۔ مگر کہاں شیخ صاحب؟ جان پہچان کے لوگوں سے پوچھتا ہوں۔ کہ اس مردود کو بدقسمتی سے کہیں دیکھا تو نہیں۔؟ جواب ملتا ہے کہ "بہت دیر پہلے وہ مسجد میں آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔" اس اثنا میں بہت سے لوگ لوٹ چکے ہوتے ہیں اور بعض آہستہ آہستہ اندر سے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد سب رخصت ہو جاتے ہیں۔ میں استغفر اللہ کا ورد کرتے ہوئے پھر اندر جاتا ہوں مگر وہاں دو تین آدمیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ کلیجہ دھک سے ہو جاتا ہے۔ ہانپتے کانپتے باہر نکلتا ہوں اور اس طرف بھاگتا ہوں جہاں کہ تانگہ ہم چھوڑ آئے تھے۔ تانگہ غائب۔ تانگہ والا غائب اور سب سے بڑھ کر شیخ صاحب غائب۔ معاً ایک خوفناک خیال دل میں آتا ہے۔ کہیں شیخ صاحب تانگہ پر تشریف تو نہیں لے گئے؟ ایک شریف اور معزز دوست سے ایسی

مدعی اور مدعی علیہ کو پکارتا ہے۔ میری یہ صدا اگرچہ فقیروں کی صدا کو مات دے رہی ہوتی ہے مگر پھر بھی نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مصداق ہوتی ہے۔ کوئی جواب نہیں ملتا میری زبان سے بے ساختہ لاحول ولا نکل جاتا ہے۔ یکایک ایک خیال میرے دل میں آتا ہے۔ کہیں شیخ صاحب میرا انتظار کر کے میرے گھر تو نہیں چلے گئے؟ کوئی آواز میرے کان میں کہتی ہے "ممکن ہے۔ بہت ممکن ہے"۔ میں سوچتا ہوں کہ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ فوراً ہر رنگ واپس جانا چاہیئے۔ دس قدم بھی نہیں چلنے پاتا ہوں کہ پیچھے سے آواز آتی ہے "ٹھہریئے ٹھہریئے!" مڑ کر دیکھتا ہوں۔ یہ نہیں کہتا کہ میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ شیخ صاحب کا ملازم چھوکرا کہہ رہا ہوتا ہے کہ "میاں حمام میں ہیں۔ آپ کو ٹھہرنے کے لئے کہا ہے۔ پانچ منٹ کے اندر آتے ہیں"۔ میں کہتا ہوں "ابھی حمام میں ہیں؟ آٹھ بج کر اڑتالیس منٹ ہو گئے اور عیدگاہ میں نماز ٹھیک دس بجے شروع ہوتی ہے۔ اور ساڑھے تین میل کا سفر ابھی باقی ہے۔ افسوس، اس نامراد شیخ کی کاہلی نہیں معلوم کب جاتی ہے؟" اور ایک سرد آہ کھینچتا ہوں۔ چھوکرا دیوان خانہ کھولتا ہے۔ اور میں داخل ہوتا ہوں اور حکم دیتا ہوں "جا تیرے میاں سے کہہ دے کہ اگر وہ پانچ منٹ میں نہیں آئے تو وہ یہاں میری بجائے میرے کپڑوں کے عطر کی بو کے سوا اور کچھ نہ پائیں گے"۔ وہ چلا جاتا ہے تو میز کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں

اس دیوان خانہ میں تقریباً ہر روز میں آیا کرتا ہوں۔ اس لئے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرہ کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ کوئی رسالہ اٹھا لیتا ہوں اور غزلیں پڑھنے لگتا ہوں۔ نظر تو رسالہ پر ہوتی ہے مگر دل شیخ کے غسل خانے میں ہوتا ہے۔ پانچ بلکہ دس منٹ گذر جاتے ہیں۔ ایسی کہیں کا! رسالہ پھینک کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور ہاتھ پیچھے کئے ہوئے کمرہ میں ٹہلتا ہوں۔ اور سوچتا ہوں کہ آخر ہمارے مسلمان یہ جو تباہ اور مفلس ہیں اس کے کیا اسباب ہیں؟ جب کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی تو پھر آکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں اور اخبار اٹھا کر اشتہارات اس امید میں پڑھنے لگتا ہوں کہ شاید کوئی ایسی دوا کا اشتہار نظر پڑے جس کو میں بلا خوف و خطر شیخ کو . . . دے سکوں تاکہ اس کمبخت کی کاہلی دور ہو جائے۔ جب کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دیتی تو حکیموں کو برا بھلا کہتے ہوئے اخبار رکھ کر "شیخ صاحب" کا ایک فلک شگاف نعرہ مارتا ہوں۔ اندر سے آواز آتی ہے "آیا بھئی۔ ابھی آیا۔ کپڑے پہن رہا ہوں"۔ میں کہتا ہوں "ایسی تیسی تیری اور تیرے کپڑے پہننے کی!" مگر یہ میں اپنے دل میں کہتا ہوں۔ گھڑی پر نظر ڈالتا ہوں تو ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں۔ عیدگاہ میں نماز ٹھیک دس بجے شروع ہوتی ہے اور ابھی ساڑھے تین میل کا سفر باقی ہے۔ بے قرار ہو کر ٹہلنا اور کوئی غزل گنگنانا شروع کرتا ہوں۔ نہایت دردناک نغمے میرے حلق سے نکلتے ہیں لیکن سننے والا کوئی نہیں ہوتا —— غرضکہ کوئی عاشق شیدا اپنے محبوب کے انتظار میں اتنا بے چین نہ ہوتا ہوگا جتنا میں اسوقت ہوتا ہوں۔

پونے نو کے قریب شیخ جی عجب بدحواسی کے عالم میں ہانپتے کانپتے منہ پونچھتے ہوئے برآمد ہوتے ہیں اور کہتے ہیں "بھئی معاف کرنا۔ تمہیں بڑی زحمت ہوئی۔ چلو چلو"۔ میں ابھی اپنے خیالات اس ناپاک ہستی کے متعلق ظاہر کرنے کے لئے گویا پر تول ہی رہا ہوتا ہوں کہ وہ غپ سے پھر اندر غائب ہو جاتا ہے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر اور دانت پیس پیس کر رہ جاتا ہوں۔ پردہ کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کا پیچھا کرتا ہوا اندر پہونچتا اور پھر اس کا گلا اپنے آہنی پنجہ میں لیکر —— مگر وہ پھر "چلو بھئی چلو۔ دیر کاہے کی ہے؟" کہتا ہوا ایک بھونچال کی طرح آتا ہے۔ اور پھر "ارے! استغفراللہ؟" کہہ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر بلوہ ہو گیا ہے۔ اور شیخ جی چیخ چیخ کر احکام صادر فرما رہے ہیں۔

جب غصہ انتہا کو پہونچتا ہے تو انسان پر ایک قسم کا سکون طاری ہو جاتا ہے۔ اس لئے جب شیخ صاحب اپنی شیروانی کے بٹن لگاتے ہوئے پھر نمودار ہوتے ہیں تو میں سکون اور سکوت کی حالت میں کرسی پر بیٹھا ہوتا ہوں۔ مجھے اس کی کامل توقع ہوتی ہے کہ وہ پھر ایک بار زنان خانہ میں ضرور جائیں گے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب اندر جانے کا عزم بالجزم کر چکے ہیں۔ کہتے ہیں "اٹھو بھئی اٹھو۔ بڑی دیر ہو گئی۔ خدا بچائے ایسے کمبخت مکان سے ——!" اس پر میں اضافہ کرتا ہوں "اور ایسے کمبخت مکین سے!" اور باہر نکلتا ہوں۔

پانچ دس قدم چلنے کے بعد میں مڑتا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ ـــــ کچھ نہیں دیکھتا ہوں۔ مطلع اور راستہ بالکل صاف ہوتا ہے اور شیخ صاحب ـــــ خدا معلوم زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ چونکہ یہ نظریئے ناممکن ہوتے ہیں اور ناقابل اعتبار۔ اس لئے ان کو مجبوراً رد کرویت پڑتا ہے۔ اتنے میں شیخ صاحب مکان سے یوں نکلتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے تیر کمان سے چھوٹتا ہے "چلو بھئی چلو۔ ٹھہرو مت بسکٹ کیں لینا بھول گیا تھا۔ جلدی کوئی تانگہ ٹھیکا لو۔"

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں تانگہ پر لدے عیدگاہ کی طرف سفر کر رہے ہوتے ہیں شیخ صاحب میں جہاں دوسری بہت سی برائیاں ہیں وہاں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ کم سخن ہیں۔ اور قاعدہ بھی ہے کہ جب ایک شخص ایک دوسرے نااہل کی دوستی سے بیزار ہوتا ہے تو اسکو زیادہ باتیں کرنے کی تمنا نہیں ہوتی۔ بہت دیر تک کوئی بات نہیں ہوتی ہے آخر میں پوچھتا ہوں کہ "کیوں نماز کا طریقہ یاد ہے؟" وہ چونک کر کہتے ہیں؟ "نہیں تو۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ بالکل بھول گیا مختصر طور پر کہہ ڈالو" میں دو دو تین تین بار ایک شفیق استاد کی طرح انہیں سمجھاتا ہوں کہ ایسے کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں۔ تب کہیں جاکر مجھے چین آتا ہے۔

عیدگاہ پہونچکر ہم دونوں ایک جگہ جاکر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ ہجوم میں گم نہ ہو جائیں۔ نماز شروع ہوتی ہے اور ختم بھی ہو جاتی ہے۔ شیخ صاحب نماز میں غلطیاں بھی کرتے ہیں اور مجھے اپنی محنت یوں اکارت جاتے دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ ہم پیش امام سے اتنی دور ہوتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ خطبہ کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ جب سب لوگ ہاتھ اُٹھاتے ہیں تو میں بھی خشوع وخضوع سے دعا کرتا ہوں کہ "خدایا! یہ ہمارے شیخ جی کو نیک ہدایت، نیک توفیق دے۔ ان کو اپنے دوستوں کی عزت وقدر کرنا سکھا ورنہ مجھے موت دیدے تاکہ کوئی جھگڑا ہی نہ رہے ـــــ"

اُدھر دعا ختم ہوتی ہے اور ادھر میں اپنے باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر نہایت گرم جوشی سے شیخ سے معانقہ کرنے کی غرض سے اُٹھنے والا ہی ہوتا ہوں کہ لوگوں کی ریل پیل اور دھکم دھکا میں کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہوں۔ جب ذرا سنبھلتا ہوں تو پہلے شیخ صاحب کو ادھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ مگر اس وضع قطع کا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ گھبرا کر چاروں طرف تلاش کرتا ہوں۔ مگر اس بھیڑ بھاڑ میں بھلے آدمی کا پتہ نہیں لگتا۔ تشویش بڑھتی جاتی ہے اور میں دھکے کھاتا ہوا اِدھر سے اُدھر اس کو ڈھونڈتے پھرتا ہوں۔ آنکھیں چندھیا چندھیا کر اور عینک صاف کرکرکے دیکھتا ہوں مگر سب بے سود۔ حد درجہ پریشان ہوکر کھنکار کھنکار کر شیخ کا نام لیکر پکارتا ہوں جیسے کوئی گائے اپنی بچھڑے کو پکار رہی ہو۔ سب یہ گو حرامی محنت بھی کارگر نہیں ہوتی تو سوچتا ہوں اب کیا کرنا چاہیئے۔ محلہ والوں سے اتفاقاً مڈبھیڑ ہوتی ہے تو ان سے پوچھتا ہوں کہ شیخ صاحب کہیں نظر آئے تو نہیں؟ کوئی نفی میں جواب دیتا ہے اور کوئی شمال کی طرف اُنگلی اُٹھا دیتا ہے۔ بس فوراً اس طرف بھاگتا ہوں۔ اس وقت مجھے نہ چہرے پر سے پسینہ پونچھنے کا خیال آتا ہے اور نہ ٹوپی کو سیدھا رکھنے کی دھن ہوتی ہے۔ بس ایک خیال ہوتا ہے۔ اس گمشدہ گدھے کی تلاش اور ملنے کے بعد دل کی بھڑاس اس پر نکالنے کی آرزو۔

جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت تھک جاتا ہوں اور وہ بدبخت نہیں ملتا تو سوچتا ہوں کہ پھاٹک پر چل کر کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ وہاں اسکا مل جانا یقینی ہے۔ پھاٹک پر فقیروں سے ذرا ہٹ کر انتظار میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اب آتا ہے کہ اب آتا ہے۔ مگر کہاں شیخ صاحب؟ جان پہچان کے لوگوں سے پوچھتا ہوں۔ کہ اس مردود کو بدقسمتی سے کہیں دیکھا تو نہیں؟ جواب ملتا ہے کہ "بہت دیر پہلے وہ مسجد میں آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔" اس اثنا میں بہت سے لوگ لوٹ چکے ہوتے ہیں اور بعض آہستہ آہستہ اندر سے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد سب رخصت ہو جاتے ہیں۔ میں استغفراللہ کا ورد کرتے ہوئے پھر اندر جاتا ہوں مگر وہاں دو تین آدمیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ کلیجہ دھک سے ہو جاتا ہے۔ ہانپتے کانپتے باہر نکلتا ہوں اور اس طرف بھاگتا ہوں جہاں کہ تانگہ ہم چھوڑ آئے تھے۔ تانگہ غائب۔ تانگہ والا غائب اور سب سے بڑھ کر شیخ صاحب غائب تھا ایک خوفناک خیال دل میں آتا ہے۔ کہیں شیخ صاحب تانگہ پر تشریف تو نہیں لے گئے؟ ایک شریف اور معزز دوست سے ایسی

امید نہیں ہو سکتی مگر شیخ صاحب کی فطرت سے میں خوب واقف ہوں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی مٹھیاں کس لیتا ہوں۔ اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ میری آنکھوں میں ایک مجنونانہ چمک پیدا ہوتی ہے۔ مگر جب خیال کرتا ہوں کہ ساڑھے تین میل اس کڑکتی دھوپ میں پیدل چلنا ہے تو میرے قلب کی حرکت بند ہوتی معلوم دیتی ہے۔ اور بے ساختہ میرے دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ "پاک پروردگار! اگر اب میرے بازوؤں میں پر نکل آئیں تاکہ میں پہونچکر فوراً اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکوں، تو میں دس فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا!" مگر معجزے آج کل نہیں ہوتے۔ اس لئے آپ کو حیرت نہ ہونی چاہئے۔ اگر میں کہوں کہ اس وقت میرے پر نہیں نکل آتے ہیں۔ میں ایک آہ سرد نہیں آہ آتشین کے ساتھ ادھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں کہ شاید کوئی گاڑی مل جائے۔ مگر شاید اللہ میاں کو میری ہمت استقلال اور جوانمردی کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے۔ گاڑی ملنا تو کجا کوئی گدھا بھی نظر نہیں آتا۔ آہ! کوئی کیا جانے کس اشتیاق سے اسوقت میری نظریں ایک گدھے کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں!

چارو ناچار بادل ناخواستہ پیدل چل پڑتا ہوں۔ کبھی اپنی پتلی پتلی ٹانگوں کو دیکھتا ہوں اور کبھی حسرت سے نئے جوتے پر آبدیدہ ہو کر نظر ڈالتا ہوں۔ کبھی شیخ صاحب کی شان میں انواع و اقسام کی گالیاں استعمال کرتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کہیں رمضان کے پاک مہینے میں روزے رہنے کی وجہ گالیاں تو نہیں بھول گیا۔ تمام راستہ یہ سوچتا ہوں کہ شیخ سے انتقام کس پیرایہ میں لیا جائے۔ کیا اس کی ہجو میں پمفلٹ چھپوا کر مفت تقسیم کراؤں تاکہ بندگان خدا اس انسان نما شیطان کو اچھی طرح جان جائیں اور اس کی دوستی کو دور ہی سے سلام کریں؟ کیا اخبارات میں اس کے خلاف معرکتہ الآرا اور ہنگامہ پرور مضامین شائع کراؤں تاکہ کوئی شریف آدمی اس کو اپنی بیٹی نہ دے؟ کیا ایک جلسہ منعقد کروں جس میں اس ننگ ملک و قوم ہستی پر زہرہ گداز تقریریں ہوں کہ اس کو اپنی سوسائٹی سے بائیکاٹ کر دو؟ — مگر میرے شریفانہ جذبات جوش میں آتے ہیں۔ میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کرتا ہے کہ "انسان کو اپنی مصیبت اور تکلیف کی گھڑیوں میں صبر اور شکر کرنا چاہئے۔ یہی مردانگی ہے۔ ایسے نازک اور آزمائش کے لمحات میں دامن صبر کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھنا نہ چاہئے۔ یہ عورتوں کا شیوہ ہے جو بات بات پر اپنے شوہروں سے لڑ پڑتی ہیں اور ادھر اُدھر کا غبار اس بیچارے پر نکالتی ہیں۔ اس ذرا سی بات پر شیخ صاحب کے خلاف اسقدر غیظ و غضب کا اظہار کہاں تک بجا ہے؟ کیا ہوا اگر تمہیں ساڑھے تین میل اس کڑکتی دھوپ میں پیدل چلنا پڑا؟ کیا ہوا اگر تمہارے "بارہ" (۱۲) روپئے والے نئے جوتے کی تلی گھس گئی؟ کیا ہوا اگر تمہاری پتلی پتلی ٹانگیں دکھنے لگیں؟ کیا ہوا اگر تمہارے ہونٹ اور حلق سوکھنے لگے؟ خیال تو کرو گھر پہنچتے ہی تمہیں لذیذ شیر خورمہ —"

مگر پھر شیطان ورغلانا شروع کرتا ہے: "آنکھ کے بدلے آنکھ۔ ناک کے بدلے ناک۔ دانت کے بدلے دانت۔ کان کے بدلے کان۔ پتلی ٹانگ کے بدلے موٹی ٹانگ —" خدا خدا کر کے جب شہر میں داخل ہوتا ہوں تو شناسا ملتے ہیں اور پوچھتے ہیں "عیدگاہ سے پیدل آرہے ہو؟ واہ بھئی واہ! حد ہو گئی۔ اجی حضرت کونسے خدا نے فرمایا تھا؟ خوب! کہو ایسا کیوں؟" میں مختصر طور پر جواب دیتا ہوں "ثواب!" اور وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتے ہیں — رفتہ رفتہ یہ بات شام تک سارے محلہ میں مشہور ہو جاتی ہے کہ میں عیدگاہ سے پیدل ٹاپتا ہوا آیا۔ لوگ آ آ کر مجھ سے پوچھتے ہیں "کیوں بھئی۔ ایسا کیوں کیا؟" تو میں مختصر طور پر جواب دیتا ہوں "ثواب" — مسلمان کہیں کے!

غرض کیا عرض کروں کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کر، کیسی کیسی تکلیفیں سہہ کر میں اپنا یہ منحوس سفر ختم کرتا ہوں؟ نہ میری پنسل میں اس کے لکھنے کی طاقت ہے اور نہ آپ میں اس کے سننے کی تاب۔ تقریباً ایک بجے تھکا ہارا شیخ صاحب کے گھر کے قریب پہونچتا ہوں۔ بھوک پیاس خصوصاً شیر خورمہ کی پیاس سے نڈھال، اپنی پتلی پتلی ٹانگوں کو بہزار وقت اُٹھا کر زمین پر پٹکتے ہوئے اپنی منزل مقصود پر پہونچتا ہوں۔ دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے یہ سوچ لیتا ہوں کہ اپنے جذبات نفرت غیظ و غضب کا اظہار اس ملعون کے سامنے نثر میں کروں یا نظم میں۔ یا پھر اپنے عربی خون کے جوش سے متاثر ہو کر اپنے غنیم پر، قبل اس کے کہ وہ سمجھے کہ کیا ہو رہا ہے پل پڑوں۔ اور ایک منٹ بعد اس کی لاش کے سینہ پر پیر رکھے ایک ڈرامائی تقریر کروں۔

میں زور سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں۔ کچھ دیر بعد شیخ صاحب ہنستے ہوئے باہر نکلتے ہیں اور مجھے دیکھ کر پکار اُٹھتے ہیں کہ "ماں! کہاں غائب ہو گئے تھے عیدگاہ میں تم؟ بہت ڈھونڈا مگر تم نہ ملے۔ میں سمجھا کہ تم اپنے کسی موٹر نشین دوست کے ساتھ چلد ئے۔ اس لئے تانگہ پہ سوار ہوکر فوراً چلا آیا کیونکہ گھر میں کام تھا مجھے۔ آؤ بھئی آؤ دیوان خانہ میں" جہ بات کے تلاطم سے میرے سینے میں ایک ہیجانِ عظیم برپا ہوجاتا ہے ذات بزرگ کے متعلق اپنے ... خیالات میں سے کس کو پہلے ادا کروں اور کس کو بعد میں سمجھ میں نہیں آتا؟ بمشکل میری زبان سے یہ مختصر مگر معنی خیز جملہ نکلتا ہے کہ "تم **شیطان** ہو!" اور پھر اسی آواز میں جو گرجتی ہوئی اور غصیلی ہونے کے بجائے رقت انگیز اور رونی ہوتی ہے، میں کہتا ہوں کہ ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

اسکے بعد کی داستان بہت مختصر ہے۔ جب اندر سے سوئیاں، شیر خورمہ وغیرہ آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ واقعی عفو انتقام سے بہتر ہے اور شیخ صاحب کو سچے دل سے معاف کردیتا ہوں۔

مگر جب بقر عید آتی ہے تو ایک دن پہلے شیخ صاحب میرے گھر آتے ہیں اور کہتے ہیں، "میں یہ کہنے آیا تھا کہ کل آٹھ بجے عیدگاہ جانا ہے۔ چلو گے نا؟" ✤



آ اے ہلالِ عید آ

از مولانا حامد حسن صاحب قادری

اے مطلعِ امید آ اے عیش کی تمہید آ
اے عشرتِ جاوید آ اے آ پیامِ دید آ
آ اے ہلالِ عید آ

آ اے امیدِ عیش آ آ اے نویدِ عیش آ
آ اے بریدِ عیش آ آ اے کلیدِ عیش آ
آ اے ہلالِ عید آ

اے شوکتِ اسلام آ اے سطوتِ اسلام آ
اے دولتِ اسلام آ اے برکتِ اسلام آ
آ اے ہلالِ عید آ

اے ماہِ نیک انجام آ اے خوانِ فیضِ عام آ
اے عید کے پیغام آ لیکر طرب کا جام آ
آ اے ہلالِ عید آ

آئینۂ قدرت ہے تو سرمایۂ عبرت ہے تو
اللہ کی رحمت ہے تو بیشک بڑی نعمت ہے تو
آ اے ہلالِ عید آ

کس درجہ خوش منظر ہے تو گویا پری پیکر ہے تو
روح الامیں کا پر ہے تو یا حور کا زیور ہے تو
آ اے ہلالِ عید آ

نظروں سے تھا مستور تو کیوں اسقدر تھا دور تو
ایمان کا ہے نور تو ہے شمعِ کوہِ طور تو
آ اے ہلالِ عید آ

قدرت کا تو اک راز ہے صنعت کا تو اعجاز ہے
خامش نوائے ساز ہے یا سازِ بے آواز ہے
آ اے ہلالِ عید آ

کیا گوہرِ خوش آب ہے یا کشتیٔ سیماب ہے
کس کعبہ کی محراب ہے کس ساز کا مضراب ہے
آ اے ہلالِ عید آ

تو پیکرِ تنویر ہے تو حسن کی تصویر ہے
تو جادۂ تدبیر ہے سطرِ خطِ تقدیر ہے
آ اے ہلالِ عید آ

آفاق میں اے ماہِ نو پھیلی ہوئی ہے تیری ضو
تو شمعِ قدرت کی ہے لو تو راہبر ہم راہ رو
آ اے ہلالِ عید آ

اے ناخنِ مشکل کشا اے جاں نواز و دل کشا
چشمِ دلِ غافل کشا راہی سوئے منزل کشا
آ اے ہلالِ عید آ

پھر وہ صلائے نوش دے جو زور دے جو جوش دے
بیدار چشم و گوش دے فردا کا ہم کو ہوش دے
آ اے ہلالِ عید آ

تو کشتیٔ مے نوش ہے جامِ مے سرجوش ہے
دنیا جو عصیاں کوش ہے رحمت کی تو آغوش ہے
آ اے ہلالِ عید آ

تو برقِ اسلام ہے تو زورقِ اسلام ہے
تو رونقِ اسلام ہے تو نورِ حقِ اسلام ہے
آ اے ہلالِ عید آ

تابش سے ہے تو زر بکف طوبیٰ کا برگِ تر بکف
یا ہے اگر خنجر بکف اٹھتے ہیں ہم بھی سر بکف
آ اے ہلالِ عید آ

پھر دل میں جوشِ تازہ دے پھر زورِ بے اندازہ دے
پھر شورِ حشر آوازہ دے عزت کا رخ کو غازہ دے
آ اے ہلالِ عید آ

طالع کو پھر تابندہ کر موہوم آئندہ کر
پھر بخششِ ملی زندہ کر پھر زندہ کر پائندہ کر
آ اے ہلالِ عید آ

مفت خورے!

از جناب چوہدری محمد طفیل صاحب نیّر بی۔اے

(۱) ایک مفت خورہ وہ ہے جو دائم المریض ہونے کی حیثیت سے یا حفظ ماتقدم کے طور پر کسی حکیم یا ڈاکٹر سے یا اتحاد کا نسخہ لے

(۲) ایک مفت خورہ وہ ہے جو کسی صاحب حیثیت دوست کے پاس بیٹھکر کسی دوسرے کی مہمان نوازی کا ذکر اس رشک انگیز طریقے میں کرے کہ میزبان کی فیاضی کی حسّی رگ پھڑک اٹھے۔

(۳) ایک مفت خورہ وہ ہے جو ہمیشہ جیب میں ایک روپیہ نقد اور ایک دس روپے کا نوٹ رکھے اور جہاں احباب کی معیت میں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت پڑے وہاں پیسوں کی جگہ روپیہ اور ... روپے یا روپوؤں کی جگہ نوٹ نکالے ... اور پھر شریف احباب یہ کہیں کہ یہ روپیہ یا نوٹ تڑوانے کی ضرورت نہیں ریزگاری موجود ہے۔

(۴) ایک مفت خورہ وہ ہے جو کسی رئیس زادے کی محفل میں آمد و رفت پیدا کرے اور پھر اُسکے حاشیہ نشینوں کو "مفت خورے" کہہ کر اپنا اعتبار جمانے کی کوشش کرے۔

(۵) ایک مفت خورہ وہ ہے جو کسی اخبار کا نامہ نگار ہو اور ... سینما کے مینجر کو کسی ڈرامے کے خلاف قلم اٹھانے کی ادبی و قلمی دھمکی دیکر "فری پاس" حاصل کرے۔

(۶) ایک مفت خورہ وہ ہے جس سے تنگ آکر کسی سینما کے پروپرائٹر یا مینیجر کو اشتہار میں "فری پاس" بند لکھنے کی زحمت اٹھانی پڑے

(۷) ایک مفت خورہ وہ ہے جو سرِ شام کسی دوست کے گھر جاکر کسی ڈرامے کی تعریف میں اسوقت تک رطب اللسان رہے جبتک کہ ڈرامے کا وقت نہ ہو جائے اور جب اس دوست کا سمندِ شوق مہمیز ہو جائے تو یہ کہہ کر ساتھ ہولے کہ آج آپ کے مہمان ہیں۔

(۸) ایک مفت خورہ وہ ہے جو سینما ہال یا اپنے سگرٹ پینے والے ہمسائے کے سامنے اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد نہایت تاسف آمیز لہجے میں یہ کہے :- افسوس ہم تو سگرٹ کیس گھر ہی بھول آئے ... اور وہ شریف آدمی خود بخود سگرٹ پیش کر دے۔

(۹) ایک مفت خورہ وہ ہے جو ریلوے کے کسی ملازم کا رشتہ دار یا دوست بنا ہوا ریل گاڑی میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا "سوراج" کی طرح اپنا پیدائشی حق سمجھے اور جب کوئی "ٹکٹ کلکٹر" ٹکٹ دیکھنے کی خواہش ظاہر کرے تو فوراً یہ کہدے کہ میں فلاں صاحب کا دوست یا رشتہ دار ہوں۔

(۱۰) ایک مفت خورہ وہ ہے جو دہلی کے ہوٹلوں میں "لیموں نچوڑ" کے نام سے مشہور ہو اور آپکے سامنے رکھے ہوئے سالن میں ذرا سا لیموں نچوڑ کر یہ کہے "دیکھئے اب سالن کیسا لذیذ ہو گیا ہے" ... اور آپ شرافت کے تقاضے سے اسے بھی شامل ہونے کو کہیں۔

(۱۱) ایک مفت خورہ وہ ہے جو باراتوں کو گذرتے ہوئے دیکھنے کا شائق ہو اور جب کوئی واقف باراتی مل جائے اسی وقت علیک سلیک کر کے یہ کہتا ہوا شامل جلوس ہو جائے

کہیں بھی کسی اتفاق ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔

(۱۲) ایک مفت خورہ وہ ہے جو صبح صبح ہی آپ کے ہاں آ پہنچے اور معمولی واقعات کو اہمیت دیکر ۔۔۔ آپ کو [illegible] دوست [illegible] کی ۔۔۔ کوشش کرے کہ بحث کرتے کرتے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جائے

(۱۳) ایک مفت خورہ وہ ہے جو ایسا ہو کہ ایک شب کی طرح صبح کی چائے ایک دوست کے ہاں پیئے۔ دوپہر کا کھانا دوسرے کے ہاں کھائے اور رات کے وقت کسی تیسرے کے دسترخوان پر جا پہنچے۔

(۱۴) ایک مفت خورہ وہ ہے جسے علامہ حسین میر کاشمیری امرتسری ثم اللاہوری کی معیت "اور ہمرکابی" کا شرف حاصل ہو۔

(۱۵) ایک مفت خورہ وہ ہے جو راحت کوش ہونے کے لئے کسی قبر کا مجاور بن جائے اور "سونے والے" کا نام فرضی شاہ رکھ کر اوقات بسر کرے۔

(۱۶) ایک مفت خورہ وہ ہے جو پیری مریدی کا سلسلہ شروع کر کے اپنی آنے والی نسلوں کے لئے کافی جائداد چھوڑ جائے۔

(۱۷) ایک مفت خورہ وہ ہے جو لستخیر اور حب کے اشتہارات اخباروں میں شائع کر کے اوباش نوجوانوں یا "دل پھینک" مختسب کی ۔۔۔ [illegible]

(۱۸) ایک مفت خورہ وہ ہے [illegible] ۔۔۔ سے ایک ۔۔۔ پوسٹ کارڈ کی فرمائش کرے۔

(۱۹) ایک مفت خورہ وہ ہے جس سے [illegible] کے ۔۔۔ قلعی سے کسی ۔۔۔ [illegible] اور وہ شخص رسالہ یا اخبار ۔۔۔ [illegible] مکتوب الیہ کو نہ پہنچا سکے۔

(۲۰) ایک مفت خورہ وہ ہے جو کوئی اخبار یا رسالہ یا کتاب آپ کو ۔۔۔ اور پھر کبھی واپس نہ کرے اور آپ جب واپسی کا مطالبہ کریں تو کھو جانے کا عذر کرتا ہوا قیمت پیش کرنے میں بھی لیت و لعل یا دریغ نہ کرے۔

(۲۱) ایک مفت خورہ وہ ہے جو "مفت راچہ گفت" کی ضرب المثل کا سچا عامل ہو اور اگر زہر ہلاہل بھی مفت مل جائے تو نہ چھوڑے۔

(۲۲) ایک مفت خورہ وہ ہے جسے مفت کی شراب مل جائے اور وہ قاضی ہو کر بھی نہ چھوڑے۔

(۲۳) ایک مفت خورہ وہ ہے جس کا آبائی لقب "متقی" ہو اور ۔۔۔ فتویٰ ۔۔۔ مفت کے مال پر ہاتھ صاف کرنے سے بھی دریغ نہ کرے۔

(۲۴) ایک مفت خورہ وہ ہے جو عید کے دن اپنے دروازے پر قفل ڈال کر دوستوں کو تبریک اور احسان پہنچانے کے لئے ان کے ہاں ۔۔۔ [illegible]

جدائی

دوستوں کی جدائی میں یہ بہت شرم کی بات ہے کہ میں زندہ رہوں اور ۔۔۔ ایسی زندگی پر کہ سچی محبت کا دعویٰ کروں اور اس کی جدائی ۔۔۔ مر نہ جاؤں۔

[illegible] سے جدا ہوا اور میں زندہ ہوں حالانکہ ایسی زندگی میرے [illegible]

اب میں بھی اس سخت جانی پر لوگوں سے معافی چاہتا ہوں کہ ۔۔۔ تو مجھ سے جدا ہو جائے اور میں زندہ رہوں؟

میرا جسم اور میرا قلب تو میرے ساتھ ہے مگر میری روح اور میری جان ۔۔۔ مگر درحقیقت جسم غربت میں ہے۔ روح ایسا کر ہم حاصل کر رہی ہے ۔۔۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ میں انسان ہوں لیکن میرے جسم میں ۔۔۔ کچھ کم حیرت کی بات نہیں ہے کہ میری ۔۔۔ بھی ایسی ہے کہ ۔۔۔

[illegible]



عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

ہاں گلے مل لے حسن ارا آئی تو
آج تو جلوہ دہِ جذبات ہو
کیوں کہیں ہم لوگ جائیں سیر کو
جنت الفردوس ہے، ہر کوچہ گو
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

عید کا میلہ لگا ہے چار سو
خوش جمالوں کا ہے مجمع کو بکو
گرچہ ہے جنت کا نقشہ روبرو
کیوں کریں سیرِ چمن کی آرزو
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

دل ہے عرصے سے شکارِ دردِ غم
آئیں جب تک وہ، تو اتنا کر کرم
عید ہے، مل لے گلے، ہو جب بہم
تجھکو آغوشِ تصور، ہے قسم
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

جب گئے انکے یہاں شوریدہ حال
تھا تبسم زیرِ لب اور یہ سوال
عیدگہ جانے کا بھی ہے کچھ خیال؟
تو کہا ہم نے کہ اے یوسف جمال
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

آفریں اے جذبۂ دل واہ واہ
دردِ ہے احساسِ لطفِ بارگاہ
کہہ رہی ہے عاشقی کی رسم و راہ
کون ہو منت پذیرِ عیدگاہ
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

دردؔ قرباں اپنے احساسات کے
انکے در پر جلوہ ہائے عید سے
جاذبے ہیں یہ صدائیں دے رہے
ہم کہیں کیوں جائیں کوچے سے ترے
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

(دردؔ کاکوروی)

دلکش اور دلچسپ

تین عیدیں

خاص عید نمبر کیلئے

اپنی طرز کا ایک عجیب و لطیف افسانہ

از مولانا عشرت رحمانی المحبوبی

اُف سنگدل، بدمزاج، دقیانوسی بڈھے ... میں دل ہی دل میں اپنے چچا لطیف عثمان کو ڈانٹ رہا تھا بلکہ کئی بار اپنے خیال میں ان پر گھونسے بھی گھمائے۔ میں اس وقت اپنے جذبات دلی سے قطعاً مجبور اور رہ از خود رفتہ ہو رہا تھا۔ یہ تمام حرکات ہوش و حواس کے عالم میں مجھ سے سرزد نہیں ہوئیں جو صرف میرے خیال تک محدود تھیں۔ عملی جامہ پہنانے کی جرأت کہاں۔ —'

تھوڑی دیر میں جب میں نے کمرہ کا دروازہ کھولا تو بڈھے میاں اپنے مخصوص، محبوب صوفہ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اور خیالی بلند پروازیوں میں محو کچھ گنگنا رہے تھے۔ میں قریب پہونچکر آداب بجا لایا اور عرض کیا۔

"پیارے چچا جان! آپ بندہ پر اسقدر شفقت و التفات روا رکھتے ہیں اور آپ کی عنایاتِ فراواں میرے حال پر اسقدر ہیں۔ کہ مجھے ہمیشہ یقین واثق ہوتا ہے کہ حرفِ مطلب زبان پر لایا اور آپ کی رضامندی سے سرفراز ہوا۔ —— "

چچا جان نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں جو کسی خاص غرض کے ساتھ زمین پر جمی ہوئی تھیں اُٹھا کر مجھے گھورتے ہوئے فرمایا۔ "ہاں! ہاں! برخوردار کہو کہنا کیا ہے تمہیں —— یہ اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت؟ کہو مطلب کہو!"

میرے پیارے چچا جان:۔ (اور دل میں خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا) مجھے یقین ہے کہ آپ کو میرا اور ——" —— اختر سلطان کا —— ہاں ہاں کہو —— کہے جاؤ نا!" —— ——

"رشتہ یار رشتہ ہوجانے میں اب کوئی اختلاف نہیں میں جانتا ہوں کہ آپ محض کچھ پانے کے لئے انکار فرماتے ہیں۔ صرف بعض اوقات بزرگانہ شفقت کے ساتھ چھیڑنے اور خوش طبعی سے خورد نوازی فرماتے ہیں اب ورنہ —— —— !"

چچا جان نے آنکھیں گھمائیں۔ اور میں گھبرایا! ——

"ہا ہا ہا! ہاں ہاں کہو —— اور کچھ کہو کیا ورنہ —— خدا نیک ہدایت دے —— کچھ اور بھی تو کہو!" —— دیکھئے نا مجھے تو معلوم تھا کہ آپ خوش طبعی فرماتے ہیں۔ چچا جان میری اور اختر سلطان کی خواہش ہے کہ آپ ہم دونوں کو اپنی نیک صلاح سے سرفراز فرمائیں یعنی کوئی ...... تاریخ ——!"

چچا جان اب ذرا سنبھلے اور تیور بھی بدل گئے۔

"تاریخ ——! بدمعاش۔ اس نیک صلاح کے کیا معنی ہیں —— بیٹا ابھی تو انتظار کرنا پڑے گا تمہیں برخوردار ——"

میں نے ان کے اس بگڑنے کی پروا نہ کی۔ اور بچوں کی طرح اُچھل کود مچادی۔

"اچھا اچھا بہت خوب۔ واہ واہ چچا جان یہ تو آپ نے خوب فرمایا —— اتنی خوش طبعی ——"

نامعقول کہیں کا —— ابھی انتظار کئے جاؤ بس یہی تمہارے حق میں مناسب ہے ——"

"—— مگر چچا جان میرے اچھے چچا جان! انتظار تو کرتے ہی رہیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ ایک خاص تاریخ اور وقت کا

تعین فرمادیں بس ——"

"اچھا تو صحیح تاریخ اور وقت پوچھتے ہو تم؟"

"جی ہاں صحیح بالکل صحیح —— آپ کو بار خاطر نہ ہو تو حساب سے نیک تاریخ ——"

"نیک! خوب! مسعود میاں! اگر میں اندازاً کوئی وقت بتا دوں تو شاید تمہاری تسکین ہو جائے گی بالفرض اگر سب سے اعلیٰ کوئی تاریخ ہو تو ——"

"نہیں نہیں میرے چچا جان ایک خاص وقت اور صحیح ترین تاریخ —— بزرگانہ نوازش ہو گی۔"

"اچھا برخوردار اگر تمہاری مرضی یہی ہے تو یہی سہی واقعی تم شریف ہو۔ کیوں نا۔ اب چونکہ تمہاری خواہش ہے تو بالکل ٹھیک اور صحیح تاریخ و وقت مقرر کر دوں۔ تو بس ایک آخری بات ہی میں بتائے دیتا ہوں —— "

میں اس وقت وفور جذبات سے بے خود تھا مسرت کا ایک سیلاب مجھ پر دوڑ گیا تھا۔ تاریخ اور صحیح وقت کا فیصلہ سننے کے لئے مضطرب تھا اور کچھ بولا نہیں جاتا تھا۔ میں گڑگڑا کر چچا جان سے زیادہ نزدیک پہنچ گیا —— چچا جان ——"

"خاموش رہو۔ بیٹا میں ابھی تمہارا اطمینان کئے دیتا ہوں تمہیں یہی رضا مطلوب ہے اور شادی کے ساتھ جہیز بھی —— یا جتنے ہونا ہمیں جہیز کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔ اچھا تو اب تاریخ اور دن کا فیصلہ کرنا ہے۔ ماہر طبیعات کی رائے ہے شادی کی خوشی عید سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ تو تمہارا بیاہ اس لئے۔ تمہارا نکاح اختر سلطان کے ساتھ بیٹا۔ انشاء اللہ ہو گا ——!

میں نے گھبرا کر کہا

"چچا جان ——"

میرے نفس کی کیفیت اس وقت عجیب تھی کچھ مسرت تھی اور کچھ امید و بیم کی کشمکش۔ بالکل اس طرح حال ہو رہا تھا جیسے کسی ملزم —— اقبالی ملزم کا فیصلہ سنایا جا رہا ہو اور کبھی اس کو یہ امید ہو کہ اقبال جرم کی بدولت رہائی ہو جائے گی اور کبھی —— خوف"

چچا جان نے بات کاٹ کر کہا ——

" —— اب غور سے سن لو۔ گھبراؤ ٹھیک نہیں۔ یاد رکھو کہ جس سال ایک ہفتہ میں تین عیدیں اکٹھی آئیں گی۔ تو اس طرح تمہیں شادی سے زیادہ خوشی شادی کی ہو گی اور شادی سے زیادہ تین عیدوں کی اس لئے بس اس عید کے دن تمہارا بیاہ رچیگا۔ سنتے ہو مسعود میاں آنکھیں پھاڑے مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔ کیا سنا۔ میں نے کیا کہا تین عیدیں جب اکٹھی آئیں گی بس —— یاد رکھو اس کو اس سے پہلے گپ شپ کے لڈو کھاتے بیٹھے رہو۔ اور اس درمیان میں میرا دماغ مت کھاؤ۔ کل عید تھی اس خوشی میں میں نے یہ نیک فیصلہ سنا دیا تمہیں —— اب اطمینان سے اس دن کا انتظار کرو ——"

میں یہ عجیب و غریب منطق سن کر حیران پریشان چچا جان کا منہ تک رہا تھا مارے خاموشی نہ تھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور میں کیا سن رہا ہوں۔ وہ الفاظ دہرائے جا رہے تھے مگر میرے دماغ میں ان کا کوئی مطلب ہی نہیں گھستا۔ ایک حرف زبان سے نہ نکلا۔ چپ چاپ کھڑا تھا جس بات کا گمان بھی نہ تھا وہ چچا جان نے منطقی دماغ سے پیدا کر کے مجھے سنا دی۔ مجھے خاموش کھڑے دیکھ کر فرمایا ——

"اچھا بس اب روانہ ہو جاؤ۔ اپنا کام دیکھو۔ خالی کھڑے کیا کر رہے ہو فیصلہ چاہتے تھے وہ ہو چکا سمجھ تو گئے نا"

کیا جواب دیتا کہ خاک سمجھا۔ سمجھنے کی بات کبھی ہوتی تو سمجھتا۔ میں تو فقط یہ سمجھا کہ محبت کے لئے تحریری کا جواب ہے۔ دنیا میں کوئی شخص عقلمند سے عقلمند اور بیوقوف سے بیوقوف بھی کسی ایسے دن کا خیال کر سکتا ہے آخر بغیر سمجھے کیسے منہ کرے۔ نو ہیکر ہوا۔ اور چچا جان کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم کھیلنے لگا۔ گویا وہ اپنے اس قطعی فیصلہ کو میری قسمت کا ایک مضحکہ خیز فیصلہ تصور فرما رہے تھے۔

(۲)

میرے چچا جان خدا کے فضل سے پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ انکی ذات گرامی یوں تو ہزاروں محاسن کا مخزن تھی۔ لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے میرے حق میں حد درجہ تکلیف دہ تھے۔ وہ متوسط قد کے بھاری بدن بلکہ تندرست و توانا آدمی تھے۔ پرانی وضع قطع کا گاڑھے کا

خیال رکھتے۔ نمود و نمائش کا شوق بڑھاپے میں بھی خاصہ تھا۔ خصوصیت سے اپنی شان و شوکت اور امارت کا قوی احساس تھا اور اس کے اظہار میں ہر وقت نہایت شد و مد سے آمادہ رہتے۔ گو بدباطن تو انہیں نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ہر کس و ناکس کے قول کی مخالفت اپنا فرض خاص تصور کرتے۔ اور ہر ممکن طور پر نہایت اصرار سے اپنی رائے کی برتری ثابت کرانے میں ساعی رہتے، یہی سبب تھا کہ ہر شخص پہلی ملاقات میں انکو ضدی اور جھگڑالو سمجھ لیتا۔ اکثر رئیسوں کی طرح انہیں بھی دوسروں کو امید و بیم میں مبتلا رکھنے کا شوق بھی خوب تھا۔ جب سمجھ لیتے کہ میرے فیصلہ یا رائے پر کسی شخص کی بھلائی برائی کا انحصار ہے تو اپنے فیصلہ کو بنانے اور لیت و لعل میں رکھنے کی انتہا کر دیتے اور ان حالات کو دیکھ کر بعض لوگ انہیں بدخواہ اور کینہ پرور بھی کہتے ہوئے نہ چوکتے تھے۔ یہ ملکہ ان میں خاص تھا۔ اسے چاہے اسے شانِ امارت کہئے یا جو کچھ۔ کہ جو درخواست ان کے سامنے پیش ہو سب سے پہلے جواب میں "نامنظوری کا اظہار ہوگا۔ لیکن طویل مدت کے بعد سوالی کو ایک کشمکش عظیم میں مبتلا رکھ کے "منظوری" ضرور صادر ہو جاتی۔ شاذ ہی کسی کو انکار کا جواب ملتا۔

اپنی تجوری" کی حفاظت ہر ممکن طریقہ سے کرتے۔ مگر بعض اوقات جب سخاوت پر آمادہ ہوتے یا کر لئے جاتے۔ (اکثر رئیسوں میں خاص عادت ہوتی ہے کہ خوشامدانہ گفتگو سخاوت پر بھی آمادہ کر دیتی ہے) تو باوجود اس خساست اور سختی کے نہایت شان کے ساتھ مالامال کر دیتے۔

ادبیات سے انہیں دلی نفرت تھی۔ ادب کا نام آتے ہی ناک بھوں چڑھا کر نہایت بددلی سے اظہارِ غیض کیا کرتے۔ ادب کی طرف میرا انہماک دیکھ کر بھی وہ مجھ سے اور زیادہ ناراض رہنے لگے تھے۔ شاعری سے تو انہیں للّٰہی بغض تھا۔ کسی شاعر کا ذکر آیا اور انکی تیوری میں بل پڑے۔ کسی بڑی سے بڑی اور مشہور سے مشہور شاعر کی تعریف ان کے سامنے ہوئی اور انہوں نے بُری طرح لتاڑ بتائی۔ مگر میں تو ان کے سامنے خاموش ہی رہتا اور ہر طریقہ سے ضبط کئے بیٹھا رہتا کہ کوئی لفظ کسی کی تعریف میں زبان پر نہ آجائے۔ اور چچا جان کی خفگی کا باعث ہو۔ کچھ مدت سے ہمارے چچا جان کو ایک خاص علم سے ذوق ہو گیا تھا۔ اس میں بڑے انہماک سے دلچسپی لے رہے تھے۔ انکی رائے میں یہ علم طبیعات، تھا جس کے اصول مفروضہ کو دہرا دہرا کر وہ بڑے شد و مد سے حکما کے اقوال سے اپنی رائے کا استدلال فرماتے حالانکہ اس علم یا فن کو طبیعات سے دور کی نسبت بھی نہ تھی۔ مگر اس مفروضہ علم طبیعات کے ذوق و شوق کی بدولت علم شربات سے وہ اور زیادہ نفرت کرنے لگے۔ یہ خاص ذوق ان کا سب سے زیادہ اس دن سے ترقی پذیر ہوا جب اتفاقیہ طور پر ایک ضرورتمند شخص ان کو ڈاکٹر کے دھوکہ میں ایک مریض کی تشخیص کے۔ لئے اصرار کر کے لے گیا۔ اور رفتہ رفتہ چلتے وہ وہاں لطیفہ لے جا کر مکمل ڈاکٹر بن گئے۔ اُس روز سے انہوں نے فن طب پر دھواں دھار لکچر اور بحث و تمحیص شروع کر دی اور طبیعات کی مہارت کے بھی خاص دعویدار ہو گئے۔ بہرحال وہ اس علم یا فن کے ماہر تھے یا نہیں۔ مدعی ضرور تھے۔ اور اپنے دعوؤں کی دلیل میں نہایت دلیر۔ اس واقعہ کے بعد سے شانِ امارت کے ساتھ ہی حکمت، کا بھی اضافہ ہو گیا۔

چچا جان کو رضامند رکھنے اور ان کی مرضی حاصل کرنے کی سب سے بہتر تدبیر یہی تھی کہ ان کی رائے (یہ خود غلط ہی سہی) اور تمام مفروضہ و مقررہ اصولوں کی مطابقت نہایت عقیدت سے کی جاتی۔ ورنہ اُن کو راہ پر لانا ممکنات کی توہین تھی۔ کیونکہ انہیں اپنی خودمختار رائے حد درجہ عزیز تھی۔ اُن کا فرمان یا اصول یا رائے تھی کہ لوگوں پر قانون کی متابعت فرض ہے" مگر اپنے لئے جس قانون کی متابعت وہ فرض سمجھتے تھے۔ نہ کوئی نقرہ تھا نہ موضوع۔ بلکہ اُن کی ذاتی رائے کے ساتھ ہر ساعت تبدیل ہوتا۔ میری ابتدائی ساری عمر ان کے سایہ میں بسر ہوئی۔ میرے والدین ایک بڑی جائداد (ترکہ) ان کی نگرانی میں سونپ گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی نورِ نظر "اختر سلطان" کی طرح اگر نہیں تو کچھ کم عزیز نہ رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی ضد اور عجیب و غریب عادات سے میری زندگی پیا ذلیل کتے سے زیادہ نہ تھی۔ پانچ سال کی عمر تک ہر وقت بیدوں سے تواضع ہوتی رہی پانچویں برس سے لے کر پندرہویں

برس کی عمر تک ہر وقت اصلاح کی ضرورت پہنچنے کی فکر رہ جاتی تھی اور پندرہ برس تک صبح و شام یہ کوشش گزار کیا جاتا تھا کہ میں ترکہ سے محروم کر دیا جاؤں گا درحقیقت میں ادا س اور مجبور رستے کی طرح تھا لیکن ادا سی تو میری فطرت کا عطیہ تھا اور میری طبیعت کا ایک خاص جزو۔

اختر سلطان میری راحت و مونس و غمگسار تھی۔ میری محبت کی رفیق و رساتھی۔ ہم ایک جگہ پلے بڑھے اور بالغ ہوئے۔ ... کے خلاف وہ مجھ سے ... اور محبت کرتی تھی اور میری حیات آرزو کا واحد ملجا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ بہت نیک اور صالح لڑکی تھی۔ ہمارا دونوں کا ایک ایسا مستحکم ... ہو چکا تھا جو ہماری زندگی کی اہم کڑی تھا۔ ہر سے کہ اس کی شکستگی ہمارے سلسلۂ حیات کا انقطاع ثابت ہوتی۔ مگر تکمیل صرف چچا جان کی مرضی پر منحصر تھی۔

اختر سلطان کی عمر بمشکل پندرہ برس کی تھی۔ اور اب ایک ایک منٹ کی جدائی وبال جان تھی۔ مگر چچا جان چاہتے تھے کہ تعلیم مکمل ہونے تک ابھی منتظر رہیں۔ اب یہ اپنی رائے کی خودمختاری تھی یا جو کچھ ہمارے لئے ایک مصیبت ضرور تھی۔ اب انھوں نے یہ رائے مطلق نکالی کہ کوئی دن تاریخ کا تعین ہی نہیں۔

بقول کریم خانم کے) انھیں اپنی اور نہی منطق کی مشق کے لئے ... ہی تو مخالفت ... تھا۔ پھر کیونکر ہماری بیچارگی سے ناز اٹھا کر اپنی رائے کی مطلق العنانی کا اظہار نہ کرتے۔ حالانکہ ہم دونوں کو سلسلۂ ازدواج میں منسلک دیکھنے کی انہیں دلی خواہش تھی اور وہ مصمم ارادہ بھی کر چکے تھے۔ کہ اپنی جیب خاص سے دس ہزار روپیہ کا جہیز عطا فرمائیں گے اور ہماری دلی تمناؤں پر اپنی رضامندی کی مہر ثبت کر دیں۔ لیکن ہم سے ایسی کوتاہ اندیشی سرزد ہوئی۔ کہ ہم نے خود جا کر اپنے ارادوں سے ان کو مطلع کر دیا۔ بھلا ایسی حالت میں وہ مخالفت نہ کرتے تو کیا کرتے۔ اپنی عادت کی عدالت کیونکر گوارا ہوتی۔ میں ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ چچا جان میں کئی کمزوریاں تھیں۔ لیکن ان کمزوریوں میں ان کی ضد کا شمار نہیں تھا۔ بلکہ یوں تو ان کی ایک خاص خرابی تھی۔ ان کی کمزوری سے میرا اشارہ اس زمانہ وہم کی طرف ہے جو ہر وقت انہیں دامن گیر رہتا تھا۔ خوابوں، شگونوں اور اسی قسم کی توہمات کی معلومات میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ عادت اور نیاں

... کے معاملے میں وہ معمولی سی باتوں کا بھی بے حد خیال اور لحاظ رکھتے تھے۔ اور اپنے آپ کو قول کا بندہ سمجھتے تھے۔ لیکن یہی انہیں ایک خبط سا ہو گیا تھا۔ اپنے ارادوں کے مفہوم کو تبدیل کرنے میں مطلق پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ مگر زبانی ہدایت کو ایک تمسک سے بھی بڑھ کر محکم شمار کرتے تھے۔

پچھلے دنوں میری اور چچا جان کی جو بات چیت ہوئی تھی۔ اس کے چند دن بعد ہی اپنے ایک دوست کی ہوشیاری کے طفیل ہم نے ان کی اس ... خصوصیت سے غیر متوقع فائدہ اٹھایا۔ واقعہ اس طرح ہوا یا خدا کو اسی طرح منظور تھا۔ کہ میرے احباب میں دو ایسے تھے جنھوں نے ایک سال غیر ممالک کی بحری سیر و سیاحت کرنے کے بعد ابھی ساحل ہند پر قدم رکھا تھا۔ اس قابل یادگار واقعہ کے تین ہفتے بعد جس نے ہماری امیدوں کو اس ... سے ملیامیٹ کر دیا تھا۔ ۱۵ فروری بروز عید دوپہر کے وقت میں ان احباب کی معیت میں چچا جان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آدھ گھنٹہ تک تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر ہم نے گفتگو کے پہلو کو اس طرح بدلا۔

شریف ——— میں کامل ایک سال ہندوستان سے غیر حاضر رہا ہوں۔ آج پورا ایک سال ہوتا ہے۔ اچھا آج کونسی تاریخ ہے!

ہاں۔ ہاں! آج فروری کی پندرہ ہے ڈاکٹر عثمان لطیف صاحب۔ (اس وقت چچا جان ڈاکٹری کی شان کے احساس سے مسرور نظر آتے تھے) آپ کو یاد ہوگا کہ میں آج سے ایک سال پہلے اسی روز آپ سے رخصت ہونے آیا تھا۔ دیکھئے! اتفاق سے مسٹر سعید بھی پورا ایک سال باہر رہے ہیں۔ ان کو سال بھی آج ہی پورا ہوا ہے؟ پہلے ہم آپ کے عید کے سلام کو حاضر ہوئے تھے۔ اور سعید صاحب ———"

سعید: "پورا ایک سال باہر رہا ہوں ڈاکٹر صاحب آپ کو تو یاد ہوگا۔ کہ میں اور شریف آج ہی کے روز پچھلے سال آپ سے رخصت ہونے آئے تھے۔"

چچا جان: "ہاں۔ ہاں مجھے خوب یاد ہے واقعی بہت عجیب بات ہے۔ کہ آپ دونوں ایک سال باہر رہے ہیں۔ واقعی عجب اتفاق ہے۔ اسی سلسلہ کو ڈاکٹر شرلاک مشہور ماہر طبیعات " واقعات کا غیر معمولی

اتفاق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شرلاک کی رائے ——"

میں۔ (بات کاٹ کر) یقیناً! چچا جان یہ تو بالکل عجیب بات ہے۔ لیکن مسٹر شریف اور مسٹر سعید غالباً ایک راستے سے نہیں گئے۔ اس لئے وقت میں کچھ اختلاف بھی ہونا چاہئے!"

چچا جان:"نا ہوش نامعقول تو کیا جانے ان باتوں کو۔ تجھے اس سے کچھ مطلب نہیں۔ میرے خیال میں تو یہ عجیب معمولی معاملہ بیحد تعجب خیز ہے اور ڈاکٹر شرلاک . . . . . . !"

میں۔ چچا جان مسٹر شریف نے اسی جہان کا چکر کاٹا ہے اور مسٹر سعید راستہ امید کے گرد گھومتے ہوئے آئے ہیں؟

چچا جان۔ خوب! ایک مشرق اور دوسرا مغرب کی سمت گیا تھا۔ تو چپ رہ نامعقول! دونوں نے زمین کا پورا چکر کاٹا ہے اچھا تو ڈاکٹر شرلاک . . . . . . "

میں۔ سعید صاحب کل آپ حضرات تشریف لاکر ہمیں اپنے سیر و سیاحت کے حالات سے محظوظ فرمائیے۔ اور شطرنج وغیرہ بھی —— ——"

شریف۔ شطرنج —— مگر آپ کو خیال نہیں شاید کل تو عید ہے کوئی اور دن مقرر کیجئے —— کل فرصت ذرا ملنے ملانے میں کم ہوگی ——"

میں:"معاف کیجئے میں اسقدر احمق تو نہیں ہوں صاحب کہ دن کا بھی خیال نہ رہے۔ کل عید کہاں ہے۔ عید کا دن تو آج ہی ہے۔"

شریف۔ نہیں جناب میں بھی غلطی پر نہیں ہوں۔ مجھے اپنی رائے پر پورا اعتماد ہے۔ کہ کل ہی عید ہے۔ آج میرے حساب سے ہرگز عید نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ——"

سعید: (متحیرکن انداز میں) آپ سب کا خیال خدا جانے کدھر ہے ذرا یاد کیجئے۔ نہ آپ صحیح فرما رہے اور نہ آپ۔ عید تو کل ہو چکی —— باسی عید کا ذکر ہی کیا ہے اب"

سب۔ (یک زبان ہوکر) واہ جناب آپ نے کمال کر دیا۔ کل عید ہو چکی؟ بہت خوب ارشاد ہے۔"

چچا جان: (بہت غور و خوض کے بعد فیصلہ کن لہجہ میں) میں کہتا ہوں آج ہی تو عید ہے۔ مجھے کیا خبر نہیں ہے۔ یہاں ڈاکٹر —— کا قول"

شریف: نہیں جناب عید کل ہوگی۔"

سعید۔ آپ حضرات ذرا اپنی یادداشت اور حافظہ پر غور کیجئے۔ میں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔ عید کل ہو چکی اور اس کا مجھے اس طرح یقین ہے جیسے اپنی اس کرسی پر بیٹھنے کا۔ ——"

میں:"(جوش مسرت سے بیتاب ہوکر) میں اب خوب سمجھ گیا آپ سب درست فرماتے ہیں۔ چچا جان ذرا غور فرمائیے۔ یہ آپ کے لئے سند ہے۔ اس دشوار مسئلہ کے حل پر توجہ فرمائیے۔ مسٹر سعید کے قول کے مطابق تو کل عید تھی۔ اب یہ دشوار معمہ نہیں رہا بہت ہی آسان بات ہے۔ تو کل ایک عید کا دن تھا۔ اس میں ذرا شک نہیں۔ اور آپ کے اور میرے نزدیک عید کا دن آج ہے۔ ہمارا خیال بھی غلط نہیں۔ ہم آج عید منا رہے ہیں۔ اور مسٹر شریف صاحب کی رائے بھی درست ہے کہ کل عید کا دن ہوگا۔ درحقیقت ہم سب اپنی اپنی جگہ راہ راست پر ہیں اور اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہی وہ سال ہے جس کے ایک ہفتہ میں تین عیدیں اکٹھی آئی ہیں۔ ——"

چچا جان:"—— مردود کہیں کا ——"

یہاں میں نے مسٹر سعید کو اپنی حمایت کے لئے اشارہ کیا۔

مسٹر سعید:"مسٹر شریف آپ نے سنا مسعود صاحب نے ہماری کیسی خبر لی۔ خوب احمق بنایا۔ بھلا یہ کیا منطق ہے میں تو اپنی رائے کے مطابق عید کا گزر جانا ثابت کر سکتا ہوں"

چچا جان۔ ثابت —— یہاں تو ڈاکٹر . . . . . "

سعید: ڈاکٹر صاحب واقعہ یہ ہے کہ زمین کا دور چوبیس ہزار میل ہے کرہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتا ہے اور مشرق سے مغرب کی سمت جاتے ہوئے یہ کل فاصلہ کامل ۲۴ گھنٹہ میں طے ہوتا ہے۔ آپ کے لئے مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ خوب سمجھ لیا ہوگا آپ نے ——"

چچا جان:"مگر بھئی —— ڈاکٹر شرلاک کی رائے ——"

سعید:"تو زمین کی رفتار کا اوسط ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔

فرض کیجئے میں یہاں سے ایک ہزار میل مشرق کی جانب جاؤں تو اس مقام سے ایک گھنٹہ قبل آفتاب طلوع ہوتے ہوئے دیکھ سکوں گا۔ اور آپ یقیناً ایک گھنٹہ بعد سورج دیکھیں گے پھر اسی رخ پر ایک ہزار میل آگے جانے سے سورج کو دو گھنٹہ پہلے نکلتے دیکھوں گا۔ اور اسی طرح جس قدر فاصلہ طے ہوتا جائے گا سورج سے قربت ہوتی جائے گی یہاں تک کہ میں زمین کا مکمل دورہ کر کے اسی مقام پر واپس آ جاؤں گا جہاں سے روانگی ہوئی ہے اس صورت سے مشرق کی جانب چوبیس ہزار میل کا راستہ طے کر کے ۲۴ گھنٹہ پیشتر طلوع آفتاب کا مشاہدہ کروں گا۔ یا یہ سمجھئے کہ میرا وقت آپ کے وقت سے ایک روز قبل ہوگا اس طرح عید ظاہر ہے کہ کل تھی اب تو اس مسئلہ کی کافی توضیح ہو گئی ۔۔۔۔"

چچا جان:" یہ تو درست ہے۔ لیکن ڈاکٹر مسٹر لاک ۔۔۔۔"

سعید۔ (باآواز بلند سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) "۔ جناب مسٹر شریف جب جانب غرب ایک ہزار میل چلے تو انہوں نے اس صورت سے ایک گھنٹہ یہاں کے اصل وقت سے کم تھا اور کامل چوبیس ہزار میل طے کرنے کے بعد ایک دن یہاں کے اعتبار سے کم رہا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ان کے دورہ کے لحاظ سے عید کا دن کل ہوگا۔ اب حساب کیجئے تو آپ کی عید آج ہے۔ میری عید کل تھی اور شریف صاحب کی عید کل ہوگی۔ اور اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسی واقعیت ہے جس کی تکذیب کے لئے یقیناً آپ بھی تیار نہ ہوں گے۔ کیونکہ آپ تو اس قسم کے منطقی اصول کی دل سے قدر کرتے ہیں اس لئے اب تو آپ کو بھی یقین ہو گیا ہوگا کہ اس سال ایک ہفتہ میں تین عیدیں جمع ہو گئیں"۔

چچا جان:" بہت خوب جناب۔ اچھی طرح سمجھ گیا میں! گویا اس فتوے کی رو سے مجھے مجبور کر دیا گیا۔ خیر، ابھی میں وعدہ خلافی پر آمادہ نہیں ہو سکتا اب تو بہر صورت میں یہی اقرار کرتا ہوں کہ تین عیدیں ایک ہفتہ میں آ گئیں" بیٹا مسعود اور انتہز "میں تمہیں مژدہ سناتا ہوں کہ میں نے جو دن تمہاری شادی کے لئے مقرر کیا تھا وہ آپہنچا۔ قسم خدا کی اچھی سوجھی میاں مسعود" تینوں عیدیں ایک ہفتہ میں اچھالے لو بھئی یہ اپنا ترکہ اور ہزاروں کا جہیز موجود ہے یہی "شادی کا دن" ہے؛ مگر ڈاکٹر مسٹر لاک ۔۔۔۔

التجائیں!

انوارِ بیخودی بن تصویرِ راز ہو جا
ہر انجمن سے لے دل اب بے نیاز ہو جا

کچھ اور شامِ غم کی ہمت نواز ہو جا
اے ظلمتِ مقدر دامن دراز ہو جا

قدرِ نیاز یہ ہے سرگرمِ ناز ہو جا
اے جلوۂ حقیقی حُسنِ مجاز ہو جا

اے پردۂ ضیا میں پوشیدہ رہنے والے
تاریک ہیں نگاہیں جلوہ طراز ہو جا

کون و مکاں ہوں بیخودِ فطرت بھی جھوم جائے
اے قلبِ سازِ الفت یوں نغمہ ساز ہو جا

کب تک رہیگا گھُٹ کر سینہ میں نالۂ دل
پستی کو پست کر اب شانِ فراز ہو جا

تاریکیٔ نظر ہو جولانگہ تجلّی
اے نورِ صبح دل میں جلوہ طراز ہو جا

تصویرِ آرزو میں ہو رنگ بے نیازی
محمود کی نظر بن، حُسنِ ایاز ہو جا

تصویرِ سوز بن کر ہو باریابِ محفل
یعنی اُس انجمن میں شمع گداز ہو جا

ہر ذرہ کو بنا دے مخمورِ خود شناسی
اے بادۂ حقیقت کیفِ مجاز ہو جا

زیبا نہیں ہے ذکریؔ یہ لافِ خود پرستی
اب شانِ عبدیت بن، وقفِ نیاز ہو جا

(ذکری بھوپالی)

کلامِ اعظم

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی

اے فلک تو نے جو گردش سے نکالا ہوتا
مجھ سے راضی وہ مرا روٹھنے والا ہوتا

تم نے پردہ سے اگر چہرہ نکالا ہوتا
رات کو تم پہ فدا چاند کا ہالا ہوتا

رازِ قدرت کا جو میں جاننے والا ہوتا
تو نہ مسجد کہیں ہوتی نہ شوالا ہوتا

وہ بھی روتے مری احباب بھی روتے سنکر
اتنا پُر درد شبِ غم کہیں نالا ہوتا

ہائے یہ موسمِ گُل عارضِ گُل جلوۂ گُل
کاش ایسے میں مرا گیسووں والا ہوتا

چاندنی دیکھ لی او چاند سی صورت والے
اب تو چہرہ کہیں پردہ سے نکالا ہوتا

بال بکھرا کے اگر ناز سے اٹھلا کر تم
دو قدم چلتے تو عالم تہ و بالا ہوتا

ہر جگہ تو ہے کہیں بھی تری تخصیص نہیں
تجھکو پاتا جو کوئی ڈھونڈھنے والا ہوتا

سینکڑوں دل میں ہیں ارمان نکلنے کیلئے
کوئی ارمان مرا تم نے نکالا ہوتا

رات دن شام و سحر کی کوئی تخصیص نہیں
مجھسے ملنے کا کوئی وقت نکالا ہوتا

شاعری میں تری آتا نہ مزہ ای اعظم
تو نے اُلفت کا اگر روگ نہ پالا ہوتا

تبرکات

حضرت حالی مرحوم کی غیر مطبوعہ غزل اور چٹھی

کہنے کی بات ہو تو اُسے کہہ سنائیے
جو دل پہ بن رہی ہے وہ کیونکر دکھائیے

بھر پائے بس زمانہ سے جو مانگتے تھے حق
فارغ خطی ہم اپنی ابھی لکھ دیں لائیے

دُنیا کی ہو ہوس تو دل و دیں گنوائیے
یاں کھوئیے بہت سا تو کچھ جا کے پائیے

یہ کیا کہ دل ہے دیر میں اور کعبہ میں مقام
ہو رہئے اُن ہی کے جہاں دل لگائیے

مشکل ہے پاک ہونا اگر دل نہیں ہے پاک
زمزم سے غسل کیجے کہ گنگا نہائیے

گر جان کا ضرر ہے محبت میں ناصحو
ہم جان ہی سے بیٹھے ہیں بیزار جائیے

اور اعتبار کھوتے ہو اپنا رہا سہا
بس آگیا یقیں نہیں قسمیں نہ کھائیے

ف حضرت حالی مرحوم نے یہ چٹھی اپنے چھوٹے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب بی۔اے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع کرنال کو بتاریخ ۲۔ ستمبر ۱۸۹۰ء علیگڑھ سے لکھی۔ چٹھی دوسرے صفحہ پر۔ (مرسلہ۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

برخوردار سعادت اطوار طال عمرہ

بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمہارا کارڈ پہنچا۔ سب عزیزوں کی خیر و عافیت معلوم ہونے سے اطمینان ہوا۔ میاں عنایت اللہ ایک ہفتہ کے لئے دلی سے بھی غالباً آج کل یہاں آجائیں گے۔ اتفاق حسن ان شاء اللہ اکتوبر کے شروع میں منتقلین سے پانی پت روانہ ہوں گے۔ تمہارا ارادہ اس موقع پر دو چار روز کے لئے یہاں آنے کا تھا اب لکھو کیا قصد ہے۔ بہتر ہے اگر اکتوبر کی پہلی دوسری تک یہاں دو چار روز کے لئے چلے آؤ اور مل جاؤ۔

میں نے سید صاحب کے مدرسے کے بڑے کام اور سید کی زندگی کا حال عربی میں لکھنا شروع کیا تھا اور تم کو بھی دکھایا تھا وہ کاپی جس میں مسودہ لکھا جاتا تھا جہاں نہیں ملتی۔ میں نے دفعہ تو اس کو وہاں ضرور الماری اور بند تک یہاں میرے پاس رہی مگر اب نہیں ملتی۔ شاید پانی پت کے گھر میں کسی وقت میں اس کو اپنے ساتھ لے گیا اور آتے وقت وہیں بھول آیا۔ معلوم نہیں کہ تم اس وقت کرنال میں ہو یا پانی پت یا دورہ میں۔ اس لئے یہ خط کرنال کے پتے سے بھیجتا ہوں۔ اگر یہ خط تم کو پانی پت میں ملے تو میز کی دراز میں اس کاپی کو تلاش کرنا اور اگر قفل لگا ہو تو لوہار سے قفل کھلوا لینا اور اگر وہاں نہ ملے تو بڑی الماری کمرے کے در کے پاس ہے اس کو کھول کر تلاش کرنا۔ اُس الماری میں چند مُٹھے بے جلد کتابوں کے بندھے ہوئے رکھے ہیں ہر ایک مُٹھے کو کھول کر اُس کاپی کو دیکھنا اور ایک کتاب تہذیب حدیث میں بے جلد کی ہے اُسکا ٹائیٹل پیج پھٹا ہوا ہے یا نشان ہو گیا ہے ہر ایک حدیث کے نیچے اردو ترجمہ ہے مگر بہت تھوڑی اور شاید زنانی کاغذ پر ہے اگر وہ ملجائے تو اس کو بھی نکال لینا۔ کاپی مذکورۂ بالا کی یہ صورت ہے کہ کاغذ فرنچ ہے اور ایک پٹھا ٹوٹا ہوا ہے۔ اس میں شاید اور بھی میرا ایک آدھ مسودہ ہوگا۔ غرضکہ ان دونوں چیزوں کو جہاں تک ہو سکے کوشش سے تلاش کر کے میرے پاس بھیجدو اور اگر دونوں چیزیں نہ ملیں تو جو کچھ مل جائے اسی کو بھیجدینا یا اگر خود آنے کا ارادہ ہو تو اپنے ساتھ لیتے آنا۔ اگر یہ خط کرنال میں یا دورہ میں پہنچے تو کبھی کسی اتوار کو پانی پت جاکر تلاش کرنا۔

میں بعنایت الٰہی اچھا ہوں۔ مولوی وحید الدین کے لئے ابھی کوئی صورت نہیں نکلی مگر سید صاحب اور سید محمود صاحب اُن کے حال پر بہت مہربان ہیں۔ ہمیشہ ایک بجے سے شام تک سید محمود صاحب پاس رہتے ہیں۔ سید صاحب کا ارادہ ان کو بورڈنگ ہوس میں کوئی کام دینے کا ہے۔ اگر ممکن ہو تو اُن کے مکان پر خود جاکر یا کسی عورت کی معرفت اُن کی والدہ کی تسلی کر دینا کہ انشاء اللہ عنقریب اُن کے لئے کوئی معقول صورت نکلنے والی ہے۔ تقریباً تین مہینے کی تعطیل تھی اس سبب سے ان کے لئے اب تک کوئی صورت نہیں نکلی۔ ۲۵۔ اکتوبر کو کالج کھلے گا اُس کے بعد امید ہے کہ خاطر خواہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ وحید الدین فی الحقیقہ بہت لائق آدمی ہیں اور امید ہے کہ اگر اُن کا یہاں رہنا ہوگا تو ان کے جوہر ظاہر ہوں گے تم کو بہت بہت سلام کہتے ہیں۔ بالفعل وہ ایک لکچر اس مضمون کا تیار کر رہے ہیں کہ سائنس کی بے شمار شاخیں اور فروع جو اس زمانہ میں نکلی ہیں ان سب کی تحصیل اور تحقیقات کرنے کی ترغیب قرآن مجید میں کی گئی ہے اور کوئی کتاب دنیا میں قرآن سے زیادہ سائنس کی حامی اور مددگار نہیں ہے۔ اس کے متعلق جسقدر خیالات انہوں نے مجھ پر ظاہر کئے ہیں وہ نہایت معقول ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ اُن کا لکچر بہت مقبول ہوگا۔ ارادہ یہ ہے کہ کالج کھلتے ہی یہ لکچر تمام طلبہ اور پروفیسروں کی موجودگی میں دیا جائے۔ ایک اور لکچر اردو زبان کے متعلق دینا چاہتے ہیں وہ اُس لکچر کے بعد دینگے۔ میں پانی پت میں مولوی وحید الدین کی لیاقت سے اسقدر واقف نہ تھا جیسا یہاں آکر ہوا ہوں۔ زیادہ دعا۔ سب چھوٹے بڑوں کو دعا اور سلام۔

راقم الطاف حسین از علیگڈھ
۲۴ ستمبر ۱۸۹۲ع

(مرسلہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

—٭—

اے عید

حضرت کوئی کے انڈیپنڈنٹ سے

"تو اب رہنے دو ہمیں بھی معلوم ہے جب تم لکھنے پہ آتے ہو تو شام سے صبح تک لکھ سکتے ہو"

بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر رہنے دینا کیا معنی؟" ہم نے بیگم سے خالص منطقی دلیل طلب کرتے ہوئے پوچھا۔ "جب تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ابھی گیارہ سے زیادہ کا وقت نہیں ہے اور صبح ہونے میں پورے آٹھ گھنٹے کی کمی باقی ہے"

"الٰہی توبہ! تو کیا واقعی آج رت جگے کا ارادہ ہے؟ رمضان کے مبارک مہینہ میں دنیا رات کو عبادت کرتی ہے، وظیفے پڑھتی ہے، تراویح ادا کرتی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مضمون نگاری کونسی قسم کی عبادت یا حق العباد ہے کہ جس کے ادا کئے بغیر آپ کو میدان حشر میں اعمال کا ٹکٹ نہ ملنے کا اندیشہ ہے"

"تم تو خواہ مخواہ بحث کیا کرتی ہو بیگم۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ مسودہ کب سے نامکمل پڑا ہوا ہے اور اڈیٹر صاحب کتنی مرتبہ یاددہانی کرا چکے ہیں۔ اگر ایک گھنٹہ کے لئے خاموش ہی ہو بیٹھو تو کون تمہاری شان نسائیت میں بٹہ لگ جائے"

"مجھ غریب کی کیا شان ہے۔ شان ہے اڈیٹر صاحب کی جنکے سامنے نہ بیوی کی حقیقت ہے نہ بچوں کی"

"اب اس کج بحثی کا تو میرے پاس کوئی علاج ہے نہیں کہ تم خواہ مخواہ اڈیٹر صاحب سے دشمنی کی ٹھان لو۔ جو واقعہ تھا میں نے تمہیں بتا دیا ہے"

"خاک بتا دیا —— بچے عید کے کپڑوں کے لئے جان کھائے جا رہے ہیں۔ گھر میں نہ دودھ کا بندوبست ہے نہ شکر کا اور آپ کو آمد ہو رہی ہے" بیگم نے ترش رو ہو کر کہا۔

"خوب! یا تو رمضان کی مقدس رات میں عبادت و وظائف کا درس دیا جا رہا تھا یا اتنی ہی دیر میں دودھ اور شکر پہ اتر آئیں۔ کیا تک ہوئی؟"

بیگم دل ہی دل میں جل کر خاموش ہو گئیں۔ ہم نے پھر ذرا چھیڑنے کے لئے پوچھا۔

"ہاں بتایا نہیں بیگم؟ تمہارے پہلے مشورے پر عمل کروں یا یہ سمجھوں کہ دوسرا مشورہ پہلے حکم کو منسوخ کرنے کے لئے دیا گیا ہے"

بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ احتجاج کے طور پر بالکل ایک اسمبلی کے ممبر کی طرح خاموش "واک آؤٹ" کا ارادہ کیا۔ ہم نے پہلے تو اس موقعہ پر وہی سوچا جو سر جارج رینی یا سر جیمس گریگ کو سوچنا چاہئے تھا۔ یعنی یہ کہ فریق مخالف میدان چھوڑ بھاگا، کچھ اپنا کھویا، اب مطلع صاف ہے جو چاہو کرو اور خوب اطمینان سے کرو مگر فوراً ہی تصویر کا دوسرا پہلو نظر آیا اور ہم خالص "گھر والے" بنکر رہ گئے۔ اس وقت اگر سر جان سائمن ہمارے پاس ہوتے تو بالا سمجھائے ہوئے ملکی اور خانگی سیاست کا فرق سمجھ جاتے۔ اور انہیں اپنی رپورٹ میں یہ از اندازہ ضرورت فقرہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی کہ "ہندوستان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جبتک کہ عورتوں کو ان کی آبادی کی مناسبت سے حقوق نہ دئے جائیں" —— انہیں کیا معلوم کہ عورتوں کو یہاں کتنے حقوق دئے جا چکے ہیں۔

پس ہم نے بھی موقعہ کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے مسودہ کو اٹھا کر ایک طرف پھینکا اور پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر بیگم کا وہ "نافرمانی" کا باس کھینچ لیا جسے اپنی لکھنؤ کی زبان میں ذرا پیار سے "اوڑھنی" کہدیا کرتے ہیں۔

اب سوائے اس کے انہیں چارہ کار ہی کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ہو

کہہ کر مسکرادیں اور قطعی بیوپانہ انداز میں ہمارے پاس بیٹھ جائیں۔ ہم نے محبت سے کہا ——— "تم تو ذرا ذراسی بات پر بُرا مان جاتی ہو بیگم!"

"تم جی بھی جلا دیتے ہو" بیگم نے نگاہیں جھکا کر چوڑیوں سے شغل کرتے ہوئے کہا۔

"خیر خاک ڈالو ان باتوں پر، اب تم یہ بتاؤ کہ کل کیا ارادہ ہے۔ چاند تو ہوا نہیں۔"

"ارادہ کیا ہوتا روزہ رکھیں گے"

"اچھا ——— یہ بات ہے، اور اگر کل عید ثابت ہوئی تو پھر اُس حرام روزے کا ثواب شیطان کی روح کو پہونچایا جائیگا یا اپنے نامۂ عمل کی زینت بنایا جائے گا؟"

"آپ کو کیوں فکر ہے؟ آپ نے حلال ہی روزے کونسے پورے رکھے ہیں؟"

بہرحال تمہارے اس بیان سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ کل کے روزے کو تم بھی قریب قریب حرام ہی سمجھتی ہو۔"

"توبہ کرو! میں کیوں سمجھتی؟"

"اب نہیں سمجھتی ہو تو جب سمجھو گی جب درمیان میں روزہ توڑنا پڑیگا۔"

"روزہ کیوں توڑنا پڑے گا؟ ——— سچ کہنا میاں کیا کہیں سے چاند کی خبر آگئی ہے"۔

"خبر تو جب آئے جب کہیں چاند ہوا ہو۔ مگر روزے افطار کرانے کے لئے تو اس کی ضرورت نہیں۔ روزے تو "دو جنوں کی راضی" سے بھی افطار کئے اور کرائے جاسکتے ہیں۔"

"دو جنوں کی راضی سے کیا مطلب؟"

"جیسے ہماری اور تمہاری راضی ——— فرض کرو اب ہم اور تم دونوں مل کر اس کا اعلان کردیں کہ ہم نے چاند دیکھ لیا ہے۔ اور ہم فی التحقیق کہ پابند شرع مسلمان بھائی ہیں تو ہے کسی کی مجال کہ کل عید نہ منائے؟"

"توبہ کرو! میاں توبہ!! دین کی باتوں میں مذاق اچھا نہیں ہوتا۔"

"توبہ کی بیٹے! ——— خاک ڈالو اس اسکیم پر بھی اگر تمہیں پسند نہیں۔ مگر یہ ہم کہے دیتے ہیں کہ ہم نہ سہی اور کوئی اللہ کا بندہ اس کی ہمت کرے گا۔ یہ تو ہونا ہی ہے۔"

"تمہارے نزدیک تو دُنیا جھوٹی اور بے ایمان ہے۔ خیر ——— مگر یہ بھی خبر ہے کہ درزی نے بچوں کے کپڑے ابھی تک نہیں دئے ہیں۔ آپ تو پنسل کاغذ سنبھال کر ایک طرف آ بیٹھتے ہیں۔ مشکل میری ہے۔"

"مشکل ہی کیا ہے؟ تم بھی اپنا سر دتہ اور چھالیہ سنبھال کر ایک طرف بیٹھ جایا کرو۔"

"جی ہاں آسان ہے!"

"جی نہیں مشکل ہے!"

دیکھو میاں تم نے پھر وہی اُلٹی اُلٹی باتیں شروع کردیں۔ ہمارا جی اُلجھتا ہے"

"جی اُلجھتا ہے تو خاک ڈالو اس قصہ پر بھی۔ کوئی اور بات شروع کرو"

"بات کیا شروع کروں اپنا سر۔ بچے جان کھائے جاتے ہیں۔ اُن کے کپڑوں کا کیا ہوگا؟"

"پہنے جائیں گے"

"تو کب پہنے جائیں گے آخر؟"

"عید کے دن پہنے جائیں گے"

"کیسے پہنے جائیں گے۔ درزی تو ابھی تک لایا نہیں"

"کل صبح آٹھ بجے تک ضرور لے آئیگا۔ ہم نے تاکید کردی ہے۔ صرف کاج باقی ہیں۔ لو اب تو خوش ہو جاؤ۔"

"اور دودھ شکر وغیرہ؟"

"اُن کا بھی انتظام کرلیا ہے۔ عید تو ہونے دو!"

بیگم مُسکرادیں۔

جب کسی گھر کی گھر والی روزہ رکھ لیتی ہے تو پھر سارے گھر والوں کے لئے روزہ رکھنا اتنا ہی ضرور ہو جاتا ہے جتنا محرم اور دسہرہ کے موقعہ پر ہندو مسلمان بھائیوں کے لئے فساد کرنا۔ یا عدم اعتماد کا ریزولیوشن پاس ہونے کے بعد کسی چیئرمین بھائی یا وزیر بھائی کا

مستعفی ہوتا۔

چنانچہ جب اگلا دن ہوا تو ——— تو بھی روزے سے تھا، تم بھی روزے سے تھیں۔ وہ بھی روزے سے تھا، یہ بھی روزے سے تھیں۔ میں بھی روزے سے تھا، ہم بھی روزے سے تھیں۔ غرض حاضر غائب متکلم ساری دنیا روزے سے تھی۔

آٹھ بجے اُٹھے، نو بجے پیاس لگی۔ دس بجے حقہ کی طلب ہوئی۔ گیارہ بجے بھوک لگی۔ قصہ مختصر بارہ بجتے بجتے ہم پیاسے بھی تھے بھوکے بھی تھے۔ پان کے لئے بھی تڑپ رہے تھے اور حقہ کو بھی حسرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اب رفتہ رفتہ یہ امید منقطع ہو چلی تھی کہ کہیں سے چاند موصول ہونے کی اطلاع موصول ہو۔ اب تک جو اطلاعات موصول ہوئی تھیں وہ سب کی سب مایوس کن تھیں۔ مثلاً یہ کہ دہلی کی قطب مینار پر چاند نہیں ہوا۔ فتحپوری کی مسجد میں چاند نہیں ہوا۔ آگرہ کے تسبیح خانہ میں چاند نہیں ہوا۔ بمبئی کی سفید گلی میں چاند نہیں ہوا۔ پونا کے مشاعرہ میں چاند نہیں ہوا۔ لکھنؤ کے امام باڑے میں چاند نہیں ہوا۔ لاہور کے عالمگیر پریس میں چاند نہیں ہوا وغیرہ وغیرہ

مگر بارہ بجکر دس ہی منٹ گذرے تھے کہ یکایک خبر آئی کہ کاٹھے میں نہ صرف چاند ہو گیا بلکہ عید بھی ہو گئی۔ ہم اُچھل پڑے جیسے کسی نے گدگدی کر دی ہو۔ اور حیرت و استعجاب مسرت و انبساط، رنج و غصہ کی تینوں کیفیات کو یک وقت ظاہر کرتے ہوئے "کیا؟ کیا؟" کہنے لگے۔

آپ کہیں گے کہ تینوں مختلف کیفیات کا جذبات میں ایک ساتھ موجود ہونا سائیکالوجی کے خلاف ہے اور صرف ہمارا عزانہ کا سو اس کی تشریح بھی سن لیجئے۔

حیرت تو ہمیں اس وجہ سے ہوئی کہ اطلاع ہماری اُمید اور توقع کے خلاف تھی۔ نو بجے تک ہم منتظر رہے اس کے بعد بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ مسرت و انبساط کا اظہار اس خیال سے ہوا کہ روٹی بھی ملیگی، پانی بھی پئیں گے، پان بھی کھائیں گے، حقہ بھی ملاحظہ کرینگے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ذرا بیگم کو چھیڑیں گے بلکہ اگر موقعہ ہوا تو اپنے دلی ہونے کا رعب جمائیں گے۔ رنج و غصہ اس بنیاد پر تھا کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ سات گھنٹے کی محنت اکارت، نہ عید ہوئی نہ شب برات۔

مگر ہمیں کچھ اچھی طرح یقین نہ آیا اور ہم واقعہ کی تحقیق کے لئے نکل ہی کھڑے ہوئے۔ ہر شخص نے یہی کہا کہ کاٹھے میں چاند ہو گیا وہاں کے کئی آدمی آج دنگا نیڑھ کر یہاں آئے ہیں اور اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہم نے اُن لوگوں سے پوچھا اور انہوں نے ہم سے بھی وہی بات کہی جو سب سے کہی تھی۔ اس خبر سے تمام شہر میں بقول رائٹر ایجنسی ایک سنسنی سی پھیل گئی اور سب نے باتفاق رائے یہ تجویز پاس کی کہ ملاں لیسین اور پیر کرنالی قسم کے آدمیوں کو وہاں بھیجکر تصدیق کرائی جائے تاکہ شرعی حجت بھی افطار صوم کے لئے پوری ہو سکے۔

اس سلسلے میں کاٹھے کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کو نظر انداز کرنا گفتگو کو ناتمام اور بے لطف چھوڑنا ہے۔ کاٹھ گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں اس جگہ واقع ہے جہاں ۷۷ درجہ کا خط طول البلد ۲۹ درجہ کے خط عرض البلد کو قطع کرتا ہے۔ اور جمنا کے مشرقی ساحل سے تقریبًا ایک میل دور ایک ایسی سطح مرتفع پر آباد ہے کہ گرد و پیش کی بستیوں کے مقابلہ میں اچھا خاصہ کسی اہرام مصری کا آوا گون معلوم ہوتا ہے۔ بقول ہمارے ایک انشا پرداز دوست کے ——— وہ اُس کی کچی پکی سر بفلک عمارتیں، وہ اُس کی لمبی لمبی مصوری نما سڑکیں، وہ اُس کی اونچی اونچی قطب نما مسجدیں اور وہ اُن کے اُبھرے اُبھرے نظر فریب گنبد ——— بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے کسی ہمالیہ کی چوٹی نے میدان حشر میں سر نکال لیا ہے۔

پھر اس جغرافی تشکیل کے بعد اُس کی تاریخی اہمیت بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔

امیر تیمور جب ہندوستان کو پامال کرتا ہوا دہلی پر اپنا آخری غصہ اُتارنے کے لئے جا رہا تھا تو اُس نے اُس تاریخی شب میں یہیں قیام کیا تھا جس میں قیدیوں کی کثرت اور بھیڑ بھاڑ سے تنگ آ کر اُس نے بیس سال سے زائد عمر کے تقریبًا ایک لاکھ آدمیوں کی گردن زدنی کا حکم صادر کیا ہے۔ چنانچہ وہ میدان جہاں اگلے روز صبح کو اس بیشمار اور بیگناہ خلقت کا خون بہایا گیا یہاں سے تقریبًا ۲ امیل کی دوری پر

جانبِ جنوب واقع ہے۔ اس کے بعد تزکِ جہانگیری اور یاد داشت احمد شاہ درّانی سے بھی اس آبادی کا وجود ثابت ہے۔ سب سے زیادہ تاریخی اہمیت کاٹھ کو اسوقت نصیب ہوئی جب سعد اللہ خاں علوی (شاہجہاں کے وزیرِ اعظم) نے یہاں کے ایک عالم کو شاہزادگان کی تعلیم و تربیت کیلئے مامور کیا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ خود سعد اللہ خاں علوی بھی یہیں کا رہنے والا تھا لیکن معتبر روایات اس کے خلاف ہیں۔ اس کے بعد عہدِ عالمگیری تک کاٹھ "مولوی سپلائنگ ایریا" رہا اور اسی بنا پر یہاں کے مُلّا اور عالم مشہور ہوگئے۔

"کٹھ مُلّا" کے لفظ کی تاریخی تاویل اس سے زیادہ نہیں۔

بہرحال اس تمام تمہید سے مدعا یہ تھا کہ جس طرح عہدِ اسلامی میں کاٹھ کے مُلّا یا علماء مشہور ہوا کرتے تھے اسی طرح اب عہدِ انگریزی میں وہاں کے "نامی بھائی" مشہور ہیں۔ (اس ضمن میں وہ بزرگ شامل نہیں جو اس مقام کی قدیم روایات کو لئے ہوئے باقیات الصلحات کے زمرہ میں ہیں)

نامی بھائیوں سے مراد صرف وہ طبقہ ہے جو تہذیبِ جدید کا دلدادہ اور انگریزیت کا اس حد تک گرویدہ ہے کہ اپنے وطن کی اسمی سرشتگی کو بھی گوارا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ حال ہی میں انہوں نے اپنی اس مغرب پسندی کو اس طرح شوقیہ جامہ پہنایا ہے کہ اچھے خاصے غریب کاٹھ کا نام بدل کر کاٹھنگٹن رکھ دیا ہے (خدا معلوم اس کا املا یہی ہے یا کچھ اور) اور ہر جائز ناجائز ذریعہ سے اس کی کوشش کیجارہی ہے کہ اگر کسی طرح کاٹھنگٹن رمنگٹن ٹائپ کی طرح مشہور نہ ہوسکے تو کم از کم ہندوستان کے آئندہ وائسرائے کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی مناسبت ضرور ہوجائے۔ اس سے بحث نہیں کہ "ٹن" کا اضافہ بہتر ہے یا "ڈن" کا۔ مطلب صرف اس بلے تکے "ٹن" سے ہے جس میں انگریزی لہجہ کی ٹھنا ٹھن شامل ہوا اور پچاس سو برس گذرنے کے بعد انگریز تو یہ کہا کریں کہ ہندوستان میں سب سے پہلا ایسا شہر جو ڈیوک آف ولنگٹن نے آباد کیا وہ کاٹھنگٹن تھا اور مسلمان اس پر جھینپ کر ... کہ مالویہ جی کی "سنگھٹن" کے جواب میں جو سب سے اول اکھاڑہ قائم ہوا اس کا نام کاٹھنگٹن رکھا گیا۔

لاحول ولا قوۃ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ کہنا یہ تھا کہ رویت ہلال کی تصدیق کے لئے ایک آثارِ قدیمہ کا ڈیپوٹیشن کاٹھ روانہ کیا گیا اور افطارِ صوم کو اس کی واپسی تک ملتوی رکھا گیا۔ ڈیپوٹیشن نے وہاں پہونچ کر خوب تحقیق کی خوب شیر کے ذائقے لئے، خوب لپٹ لپٹ کر عیدیں ملیں اور "نامی برادران" کی کوششوں کو ہر طرح مکمل و کامیاب پایا۔ اب یہ اور بات ہے کہ چاند دیکھنے والوں میں سب سے پیش پیش جو گواہ تھے اُن میں سن رسیدہ صرف ایک جاٹ تھا اور ایک بقّال۔

بالآخر ڈیپوٹیشن واپس ہوا۔ شہر میں منادی ہوگئی کہ روزے افطار کر لئے جائیں (حالانکہ بعض حضرات کو ہم نے ڈیپوٹیشن کی واپسی سے قبل ہی سگریٹ کے دھوئیں اُڑاتے ہوئے دیکھ لیا تھا)

اب ڈیڑھ بجا تھا۔

مُلّا یٰسین اپنی کارگذاری پر بہت خوش تھے اور سمجھتے تھے گویا چاند انہوں نے ہی نکلوایا ہے ورنہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ رمضان شریف اس سال آسانی سے تشریف لیجاتے۔ ہم نے انہیں مبارکباد دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ——"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

مبارکباد کا جواب تو انہوں نے عید کی تہنیت سمجھ کر انہیں الفاظ میں دے دیا لیکن بعد کا جملہ چونکہ اُن کی استعداد قابلیت سے ذرا باہر تھا اس لئے اُس پر صرف ایک بے معنی ساخندہ زنکر کہنے لگے —— "اللہ کا شکر ہے" غالباً وہ میرے جملہ کو مزاج پُرسی کا مترادف سمجھے۔

اسی طرح گذشتہ عید نامی برادران کی عنایت سے ہمیں قریب قریب اہلِ عید کے برابر پڑ گئی۔

"کوئی"

لوٹ: مضمون ہذا میں نام اور مقامات خیالی ہیں۔

ہلالِ عید

عید نمبر کیلئے

از جناب موج صاحب لودھیانوی

(۱)

ہے عید کا پیغام بر — افق فلک پہ جلوہ گر

لو آگیا۔ وہ آگیا۔

باناز و انداز و ادا

پہنے ہوئے نوری قبا

لایا نوید جانفزا

وہ جسکو کہتے ہیں سبھی | اہلِ زمیں کا میہماں

اللہ اکبر ہے یہی | مسلم ترا قومی نشاں

کیا صاف آتا ہے نظر

افق فلک پہ جلوہ گر — وہ عید کا پیغام بر

---

(۲)

وہ پیاری صورت پر ضیا — وہ دلربایانہ ادا

بیساختہ۔ بیساختہ

اُٹھے ہیں ہر دستِ دعا

نکلے ہے منہ سے مرحبا

صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

ہر آنکھ ڈھونڈے ہے اسے | ہر دل کو شوقِ دید ہے

شام ہلالِ عید ہے | وابستہ صبحِ عید ہے

وہ مظہرِ نورِ خدا

وہ پیاری صورت پر ضیا — وہ دلربایانہ ادا

---

(۳)

آئی ہے اُسکے سنگیاں — گھر گھر رچی ہیں شادیاں

فرطِ مسرت سے بشر

کرتے ہیں قربان دل جگر

کس پر؟ ہلالِ عید پر

کس پر؟ جمالِ عید پر

ہر اک پہ طاری ہے خوشی | ناشاد بھی دلشاد ہے

ہے نور آج ہر سمت ہی | شورِ مبارکباد ہے

کیفیت افزا ہے سماں

گھر گھر رچی ہیں شادیاں — آئی ہے اُسکے سنگیاں

معرکۂ تکرار

از جناب میر نذر علی صاحب درد کاکوروی!

الفاظ زبان اور اسکی شاعری جیسی کچھ دلاویز و دلچسپ و شیریں ہے تمام سخن فہم حضرات بخوبی واقف ہیں خصوصًا ایسی غزل جس میں الفاظ کی معنی خیز تکرار ہو لف و نشر مرتب ہو صنائع لفظی بھی ہوں تو وہ اور بھی مزہ دیجاتی ہے۔

ذیل میں ہم چند اساتذہ کی غزلیں لکھتے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ جن میں حسب ذیل حضرات نے زورِ قلم دکھایا ہے

حضرت نظامی ۔ حضرت خسرو ۔ حضرت سلطان علی شہید۔

ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور حضرات بھی ایسے ہوں جنہوں نے اس طرز میں کچھ خامہ فرسائی کی ہو۔ لیکن مجھے صرف مذکورۃ الصدر حضرات کی غزلیں ملی ہیں۔ اس ایجاد کا سہرا غالبًا نظامی کے سر ہے۔

ہم پہلے نظامی کی غزل لکھتے ہیں۔

شدم بر صورتِ عاشق کہ ہر مہ کند غوغا
چہ صورت، صورتِ دلبر، چہ دلبر، دلبرِ زیبا

بگرید چشمِ من ہر دم ز شبنم چشمہ گردد
چہ چشمہ، چشمۂ لولو، چہ لولو، لولوِ لالا

اگر در باغ بنشیند مرا در غلغل بر انگیزد
چہ غلغل، غلغلِ بلبل، چہ بلبل، بلبلِ شیدا

چہ باشد یا کسی دارم غمم را ہمدمے باشد
چہ ہمدم، ہمدمِ محرم، چہ محرم، محرمِ دنیا

نگارِ من بصد خوبی ز زلفش نکہتے دارد
چہ نکہت، نکہتِ عنبر، چہ عنبر، عنبرِ سارا

مرا در ہجر جاناں نظامی شربتے باید
چہ شربت، شربتِ قابل، چہ قابل، قابلِ جانا

دیکھئے غزل کسقدر مرصع ہے ہر لفظ ہر فقرہ اپنی روانی کی خود داد دے رہا ہے خصوصًا یہ دو شعر غزل کی جان ہیں۔

اگر در بیش بنیم ز شبنم چشمہ گردد　　چہ چشمہ، چشمۂ لولو، چہ لولو، لولوِ لالا

اور پھر یہ شعر

نگارِ من بصد خوبی ز زلفش نکہتے دارد　　چہ نکہت، نکہتِ عنبر، چہ عنبر، عنبرِ سارا

مگر شہید لکھنوی نے اسی مضمون کو کسی قدر بلند تر پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

بقول علامہ آزاد بلگرامی ؎

شاہد معنی کہ باشد جامۂ لفظش کہن　　نکتہ دانے گر بر تازہ پوشاند خوش است

شہید نے جس مضمون کو نیا لباس پہنایا ہے وہ یہ ہے ؎

صبا آورد بمن ہدیہ، چہ ہدیہ، ہدیۂ نکہت
چہ نکہت، نکہتِ کاکل، چہ کاکل، کاکلِ پیچاں

نظامی کے بعد غالبًا اس رنگ میں خسرو نے قلم اٹھایا ہے۔ اب ذرا ان کی غزل سنئے۔

توئی در ملکِ جاں خسرو، چہ خسرو، خسروِ خوباں
بود کنہا قدرت فتنہ، چہ فتنہ، فتنۂ دوراں

جمالت مجمعے باشد، چہ مجمع، مجمعِ خوبی
چہ خوبی، خوبیِ یوسف، چہ یوسف، یوسفِ کنعاں

بسر زلفت یکے ہندو، چہ ہندو، ہندوِ کافر
چہ کافر، کافرِ رہزن، چہ رہزن، رہزنِ ایماں

چو خسرو بندہ باشد، چہ بندہ، بندۂ عاشق
چہ عاشق، عاشقِ بیدل، چہ بیدل، بیدلِ حیراں

نظامی کے یہاں بعض جگہ غیر مانوس الفاظ ہیں خسرو کے یہاں کوئی نہیں۔ خسرو نے اگرچہ قافیہ بدل کے غزل لکھی ہے۔ وہی الفاظ ہیں، وہی صنعت ہے، اسی مضمون کی تکرار ہے مگر الفاظ کی الٹ پھیر اور نئی بندش نے حسنِ کلام کو دوبالا کر دیا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موتی جڑے ہوئے ہیں۔ ایک ایک لفظ ایک ایک فقرہ ورد بنا ہوا ہے جس کو خاتمِ کلام سے کسی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا۔

خسرو کے بعد شہید لکھنوی نے انہیں مضامین کو نظم کیا ہے اور اس انداز سے نظم کیا ہے کہ ایک ایک لفظ کی بندش جوش اور اپنی معنوی نزاکت سے لبریز ہے۔ شہید۔ ہیں ہندی نژاد مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ایرانی بول رہا ہے یہی وجہ ہے کہ زبان سے بے اختیار

و کلام اِلٰہی ہے جس پر کا مطلب ہے ؎

تو بی درملک جاں خسرو، چہ خسرو خسرو خوباں ٭ بود تخلی قدت فتنہ، چہ فتنہ فتنۂ دوراں

اس میں بھی اسی طرح فتنہ برپا کیا ہے۔

قد دلجوئے تو فتنہ، چہ فتنہ فتنۂ محشر ٭ چہ محشر محشر آفت، چہ آفت آفتِ دوراں

اس بحر کا وہ شعر جس کے دوسرے مصرعے کو شہید نے طرح کا مصرعہ قرار دیا ہے یہ ہے۔

بیارت مجمعے باشد، چہ مجمع مجمعِ خوبی ٭ چہ خوبی خوبیٔ یوسف، چہ یوسف یوسفِ کنعاں

شہید نے اس پر اس طرح گرہ لگائی ہے۔

بہ حسن تو معدن، چہ معدن معدنِ خوبی ٭ چہ خوبی خوبیٔ یوسف، چہ یوسف یوسفِ کنعاں

شہبا میٹھوی کی پوری غزل یہ ہے ؎

تو زلف تو بود سنبل، چہ سنبل سنبلِ بحیاں ٭ قدِ تو دوحۂ جنت، چہ جنت جنتِ رضواں

بہ حسن تو معدن، چہ معدن معدنِ خوبی ٭ چہ خوبی خوبیٔ یوسف، چہ یوسف یوسفِ کنعاں

بچشمت گردشِ ساغر، چہ ساغر ساغرِ بادہ ٭ چہ بادہ بادۂ مستی، چہ مستی مستیٔ رنداں

قدِ دلجوئے تو فتنہ، چہ فتنہ فتنۂ محشر ٭ چہ محشر محشرِ آفت، چہ آفت آفتِ دوراں

خدِ تو موجبِ حیرت، چہ حیرت حیرتِ دیدہ ٭ چہ دیدہ دیدۂ اختر، چہ اختر اخترِ تاباں

بدندانت ہمہ مطلب، چہ مطلب مطلبِ قیمت ٭ چہ قیمت قیمتِ گوہر، چہ گوہر گوہرِ غلطاں

شکست از حسن تو توبہ، چہ توبہ توبۂ زاہد ٭ چہ زاہد زاہدِ کامل، چہ کامل کاملِ الایماں

صبا آرد ز من ہدیہ، چہ ہدیہ ہدیۂ نکہت ٭ چہ نکہت نکہتِ کاکل، چہ کاکل کاکلِ پیچاں

شہبا آمد بایں عزت، چہ عزت عزتِ معنی ٭ چہ معنی معنیٔ رتبہ، چہ رتبہ رتبۂ سبحاں

کریما (مطبوعہ مطبع ابوالعلائی حیدرآباد واقع گلزار حوض) کے اختتام پر بھی اسی طرز کی ایک غزل درج ہے۔ یہ غزل لطفی شاعر کی ہے۔ اس میں خواہ مخواہ بھی الفاظ کی ابتدا میں ایک الف بڑھا کر بحر کا رکن پورا کیا گیا ہے مثلاً لفظ مونس کو دوبار لانا مقصود ہے۔ تو پہلے مونس پر الف بڑھا کر لائے ہیں پھر بغیر الف کے۔

بعض الفاظ اگرچہ الف اور بغیر الف دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں جیسے طاعت۔ اور۔ اطاعت۔ قامت۔ اور۔ اقامت۔ مگر غنچہ کو "اغنچہ"۔ اور سنبل کو "اسنبل"۔ حالت کو "احالت"۔ چاکر کو "اچاکر"۔ آفت کو "اآفت"۔ ساقی کو "اساقی" استعمال کرنا ذوقِ سلیم کے منافی ہے۔

اس بھرتی سے صنائع لفظی اور بندش الفاظ کا حسن بھی باقی نہیں رہتا۔ لطفی کی پوری غزل یہ ہے۔

نمی بردند صبر دل، امونس مونسِ دلبر ٭ چہ مونس مونسِ جاناں، چہ دلبر دلبرِ شکر

دلم بردند جانم ہم، اقامت قامتِ زیبا ٭ چہ قامت قامتِ رعنا، چہ عارض عارضِ انور

بود چشم و دہانِ او، انرگس نرگسِ چشمہ ٭ چہ نرگس نرگسِ شہلا، چہ چشمہ چشمۂ کوثر

دہان و چشم آں سرو، اغنچہ غنچۂ جادو ٭ چہ غنچہ غنچۂ گویا، چہ جادو جادوئے کافر

خط و خالِ نگارینش، اسنبل سنبلِ نقطہ ٭ چہ سنبل سنبلِ مشکیں، چہ نقطہ نقطۂ عنبر

ز دورِ ہجر او دارم، احالت حالتِ خاطر ٭ چہ حالت حالتِ غمگیں، چہ خاطر خاطرِ ابتر

ترا مہرو مہ آمد، از جاں اچاکر چاکرِ بندہ ٭ چہ چاکر چاکرِ دیریں، چہ بندہ بندۂ کمتر

ز زلفت فتنہ شد پیدا، اآفت آفتِ فتنہ ٭ چہ آفت آفتِ جاں، چہ فتنہ فتنۂ بے مہر

ز حق لطفی ہمی خواہد، اساقی ساقیٔ بادہ ٭ چہ ساقی ساقیٔ کوثر، چہ بادہ بادۂ احمر

عارف ہوا اخاکسار نے اسی رنگ میں دو غزلیں لکھی تھیں۔ موقع کے لحاظ سے غالباً ان دونوں غزلوں کا یہاں لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

بتے دارم بہی وش، خوش ادائے، لالہ رو، دلبر ٭ چہ دلبر دلبرِ عاشق، چہ عاشق عاشقِ مضطر

جبینش رشک مہ، بینی بریں طور دلم جلوہ ٭ چہ جلوہ جلوۂ عارض، چہ عارض عارضِ انور

بیا اندر گلستانے شنو از گوش دل نغمہ ٭ چہ نغمہ نغمۂ بلبل، چہ بلبل بلبلِ خوشتر

بنوشم ایں ساغر دلش پُر از بیہوشی و مستی ٭ چہ مستی مستیٔ بادہ، چہ بادہ بادۂ احمر

برائے تشنگانِ حشر لطفِ خالق بود رحمت ٭ چہ رحمت رحمتِ ساقی، چہ ساقی ساقیٔ کوثر

بیالے درد دل بنگر کہ شد خاکِ درِ حضرت ٭ چہ حضرت حضرتِ حیدر، چہ حیدر حیدرِ صفدر

لبِ لعلِ تو چوں غنچہ، چہ غنچہ غنچۂ خنداں ٭ دو چشمِ سرمگیں خنجر، چہ خنجر خنجرِ بُرّاں

جمالِ یار می بینم بہر شکلے بہر صورت ٭ چہ صورت صورتِ معنی، چہ معنی معنیٔ پنہاں

چمن حسنِ تو گلشن، چہ گلشن گلشنِ جنت ٭ رخِ عالم روئے تو مصحف، چہ مصحف مصحفِ یزداں

مرنج اے گلبدن از من منم گلچینِ ایں گلشن ٭ چہ گلشن گلشنِ عارض، چہ عارض عارضِ خوباں

ز عکسِ تابشِ آں مہرِ انور گشتہ ام ذرہ ٭ چہ ذرہ ذرۂ اختر، چہ اختر اخترِ تاباں

برائے عاشقِ بیدل بود چشمِ سیہ جادو ٭ چہ جادو جادوئے کافر، چہ کافر کافرِ ایماں

عطا کن دردرا ساغر، چہ ساغر ساغرِ بادہ ٭ چہ بادہ بادۂ دلکش، چہ دلکش دلکشِ مستاں

ناچیز درد کاکوردی

مہ شوال

نور صاحب لودھیانوی

عید نمبر کیلئے

دِکھا۔ وہ عارضِ زیبا و بیمثال۔ اُبھر ‖ اُبھر خدا کے لئے۔ حسنِ لازوال۔ اُبھر
دِکھا۔ ہمیں بھی ذرا شانِ ذوالجلال۔ اُبھر ‖ اُبھر۔ اُبھر۔ تو اُبھر بھی۔ مہِ شوال۔ اُبھر

ہر ایک دیدۂ مضطر نثار ہے تجھ پر!
ہماری عید کا دارومدار ہے تجھ پر!

نکال گوشۂ ابرو۔ شفق کی چلمن سے ‖ ہمیں بھی نور عطا کر تو روئے روشن سے
تیری ہی دید کو نکلے ہیں اپنے مسکن سے ‖ ہے انتظار ہمیں تیرا کئی دن سے

تیری تلاش میں اُٹھتی ہیں بار بار آنکھیں
دل و جگر ہیں جو مضطر۔ تو بیقرار آنکھیں

خوشی و عیش کا پیغام ہے تیری صورت ‖ سکونِ قلب۔ دل آرام ہے تیری صورت
قسم خدا کی الف لام ہے تیری صورت ‖ بناتی بندۂ بے دام ہے تیری صورت

"تو عین۔ عید ہے۔ یا عین عید کی صورت"
"ہو عید۔ دیکھیں جو تجھ سے سعید کی صورت"

زوال بھی ہے تیرے۔ اسلئے کمال بھی ہے ‖ تو پیر کہنہ بھی ہے اور خوردسال بھی ہے
نہاں یہ تجھ میں اک آغاز بھی مآل بھی ہے ‖ تو زلف و گیسو سا اک عقدۂ محال بھی ہے

اُبھر کے آج اُفق سے پیام دیتا جا
پیامِ عید کے بدلے سلام لیتا جا

شہدائے محبت!

از جناب ایم ۔ سلیم ۔ نیدوروی

ایلین ۔ مجسمۂ حُسن، پیکرِ رعنائی، دوشیزگانِ یونان میں سب سے زیادہ حسین اور ہزاروں میں ایک تھی۔ حُسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حُسنِ سیرت میں بھی شہرۂ آفاق تھی۔ اخلاق، انکسار، طبع، خدمتِ خلق، اور حصولِ علم کے شوق نے اُسے ارضی حور بنا رکھا تھا۔ ہر کوئی جسے ایک بار بھی اُس سے گفتگو کا موقع ملتا اُس کا گرویدہ ہو جاتا۔ لوگ اُسے "بنتِ مریم" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اور بہت سے "معصوم دیوی" کہتے تھے۔ بیرحم فلک کے ہاتھوں آغوشِ مادر سے وہ کم سنی ہی میں جدا کر دی گئی تھی۔ اور اُس کی زندگی کا سہارا صرف اُس کا ضعیف باپ تھا۔ لیکن چرخ کج رفتار نے اس معاملہ میں بھی ایلین کو محروم مسرت رکھا۔ جتنی ہی وہ خلیق اور ملنسار تھی۔ اتنا ہی اُس کا باپ تنہائی پسند اور دولت کا دلدادہ تھا۔ اُس نے خود اپنی ذاتی کوششوں سے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ اس وقت اُس کا شمار ملک کے دولتمند اور متمول لوگوں میں تھا۔ اُس کو دنیا میں اگر کسی چیز سے اُلفت تھی تو صرف دولت سے، اور اسی کو اُس نے اپنا مقصدِ حیات قرار دے رکھا تھا۔

جارج شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ گو امتدادِ زمانہ نے اُسکی آبائی ثروت و عظمت کا خاتمہ کر دیا تھا تاہم اُس کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی نہیں ہوئی تھی اور وہ بدستور شاہانہ وقار و عظمت کے ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ اُس میں غرور و نخوت نام کو نہ تھا۔ وہ اپنے سے کم درجہ لوگوں کے ساتھ انتہائی خلوص اور محبت سے پیش آتا۔ ان کی ہر خدمت کے لئے تیار رہتا۔ اور اکثر و بیشتر فرصت کے اوقات غرباء کی تیمارداری اور اُن کی مدد کرنے میں صرف کرتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں جارج اپنی خداداد قابلیت اور ہمدردی کے لئے بیحد مشہور ہو گیا۔ ہر چھوٹا بڑا اُس کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتا۔ اور اُس سے ملنا باعثِ فخر سمجھتا۔

جارج ابھی عمر کی بیسویں بہار سے گذر رہا تھا کہ ایک دن اتفاقیہ اُس کی ملاقات ایلین سے ہو گئی۔ ایلین نے اپنے شباب کی پندرہویں منزل میں قدم رکھا تھا۔ اس کا مکان جارج کے مکان سے قریب ہی واقع تھا۔ ایک بار ملاقات ہو جانے کے بعد دونوں اکثر اوقات فرصت کے لمحات ایک ساتھ گذارتے۔ کبھی کسی مسئلہ پر بحث و تمحیص ہوتی اور کبھی ایلین ۔ جارج کی خداداد ذہانت اور اُس کی ہمدردی کی توصیف میں گھنٹوں صرف کر دیتی۔ جارج بھی ایلین کی شیریں گفتاری، اُسکی قابلیت اور حُسنِ طبع کی تعریف کرتا۔ ایلین کسی خاص مسئلہ پر تقریر کرتی ہوتی تو جارج خاموش ہمہ تن گوش بنا اُس کی اداؤں اور طرزِ تکلم کی داد دیا کرتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے بغیر تلخ نظر آنے لگی۔

وقت کی خوبی کہئے یا زمانہ کی گردش کہ انہی ایام میں جب جارج اور ایلین ایک جان دو قالب ہو رہے تھے۔ اُن کے والدین کے درمیان کسی مسئلہ پر ناچاقی ہو گئی۔ اور معاملہ اس حد تک پہونچا کہ ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہو گیا۔ جارج کے والدین کو اپنی شرافت اور نجابت پر انتہائی ناز تھا تو ایلین کے والد کو اپنی دولت و ثروت پر۔ بالآخر باہمی رنجش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایلین کے والد نے جارج کو اپنے مکان پر آنے کی ممانعت کر دی۔ اور ایلین کو سختی سے اُس سے علیحدہ رہنے کی تاکید کی۔ چونکہ وہ اس محبت سے بے خبر نہ تھا لہذا دو محبت کے پجاریوں کے درمیان آئندہ خط و کتابت کا سلسلہ

بند کرنے اور ہمیشہ کے لئے اُن کی باقیماندہ آرزوؤں کا خاتمہ کرنے کی اُس نے بہترین ترکیب یہ سوچی کہ ایک خوبصورت، دولتمند، باعزت، اور علم و اخلاق سے آراستہ نوجوان کو اپنی مرضی سے ایلین کا شوہر منتخب کرلیا اور اسی درجہ عجلت سے کام لیا کہ بلا اُس کی مرضی اور اطلاع کے عقد کیلئے دن تاریخ بھی مقرر کردی۔

اس خبر کو سنتے ہی ایلین کی نظروں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس معاملہ میں زبان کھولے۔ لیکن والد کی سخت مزاجی اور ضد سے اس انتخاب پر حرف گیری کرنے کی جرأت نہ کرسکی وہ جانتی تھی کہ نظام قدرت بدل جائے لیکن والد اپنی ہٹ سے باز نہ آئیں گے۔ چنانچہ انتہائی پریشانی کے باوجود اُس نے دامنِ صبر و تحمل کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور خاموش بیٹھی اپنی گردشِ تقدیر کا تماشہ دیکھتی رہی۔ بس خاموشی کو اس کے والد نے اظہار اقرار پر محمول کیا اور آناً فاناً تمام شہر میں دعوتی رقعے تقسیم کرا دیئے۔

اس خبر وحشت اثر نے جارج کے جذبات میں ایک ہنگامۂ عظیم برپا کردیا۔ اُس کی حالت غیر اور دماغ مختل ہوگیا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا لیکن دماغ جواب دیجاتا۔ تمام دن وہ اسی پریشانی اور خلجان میں اِدھر اُدھر گشت لگاتا رہا۔ لیکن کسیطرح دماغ کو سکون نہ ہوا۔ آخرکار انتہائی یاس و اُمید کے مشترکہ جذبہ کے ساتھ اس نے چند سطور ایلین کے بارگاہِ حسن میں لکھ کر بھیجدیں :-

"میری رُوح پرور ایلین کا خیال" جو کچھ عرصہ سے میرے جسم کی رگ رگ میں سرایت کرکے میری انتہائی خوشی اور مسرت کا واحد ذریعہ تھا۔ آج میرے لئے سب سے زیادہ جانکاہ اور زہرہ گداز ثابت ہورہا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس ناپائدار زندگی کے بقیہ چند لمحے کس طرح اس دنیائے فانی میں بسر ہوسکیں گے۔ میں نے آئندہ زندگی پر بہت کچھ غور کرنے کی کوشش کی۔ مگر دماغ کوئی صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر رہا۔ اے میری حیات فانی کی واحد مسرت! میری اچھی ایلین! تو ہی بتا کہ تیرا یہ ناکارہ پرستار اس دنیائے ہنگامہ خیز میں اپنی مرکزِ محبت کو دوسرے کی آغوشِ تمنا میں دیکھنے کے لئے کس طرح زندہ رہے۔ سرسبز و شاداب مرغزار، پھولوں سے بھرے ہوئے چمنستان، چشمۂ آب سے سیراب کیاریاں جہاں ہمارے گذشتہ زندگی کے بیشتر حصے باہمی محبت و خلوص کی گفتگو اور پرستاری میں صرف ہوئے ہیں آج میرے لئے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہورہے ہیں۔ یہاں کا پتہ پتہ جو کل تک درسِ محبت دے رہا تھا۔ آج بے ثباتیِ دنیا کا سبق پڑھا رہا ہے یہاں تک کہ زندگی خود میرے لئے اب ایک وبال معلوم ہوتی ہے۔ اے باغِ جہان کی معصوم کلی! میری اچھی ایلین، خدا کرے تم ابدالاباد تک دنیا کے آغوشِ مسرت میں کھیلتی اور اس کی بہاریں لوٹتی رہو؛

ع، بہار ہو کے رہو شاد جس چمن میں رہو۔

لیکن اپنے معصوم دل سے مجھ جیسی ناشاد و نامراد ہستی کا خیال دُور کردو۔

تمہارا جارج"

یہ خط اُسی شام کو ایلین کے پاس پہونچا دیا گیا۔ خط پڑھتے ہی وہ بیہوش ہوگئی۔ اور تمام شب اپنے کمرہ میں تنہا پڑی رہی۔ نسیم سحر کے ٹھنڈے جھونکوں نے اُسے چونکا دیا۔ ابھی وہ اچھی طرح سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ جارج کے ملازمین کی آمد و رفت اور اس کے والد سے طرح طرح کے استفسار نے اسکا ماتھا ٹھنکایا۔ یہ بجلی کی طرح تیزی سے اُٹھ کر گرتی پڑتی اپنے والد کے پاس پہونچی جہاں یہ معلوم کر کے کہ جارج نصف شب سے لاپتہ ہوگیا ہے۔ بس یہ سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ ان تمام معاملات کی ذمہ دار اور ملزم اپنے کو گردان کر ایلین دل ہی دل میں انتہائی پیچ و تاب کھا رہی تھی کہ اُس نے والد کے انتخاب پر سکوت کیوں اختیار کیا۔ اور حرف انکار زبان پہ نہ لائی ۔۔۔ اعلان شادی کر ہی جارج کی موت کا مرادف ثابت ہوئی

تھی۔ اور اب اُس نے تہیہ کرلیا کہ ایسی بربادکن شادی کے بجائے وہ والد کی سختی، ناخوشی اور ملامت سب کچھ برداشت کرلے گی۔

جارج سے ہمیشہ کے لئے نجات ملتے دیکھ والد نے بھی ایلین سے الگاؤ کو ہمیشہ نہ دے کر اسی طرح سمجھوتہ کرلیا کہ بلا تکلف کل اخراجات و مصارف دیکر ہونے والے رشتہ سے معذرت مانگ لی۔ اور اسی طرح پر اس شادی کا جو بجائے محبت کے محض تجارتی اصول پر مبنی تھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا؛

ایلین کا اب کل وقت عبادت میں صرف ہونے لگا۔ اور اس نے تہیہ کرلیا کہ باقیماندہ زندگی کسی خانقاہ میں داخل ہوکر خدا کی یاد میں صرف کردے گی۔ اس فیصلہ سے اُس کے دولت کے پجاری باپ کو کچھ زیادہ رنج نہیں پہونچا۔ بلکہ وہ خوش تھا کہ اس طرح پر اس کی دولت اور زیادہ بچ سکے گی۔ چنانچہ وہ قریب کے ایک خانقاہ میں جو عورتوں کے لئے مخصوص تھی ایلین کو داخلہ کے لئے بھیج دیا۔ ایلین کی عمر اس وقت بیس سال کی تھی۔ اول تو وہ یونہی کمالِ خوبصورت تھی اسپر عبادت کی ضیاء پاشی نے اور جِلا کردی۔ رگ رگ سے رنگینئ شباب ٹپکنے لگا۔

اس خانقاہ کا ایک راہب اعلیٰ انتہائی عبادت گذار اور راست باز تھا جس کی رحمدلی، فیاضی، عبادت گذاری اور ہمدردی تمام یونان میں ضرب المثل ہورہی تھی۔ رومہ کا دستور ہے کہ جو شخص جتنا ہی زیادہ پریشان ہوتا ہے وہ اُتنے ہی بڑے راہب کی بارگاہِ نیاز میں پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کلیہ کے مطابق ایلین اس مقدس ہستی کی خدمت میں پیش کی گئی۔

(۲)

جارج جو مکان سے غائب ہوا تو انتہائی پریشانی اور بے چینی کی حالت میں سیدھا اسی خانقاہ میں آپہونچا۔ اس کا مقدس راہب بہت ضعیف اور خداترس بزرگ تھا۔ اُس نے جارج کی داستانِ محبت بڑی ہمدردی سے سُنی اور اُس سے بہت پیار کے ساتھ پیش آیا۔ اُس نے جارج کو اپنا خاص شاگرد بنالیا اور اپنی تمامتر توجہ اُسی کی اصلاح پر صرف کرنے لگا۔ جارج شروع سے ہی ایک جوان صالح تھا۔ اُس پر ایسی مصیبت اور پریشانی کی حالت میں "راہب اعلیٰ" جیسی خلیق بزرگ کی ناصحانہ اور پدرانہ شفقت اور عبادت گذاری کی ترغیب نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ خلیفہ کے فرائض انجام دینے لگا۔ جارج کے اس عہدہ پر فائز ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مقدس باپ کا انتقال ہوگیا۔ اور جارج اپنی کسرنفسی، اور عبادت گذاری کی خصوصیات کی بناپر اس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ جارج کی قابلیت اور اخلاق کا یہ عالم تھا کہ جو اس سے ایک بار گفتگو کرلیتا تمام عمر کے لئے اس کا گرویدہ بن جاتا چنانچہ یہی زمانہ تھا جب ایلین اپنی کتاب زندگی کی ورق گردانی کیلئے منتخب کی گئی۔ جارج نے دور رہبانیت شروع کرنے کے ساتھ ہی اپنا قدیم نام بھی جو ناکامئ محبت کی یاد دلانے کا واحد ذریعہ تھا تبدیل کرلیا تھا۔ اوراب وہ مقدس "فرانسس" کے نام سے مشہور تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، منڈے ہوئے سر اور راہبانہ پوشش ایکے قدیمی وجود کی کچھ اس طرح پر دہ پوشی تھی کہ اُس کو دیکھ کر جارج کا شبہ کرنا غیرممکن تھا۔

ایک دن جبکہ اعترافِ معاصی کے مقدس کمرہ میں بند وہ راہبوں کے بیان کو سُنکر اُنہیں نجات کا مژدہ سنا رہا تھا۔ ایلین نے دوزانو ہوکر باچشم پُرنم اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنی قلبی وروحی کیفیت کو عریاں کیا۔ اپنی روداد زندگی کو دہراتے ہوئے جو تمام وکمال معصومیت سے پُر اور گناہ کی کثافتوں سے پاک و مبرا تھی بے تحاشا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اس دور زندگی پر پہونچکر جس میں سامع خود سب سے زیادہ شریک تھا۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہنا شروع کیا: "آہ! میرا طرزِ عمل!! مجھے ڈر ہے کہیں ایک ایسے معصوم اور نوجوان ہستی کی موت کا باعث نہ ہوا ہو جس کا بجز اس کے کوئی قصور نہ تھا کہ وہ مجھ جیسی ناکارہ و بدقسمت ہستی سے محبت کرتا تھا خدا ہی علیم ہے کہ جب تک وہ زندہ رہا مجھ کو کس درجہ عزیز تھا۔ وہ میری مسرتوں کا مرکز [illegible] میں نہیں کہہ سکتی۔ اُس کی یاد، اُس کا خیال [illegible]

المناک اور مایوس کن ہیں۔ یہ محض اُسی کی یاد اور اسکا غم فراق ہے جس نے آج مجھے دنیا سے الگ تھلگ کر کے یہاں پہونچا دیا ہے۔ کاش وہ زندہ ہو، اور میں اُس کی یاد میں تمام عمر بسر کر سکوں۔ اتنا کہنے پائی تھی کہ اُس کی آواز حلق میں آکر رُک گئی۔ اور آنکھوں سے دو چشمے جاری ہو گئے۔ ایلین کا ایک ایک لفظ 'راہب اعلیٰ' کے دل میں نشتر کی طرح پیوست ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے سیلاب اشک رواں ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سکوت مطلق طاری رہا۔ بالآخر پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے 'راہب اعلیٰ' نے آگے بیان کرنے کو کہا۔ دل گرفتہ ایلین نے تعمیل ارشاد میں زبان کھولی ہی تھی کہ صبر و تحمل کا لبریز پیمانہ چھلک پڑا۔ اور اُس کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل گئی۔ یہ حالت دیکھ کر 'راہب اعلیٰ' سے بھی زیادہ ضبط نہ ہو سکا اور وہ بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ایلین نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا کہ اب میں نے معصوم جارج کی یاد میں عہد کر لیا ہے کہ باقیماندہ زندگی راہبہ کی حیثیت سے گذاروں۔ میں شروع میں جارج پر فدا ہوئی اور آخر دم تک جارج کی یاد میری زندگی کی رفیق رہے گی۔ فرانسس اس طرح اپنا بھولا ہوا نام سنکر اور ایلین کے ایثار و قربانی کو دیکھ کر زار زار رو رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جس ہستی کے متعلق آج سے برسوں پیشتر اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ دوسرے کی آغوش محبت کو کامران بنا رہی ہے آج اسی طرح غم ایثار کی پتلی بنی اسی کے سامنے اُس کی جوگن بنی کھڑی ہے۔

اچھی طرح رو لینے کے بعد جب 'راہب اعلیٰ' کو قدرے سکون ہوا تو اس نے بہت ہی محبت آمیز اور درد بھرے الفاظ میں کہنا شروع کیا "خداوند یسوع کی مقدس بیٹی! صبر کر، تیرے تمام گناہ بخشدیئے گئے۔ تجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس پر تو اس درجہ متاسف و نالاں ہو۔ تجھے خواہ مخواہ کوئی عہد کر کے اپنے شباب کی پر کیف بہاروں کو قربان نہیں کرنا چاہیئے" اس کے بعد فرانسس نے ایلین کو رخصت کی اجازت دی۔ اور دوسرے دن صبح آنے کی ہدایت کر دی تاکہ اُس مقدس زندگی کا کچھ درس دے سکے جس پر وہ آئندہ عمل پیرا ہونا چاہتی ہے۔ ایلین اجازت پاتے ہی روانہ ہو گئی۔ اور اگلی صبح کو پھر داستان غم کی تجدید کے لئے حاضر ہوئی۔

فرانسس نے اس عرصہ میں اپنے دل پر اچھی طرح قابو حاصل کر لیا تھا۔ اور آج نہایت خوبی کے ساتھ ایلین کو اُس کی آئندہ زندگی کی خوبیاں اور عبادت کی حلاوت و برکت کی تلقین کرتا رہا۔ اُس نے ایلین کے دل و دماغ سے وہ تمام شکوک اور خطرات جن کی باعث وہ انتہائی بے چین اور متفکر تھی دور کر دیئے۔ اور آئندہ کے لئے ڈھارس دیتے ہوئے، وعدہ کیا کہ جب وہ اپنے معصوم چہرہ پر 'رہبانیت' کی تقدس بار نقاب ڈال کر مقدس مریم کے نام پر اعتکاف میں داخل ہو جائے گی تو بھی وقتاً فوقتاً وہ رشد و ہدایات کے انوار و فیض سے بذریعہ تحریر اُس کے دل کو منور کرتا رہا کرے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ گو ہماری خانقاہ کے قوانین اور اصول اب آئندہ اس بات کی اجازت نہیں دینگے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ تاہم دنیا کی کثافتوں سے پاک معصوم ہستی! میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تو نہ صرف میری دعاؤں میں ہی شریک رہے گی بلکہ میری روح اور قلب کی گہرائیوں میں تو گھر کر چکی ہے۔ اور تا زیست اس عاجز و ناکارہ کی زندگی کی واحد یادگار رہیگی۔ اب جا۔ خاموشی و مسرت کے اُس راستہ پر گامزن ہو جا جس پر تو نے قدم اُٹھایا ہے۔ بہت جلد تو دیکھ لیگی کہ اس پاک زندگی میں روحانی و وجدانی مسرتیں کس درجہ سرعت کے ساتھ حاصل ہوتی ہیں جو دنیاوی زندگی کی کثافتوں میں رہ کر تمام عمر حاصل نہیں ہو سکتیں۔

ایلین مقدس فرانسس کی ہدایات سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ اس نے دوسرے ہی دن، اپنے عہد کو رہبانیت کا اصلی جامہ پہنا کر پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا۔ رسومات، داخلہ کے ختم ہوتے ہی وہ منتظمہ کے ہمراہ ایک کمرہ میں پہونچا دی گئی۔ جو اب اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ داخلہ کے دوسرے ہی دن منتظمہ نے ایک خط لاکر ایلین کو دیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"اُس زندگی کے اوّلیں مسرت اور تحائف کے موڑ پر جس میں اب تم داخل ہوچکی ہو میں تمہیں بتلانا چاہتا ہوں کہ جارج جس کی موت کا خیال تمہارے دل و دماغ پر غیر فانی نقش کی طرح ثبت ہوچکا ہے اور جو ہر وقت تمہارے خیال کا مرکز بنا رہتا ہے اب بھی حیات کی مسرتوں سے مالامال اور شگفتہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ پہلے حسن مجاز کا گرویدہ تھا اور اب حقیقت کا وہ "راہب اعلیٰ" جس کے روبرو تم نے اپنی کتاب زندگی کی پردرد کہانی سنائی ہے کبھی جارج تھا جس کے لئے تم اسقدر غمگین اور ملول ہو رہی ہو۔ مگر اب وہی تمہیں انتہائی خلوص اور محبت کے ساتھ خدائے لایزال کی بارگاہ میں عبادت کا سبق دے رہا ہے گو یہ صورت ہماری خواہشات کے خلاف ہو تاہم قدرت ہماری بہتری کے سامان بہم پہنچا رہی ہے ہماری ناکامیٔ محبت ہی ہماری ابدی کامرانی کا ذریعہ تکمیل بن رہی ہے تم اب بھی اپنے قدیم جارج کو مردہ تصور کرو۔ لیکن یقین رکھو کہ تمہیں ایک وہ ہستی ہو جس کے بغیر فرانسس کی دعائیں مکمل اور اس کا دل کبھی سکون پذیر نہیں ہوسکتا

فرانسس"

ایلن تحریر دیکھ کر ہی چونکی تھی لیکن اب جو اُس نے غور کیا تو "راہب اعلیٰ" کی آواز، "طرز گفتگو" اور سب پر مستزاد "اعتراف معاصی" کے وقت اُس کی گریہ وزاری اور ہمدردی صاف اس بات کی شاہد تھیں کہ وہ "راہب اعلیٰ" فرانسس کے روبرو نہیں بلکہ اپنے ہی دل کے "پجاری" اپنے ہردے کے دیوتا اپنے جوگ کے پیا اور اپنے ہی تن من کے مالک کے سامنے اُس نے داستان محبت سنائی۔ اس یقین کے ساتھ ہی دو نرگسی آنکھوں سے محبت کے پھول بکھرنے لگے۔

(۳)

خطوط جو مقدس فرانسس اور سِس ایلن نے ایک دوسری کو روانہ کئے تبرکاً آج بھی خانقاہ میں محفوظ ہیں۔ اور اکثر نوجوان ہستیوں کو تبرکاً پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تاکہ ان کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی میں انقلاب پیدا کرسکیں۔

تقریباً دس سال اسی طرح ایلن اور جارج ایک دوسرے سے انتہائی قریب لیکن بُعد جسمانی کی حالت میں مقدس باپ یسوع اور پاک ماں مریم کے نام پہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اتفاقیہ تمام خانقاہ میں وبائی بیماری کا حملہ ہوا۔ بہت سے راہب اس کی نظر ہو گئے۔ جارج بھی اس کی ہلاکت آفریں زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جب وہ بستر مرگ پر پڑا زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا اُس نے ایک خط اُسی حالت میں ایلن کو تحریر کیا۔

"میری اچھی ایلن! آج تمہارا جارج فی الحقیقت تم سے رخصت ہو رہا ہے۔ آج تک تم نے جو کچھ کیا اور جس طرح پاک محبت کی یادگار قائم کی اُس کی مثال آئندہ دور میں شاید ہی دنیا پیش کرسکیگی۔ گو ہم ایک دوسرے کی نظروں سے دور تھے۔ لیکن اطمینان تھا کہ ہم ایک ہی عمارت کی چھت کے نیچے مقیم ہیں۔ یہ جدائی محض عارضی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر سے امید ہے کہ ہماری روحیں بہت جلد اس طرح وصل ہوجائیں گی کہ ابدالآباد تک پھر کبھی جدا نہ ہونگی۔ تم صبر سے کام لینا اور مغفرت کی دعا کرنا۔

تمہارا قدیم جارج"

ادھر ایلن کی بھی حالت صبح سے غیر تھی۔ ڈاکٹر نبض پہ ہاتھ رکھے گھبرا رہا تھا۔ اور وہ بستر پہ بیہوش پڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد قدرے ہوش آیا۔ ڈاکٹر رخصت ہوگیا اور ایلن اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی حالت سنبھلتے دیکھ کر منتظمہ نے فرانسس کا خط پیش کردیا۔ اور کہا کہ یہ غالباً اُن کا آخری پیغام ہے۔ خط کو دیکھتے ہی ایلن کے چہرہ پر مسرت کھیلنے لگی۔ اُس نے نہایت اطمینان سے خط کو پڑھا اور منتظمہ کو بلا کر کہنے لگی۔ دیکھئے میں آپ کو وصیت کرتی ہوں کہ جس طرح ہم زندگی میں ایک دوسرے سے انتہائی قریب رہے ہیں اسی طرح میری خواہش ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہم ایک دوسرے

کے پہلو بہ پہلو دفن ہوں۔ مجھے اُمید نہیں ہے کہ میرا یہ پیغام جاآرج تک پہونچ سکیگا لیکن آپ کو اسکا ذمہ دار قرار دیتی ہوں اور بس۔ اتنا کہہ کر وہ لیٹی تو پھر ہمیشہ کے لئے خاموش تھی۔

ان کی پاک محبت اور نوجوان موت کو دیکھ کر منتظمہ کے بھی آنسو نکل پڑے اور آناً فاناً تمام خانقاہ میں کہرام مچ گیا۔ ایلین کی وصیت کے مطابق دونوں کی قبریں ایک ہی جگہ بنائی گئیں۔ اور آج بھی خانقاہ میں داخل ہونے والا ہر شخص سب سے پہلے انہیں قبروں کے کتبہ کو پڑھتا ہے۔

سلیمہ صدیقی
حیدرآباد

> مقدس راہب علی فرانسس اور راہبہ ایلین کی پاک روحیں یہاں مدفون ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی محبت کے پاک سائے میں گذار دی۔ اور آج بھی ایک دوسرے کے ہم پہلو ہیں۔

جواہر ریزے

(عربی سے ترجمہ کیا گیا)

شراب

صبح صادق نے رات کی سیاہی کو رخصت کردی ایسے سہانے وقت میں مجکو ایسی شراب دے کہ عقل و ہوش دونوں جلجائیں اور وہ شراب ایسی ہو کہ جس کی صفائی اور پاکیزگی سے شراب اور جام میں کوئی تمیز نہ رہے۔

خضاب

بالوں کی سفیدی میں عیب نمایاں ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نے خضاب لگا لیا۔
حالانکہ "خضاب" لگانا عیب کی بات ہے
میں نے دوست کی جدائی یا کسی کے عیب لگانے یا کسی کے لعنت ملامت کرنے کے خوف سے "خضاب" نہیں لگایا۔
بات یہ تھی کہ بالوں کی "سفیدی" کچھ ایسے بُرے طریقے سے نمایاں ہوئی کہ صرف سفیدی کو سزا دینے کے لئے میں نے اس کے چہرے پر "کالک" لگا دی

وعدے

اے میرے پاک رنگ دوستو!
تم میری طرف مکر و فریب کی نسبت نہ دو۔ کیونکہ مکر و فریب میری عادت نہیں ہے۔
میں اپنی گذشتہ عمر اور مسرتوں کی قسم کھاتا ہوں کہ میں وعدوں اور معاہدوں پر برقرار ہوں اور محبت کے معاہدے ٹوٹے نہیں ہیں۔

جب کسی سخی کی بخشش وعدے پر اُٹھا رکھی جاتی ہے اور اتفاقاً اس وعدے میں کچھ تاخیر ہوجاتی ہے تو ایسے وعدے اکثر مورد الزام سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے کالی کالی گھنگھور گھٹائیں آئیں بجلی چمکے اور پانی نہ برسے۔

میں جب اپنے محبوب سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنے وصل سے مسرور کر تو وہ انکار کرتا ہے۔ اور اس خیال سے کہ گویا میں فعل حرام کا خواستگار ہوں۔
اسکا یہ انکار اگر گناہ کے خیال سے ہے تو کوئی گناہ اس سے بڑھکر نہیں کہ ایک مسلمان تیغ مفارقت سے بے گناہ قتل ہو جائے۔

(از جناب
خیر بھوروی)

لطمہ!

از مولانا شاکر صاحب ناطقی کانپوری

عید کے چند لمحے مولانا محمد علی مرحوم کی یاد میں!

حشر کا آغاز تو شاکر نہیں انجام عید
صبح عاشورہ کا منظر بن گئی ہے شام عید

اے ہلال چرخ کیوں لایا ہے تو پیغام عید
آنکھ سے آنسو رواں ہوتے ہیں سن کر نام عید

اپنے لیڈر کا ہمارے دل پہ تازہ زخم ہے
مت ستا اب غمزدوں کو ای خیال خام عید

چھا رہا ہے ہر طرف یہ ظلمت غم کا اثر
ہر بیاض صبح پر غالب سواد شام عید

روح گھبراتی ہے تن میں اب خوشی کے نام سے
اے ہلال چرخ کیوں پھیلا رہا ہے دام عید

کیا بتائیں دل میں ہم رکھتے تھے کیا کیا ولولے
وائے قسمت خاک میں سب مل گیا آرام عید

چھپ گیا القدس میں ہندوستاں کا آفتاب
ہم نشیں کیا پوچھتا ہے ہم سے تو انجام عید

ساز عشرت سے ترانے سن رہا ہوں غم کے میں
میں ہوں اب ناکام فرصت ہے دل اب ناکام عید

مجلس ماتم بنی ہے اب میری بزم طرب
ہیں محرم کے سے دن اپنے لئے ایام عید

کس کے مرنے کا یہ غم سارے فضا پر ہے محیط
اب نہ صبح عید خوش منظر نہ دلکش شام عید

کچھ تجھے بھی ہے خبر آخر مرے غربت نصیب
دے رہا ہے ذرہ ذرہ ہند کا پیغام عید

بیقرار یاد ہے جو دل ہر سینے میں نہاں
ہے یہی بہتر پلٹ جا آج اے ہنگام عید

عیش و عشرت کے مناظر ہیں شاکر غم فزا
کردیا برباد دور چرخ نے ہنگام عید

رئیس الظرفا عبید زاکانی

جناب مولانا احسن صاحب ناظمی جالندھری
پروفیسر سینٹ … کالج

ہر قوم کی ادبیات اس کے ذوق ملّی کا مظہر اور اس کے احساسات قومی کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اور اگرچہ تغیرات عظیم۔ انقلابات روزگار اور اوضاع حیات اجتماعی ان میں تغیر و تبدیل پیدا کر دیتے ہیں تاہم روح ادبی کی قوت ممیزہ اس قوم کی ادبیات میں بخوبی نظر آتی ہے۔

ادبیات زبان فارسی بھی جو اہل ایران کے ذوق سلیم کی جلوہ گاہ ہیں عجیب لطافت و صفائی کی مالک ہیں اور یہ لطافت اس قوم کی ادبیات مختلفہ میں صفت ممیزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ ادبیات جو نژاد آریائی کی بھی حامل ہیں اور اختصاصات روح مشرق پر بھی شامل ہیں دانشمندان عالم کی توجہ کا مرکز بنیں اور قوم ایرانی کو اہل نظر کی نظر میں سربلند و سرافراز کر دیا۔

اگرچہ افسوس و حسرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرون وسطیٰ نے اہل ایران کو بعض بعض ذوق ادب کو ترقی دینے سے باز رکھا لیکن انہوں نے دوسرے شعبوں میں ایسے ایسے شاہکار پیش کئے کہ نہ صرف ان نقصانات کی جبر و تلافی ہو گئی بلکہ بعض انواع کی ادبیات فارسی کو اس درجہ بلند پایہ پر پہونچا دیا کہ کسی قوم و ملت نے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کی۔

ایک شعبۂ ادبیات جو بدقسمتی سے زیادہ مورد توجہ و مرکز اعتنا نہ سمجھا گیا "شعبۂ ظرافت" ہے جو لطیف ترین مضامین ادبی اور رفیق ترین نکتہ ہائے ذوقی کا سرمایہ دار ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم مولانا عبید زاکانی کے منتخب لطائف پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس استاد سخن نے کیسی مہارت کے ساتھ مضامین لطیف کو عبارات ظریف میں ادا کیا ہے اور کیسی قدرت کے ساتھ گوہر معنی پروئے ہیں۔

عبید زاکانی رئیس الظرفا اور سرآمد سخن سرایان ہزل گو تھا اس کا وطن قزوین کا قریۂ زاکان ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور شاعر ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی اور سلمان ساوجی کا ہم عصر ہے۔ نہایت فاضل و ادیب تھا۔ شاہ ابو اسحاق کے زمانہ میں شیراز میں تحصیل علوم کی تکمیل کے بعد قزوین واپس آیا اور منصب قضا پر فائز ہوا۔

عبید زاکانی کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس فکر ہزل و ہجا پر نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ حقائق تلخ کو شوخی و ظرافت کے ساتھ اہل زمانہ کے ذہن نشین کرے۔ ہندوستان میں اکبر الہ آبادی (جن کو مولانا محمد علی مرحوم جج اکبر بروزن حج اکبر کہا کرتے تھے) کا بھی مقصد سخن و مطمح نظر یہی تھا۔

شکر میں ہے لپٹی ہوئی گویا کونین
تلخی پنہاں ہے اس کی شیرینی میں

چنانچہ عبید زاکانی کی تصانیف "اخلاق الاشراف" اور رسالۂ دلگشا اور "صد پند" شاعر کے علوئے مقام کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں اور اس زمانہ کے فساد اخلاقی کے لئے آئینہ صافی و بیان کافی ہیں۔

عبید زاکانی نے اول اول ہزل کی طرف توجہ نہ کی تھی بلکہ اور شعبوں کو پیش نظر رکھا اور تصانیف کیں مثلاً علم معانی و بیان میں ایک رسالہ لکھا۔ قصائد لکھے۔ لیکن ان میں سے کسی کی طرف بادشاہ وقت اور امرائے زمانہ نے اعتنا نہ کی۔ یہ حالت دیکھ کر شاعر نے شیوۂ ہجوگوئی اختیار کیا اور اس کے ذریعہ سے نعمت و تقرب حاصل کیا



ایک مجسمہ ساز عورت



تصویر خواب

پال مال ایک نوجوان روسی مصور ہے۔ جسکی رومانوی زندگی عجیب و غریب واقعات کا مجموعہ ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اسنے لندن کی نمائش میں اپنے کارنامے دکھا کر قدردانوں سے خراج حاصل کیا۔ ابتدائے حال میں وہ زار کی افواج میں ایک عہدہ دار تھا۔ دوران جنگ میں وہ روس کی جانب سے لڑ کر زخمی ہوا۔ اور جب ملک میں انقلاب برپا ہوا تو انقلاب پسندوں نے اسے گرفتار کر کے اسپر موت کا فتوے صادر کردیا۔ قید خانہ میں اسنے داروغہ جیل کی تصویر تیار کی۔ جسے دیکھکر وہ اتنا خوش ہوا کہ چپ چاپ اسے جیل سے بھگا دیا۔ سنہ ۱۹۲۱ میں وہ ایران پہونچا اور طہران میں اسنے یہ تصویر بنائی۔

چنانچہ خود کہتا ہے۔

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم ٭ کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز ٭ تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

عبید زاکانی پیشۂ ہزل و ہجا کے وسیلے سے ہر جگہ محترم و معزز ہو گیا اور شعرائے عصر سے مراسم و تعلقات قائم ہو گئے۔ ایک مرتبہ سلمان ساوجی نے اس کی ہزل میں یہ شعر کہا۔

جہنمی ہجاگو عبید زاکانی ٭ مقرر است بہ بیدولتی و بیدینی

عبید نے بھی سنا لیکن خاموش رہا۔ ایک موقع پر بغداد میں سلمان سے ملاقات ہوئی۔ سلمان عبید کو نہ پہچانتا تھا۔ سلمان کا نام و اشعار بھی قزوین میں مشہور ہیں یا نہیں؟" عبید نے کہا سلمان کے یہ شعر بہت مشہور ہیں:۔

من خراباتیم و بادہ پرست ٭ در خرابات مغاں عاشق و مست
میکشندم چو سبو دوش بدوش ٭ می برندم چو قدح دست بدست

اور یہ اشعار پڑھ کر کہا کہ اگرچہ سلمان زبردست شاعر ہے لیکن ظن غالب یہ ہے کہ یہ اشعار اس کی بیوی کے ہوں گے۔ سلمان فوراً سمجھ گیا کہ یہ شخص عبید زاکانی ہے اور اس فقرہ سے مقصود سلمان کے شعر ہجویہ کا انتقام ہے۔ بہت معذرت کی اور معافی چاہی۔

عبید زاکانی نے ۷۲۲ھ میں شہر بغداد میں وفات پائی۔

کتاب اخلاق الاشراف میں عبید زاکانی نے اپنے زمانے کے اکابر و اعیان۔ امراء و ارکان سلطنت کے اخلاق و اوضاع پر نہایت لطیف پیرایہ میں نکتہ چینی کی ہے۔ اسلوب بیان یہ اختیار کیا ہے کہ فضائل چہارگانہ حکمت و شجاعت و عفت و عدالت کے الگ الگ عنوان قرار دیکر ہر ایک کے تحت میں اول وہ اصول بیان کئے ہیں جو علمائے سلف نے مقرر کئے تھے اور ان کا نام "مذہب منسوخ" رکھا ہے۔ پھر وہ اصول درج کئے ہیں جو علمائے عصر حاضر اور فضلائے ابنیٔ زمانہ نے زمانہ سازی و نفس پرستی کی وجہ سے وضع کر لئے ہیں۔ اور ان کا نام "مذہب مختار" رکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے زمانہ کے بزرگ جن کی ذات شریف سے روئے زمین مشرف ہے کابرِ سابق کی سنن و آراء سے انکار کرتے ہیں۔ روح ناطقہ کے قیام و بقا کو محال اور حشر و نشر کو باطل سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ

آنرا کہ دادہ اند ہمیں جاش دادہ اند
و آنرا کہ نیست وعدہ بفردوش دادہ اند

اس کے آگے لکھتا ہے:۔

لاجرم از حشر و نشر و عقاب و عذاب و قرب و بعد و رضا و سخط و کمال و نقصان فراغتے تمام دارند و نتیجۂ این معتقدات است کہ ہمہ روزہ عمر در کسب شہوات و نیل لذات مصروف فرمودہ می گویند

اے آنکہ نتیجۂ چہار و ہفتی ٭ وز ہفت و چہار دائم اندر تفتی
مے خور کہ ہزار بار بیشت گفتم ٭ باز آمدنت نیست چو رفتی رفتی

و بسبب این عقیدہ است کہ قصد خون و مال و عرض خلق پیش ایشاں خوار و بے مایہ نماید

برادر یکے جرعہ ہمرنگ آذر
گرامی تر از صد خون برادر

الحق زہے بزرگاں صاحب توفیق کہ آنچہ چندین ہزار سال با وجود تصفیۂ عقل و روح محجوب ماندہ بود برحمتے بر ایشاں کشف شد"

دوسرا رسالہ ریش نامہ ہے۔ اس میں ریش مقدس پر وہ وہ پھبتیاں کہی ہیں اور ایسے ایسے فقرے کسے ہیں کہ ہزل و ظرافت کا حق ادا کر دیا ہے۔ صرف ایک حکایت سُن لیجئے:۔

"آدم تا در بہشت بود ریش نداشت۔ ملائکہ او را سجدہ کردند۔ چوں ریش بر آورد ملائکہ ہرگز ریش ندیدہ بودند آغاز ریشخند کردند۔ مسکین از انفعال از بہشت بیروں جست و بہ صحرائے دنیا گریخت و بزحمت گرفتار شد

گر ریش را بدے بجہاں در فضیلتے
اہل بہشت را ہمہ دادی خدا ریش"

تیسرا رسالہ "صد پند" ہے کہ پند نامہ افلاطون کی تقلید میں لکھا ہے۔ اس سے بھی مقصود یہی ہے کہ اپنے زمانے کے رذائل اخلاق کو افشا کرے اور ان پر عبرت دلائے۔ بعض متین و سنجیدہ نصائح ہیں اور

بعض ظرافت آمیز بطور نمونہ چند پند نقل کرتا ہوں۔

برخود پسنداں سلام بدہید۔

زماں ناخوشی را بحساب عمر مشمرید۔

تا توانید سخن حق مگوئید تا بر دلہا گراں مشوید۔ ومردم بے سبب از شما نرنجند۔

مسخرگی وقوادی ودف زنی ومغنازی وگواہی بدروغ دادن دیں بدنیا فروختن وکفران نعمت پیشہ سازید تا پیش بزرگاں عزیز باشید واز عمر خود برخوردار گردید۔

از تنعم وانگاں وحکمت قابلہ وحکومت حاملہ وکھل گہوارہ وسلام امراد وتحلیت زن وغوغائے بچہ ترساں باشید۔

طعام وشراب تنہا خورید کہ ایں شیوہ کار قاضیاں وجہوداں باشد۔

جہد کنید تا حرص بر مزاج شما غلبہ نکند۔ بے ایمان وبے مروت نگردید

از منت خویشاں وخسیساں وگرہ پیشانی خدمت گاراں ناسازگاری اہل خانہ وتقاضائے قرض خواہاں گریزاں باشید۔

بہرحال از مرگ بپرہیزید کہ از قدیم مرگ را مکروہ داشتہ اند۔

ہزل خوار مدارید وہزالاں را بچشم حقارت منگرید۔

چرچا رسالہ "تعریفات مشہور" ہے اس میں ظرافت وہزل کا جدید پیرایہ اختیار ہے۔ یہ گویا ایک نئی کتاب لغات ہے ابنائے زمانہ کے اخلاق واوضاع معانی الفاظ کی صورت میں بیان کئے ہیں۔ یہ چیز عبید زاکانی کی ایجاد ہے۔ چند لغات دیکھئے۔

الدنیا	آنجا کہ ہیچ آفریدہ درو بے نیاساید۔
الدانشمند	آنکہ عقل معاش ندارد
العالم	بے دولت
الجواد	درویش
الخسیس	مالدار
النامراد	طالب علم
المدرس	بزرگ ایشاں
المعید	مسرق
المفلوک	فقیہ
ظرف الحرمان	دوات او
المکسور	قلم او
المرھون	کتاب او
المبتر	اجزائے او
الجرکین	جزدوان او
ام النوم	مطالعۂ او
دار التعطیل	مطالعہ خانہ او
الخراب والبائر	اوقات او
العسس	آنکہ شب راہ زند وروز از بازاریاں اجرت خواہد
القاضی	آنکہ ہمہ اورا نفرین کنند
المندفه	دستار قاضی
العذبه	دم او
نائب القاضی	آنکہ ایمان ندارد
الوکیل	آنکہ حق باطل گرداند
العادل	آنکہ ہرگز راست نگوید
المیانجی	آنکہ خدا وخلق از او راضی نباشند
اصحاب القاضی	جمعے کہ گواہی بسلف فروشند
المبرم	پیادہ قاضی
قوم مشوم	خویشاں او
طالب الزر	ہم نشیں او
البھشت	آنچہ نہ بینند
الحلال	آنچہ نخورند
مال الایتام والاوقاف	آنچہ برخود از ہمہ چیز مباح تر دانند
چشم قاضی	ظرفے کہ بہیچ پر نشود
المو خیم	عاقبت او
المالك	منظر او
الدرك الاسفل	مقام او
بیت النار	دار القضاء

عتبۃ الشیطان   آستانۂ او

الھاویہ والجحیم والسقر والسعیر   پہار ہ دہ آں

الرشوۃ   کارساز بیچارگاں

السعید   آنکہ ہرگز روئے قاضی نہ بیند

شرب الیھود   معاشرت قاضی

الواعظ   آنکہ بگوید ونکند

الندیم   خوش آمدگو

الشاعر   طامع خود پسند

الامام   نماز فروش

پانچواں رسالہ "التضمینات والقطعات" ہے جس میں چند ظرافت آمیز نظمیں ہیں۔ عبید زاکانی کی ظرافت کا رنگ نظم سے زیادہ نثر میں گہرا شوخ اور دلکش ہے۔ اس کی نثر نے اسلوب بیان میں جو جدتیں ہیں وہ نظم میں نہیں ہیں۔ ظریف شاعر ہر ملک وزبان میں گذرے ہیں۔ ایران میں بھی عبید زاکانی سے قبل وبعد چند شاعروں نے ظرافت ریزیاں اور ہزل انگیزیاں کی ہیں۔ ہندوستان میں بھی خوش طبع ومزاح پسند شعرا کی کثیر تعداد نظر آتی ہے۔ لیکن بلا مبالغہ یہ حقیقت واقعہ ہے کہ اکبر الہ آبادی سے زیادہ شوخ، زیادہ ظریف، زیادہ لطیف، زیادہ بلیغ اور ساتھ ہی زیادہ مفید نمونہ ظرافت دنیا کے کسی شاعر نے پیش نہیں کیا۔

اکبر کا کلام ہے کلام اکبر

عبید زاکانی کی منظومات میں اکثر اپنی حالت کے متعلق زار نالی ہے۔ قرض سے تنگ آکر کہتا ہے۔

مرا قرض ہست ودگر ہیچ نیست   فراواں مرا خرج وزر ہیچ نیست
جہاں گو ہمہ عیش وعشرت بگیر   مرا زیں حکایت خبر ہیچ نیست
ہنر خود ندارم دگر نیز ہست   چو طالع نباشد ہنر ہیچ نیست
عنان ارادت چو از دست رفت   غم فکر وبرگ دگر ہیچ نیست

بدرگاہ حق التجا کن عبید
کہ ایں رفتن در بدر ہیچ نیست

اس سے زیادہ درد انگیز نالہ سنئے :۔

مردم بعیش خوشدل ومن مبتلائے قرض   ہر کس بکار وبارے ومن در بلائے قرض
قرض غذا وقرض حلاوت بگردنم   آیا ادائے قرض کنم یا ادائے قرض
خرجم فزوں ز عادت وقرضم فزوں نعد   فکر از برائے خرج کنم یا برائے قرض
در شہر قرض دارم واندر محلہ قرض   در کوچہ قرض دارم واندر سرائے قرض
از صبح تا بشام در اندیشہ ماندہ ام   تا خود کجا بیابم ناگہ رجائے قرض
مردم ز دست قرض گریزان ومن ہمی   خواہم بس از نماز ودعا از خدائے قرض
عرضم چو آبروئے گدایاں بباد رفت   از بس کہ خواستم ز در ہر گدائے قرض
گر خواجہ تربیت نکند پیش بادشاہ   مسکیں عبید چوں کند آخر ادائے قرض
خواجہ علاء دین ودیں آنکہ جز کفش   ہرگز کسے نداد بگیتی سزائے قرض

افلاس وفاقہ مستی کا حال دیکھئے کیا خوب رباعی کہی ہے :۔

درخانۂ من ز نیک وبد چیزے نیست   جز بنگی وپارۂ نمد چیزے نیست
ز ہر چہ بپزند نیست غیر از سودا   وز ہر چہ خورند جز لگد چیزے نیست

اور سنئے وہی شکایت ہے۔

از زحمت تنگدستی وشدت برد   در خانۂ ما نہ خواب یابی ونہ خورد
در تابہ دو مس وکاسہ وکوزۂ ما   نہ چرب نہ شیریں نہ گرم ہست ونہ سرد

ایک قطعہ میں شکوۂ تقدیر کرتا ہے اور کس بلیغ پیرایہ میں اپنے معائب کے ساتھ اپنے محاسن گناتا ہے۔

عجب بماندہ ام از بخت نامساعد خویش   کہ ہیچ بہرہ ندارم ز شاہ ومیر ووزیر
بفسق ورندی وقلاشی از کہ ام کمتر؟   ہنر مگیر وفصاحت مگیر وشعر مگیر!

پھر فسق وفجور کا بیان ہے لیکن دوسرے اسلوب سے :۔

شراب خوارم وفرزاد ورند وشاہد باز   مرا ز دست ہنر ہائے خویشتن فریاد
ز ننگ توبہ وتسبیح خویش ورانجم   کہ ہر یکے بدگر گونہ داردم ناشاد

زاہد گوشہ نشین تو مشہور ہے۔ عبید زاکانی "فاسق گوشہ نشین" بنتا ہے۔ اس کی حالت تنگدستی وقرض کشی ورندی کے لحاظ سے اس مضمون کو دیکھئے کہ کس قدر لطیف ہو گیا ہے۔ گوشہ نشینی کا سبب فسق ورندی میں انتہائی انہماک ومشغولیت بھی ہو سکتا ہے۔ افلاس بھی۔ قرض خواہوں کا اندیشہ بھی۔ لیکن وہ "استغراق فی الفسق" ہی کو اس "زہد" وعزلت گزینی وترک دنیا کی علت قرار دیتا ہے۔

کہتا ہے:۔

برہیچ کسم نہ مہر ماندہ است نہ کیں — یکبارہ گسستہ دست از دنیا و دیں
در گوشہ نشستہ ام بہ فسقے مشغول — ہرگز کہ شنیدہ فاسقے گوشہ نشیں

ملانی خانہ داری سے پریشان ہو کر کہتا ہے۔

دل خستہ ہمیشہ از زن و فرزندم — یارب کہ دریں بند بلا نپسندم
گر روزے دریں بند خلاصی یابم — اے بس کہ بریش کدخدایان خندم

ایک رندانہ رباعی اور سن لیجئے جس میں عمر خیام کا رنگ ہے:۔

تا بتوانی مے مصفا میخور — با دست بریز دل اعدا میخور
مندیش کہ دیروز مقبول آمد امروز — مے مجور و فردا غم فردا میخور

آخری رسالہ "دلکشا" ہے جس میں فارسی اور عربی زبان میں بہت سے لطیفے جمع ہیں۔ نہایت دلچسپ ہیں۔ لیکن بہرحال لطیفے ہی ہیں جن میں سے اکثر مشہور ہیں۔ پھر تعداد کثیر میں سے انتخاب بھی دشوار ہے۔ دو ایک مختصر لطیفے بطور نمونہ درج کرتا ہوں۔

حکایت

ایک عورت نے خلیفہ واثق کے سامنے دعویٰ پیغمبری کیا۔ خلیفہ نے پوچھا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر تھے" عورت نے کہا "تھے" خلیفہ نے کہا "جب ان کا یہ ارشاد ہے کہ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا) تو تیرا دعویٰ باطل ہوا۔ عورت نے جواب دیا کہ انہوں نے لا نبی بعدی فرمایا ہے۔ لَا نَبِیَّۃَ بعدی (میرے بعد کوئی عورت پیغمبر نہ ہوگی) تو نہیں فرمایا"

دو لطیفے عبید زاکانی کی عبارت میں سنئے کہ ان کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

حکایت

یکے از دیگرے پرسید کہ قلیہ را بقاف کنند یا بہ غین۔ گفت قلیہ نہ بہ قاف کنند و نہ بہ غین۔ قلیہ بگوشت کنند۔

حکایت

مجد ہمگر زنے زشت داشت و در سفر داشت، روزے در مجلسے نشستہ بود۔ غلامش دواں دواں بیامد کہ ای خواجہ خاتون بخانہ فرود آمد۔ گفت کاش خانہ بخاتون فرود آمدے

(ترجمہ و اخذ)

رخصت کا وقت

(رابندرا ناتھ ٹیگور کی ایک تازہ ترین نظم)

بارش ختم ہو گئی ہے، میرے محبوب! تو اپنا گیت ختم کر! رخصت
کا یہ بہترین وقت ہے!
اپنا نغمہ ختم کر کیونکہ ہمارے سامنے جو سفر ہے وہ بہت
طویل ہے اور صبر آزما!
کشتی کنارے پر نہیں ہے دیکھو وہ دور جا چکی ہے اور طوفان
ندی میں ادھر ادھر جھکولے کھا رہی ہے!
خنک اوراق شجر سے مستور ہو گئے
شہد کی مکھیاں جھاڑی میں اپنی راہ بھول گئی ہیں!
جس کے سکوت مطلق کو منتشر کرنے کے لئے ہوا میں معمولی جنبش
بھی نہیں ہے
نم آلود آسمان کی قوس قزح نئی بارش کی یاد دل میں تازہ
کر رہی ہے۔
ـــــ اب وقت ہے! ـــــ تو اپنا گیت ختم کر دے
ـــــ اور میرے ساتھ **لامحدود** کی طرف
چل پڑ!

(مترجم ظفر قریشی دہلوی)

عید کے روز مرے گھر میں محرم آیا

(از حضرت مولانا محمد حنیف صاحب فیضؔ مرحوم مغفور تلمیذ رشید حضرت داغؔ دہلوی مرحوم)

عید نمبر — کیلئے

وصل میں یاد شب ہجر کا ماتم آیا
عید کے روز مرے گھر میں محرم آیا

جب تسلی کو کوئی یار نہ ہمدم آیا
ملک الموت ہی ناچار شب غم آیا

چین دم بھر کسی پہلو نہ شب غم آیا
کبھی آنکھوں میں کبھی لب پہ مرے دم آیا

آدمی رنج و مصیبت میں گرفتار ہوئے
کیوں جہاں میں قدم حضرت آدم آیا؟

کر دیا نامۂ اعمال کو دھو دھو کے سفید
حشر میں کام یہی دیدۂ پرنم آیا!

ہوئے خنجر کے گلے ملنے سے پہلے ہی شہید!
عید قربان نہ ہوئی تھی کہ محرم آیا

اس نے چھڑکا مرے زخموں پہ جو پہرہ کا نمک
کام کچھ عیسیٰ مریم کا نہ مرہم آیا!

سخت جانی سے مرے اسکے لبوں پر دم تھا!
دم جو نکلا مرے خنجر میں ترے دم آیا

ڈھونڈتا ہی رہا حوران جناں میں اس کو
کبھی جنت میں مجھے چین نہ اک دم آیا

بعد مرنے کے کسی نے نہ خبر لی میری!
پوچھنے حال کوئی دوست نہ ہمدم آیا

آگیا دل میں شب وصل خیال شب ہجر
باغ جنت میں مجھے یاد جہنم آیا!

یک بیک جاگ اٹھا فتنۂ خوابیدۂ حشر
خواب میں اس کے جو وہ فتنۂ عالم آیا

پیچ و تاب دل بیتاب نے سونے نہ دیا
قبر میں یاد جو وہ گیسوئے پرخم آیا

خاک میں تجھ کو ملا دوں گا ابھی سرمۂ طور!
نرگسی چشم میں گر قطرۂ شبنم آیا

نزع کی سن کے خبر آنا مری ، لیں پہ نزع
ہائے آیا بھی ستمگار تو کس دم آیا!!

رفیقِ بیکسی

از جناب ایم ایم اسلم صاحب

کوہستان پربت کی وادیوں میں رہنے والے جاڑا پڑتے ہی اپنے ڈھور ڈنگرے کر میدانوں میں اُتر آتے تھے۔ پہاڑوں اور میدانوں میں روئی کے گالوں کی طرح برف پڑی ہوئی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے آبشار جن کا پانی موسمِ بہار میں سیماب کی طرح تڑپتا پتھروں اور چٹانوں پر سے اُچھل اُچھل کر سبزہ زاروں اور مرغزاروں سے عشق بازیاں کرتا اور پیچ و بل کھاتا ہُوا میدانوں کو سیراب کیا کرتا تھا۔ جم کر یخ ہو گئے تھے۔ وہ پہاڑی ندی نالے جن کے پانی کی شورشوں میں باجے کا لطف آیا کرتا تھا خشک ہو چکے تھے۔ پہاڑوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں سے موتیوں کی طرح ٹپکنے والا پانی اب یخ ہوکر مصری کی ڈلیوں کی طرح پتھروں اور چٹانوں کے کنگروں اور کناروں سے لٹک رہا تھا گھنے اور سایہ دار پیڑ جو کبھی جنگلی چڑیوں کے دلنواز ترانوں سے آباد تھے پتوں کے بار سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اور سر سے پاؤں تک برف روئی کے سپید سپید گالوں کی طرح ان کی ٹنڈ منڈ شاخوں سے چپکی ہوئی تھی۔ موسمِ بہار کی وہ نازک اور خوبصورت تتلیاں اور پیارے پیارے رنگوں والے چھوٹے چھوٹے طائر جن کے دم سے ہر وادی وادیٔ ایمن بنی رہتی تھی کھوؤں اور دراڑوں میں جا چھپے تھے۔ جاڑا جوبن پر تھا۔

دامنِ کوہسار سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ لوگ سارا دن جھونپڑوں میں گھسے پڑے رہتے۔ کبھی جو دوسرے تیسرے قسمت سے دھوپ نکلتی تو یہ لوگ بھی عروس العرض کی طرح جھونپڑیوں سے باہر نکل آتے۔

اسی بستی میں کرشنا اور رکمنی دو بہنیں رہتی تھیں۔ دونوں اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ ان کا باپ منی رام بہت بوڑھا تھا۔ بیٹیوں کو دے دلا کر اس کے پاس دو چار گھماؤں زمین اور دو تین مویشی رہ گئے تھے۔ لڑکیوں کی ماں مدت سے مر چکی تھی۔ منی رام بٹائی پر زمین کاشت کرواتا تھا۔ اور اسی پیداوار پر اس کی گذران تھی۔

بیاہے جانے کے بعد رکمنی اور کرشنا کچھ ایسی بے مروت ہو گئیں کہ بوڑھا منی رام ان سے بہت بیزار ہو گیا۔ لیکن دونوں کی نگاہ اس کچی زمین پر اور ان ڈھوروں پر تھی جو منی رام نے اپنے لئے رکھ لئے تھے۔ ہر ایک یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح یہ سب کچھ اسی کو مل جائے۔ منی رام اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ جائداد وہ اسے دے گا جو مرنے کے بعد اس کے کریاکرم کی حامی بھرے۔ تاکہ مرنے کے بعد اس کی ہڈیاں تو ٹھکانے لگ جائیں۔

منی رام گو دونوں سے ناراض تھا لیکن کرشنا چونکہ عمر میں چھوٹی تھی اور بوڑھے کو اس سے کچھ محبت بھی تھی اس لئے وہ دل سے یہ چاہتا تھا کہ اگر کرشنا مان جائے تو وہ اسی کے ہاں جا رہے اور یہ سب کچھ اسی کو دیدے۔

اسی اثنا میں کرشنا کے ہاں ایک لڑکا ہوا۔ منی رام نے اپنا سب اثاثہ بیچ کر کرشنا کے لڑکے کو کنگن بنوا دیئے۔ اور باقی جو بچ رہا وہ اپنے پاس رکھ لیا۔ اب منی رام اپنی جھونپڑی میں اکیلا پڑا رہتا۔ خود اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتا۔ ہر روز نہیں بلکہ وہ بھی کبھی دوسرے روز۔ اس بیکسی اور تنہائی میں اس کا اگر کوئی رفیق تھا تو وہ اس کا کتا تھا۔ جو سارا دن منہ پیٹ سے لگائے جھونپڑی کے اندر پڑا رہتا اور اپنے

بوڑھے مالک کے روکھے سوکھے ٹکڑوں سے پیٹ بھرلیتا

منی رام کو خیال تھا کہ کرشنا یا اس کا شوہر خود ہی اس سے اپنے پاس آٹھ آنے کو کہیں گے۔ لیکن وہ بھولے سے بھی یہ بات زبان پر نہ لائے۔ ایک ضعیفی دوسرے کھانے پینے کا کچھ برائے نام انتظام اور پھر اس پر بیٹیوں کی کج خلقی اور داما دوں کی سرد مہری ان سب تفکرات کے باعث منی رام غریب بیمار پڑ گیا۔ کرشنا اور رکمن دونوں میں پہلے ہی کچھ ایسی راہ و رسم نہ تھی۔ لیکن جب کرشنا کے بیٹے کو منی رام نے کنگن بنوا دیئے تو رکمن کرشنا سے اور بھی الجھی اور باپ سے تو اس قدر ناراض ہوئی کہ بھول کر بھی اس کی خبر نہ لی۔ منی رام غریب کھاٹ پر پڑا پڑا صرف "ہے رام" کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ اور کبھی لب شکوہ وانہ کرتا

آخر جب بہت لاچار ہوا تو ایک روز جب آفتاب جہانتاب کی سنہری کرنیں گھاس پھوس ہی سے گذر کر جھونپڑی میں رقص کر رہی تھیں۔ وہ ہمت کرکے باہر نکلا اور جریب ٹیکتا ہوا افتاں و خیزاں کرشنا کے گھر کی طرف چلا۔ اس کا وفادار کتا بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

جب منی رام بیٹی کی جھونپڑی کے پاس پہنچا تو وہ چشمہ پر سے پانی بھرنے جا رہی تھی بغل میں ننھا سا بچہ تھا اور سر پر گگریا تھی۔ باپ کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ننھا اچھا ہے؟" منی رام نے بچہ کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں ننھا تو اچھا ہے" کرشنا بولی "تم کیسے آئے؟"

منی رام بیٹی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کرشنا! میں بہت لاچار ہوں ... بہت بیمار ہوں۔ بیٹی کرشنا! ......"

کرشنا بات کاٹ کر بولی۔

"بیمار ہو تو میرا گھر ہسپتال تھوڑا ہے ... یا میں کوئی حکیم ڈاکٹر ہوں"

منی رام: "بیٹی کرشنا! میں تمہیں کچھ تکلیف نہ دوں گا۔ بس ایک کونے میں پڑا رہنے دو ..... میں بہت لاچار ہوں"

کرشنا: "لو اور سنو۔ میرا گھر ہی ولدر کے لئے رہ گیا۔ جاؤ رکمن کے پاس" یہ کہہ کر اس نے آگے قدم اٹھایا۔ بیٹی کی بے مروتی دیکھ کر منی رام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بڑی منت سے کہا۔

"کرشنا! دیا کرو بیٹی"

لیکن کرشنا نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور چشمہ کی طرف چلی گئی۔

منی رام "ہے رام" کہہ کر کرشنا کے دروازے سے لوٹا۔ اس کا کتا دم ہلاتا ہوا اس کے پیچھے ہو لیا۔

کرشنا سے مایوس ہو کر اسے خیال آیا کہ رکمن بڑی ہے۔ اس کا خاوند بھی کچھ اتنا برا آدمی نہیں۔ شاید ان کے ہاں پناہ مل جائے۔ وہ بڑی بیٹی کے گھر کی طرف آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اور جریب ٹیکتا ہوا چلا۔ بیمار تو پہلے ہی تھا لیکن کرشنا کی بے مروتی سے اس کے دل پر سخت چرکا لگا۔

جب منی رام رکمن کے ہاں پہنچا تو وہ اس وقت جھونپڑی میں بیٹھی روٹی پکا رہی تھی اس کے دو بچے ماں کے پاس ہی بیٹھے کھیل رہے تھے۔ دھواں باہر نکلنے کے لئے رکمن نے تھوڑا سا دروازہ کھول رکھا تھا۔

منی رام نے دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دی۔

"رکمن بیٹی"

رکمن اندر سے آواز پہچان کر بولی۔

"کیا ہے" "اندھیرے" اندر آ جاؤ"

منی رام اندر جا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ہی اس کا کتا بھی دم ہلاتا ہوا آ بیٹھا۔

"کیسے آئے؟" رکمن نے روٹی بیلتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی!" منی رام بولا "میں کئی دنوں سے بیمار ہوں --- کوئی پانی دینے والا بھی نہیں ..... افسوس کسی سے اتنا بھی نہ ہوا کہ جھوٹے منہ بات تو پوچھتا"

"ہوں"۔ رکمن توے پر روٹی ڈالتے ہوئے بولی۔

منی رام: "بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں ... ہے رام"

رکمن کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی اور پھر پوچھا۔
"تو پھر اب کہتے کیا ہو!"
"کچھ بھی نہیں" منی رام نے کھانستے ہوئے کہا "کیا کہنا ہے میں نے... یہاں کہیں کونے میں پڑا رہنے دو... تمہارے بچوں کو دعا دوں گا"
"ہوں" رکمن بولی اور پھر بیٹی کے چولہے پر گر دو گے تو خلقت کیا کہے گی... بے شرم تو نہ آئے گی"
"کہاں جاؤں؟" منی رام بھرائی ہوئی آواز سے بولا "کس کا آسرا ڈھونڈوں؟ تم بیٹی ہو کر سہارا نہ دو گی تو غیروں سے کیا امید رکھوں؟"
رکمن نے ایک روٹی اور تھوڑا پیاز ایک پتہ پر رکھ کر باپ کی طرف سرکا کر کہا۔
"روٹی کھانی ہے تو کھا لو... اور سا تھ لے جانی ہو تو لیجاؤ"
منی رام بیٹی کی طرف دیکھ کر بولا۔
"کہاں لے جاؤں۔ رکمن کس کے پاس جاؤں؟"
"اپنی لاڈلی کرشنا کے ہاں جاؤ نا... جسے کل کنگن بنوا دئے تھے... میرے بچوں کو کیا دیا تھا... بیمار تھے تو اسے کہلا بھیجا ہوتا۔ ہمیں دیا ہی کیا تھا جو آج ہمارے پاس آ گئے تم۔"
"بیٹی رکمن!" منی رام بولا "دنیا میں جو کچھ میرے پاس تھا تم دونوں سے چھپا کر نہیں رکھا... چند دن کا مہمان ہوں۔ میرے پاس ابھی دس پانچ روپے ہیں۔ مر جاؤں گا تو ہڈیاں ٹھکانے لگا دینا... ہے رام" اور پھر "یہ روٹی اٹھا لو۔ مجھے بھوک نہیں"
منی رام نے جو روٹی بیٹی کی طرف بڑھائی تو کہتے کہتے ایک بار سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

شام ہو چکی تھی۔ منی رام گھٹنوں میں سر دئے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ رکمن کا خاوند بھی کام کاج سے فارغ ہو کر آ گیا تھا۔ اور چولہے کے پاس بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ دونوں چپکے چپکے کانا پھوسی کر رہے تھے۔ منی رام غریب سردی سے کانپ رہا تھا۔ رکمن جب کام سے فارغ ہوئی تو بولی۔

"اب اٹھو نا تم۔ رات ہونے کو ہے" اور پھر منی رام کو خاموش پا کر "سوتے ہو ابھی سے۔ رات کہاں کاٹو گے؟ اٹھو نا!"
منی رام نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔
"کہاں جاؤں رکمن! یہیں چولہے کے پاس پڑا رہنے دو... ہے رام"
"دیکھا اپنے" رکمن بولی "تمہیں بھی اور تمہارے رام کو بھی۔ جاؤ نا رام کے پاس"
"رام بلاتا نہیں بھی رکمن"۔ منی رام نے ایک آہ بھر کر کہا۔
"اب اٹھو گے بھی"
لیکن منی رام نے کچھ جواب نہ دیا۔
"بڑی بپتا پڑی" رکمن سر ہلا کر بولی۔ اور پھر کام دھندے میں لگ گئی۔

منی رام غریب کا پنڈا بخار سے پھنک رہا تھا۔ گو شدت کی سردی تھی لیکن زبان حلق میں سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔ اور پھر کھانسی پر بار بار کھانسی اٹھنے سے اس کا سینہ دھونکنی کی طرح دھونک رہا تھا۔
"تم تو تھوک تھوک کر فرش پر لیپ کر دو گے" رکمن بولی "اٹھو ڈھوروں کے پاس جا کر پڑا رہو۔"
لیکن منی رام میں بولنے کی تو سکت ہی نہ تھی وہ کھانستے کھانستے زمین پر پڑ گیا تھا۔
"اب کیا کریں" رکمن خاوند کی طرف دیکھ کر بولی۔
"میں کیا جانوں۔ یہاں مر گیا تو بپتا ہی پڑے گی" اور پھر "کہو تو اسے ڈھوروں کے پاس اٹھا کر چھوڑ آئیں۔ وہاں سردی سے تو بچے گا"
"لیکن کرشنا کے پاس کیوں نہ پہنچا دیں"
"کیا افیون کھائی ہے... اس وقت؟ باہر تو برف پڑ رہی ہے"
"تم جانو"
"میں کیا جانوں" خاوند بولا۔ "لو آؤ اٹھائیں"
دونوں نے مل کر غریب منی رام کو اٹھایا اور باہر لا کر مویشیوں والی جھونپڑی میں زمین پر ایک طرف ڈال دیا۔ اس اٹھانے اور

لیجانے میں انہیں منی رام کی کمر کے ساتھ ایک ہمیانی بندھی ہوئی معلوم ہوئی رکمن کے شوہر نے وہ چپکے سے کھول لی۔ اس میں روپے تھے۔ یہی غریب نے اپنے کریاکرم کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ دونوں جھونپڑی کا دروازہ بند کرکے باہر نکل گئے۔

ایک بخار پھر پیاس کی تلخی۔ اور اس پر ڈھوروں کا ساتھ۔ منی رام بہت دیر تک وہیں پڑا کراہتا رہا۔ آخر گرتا پڑتا جھونپڑی سے نکلا۔ اور بیٹی کے دروازے کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ آوازیں دینے لگا۔

"رکمن! بیٹی! ایک گھونٹ پانی دیدو ..... ہے رام"

غریب کے منہ سے بار بار یہی الفاظ نکلتے تھے۔ مطلع آسمان بالکل صاف تھا۔ ننھے ننھے ستارے بڑے تعجب کے ساتھ آنکھیں جھپک جھپک کر بوڑھے بیکس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر نڈھال ہوکر غریب بیٹی کے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور سر جھکا لیا۔ صبح جب لوگ جھونپڑیوں سے نکلے تو انہوں نے منی رام کو بیٹی کے دروازے پر مردہ پایا۔ وہ برف کے نیچے دب کر سکڑ گیا تھا۔ اور اس کے پاس ہی اس کا کتا پیٹ سے سر لگائے مرا پڑا تھا۔

ایم۔ اسلم

غزل

از۔ جناب بابو کرشن مکند صاحب تاج

نگاہوں سے مری دنیا کا ہی روپوش ہوجانا
مری عرضِ تمنا پر ترا خاموش ہوجانا!

جوانی آئی آتے ہی اٹھے پردے محبت کے
کسی کا ہوش میں آنا ہی تھا مدہوش ہوجانا

یہی تھا اختتامِ قصۂ طولِ شبِ فرقت
ترے بیمار کا وقتِ سحر خاموش ہوجانا

شکایت حشر میں اور میں کروں یہ غیر ممکن ہے
میں کن آنکھوں سے دیکھوں گا ترا خاموش ہوجانا

تمہیں دیکھو گے تم نے رات بھر مجھکو جلایا ہے
چراغِ آرزو کا صبح کو خاموش ہوجانا

کسی دن تاج محفل میں تجھے بدنام کردیگا۔
ترے جذباتِ دل کا خود بخود پرجوش ہوجانا

از جناب
حافظ وکیل احمد صاحب
حافظ غازیپوری

بانگِ حافظ

عالمگیر کے
عید نمبر
کیلئے

جلوۂ حُسن کو اب میں "متشکل" سمجھا
جس کو دنیا نے فقط "نقطۂ کامل" سمجھا

گلشنِ عشق میں یہ عشق کا "حاصل" سمجھا
یعنی ہر غنچۂ پژمردہ کو "اک دل" سمجھا!

جادۂ شوق میں اسرارِ منازل سمجھا
یعنی ہر ذرّے کو تیرا متشکّل سمجھا

لُطف آمیز تجلی تھیں ادائیں اُنکی
شوق، آئینۂ سینا کو مقابل سمجھا

مرحبا "تکملۂ" لذتِ احساسِ کرم
"درد" کے فلسفے کو آج مرادل سمجھا

کھُل گئے اُس پہ حقیقت کی "رموزِ رنگیں"
اپنی ہستی کو جو "اسرار کی منزل" سمجھا

ہوش نے "قیدو تعین" سے جو پائی فرصت
فطرتِ عشق میں وہ "حُسن کو شامل" سمجھا!

جب نظر آئے "سرِ آب" "حبابِ سیمیں"
میں تو ہر ایک کو "ڈوبا ہوا اک دل" سمجھا!!

مجھ سے کیا پُوچھتے ہو "جوشِ" بہارِ فطرت
جس قدر ڈوب کے دیکھا اُسے "مشکل" سمجھا!!!

مستقل ہوش ہے یا مستقل اک بے ہوشی
عشق تو اپنی حقیقت کا یہ حاصل سمجھا!!

جسقدر بُعد نہیں اس سے زیادہ ہے "گریز"
میں سمجھنے کو تو ہر موج کو ساحل سمجھا!

رقص میں آگیا پھر رنگ بہارِ گلشن
شعر حافظ کو مگر شعر منادل سمجھا!

خاندان بہمنیہ کی وجہ تسمیہ

از مولانا احمد ... ایم۔اے

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ اکثر غلط اور بے بنیاد باتیں جو اپنے اندر دلچسپی کا پہلو لئے ہوئے ہوتی ہیں مقبول اور زبان زد خاص و عام ہو کر اسقدر مشہور اور راسخ ہو جاتی ہیں کہ پھر ان کی تردید میں کتنے ہی دلائل پیش کئے جائیں لیکن ان سے کوئی نمایاں فائدہ نہیں ہوتا۔

غلط بیانی کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جو بات کسی بلند مرتبہ اور با اثر شخص کے قلم سے مرقوم ہو جاتی ہے عوام کے نزدیک مستند کا حکم رکھتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ بے چون وچرا تسلیم کر لی جاتی ہے۔ پھر اگر کوئی شخص خواہ وہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہو اس کے خلاف تحریر کرے تو قابل التفات نہیں خیال کیا جاتا۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔

دکن کی تاریخ میں خاندان بہمنیہ کے عروج۔ اصل و نسب اور "بہمنی" نام کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں جو حالات مشہور آفاق ہیں بازاری گپوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جن کو محمد قاسم فرشتہ مؤلف تاریخ فرشتہ نے غلطی سے تاریخی واقعات کے درجہ تک پہونچا دیا ہے۔ چونکہ تاریخ فرشتہ ہندوستان کی دیگر عام تاریخوں کی نسبت زیادہ عام فہم اور کثیر الاشاعت ہے اس لئے اس کے بیان کو جو شہرت حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں نصیب ہوئی اور حقیقت پر پردہ پڑا رہا۔

فرشتہ لکھتا ہے: "حسن نام شخصے بدار الخلافہ دہلی در ملازمت کانگوی بہمن منجم کہ ندیم شہزادہ محمد تغلق شاہ قرب و منزلتے داشتے بود و در کمال فلاکت روزگار میگذرانید از تنگی معاش بہ تنگ آمدہ از کانگوی درخواست شغلی و خدمتی نمود کہ بآں قیام نماید۔ کانگوی ... در حوالی دہلی زمین خرابہ باو حوالہ نمود تا آں را زراعت نماید۔ حسن بامر زراعت و فلاحت مشغول گشت۔ ناگاہ روزے قلبہ در زمین بند شد ... چوں خوب ملاحظہ کرد زنجیر را در گردن ظرفے مملو از اشرفی ... دید ... وقت شب بخانہ کانگوی بہمنی برد ... کانگوی بہمنی بر امانت و دیانت او آفریں گفتہ علی الصباح ایں واقعہ عجوبہ را بعرض شہزادہ رسانید۔ شہزادہ از کمال دیانت و علو ہمت حسن تعجب نمودہ او را بحضور خود طلبید ... و بسامع پدر خود پادشاہ غیاث الدین تغلق شاہ رسانید الخ (تاریخ فرشتہ مطبوعہ بمبئی جلد اول صفحہ ۵۱۹ - ۵۲۰)

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ حسن نام ایک غریب شخص دہلی کے ایک نجومی مسمی کانگوی بہمن کے کھیت میں کام کرتا تھا۔ ایک روز حسن کو کھیت میں کچھ دفینہ ملا جو اس نے اپنے آقا کو دیدیا۔ آقا نے اس کی ایمانداری سے خوش ہو کر اس کو شاہ دہلی (غیاث الدین تغلق) کی سرکار میں ایک عہدہ دلوا دیا۔ بعد ازاں وہ درجہ بدرجہ ترقی کر کے بادشاہ بن گیا۔

فرشتہ کا یہ بیان جب تک اس کی تائید دیگر معتبر تاریخوں سے نہ ہو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ محولہ فوق واقعہ ۱۳۲۱ء اور ۱۳۲۵ء کے درمیان ہوا اور فرشتہ نے اپنی کتاب ۱۰۱۹ھ - ۱۶۱۰ء میں لکھی۔ لیکن دیگر کتب تواریخ کی ورق گردانی کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ ؎

بقدر طاقت خود خوطہا زدم بسیار ۔۔۔ در یکہ می طلبم آں بہیچ دریا نیست
ایں سخن با دیگر از من نیست ۔۔۔ عہد بر راوی است و بر من نیست

اصل واقعہ کی تحقیق کے لئے ہم سب کو سب سے پہلے معاصر مورخوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے جو فرشتہ سے پہلے گذرے ہیں۔ انہیں ضیاء الدین برنی مؤلف تاریخ فیروز شاہی سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے اکثر سلاطین

خلجی و تغلق کے چشم دید حالات لکھے ہیں جیسا کہ وہ خود کہتا ہے :۔

چنیں گوید دعاگوی ہمہ مسلمانان ضیاء برنی کہ آنچہ ایں
ضعیف از اخبار و آثار جلالی و علائی و تا آخر دریں تاریخ
نوشتہ است بر حکم مشاہدہ و معائنہ در قلم آوردہ الخ"
(تاریخ فیروز شاہی مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۶۲ء صفحہ ۱۴۵)

علاء الدین حسن بہمنی نے ۱۳۴۷ء میں محمد تغلق کے عہد میں سلطنت بہمنیہ کی بنیاد ڈالی اور یہ واقعہ ضیاء برنی کے عین حیات میں ظہور پذیر ہوا۔ علاوہ ازیں حسن بہمنی سے کماحقہ واقف ہوگا۔ اپنی تاریخ میں اس نے کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے مثلاً

از دیو گیر خبر رسید کہ حسن کانکو و دیگر باغیاں و مشلطاں
کہ در روز محاربہ از پیش لشکر سلطان گریخت بودند بہ
عماد الملک زوند

حسن کانکوی در دیو گیر آمد و چتر برگرفت ... بر حسن کانکو
در دیو گیر جمعیت بسیار گرد آمدہ (تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۵۱۴)

لیکن تمام کتاب میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی جس سے فرشتہ کے بیان کی تائید ہو سکے۔ کیا یہ قرین قیاس ہے کہ برنی جو حسن کانکو کا ہمعصر تھا حقیقت سے بے خبر تھا؟

شیخ عبد القادر البداؤنی جس نے ۱۵۹۵ء تک کی تاریخ قلمبند کی ہے اور جو فرشتہ کا ہمعصر تھا کہتا ہے "حسن کانکو نے علاء الدین کا لقب اختیار کیا اور سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ اور اس وقت سے دولت آباد کے مضافات کی حکومت اور اس ملک کی سلطنت اس کے خاندان میں رہی۔ کتاب فتوح السلاطین اس کی شان میں تصنیف کی گئی"
(منتخب التواریخ مترجمہ جارج رینکنگ جلد اول صفحہ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۴۔ ۳۲۲۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ ۱۸۹۸ء)

بداؤنی نے بھی کانکوی بہمن منجم کا مطلق نہیں ذکر کیا۔

نظام الدین احمد اپنی کتاب طبقات اکبری میں جو ۱۵۹۵ء کی تالیف ہے رقمطراز ہے :۔

"ناقلان آثار چنیں روایت کردہ اند کہ علاء الدین حسن بہمنی
کہ بحسن کانکو بہمنی اشتہار دارد و متقلب بروزگار در زبان
سلطان تغلق شاہ بدار السلطنت دہلی رسید روزے
قطب العارفین شیخ نظام الدین دہلوی دعوتی تمام فرمودہ
بودند۔ سلطان و جمیع بزرگان خاصہ بودند۔ چوں سفرہ
برداشتند و سلطان محمد مرض گروید۔ شیخ بخادم فرمود
کہ سلطان رفت و سلطانے بر دراست برو بیار۔ خادم
بیروں رفت حسن کانکو را بر در دید بخدمت شیخ در آورد و حسن
از خلوص اعتقاد سر انقیاد بر قدم شیخ نہاد و نیاز مندی نمود
شیخ گردہ ناں بر انگشت نہادہ باو داد از انگشت و شیخ و
گردہ ناں صورت چتر حاصل شد چنانچہ حاضران و حسن بر
بشارت شیخ آگاہ شدند و او مسرور و مبتہج از خدمت شیخ
حسن بیروں آمدہ بشارت گرفتہ بالتفاق جمعے از افغاناں
متوجہ دکن شد۔
(طبقات اکبری مطبوعہ نول کشور صفحہ ۴۰۸)

یہ بیان نہایت مفصل اور واضح ہے۔ مورخ مذکور علاء الدین حسن کی بادشاہت کو حضرت شیخ نظام الدین رح کی پیشگوئی کا نتیجہ بتاتا ہے۔ لیکن کسی منجم کی بابت کچھ نہیں کہتا۔ اگر فرشتہ کے بیان کردہ واقعہ کی کوئی اصلیت ہوتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ صاحب طبقات اکبری اس مناسب موقعہ پر اس کا ذکر نہ کرتا۔ مجکو تو اس میں بھی شبہ ہے کہ محمد تغلق کے دربار میں کانکوی بہمن نام کوئی شخص تھا بھی یا نہیں

امین احمد اپنی کتاب ہفت اقلیم میں جو ۱۶۰۲ء میں یعنی فرشتہ سے پہلے تالیف کی گئی تھی لکھتا ہے :۔

طبقہ اول ملوک گلبرگہ است و اول ایشاں علاء الدین حسن
است۔ چوں صاحب عیون التاریخ نسب وی را بہ بہمن بن
اسفندیار می رساند ہر آئینہ آں سلسلہ بہ بہمنی اشتہار یافتہ
(جنرل ایشیاٹک سوسائٹی دسمبر ۱۹۰۹ء)

علاوہ ازیں سراج التواریخ۔ برہان مآثر۔ بہمن نامہ۔ تاریخ محمود شاہی اور تحفۃ السلاطین وغیرہا جو بہمنی خاندان کی معتبر تاریخیں ہیں اور تاریخ فرشتہ سے قبل لکھی گئی تھیں فرشتہ کے بیان کی تصدیق نہیں کرتیں اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا کہ حسن کانکو کے اصل و نسب

کے متعلق سب سے پہلے فرشتہ نے غلطی کی اور مورخین مابعد میں سے جن کا بیان اس کے مطابق ہے انہوں نے اسی کی تقلید کی ہے۔ کیونکہ فرشتہ سے قبل کوئی مورخ خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ ہو اس کا متفق نہیں ہوا۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ فرشتہ کے بعد تمام مورخوں نے اس کے بیان کو قبول کر لیا اور صرف جدید تحقیقات نے اس کی تردید کی ہے۔ صرف چند اہل قلم ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اس کی تردید کی مثلاً رائے بھارا مل مؤلف لب التواریخ ہند اور فاضل ایم بیل مؤلف مفتاح التواریخ مگر ان کو مورخ کہنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کتابیں کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ جیسا کہ خود ان کے مؤلف اعتراف کرتے ہیں تاریخ فرشتہ یا کسی اور تاریخ کی نقل ہیں اور تحقیق و تنقید سے بالکل عاری۔

بخلاف ان کے منشی سبحان رائے جنڈاری صاحب خلاصۃ التواریخ اور میر غلام حسین خاں صاحب سیر المتاخرین اس مسئلہ میں فرشتہ سے کلی اختلاف رکھتے ہیں۔

منشی سبحان رائے اپنی کتاب میں جو اورنگ زیب عالمگیر کے چالیسویں سال جلوس یعنی ۱۱۰۷ھ میں قلمبند ہوئی لکھتا ہے۔

> از انجا کہ حسن کانگو از نسل بہمن بن اسفندیار بن گشتاسپ بود از یں جہت او را بہمنیہ گفتندے۔ سلطان محمد علاء الدین عرف حسن کانگو کہ از معتقدان قدوۃ الاصفیا شیخ نظام الدین اولیا بود بموجب دعائے شیخ در ۷۴۸ھ دکہن را متصرف شدہ سکہ و خطبہ بنام خود کرد۔
>
> (خلاصۃ التواریخ قلمی ص ۲۹۳)

سید غلام حسین خاں جس نے سبحان رائے سے ستاسی سال بعد ۱۱۹۴ھ میں قلم اٹھایا لکھتا ہے:۔

> و علاء الدین حسن کہ بحسن کانگو مشہور و از جملہ سپاہیان ملک لاچین بود باتفاق جماعۂ اوباشاں در دولت آباد لوائے حکومت برافراشتہ خود را سلطان علاء الدین خطاب کرد۔ و حسن کانگو کہ از نسل بہمن بن اسفندیار بن گشتاسپ بود و ازیں جہت او را بہمنی گفتندے در سنہ ہفتصد و چہل و ہشت ہجری دکن را متصرف شدہ و سکہ و خطبہ بنام خود کرد۔
>
> (سیر المتاخرین مطبوعہ نول کشور جلد اول ص ۳۰۶)

خلاصۃ التواریخ اور سیر المتاخرین کے ماخذوں میں تاریخ فرشتہ بھی ہے تاہم انہوں نے اس سے اختلاف کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک فرشتہ کا یہ بیان کوئی اہمیت و صداقت نہیں رکھتا تھا۔

پس ثابت ہوا کہ حسن کانگو کا بہمن بن اسفندیار کی نسل میں ہونا کوئی نئی تلاش و تحقیق نہیں ہے بلکہ ابتدا سے تمام مورخ یہی مانتے اور لکھتے چلے آئے ہیں اور لطف یہ ہے کہ خود فرشتہ بھی اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

> بر مطالعہ کنندگان احوال سلاطین بہمنیہ مخفی و مستور نماناد کہ صاحب تاریخ تحفۃ السلاطین و سراج التواریخ و بہمن نامہ دکنی ۔ ۔ ۔ در اصل و نسب سلطان علاء الدین حسن کانگوی بہمنی صریحا حرفے نگفتہ اند اما در وقت ستائش بعضی جائیہا او را بشاہان کیان منسوب کردہ و بعضے جایہا او را بہ بہمن بن اسفندیار نسبت کردہ ستائش نمودہ اند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نقلست کہ مسود ایں اوراق ببلدۂ احمد نگر در سلک ملازمان مرتضیٰ نظام شاہ بحری انتظام داشت در کتاب خانۂ او رسالۂ بود مشتمل بر تحقیق اصل و نسب سلطان علاء الدین حسن کانگوی بہمنی و نام مصنف آں مذکور نبود بنظر ایں خاکسار بمقدار در آمد و ما حصل آں رسالہ اینکہ سلطان علاء الدین حسن کانگوی بہمنی از نژاد بہرام گور است بر ایں نہج سلطان علاء الدین حسن بن کیکاؤس بن محمد علی بن حسن بن سہام بن سیمون بن اسلام بن ابراہیم بن نصیر بن رستم بن کیقباد بن منوچہر بن نامدار بن سفندیار بن کیومرث بن خورشید بن صعصای بن نعفور بن فرخ بن شہریار بن عامر بن سہید بن ملک داؤد بن ہوشنگ بن نیک کردار بن فیروز بخت بن نوح بن صانع نسبت

صانع بچند واسطہ به بہرام گور میرسد وبہرام گور از نسل ساسانست وساسان از نسل بہمن بن اسفندیار کہ از خمسۂ بادشاہان کیان بود واینکہ سلطان علاء الدین حسن واولاد عظیم الشان اورا بہمنیہ گویند بدیں تقریب است اما آنچہ بخاطر ناقص جامع ایں اخبار میرسد آنست کہ چوں نام کانگوی بہمن جزو نام سلطان علاء الدین حسن گردیدہ اورا بہمنی گفتند ... (تاریخ فرشتہ صفحہ ۵۲۳-۵۲۵)

لیکن فرشتہ کی خطرناک غلطی یہ ہے کہ اس نے محض سوء ظن کی بنا پر تمام معتبر و مستند تاریخوں کو نظر انداز کرکے اپنے قیاس اور بازاری افواہوں کو ترجیح دی۔ سوء ظن کے سوا فرشتہ کے پاس مندرجہ بالا شجرۂ نسب کو باور نہ کرنے کی کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ اس کا سوء ظن سراسر بیجا ہے کیونکہ اہل اسلام میں ابتدا سے خاندانی شجرے محفوظ رکھنے کا دستور چلا آتا ہے۔ اعلیٰ خاندانوں میں شجروں کی صحت کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام کیا جاتا تھا۔ کوئی شخص کسی غیر کو اپنا مورثِ اعلیٰ نہیں فرض کرتا تھا۔ ہندوستان میں اکثر مسلمان شاہی خاندان نومسلم تھے لیکن کسی اہلِ دربار نے ان کو سید یا افغان یا ایرانی یا تورانی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دہلی کے غلام بادشاہوں نے کبھی اپنی اصل کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہا۔ ان حالات کے پیشِ نظر خاندان بہمنیہ کو اس معاملہ میں مستثنیٰ سمجھنا سخت غلطی ہے۔

علاوہ ازیں علاء الدین حسن اپنی تخت نشینی سے پیشتر ہی بہمن نژاد مشہور تھا جیسا کہ خود فرشتہ اعتراف کرتا ہے۔ ذیل کی عبارت قابلِ غور ہے:۔

.... ایشاں گفتند ہر کس را تو گوئی و فرمائی ما اطاعت نمودہ اورا بشاہی برمیداریم ناصر الدین شاہ گفت کہ حسن کانگوی المخاطب بظفر خاں بہمن نژاد است و آثار بزرگی و شجاعت از ناصیہ او ہویدا است و شائستۂ تاج و تخت است۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۲۵)

عبارت مندرجۂ بالا میں فرشتہ آپ اپنی تردید کرتا ہے کیونکہ اس کا یہ خیال کہ حسن کانگو کے بادشاہ ہونے پر شاعروں اور خوشامدیوں نے اس کا سلسلۂ نسب بہمن بن اسفندیار سے ملادیا بالکل بے اصل ٹھہرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن کے جلوس کے بعد درباریوں نے اس کے خاندان کو بہمن سے منسوب کرنے میں محض ایک حقیقت کا اظہار کیا جس میں مبالغہ کو کوئی دخل نہیں تھا۔

لفظ "کانگو" یا "کانکو" بھی تشریح طلب ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہفت اقلیم مؤلفہ امین احمد کا جو قلمی نسخہ ہے اس میں کانکو یا کانگو کی بجائے "کاکویہ" درج ہے جس کی نسبت بعض فضلائی رائے ہے کہ یہ حسن کے باپ کے نام کیکاؤس کی ایک مسخ شدہ صورت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا پورا نام مع ولدیت ولقب یوں ہونا چاہئے۔

علاء الدین حسن بن کیکاؤس بہمنی

یا باضافت پدری

علاء الدین حسن کیکاؤس بہمنی

(جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال جلد ۵ شمارہ ۱۱)

بہت ممکن ہے کہ حسن کی ابتدائی زندگی میں کثرت استعمال سے "کیکاؤس" کا "س" حذف ہوگیا ہو۔ اس صورت میں لفظاً "کیکاؤ" خفیف تغیرات کے ساتھ حسب ذیل شکلیں اختیار کرسکتا ہے:۔

(۱) ککاؤ
(۲) کانکاؤ
(۳) کانکو
(۴) کانگو

اس حالت میں حسن کا پورا نام ولقب اس طرح مرقوم ہوگا،

علاء الدین حسن کانکو بہمنی

اور عقدہ زیر بحث حل ہوجائے گا کیونکہ یہ ماننا پڑے گا کہ لفظ "کانکو" جو حسن کے نام کا ایک جزو بن گیا ہے دراصل اس کے باپ کے نام سے ماخوذ ہے نہ کہ کسی نجومی کے نام سے۔

الغرض فرشتہ کی شہادت کو جو محض غیر معتبر روایات و قیاسات پر مبنی ہے دیگر لاتعداد قدیم وجدید اور معاصر مورخوں اور تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں کے بیانات پر ترجیح دینا اصول تاریخ کے منافی ہے

(اقتباس از میرٹھ)

خدائے تمنّا سے

پھر سرِ بام وہی طور کے ساماں کر دے
اپنے جلووں کو ذرا اور نمایاں کر دے!

جنبشِ ناز سے پھر بال پریشاں کر دے
ظلمتِ کفر کو سرمایۂ ایماں کر دے!

آ کے اک ایک دلِ مایوس کو حیراں کر دے
اپنی صورت کو چراغِ شبِ ہجراں کر دے!

تو نگاہوں کو نہ تکلیفِ پشیمانی دے
درد کم ہو نہیں سکتا تو فراواں کر دے!

کر کے تجدیدِ وفا غمکدۂ شوق میں آ
آ ذرا گردشِ گردوں کو پشیماں کر دے!

دل بھی تو، روح بھی تو، جسم بھی تو، جان بھی تو
آج میں خود سے مخاطب ہوں ذرا "ہاں" کر دے!

رات ہنستی ہے اٹھا دے رخِ روشن سے نقاب
ماہِ کامل کو چراغِ تہِ داماں کر دے!

یا تو وہ ختم کرے ذکرِ عدو فکرِ عدو
یا کسی طرح اسے بھی مرا ارماں کر دے!

ہے خودی میں بھی دوئی اور جلا اور مٹا
داغ یہ دل میں دیا ہے تو درخشاں کر دے!

ہے گراں فطرتِ آزاد پہ قیدِ ہستی
کاش طالب کوئی جینے سے ہراساں کر دے

طالب باغپتی

دو دشمن درندوں کا دلچسپ دنگل!

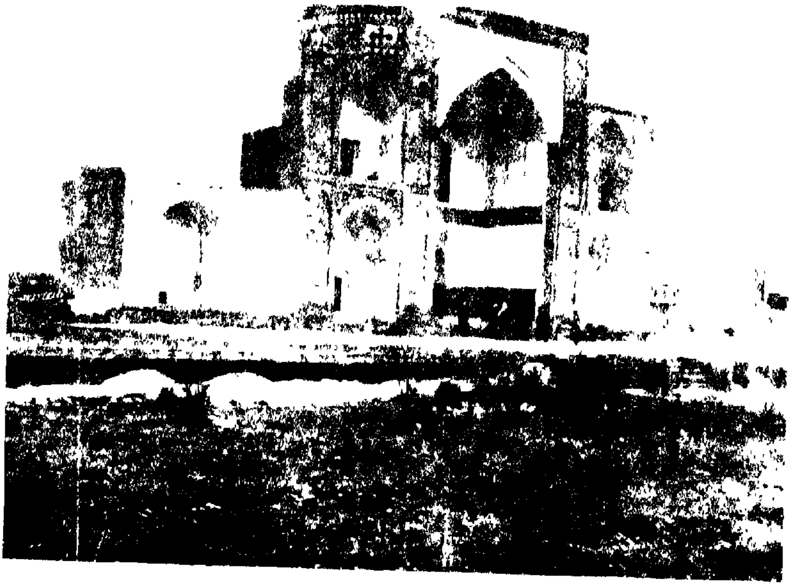
از جناب ایم ایم شمیم ملہوری

"اپنے دفتر بے معنی کا ہر ورق سے تیسرے سال مطالعہ کرنے پر... بعض اوقات اپنے پرانے مسلسل مضامین کے بعض اجزاء پریشان ایسے مل جاتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اُس زمانہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب مضمون نگاری کے شوق کی ابتدا تھی۔ طبیعت کی اُمنگیں۔ دل کے حوصلے بےحد بڑھے ہوئے تھے۔ دل چاہتا تھا۔ کہ ہر ایک مضمون ٹیگوریت۔ نگاریت .. چست بندشوں اچھوتی ترکیبوں۔ اور دقیق الفاظ کا طلسم ہو .. ذیل کا مضمون بھی اُسی وقت کا لکھا ہوا ہے۔ مگر اب چونکہ یہ اصول پیشِ نظر ہے .. کہ سادہ سلیس نگاری میں جو لطف ہے وہ کسی میں نہیں .. میں نے اس کو بڑی حد تک موجودہ رنگ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور کہیں کہیں پرانی یادگی برقرار رکھی ہے۔ اسکا صفحاتِ "عالمگیر" ہی میں شائع ہونا اس لئے ضروری تھا۔ کہ اسی مضمون کا پہلا حصہ تقریباً ۵ برس قبل "منظر مصیبت" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے .. وہ اور یہ دونوں بیان و اقعہ کے لحاظ سے بالکل مکمل ہیں۔ سوائے معمولی حوالہ جات کے اور کوئی تعلق نہیں۔ مگر اس سے اصل واقعہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ نہ پڑھنے والے کو بےلطفی ہو سکتی ہے۔ تاہم اگر ناظرین میری گذارش پر "منظر مصیبت" کا ایک بار مطالعہ کر کے۔ پھر اس واقعہ کو پڑھیں۔ تو بعید لطف آئے گا .. اور دلچسپی دوبالا ہو جائے گی۔ "عالمگیر" سے روپوشی کے متعلق بعض احباب نے جن اسباب کی بابتہ اظہار خیال فرمایا ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں۔ کہ وہ غلط ہیں۔ بس اس ایک شعر کو پڑھئے .. اور مطلب سمجھ لیجئے۔ ~

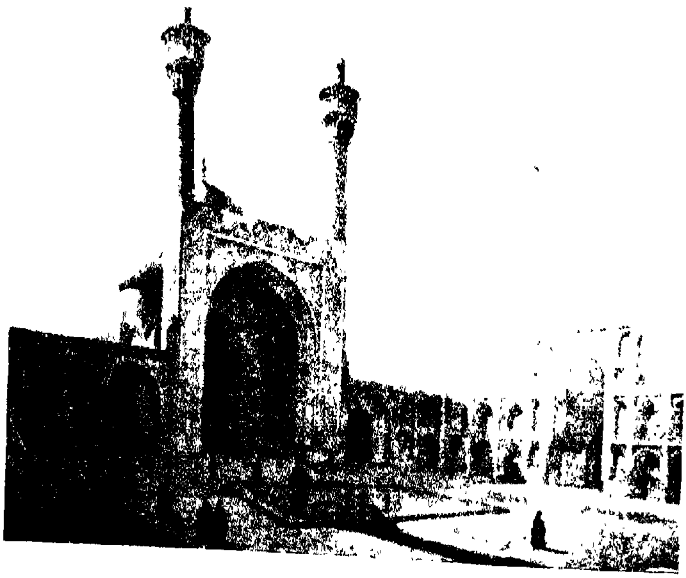
اب مجھ میں وہ دم ہی کہاں ہے   وہ دل وہ جگر۔ وہ جی کہاں ہے۔

شمیم ملہوری"

ظلمت شب کے عفریت سیاہ کو شکست دینے کے لئے۔ افقِ مشرق پر سپیدۂ سحر کے رزانی ہراولی دستہ نے اپنی صفیں آراستہ کرنا شروع کیں۔ ستاروں کے منہ پر زردی چھا گئی۔ اور وہ اس طرح بتدریج غائب ہونے لگے۔ جس طرح عروس نو گھونگھٹ کے آڑ میں شرمگیں انداز سے منہ چھپا لے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شہنشاہ خاور کے پرشکوہ طلوع نے سطح کائنات کے ہر ذرہ کو منور و تاباں کر دیا .. اور دنیا کی ہر شے ذی روح نظر آنے لگی .. میں کشتی میں بیٹھا ہوا۔ خدا معلوم کن خیالات میں محو۔ ان مناظر فطرت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پانی کا نشیب و فراز .. امواج کی دلربا اٹھکیلیاں۔ کشتی کی رفتار۔ فضا خاموش۔ ہر شے فطرتی اثر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی۔ اور بحر ذخار کی سطح آب پر طلوع مہر کا عکس ایسا شاندار نظارہ پیش کر رہا تھا جس کا اظہار قلم سے ناممکن ہے ...... ہاں .. یہ طلوع آفتاب میرے اٹھارہ ہمسفروں کے لئے آخری .. اور ہم باقیماندہ کے مصائب کا ابتدائی نشان تھا .. چند ساعت قبل ہم اپنے اٹھارہ ساتھیوں کو آبی قبر کے گوشے میں سلا چکے تھے۔ مگر میرے لئے یہ کس درجہ شکر کا مقام تھا۔ کہ میرا لخت جگر۔ گوشۂ دل۔ راحت جاں .. نورِ نظر .. پیارا اسد مجھ سے چھن کر پھر مجھ سے آن مل چکا تھا ... میں بار بار سجدہ ایزدی بجا لا رہا تھا۔ کہ یکایک کشتی کے ذرا سے گھماؤ نے .. تو کیا اس کی بعض منا چٹان۔ یا مونگی کر۔ جس کے تئے ہم نے جان کا خطرہ میں ڈال کر



مقبرہ عمر خیام



اصفہان کی ایک مسجد

[illegible] ۔ قرن [illegible]
[illegible] ... اور اس چٹان
[illegible] ... کی پشت
[illegible] نے اس [illegible]
[illegible] ۔ اور جھک کر کشتی میں پیچھے ہٹ گیا۔
[illegible] ۔ کہ چٹان کی جسامت ... فٹ .. اور سطح پر تقریباً
... فٹ ... بالکل حبشی کے سر کی طرح تراشی گئی تھی۔ چہرہ
کی [illegible] انتہائی مہیب اور ڈراؤنا تھا ۔۔ اس
میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں۔ ویسے ہی بھدے گال .. موٹے موٹے
ہونٹ ۔ اور چپٹی ناک ۔ شعاع آفتاب میں صاف و واضح نظر
آرہی تھی ۔ سر کی گولائی جو ہزاروں برس پیشتر سے آب و ہوا اور
[illegible] کے اثر سے بعینہ انسان کے سر سے مشابہ ہوگئی تھی
اس پر بے ساختہ خس و خاشاک کی روئیدگی نے سونے پر سہاگہ
کا کام کیا تھا۔ کہ دور سے آفتاب کی روشنی میں خاصا بالوں کا گمان ہوتا
تھا ... واقعی عجیب حیرت خیز نظارہ تھا۔ اتنا عجیب ۔ کہ اب مجھے
یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ۔۔ کہ یہ دست قدرت کی کرشمہ
سازی نہ تھی ۔ بلکہ زمانہ سلف کی کسی برباد شدہ قوم نے مشہور و
معروف اہرام مصر کی طرح یہ عفریتی شکل بھی۔ زبردست چٹان کو تراش کر
ایک وقت [illegible] ہی تعمیر کیا تھا .. تاکہ مخالف حملہ آور دشمن کی مدافعت
کی جا سکے .. یا کسی کو اس طرف آنے کی جرأت نہ ہو .. بدقسمتی سے
مجھے اس امر کی تصدیق کا کوئی موقعہ نہ مل سکا۔ اس لئے کہ اس چٹان تک
[illegible] سے پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ علاوہ بریں
[illegible] دیکھتے تھے ... ہاں .. واقعات مابعد کے پیش آجانے
[illegible] یقین ہے ۔ کہ یہ انسانی ہاتھوں کی صنعت تھی
[illegible] یقین دلانے کی بابت میرے پاس سوائے
[illegible] کوئی جواب نہیں ۔ کہ یہ حبشی کا سر رکھنے والی چوٹی ۔۔ اب
[illegible] وطن غیر [illegible]
[illegible] ہزار برس پیشتر
[illegible] مصری شاہزادی سے بیٹے

[illegible] قلعہ اطلسی کی [illegible]
میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں .. کہ ہماری یا ہم جیسی صدیاں پیشتر آئیں
اور چلی گئیں۔ اسی طرح ہماری موت کے بعد بھی خدا معلوم کتنی صدیاں
اور گزر جائیں گی .. مگر وہ بدستور اسی جگہ موجود رہے گی .. کہ جب
تک روزِ حشر ہی اس کی ہستی کو معدوم کر سکے ۔

"کیوں ۔۔ جہانگیر تم نے اس حبشی نما چوٹی کو دیکھ کر کیا رائے قائم
کی .." میں نے اپنے رفیق ملازم سے سوال کیا ۔ جو کشتی کے ایک
گوشہ میں بیٹھا ہوا سوپ کھا رہا تھا .. رات کے المناک مصائب
نے اس کی شکل بگاڑ دی تھی ۔ میں نے اس ناخوشگوار آتشیں عفریتی
شکل کی طرف اشارہ کیا۔

"اف ۔! ۔۔ خدا ۔ ... یہ کیا ؟ .... حضور ۔" جہانگیر نے اس چوٹی کی
مہیب نوعیت کو پہلی بار غور سے دیکھ کر کہا ... "میں سمجھتا ہوں ۔ کہ کوئی
بڈھا خبیث اپنی تصویر کھنچوانے کے لئے ان چٹانوں پر بیٹھ
گیا ہے ۔"

میں ہنسا .. اور میرے قہقہہ نے نور نظر اسد کو بیدار کر دیا ..
"ہائیں ۔ یہ کیا ؟" اس نے بیدار ہوتے ہی کہا .. یہ میری کیا حالت
ہے ۔ میں تو بالکل بھیگا ہوا پڑا ہوں .. دوسری بڑی کشتی کیا ہوئی ...
مجھے ذرا سا پانی پلائیے۔"
"راحت جان ۔ بیٹا اسد .. تمہیں شکر ایزدی بجا لانا چاہئے ..
کہ تم زندہ تو ہو ۔" میں نے انتہائے شفقت سے اس کے سر پر
ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔ "بڑی کشتی ڈوب گئی ۔ اور اس کا ہر مسافر
ہم چاروں کے سوا بحر فنا میں غرق ہو چکا ۔ تمہاری جان کا بچنا بھی معجزہ
سے کم نہیں ۔ بس ایک کرشمہ قدرت تھا ..." اس طرف جہانگیر
ہماری ذاتی کشتی کے خانوں میں اسد کے لئے پانی اور گلاس تلاش
کر رہا تھا .. ادھر میں نے اسد سے رات کی المناک مصیبت کا تمام
واقعہ مختصر طریق پر بیان کر دیا۔

"الٰہ العالمین" اس نے آہستہ سے کہا ۔ "کتنی عجیب بات ؟ ....
کیا شان قدرت ہے ۔ کہ صرف ہم چار اس طرح زندہ رہنے کے
لئے باقی رہ گئے ۔"

اتنے میں صراحی اور پانی کا گلاس آگیا۔ جسے ہم سب نے خوب دل کھول کر پیا۔ اور اس کی موجودگی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ مہر عالمتاب کی شعاعیں تیز ہو رہی تھیں۔ اور اس کی فرحت بخش گرمی ہمارے ترجسم اور تھکے ہوئے اعضاء کو بیحد آرام پہونچا رہی تھی۔ اس لئے کہ ہم کو متواتر پانچ چھ گھنٹوں سے تر کپڑوں میں گذارنا پڑا تھا۔

"آہا.." صراحی ایک طرف رکھتے ہوئے.. اسد کی زبان سے نکلا... "وہ سر جس کا تحریر میں ذکر ہے۔ سامنے نظر آرہا ہے۔ یعنی وہ چٹان۔ جو حبشی کے سر سے مشابہ ہے۔"

"ہاں .. ہاں ... وہ سامنے نظر آرہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آہ .. تو کیا وہ تحریر لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔"

"اس سے یہ امر تو لازم نہیں آتا۔" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا: "ہمیں اس چوٹی کے متعلق معلوم تھا۔ کیونکہ تمہارے والد مرحوم نے بھی اس کو دیکھا تھا۔ بہت ممکن ہے.. کہ یہ وہ سر نہ ہو۔ جس کا تحریر میں ذکر ہے۔ اور بفرض محال یہ وہی ہے۔ تو اس سے آگے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی.."

اسد میری بات سنکر فاتحانہ انداز سے مسکرایا.. اور کہنے لگا.. "چچا منیر فرخ قزلباش.. کیا آپ خدانخواستہ یہودی ہیں۔ کہ کسی بات کا یقین ہی نہیں کرتے۔ اب اگر زندگی باقی ہے۔ تو آنکھیں سب کچھ دیکھ لیں گی.."

"بجا ہے... انشاءاللہ.." میں نے کہا: "یہ بات تو غالباً تم بھی تسلیم کرو گے۔ کہ ہم اسوقت ایک ریتیلے ساحل کے قریب کسی دریا کے دہانہ میں چل رہے ہیں.. جہانگیر.. ذرا اپنی پتوار تو سنبھالو۔ ساحل کے قریب چل کر دیکھیں۔ آیا کہیں حفاظت سے اترنے کی بھی جگہ ہے.. یا نہیں.."

دریا کا دہانہ جس میں ہم اب داخل ہو رہے تھے۔ زیادہ چوڑا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ کہرہ کے ابخرات جو ہر دو جانب کناروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ہمارے لئے اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ لگانے میں حائل تھے.. مشرقی افریقہ کے قریب قریب تمام دریاؤں کے منطابق دہانہ پر کافی روک کا سامان جمع تھا۔ جس وقت ساحل پر ہوا کا زور ہو۔ اور پانی کا بہاؤ نیچے کی طرف ہو۔ تو کشتی کے لئے ایک انچ بھی آگے بڑھنا ناممکن ہو سکتا ہے.. مگر اس وقت صورت حالات بالکل مختلف تھی.. اور مشکل حل ہو سکتی تھی..... ہم تقریباً ۲۰ منٹ میں اس کو عبور کر گئے۔ لطف یہ کہ ہم کو زیادہ کوشش بھی نہیں کرنا پڑی.. ساحل پر چلنے والی ہلکی ہوا نے تھوڑے سے بہت جھٹکے اور جھکولے دے کر ہمیں از خود اس روک سے گذار دیا۔

اس عرصہ میں آفتاب کی گرمی نے کہرہ کو ناپید کرنا شروع کر دیا۔ اور حدت ہر لحظہ بڑھنے لگی.. ہمیں پہلی بار معلوم ہوا.. کہ دریا کا دہانہ یہاں پر تقریباً بالنصف میل چوڑا تھا۔ کناروں پر دلدل تھی.. اور ہزارہا مگر اور گھڑیال لٹھوں کی طرح پڑے ہوئے لوٹ رہے تھے۔ ہم لوگوں کے سامنے تقریباً ایک میل فاصلہ پر زمین سخت اور ہمارے مفید مطلب نظر آتی تھی۔ چنانچہ ہم نے اسی طرف کشتی کو چلانا شروع کیا.. پندرہ ہی منٹ میں ہم وہاں پہونچ گئے۔ کشتی کو ایک خوبصورت درخت سے باندھ کر۔ جس کے پتے نہایت چوڑے اور چمکیلے تھے۔ پھول یاسمن سے مشابہ۔ گلاب کی رنگت کے پانی پر جھکے ہوئے تھے۔

بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہہ کر ہم اتر پڑے۔

اترتے ہی ہم نے کپڑے اتارے.. بدن مل مل کر صاف کیا۔ کپڑے دھو کر پھیلائے۔ کشتی کا سامان بھی نکال کر دھوپ میں رکھدیا۔ جو اتنی جلدی خشک ہو گیا.. کہ ہم کو حیرت ہو گئی۔ دھوپ سے بچنے کے لئے ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر ہم نے بھنے ہوئے خشک گوشت کا ناشتہ کیا۔ جو ہمارے ساتھ کافی مقدار میں موجود تھا۔ اور اپنی اس عقلمندی پر کہ ہم نے ایک روز قبل اپنی کشتی میں تمام سامان اچھی طرح رکھ لیا تھا۔ ہم باہم مبارکباد دے رہے تھے.. ورنہ یہ سب سامان بڑی کشتی کے ساتھ غرق ہو جاتا.... ہم ناشتہ سے فارغ ہی ہوئے تھے۔ کہ کپڑے بالکل خشک ہو گئے۔

اتنے میں کہ طبیعت قدرے بشاش ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ سوائے ماندگی اور چند خراشوں کے ہمیں اس المناک طوفان سے بہت ہی کم صدمہ پہونچا تھا۔ جس نے ہمارے اشارہ

ساتھیوں کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ دنیا سے معدوم کر دیا تھا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ اسد نیم غرق ہو چکا تھا۔ لیکن یہ بات اسد کے مانند ۵۴ سالہ طاقتور اور کسرتی نوجوان کے لئے زیادہ باعث تشویش نہ تھی۔ اور وہ اس وقت بالکل چاق و چوبند تھا۔۔

خیر... اب فارغ ہو کر ہم نے اپنے گرد و پیش دیکھ بھال کا ارادہ کیا۔ ہم ایک ایسے خشک و سخت قطعہ زمین پر تھے۔ جو ۳۰ گز چوڑا اور ۵۰۰ گز لمبا تھا۔ جسے دریا کے ایک جانب ساحل یا گھاٹ کہنا بجا نہ ہوگا... باقی ماندہ ہر سہ اطراف میں دلدل کا ایک ویران وغیر مختتم سلسلہ تھا۔ کہ حد نظر تک دلدل ہی دلدل دکھائی دیتی تھی۔ یہ قطعہ زمین اپنے گرد و پیش کی دلدلی زمین کی سطح سے تقریباً ۲۵ فٹ اونچا اور اسی قدر دریائی سطح سے بلند بنایا گیا تھا۔ اس میں خوف کلام نہیں۔ کہ یہ بھی انسانی ہاتھوں کا تعمیر کردہ تھا۔

"یہ جگہ تو بالکل گھاٹ کی طرح معلوم ہوتی ہے۔۔" اسد نے سوچ کر کہا۔

"لغو..." میں نے جواب دیا۔ "وہ کون بیوقوف ہوگا جس نے ان خوفناک دلدلی قطعات زمین کے درمیان کشتی وغیرہ کے ٹھہرنے کے لئے گھاٹ بنانے کی فکر کی ہو گی۔۔ جہاں کسی طرف آبادی کا نشان نہیں۔۔ اور اگر کوئی آبادی بھی ہو گی۔۔ تو وحشیوں کی..."

"غالباً یہ ہمیشہ سے دلدل ہی نہ ہوگی... اور نہ لوگ ازل سے وحشی ہونگے۔۔" اسد نے اسی خشک انداز میں کہا۔۔ ہم دریا کی جانب منہ کئے۔ اس کے نشیبی کنارہ کو دیکھ رہے تھے۔۔ "یہ دیکھئے" اس نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کر کے بتلایا۔۔ جہاں گذشتہ شب کے طوفان باد نے ایک منگولیا یاسمن کے مانند درخت کو جو بالکل ساحل کے نشیبی حصہ میں کھڑا تھا۔ جڑ سے اکھاڑ کر گرا دیا تھا۔۔ اس کی جڑ اپنے ساتھ مٹی کا بہت سا تودہ لئے پانی سے باہر نکل پڑی تھی۔۔ "کیا یہ پتھر اور چونے کا کام نہیں۔۔ اگر نہیں ہے۔ تو اس سے زیادہ حیرت خیز مشابہت اور کیا ہو سکتی ہے"

"پھر وہی لغویت۔" میں نے ہنس کر کہا۔۔ اور ہم لوگ اتر کر اس جگہ پہونچ گئے۔ جہاں جڑ اکھڑی پڑی تھی۔۔

"جی ہاں۔ ذرا ملاحظہ کیجئے" اسد نے آنکھیں مارتے ہوئے کہا۔

اس مرتبہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ رفع ندامت کے لئے سر جھکا کر سیٹی بجانے لگا۔۔ واقعی اس جڑ کے ساتھ زمین کا ایک حصہ لگا ہوا تھا۔۔ جو بلاشک و شبہ بڑے پتھروں اور چونہ کی جڑائی کا بنا ہوا۔ اتنا سخت تھا۔ کہ میں اپنے شکاری چاقو سے بھی اس پر کوئی نشان تک نہ بنا سکا۔ صرف یہی نہیں۔۔ بلکہ اسی جگہ صاف زمین کی دیوار نما تہ میں کچھ کھلا ہوا حصہ دیکھ کر میں نے وہاں کی نرم مٹی ہاتھ سے ہٹائی۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ پتھر کا ایک دائرہ تقریباً ایک منٹ قطر کا بنا ہوا موجود ہے۔۔ اسے دیکھ کر میرے پیر لڑکھڑا گئے... اور پیشانی پر عرق آگیا۔

"چچا مسٹر فرخ... یہ کسی زمانہ میں وہ گھاٹ ہوگا۔۔ جہاں بڑی کشتیاں ٹھہرتی ہونگی... میں صحیح عرض کرتا ہوں نا؟" اسد نے درپردہ میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے... دانت نکال کر کہا۔۔

میں نے جواب میں "لغو" کہنے کی کوشش کی۔۔ مگر الفاظ حلق ہی میں اٹک کر رہ گئے۔ یہ شکستہ دائرہ خود ہی اپنا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ یقیناً کسی گذشتہ زمانہ میں جہاز اس جگہ لنگر انداز ہوتے ہونگے۔ اور یہ سنگی دیوار بلاشک و شبہ تعمیر کردہ گھاٹ کا باقی ماندہ حصہ تھی۔ اور غالباً وہ شہر جس کے لئے یہ گھاٹ بنا تھا۔ اب ان دلدلوں کے نیچے دبا پڑا ہوگا۔

"چچا فرخ۔۔ اب کچھ کچھ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تحریر کی حکایت میں اصلیت ہے۔۔" مسرور اسد نے اور زیادہ چھیڑتے ہوئے کہا۔ میں نے سامنے نظر آنے والے حبشی کے سر اور اس تعمیر شدہ دیوار پر نظریں جمائے ہوئے۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ خود ہی کہنے لگا۔۔

"افریقہ کے مانند ملک میں۔ زمانہ سلف کی مردہ اور بھولی ہوئی تہذیب کی یادگاروں کا ہونا ناممکنات سے نہیں۔ مصری تہذیب کی صحیح تاریخ کا آج تک کسی کو علم نہیں۔۔ کیا عجب اس کی شاخیں یہاں تک پھیلی ہوئی ہوں۔۔ جس طرح اہالیان بابل... ایسینیا۔ فارس وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک قوم کم و بیش مصری تہذیب سے

آراستہ تھی۔ یہودیوں کا ذکر ہی کیا۔ جن کو آج کل زمانہ مانتا ہے ... بہت ممکن ہے۔ ان میں سے کسی قوم کا اس جگہ تجارتی بندرگاہ .. یا مملکت کا کوئی حصہ واقع ہو۔ ارے میاں .. تمہیں یاد ہے .. قلوہ کے نزدیک ہم کو سفیر سلطنت نے فارس کے چند دبے ہوئے شہروں کے قدیم آثار دکھلائے تھے۔

"جی ہاں۔ بجا ہے۔" اور کہنے لگا "مگر یہ تو آپ کے پہلے بیان سے قطعی مختلف ہے .."

"خیر۔ اب کیا کیا جائے۔" میں نے بات کو ٹالتے ہوئے سوال کیا۔

چونکہ اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس لئے ہم لوگ ٹہلتے ہوئے دلدل کے کنارے تک پہونچ گئے۔ اور اس پر نگاہ دوڑائی۔ واقعی اس کی کوئی انتہا نظر نہ آتی تھی۔ اور اس کے غاروں سے ہزار ہا قسم کے دریائی پرندوں کے جھنڈ اِدھر اُدھر اُڑتے نظر آرہے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کی کثرت سے آسمان بھی گناہوں سے پوشیدہ ہو جاتا .. اب چونکہ آفتاب کی گرمی بڑھ رہی تھی۔ اس نے اس دلدل سے زہریلے ابخرات کے ہلکے ہلکے بادل اور چشموں سے لرزاں دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔

"مجھے دو باتیں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔" میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ جو اس نظارہ کو مایوسانہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ "اول یہ کہ ہم اس دلدل کو کسی طرح عبور نہیں کر سکتے .. دوسرے یہ کہ اگر ہم یہاں مقیم رہیں تو یقیناً بخار سے ہلاک ہو جائیں گے۔"

"حضور .. یہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔" جہانگیر بولا۔

"بہت خوب .. تو اب ہمارے پاس دو ہی چارہ کار ہیں .. یا تو ہم کشتی واپس کر کے سمندر میں کسی بندرگاہ کی تلاش کریں۔ جہاں جہاز مل سکے۔ یا اس دریا میں اور آگے بڑھ کر دیکھیں۔ قسمت کہاں پہونچاتی ہے۔"

"خدا معلوم آپ کا فیصلہ کیا ہو۔" اسد نے جواب دیا۔ "میں تو اسی دریا میں آگے بڑھ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ کیا پیش آتا ہے۔"

جہانگیر کی آنکھیں بھر گئیں۔ اور ہمارے عرب دوست نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اور ایک آہ بھر کر چپ ہو گیا۔ رہا میں .. میں نے نہایت نرم لہجہ میں سمجھایا۔ کہ ہم لوگ اس وقت عفریتی شکل اور بحر زخار کے درمیان معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کا کیا غم ہو سکتا ہے۔ کہ ہم کہاں ہیں۔ اور کہاں نہیں .. مگر سچ پوچھئے۔ تو دل میں میری بھی یہ خواہش تھی۔ کہ اسد کے کہنے کے مطابق آگے بڑھ کر دیکھا جائے۔ اس سنگی حبشی کے سر اور پختہ سنگی گھاٹ کی موجودگی نے میرے جذبہ استعجاب کو اس درجہ برانگیختہ کر دیا تھا کہ مجھے دل ہی دل میں شرمندگی و ندامت کا احساس ہو رہا تھا۔ تاہم میں یہ چاہتا تھا۔ کہ خواہ جان جائے یا رہے .. بہرحال اس کا رفع کرنا لازمی ہے چنانچہ بادبانوں کو احتیاط سے درست کر کے۔ کشتی کو سنبھالا۔ اور اپنی اپنی بندوقیں ہاتھ میں لیکر ہم پھر سوار ہو گئے .. اور آگے چل دیئے۔

خوش قسمتی سمجھئے کہ اس وقت ہوا کا رخ سمندر کی جانب سے ساحل کی طرف تھا۔ اس لئے ہمیں کشتی بڑھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ہمیں یہ بعد ازاں معلوم ہوا کہ عموماً صبح سے لے کر کچھ گھنٹے ہوا کا

نوٹ .. مشرقی ساحل افریقہ پر۔ قلوہ کے قریب۔ زنجبار سے تقریباً .. ۴ میل فاصلہ پر ایک ٹیلہ ہے۔ جو حال ہی میں امواج کی ٹکروں سے کھل کر پیدا ہو گیا ہے۔ اس ٹیلہ کی چوٹی پر بہت سی ایرانی وضع کی قبریں اور مزار بنے ہیں۔ جو انہیں پر مندرج تاریخوں کے مطابق .. ۷ سال قبل کی معلوم ہوتی ہیں۔ ان قبروں کے نیچے ایک مٹی کی سطح ہے۔ جو کسی شہر کی برباد شدہ بستی کا پتہ دیتی ہے۔ اس ٹیلہ سے اور نشیب کی طرف بڑھ کر مٹی کی ایک دوسری سطح ہے۔ جو کسی مزید قدیم شہر کا منہدم حصہ معلوم ہوتی ہے .. اس سے بھی آگے نشیب کی جانب ایک اور تیسری سطح ہے۔ جو کسی ایسے وسیع شہر کی بربادی کے آثار لئے ہوئے ہے۔ جس کا علم فانی انسان کو نہیں۔ اس آخری شہر کی سطح زمین پر کچھ نمونے چمکیلے مٹی کے برتنوں کے ایسے پائے گئے .. جو انہیں سے ملتے جلتے اب تک اس ساحل کے گرد و نواح میں ملتے ہیں .. میرا خیال یہ ہے .. کہ یہ برتن اس وقت لندن کے مشہور و معروف ماہر آثار قدیمہ سر جان کرک کے قبضہ میں ہیں .. (مرتب)

رخ سمندر سے ساحل کی طرف۔ اور غروب آفتاب کے وقت ساحل سے سمندر کی طرف رہتا تھا۔ اس راز کا فلسفہ جو میں عرض کر سکتا ہوں۔۔ غالباً یہ ہے۔ کہ جس وقت زمین رات کی خنکی۔ اور شبنم کی ریزش سے سرد ہو جاتی ہے۔۔ تو گرم ہوا اُٹھ کر سمندر سے ساحل کی طرف چلنے لگتی ہے اور جیوں ہی سطح زمین آفتاب کی حدت سے گرم ہوئی۔ اس کا رخ بدل جاتا ہے۔ خیر صورت حال کچھ ہو۔۔ اس خطہ ملک میں ایسا ہی دیکھا گیا۔۔

اس موافق ہوا کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم لوگ نہایت خوش خوش ۸ گھنٹے متواتر دریا میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایکبار ہم ایک دریائی گھوڑے کے پاس پہونچ گئے جس نے سر نکال کر ہماری کشتی سے دس بارہ ہاتھ کے فاصلے سے اس زور کی چھنکار ماری۔۔ کہ جہانگیر کا تو دم نکل گیا۔ اور اگر سچ پوچھئے۔ تو میں بھی ڈر گیا۔ یہ زندگی میں پہلی بار دریائی گھوڑا دیکھنے کا اتفاق تھا۔ اور اگر اسے جذبۂ شوق کا مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ تو شاید ہم پہلے ہندوستانی باشندے تھے۔ جن کو دریائی گھوڑ اس طرح زندہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔۔ واللہ۔۔۔ ایک یا دو بار تو مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ ہماری کشتی پر چڑھے آتے ہیں۔ اسد نے چاہا۔ کہ بندوق کا فیر کر دے۔۔ مگر میں نے نتائج کا خیال کر کے اُسے باز رکھا۔۔ ان کے علاوہ صدہا گھڑیال دلدلی ساحل پر لوٹیں لگا رہے تھے۔ اور لکھوکھا دریائی جانور اس طرف اُس طرف مصروف پرواز تھے۔ ان میں سے چند کو ہم نے شکار کیا۔ منجملہ ان کے ایک جنگلی ہنس بھی تھا جس کے پروں پر نوکیلے خاروں کے علاوہ۔۔ دونوں آنکھوں کے درمیان سے نکلا ہوا تقریباً ایک انچ لمبا ایک اور کانٹا تھا۔۔ اس کے بعد پھر ہمیں اس قسم کا کوئی ہنس شکار میں نہیں ملا۔ اس لئے میں عرض نہیں کر سکتا۔ کہ آیا یہ کوئی معمولی دریائی جانور تھا۔۔ یا کسی خاص نسل کا پرند تھا۔۔ جو کمیاب ہے۔۔ یہ میں نے اس لئے بیان کر دیا۔ کہ ماہران علم الحیوانات اس معاملہ پر غور فرمادیں جہانگیر نے اسکا نام گھڑیالی ہنس رکھ دیا۔

دوپہر کے وقت آفتاب کی حدت بحد شدت ہو گئی۔ اور اس وقت دلدلی کناروں سے جو بخارات اُٹھنا شروع ہوئے۔ وہ اسدر جہ بدبودار اور ناگوار خاطر تھے۔ کہ ہمیں مجبوراً احتیاط صحت کی خاطر کونین کی چند خوراکیں نگلنا پڑیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہوا قطعی بند ہو گئی۔ اور ایسی صورت میں اپنی کشتی کو آگے بڑھانا ایک امر عبث تھا۔ مگر ہم اس سے خوش تھے۔ کہ خوش قسمتی نے ہمیں چند درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب سایہ میں پہونچا دیا تھا۔ یہ عجیب قسم کی جھاڑیاں تھیں۔ جو لب دریا کثرت سے اُگی ہوئی تھیں۔ ہم یہاں پہونچکر رُک گئے۔ اور لیٹ کر آرام کرنے لگے۔ تاکہ غروب آفتاب تک کچھ راحت مل جائے۔۔ کچھ دور آگے ایک پایاب جگہ میں زمین کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ ہم نے ارادہ کیا۔۔ کہ رات کی آمد سے پہلے اس جگہ پہونچ جانا ضروری ہے۔۔ پھر کچھ بندوبست کیا جائیگا۔ ہم کشتی کو کھولنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے۔۔ کہ یکایک ایک دریائی ہرن۔۔ بڑے خمدار سینگوں اور پیٹھ پر سفید دھاریوں والا۔۔ پانی پینے کے لئے کنارے پر نظر آیا۔ اُس کو قطعی علم نہ تھا۔ کہ اُس جگہ سے پچاس ہی گز فاصلہ پر ہم کشتی میں چھپے بیٹھے ہیں۔ سب سے پہلے اسد کی نگاہ اُس پر پڑی۔ چونکہ وہ پختہ نشانہ باز۔۔ اور شکار کا شوقین تھا۔۔ اسے دیکھتے ہی اس کے تیور بدلے۔۔ میں فوراً ہی تاڑ گیا۔۔ اور معاً اُس کی بندوق اُٹھا کر اُسکے ہاتھ میں دیدی۔۔ اور خود بھی اپنی بندوق سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"لو دیکھو۔" میں نے آہستہ سے کہا "خبردار نشانہ خطا نہ ہو۔۔"

"خطا؟۔۔۔" اس نے نہایت حقارت سے منہ بنا کر جواب دیا۔ "اگر میں کوشش بھی کر دوں۔ تب بھی ایسا صاف نشانہ خطا نہیں ہو سکتا۔۔۔"

ادھر اُس نے اپنی بندوق اُٹھائی۔ اُدھر ہرن نے عجیب شان رعنائی کے ساتھ پانی پی کر سر اُٹھایا۔ اور دریا پر ایک اچٹتی نظر دوڑائی وہ غروب ہونے والے آفتاب کے مقابل ایک بلندی پر کھڑا تھا۔

جو دلدل سے بالکل ملی ہوئی جگہ تھی۔ خدا جانتا ہے۔ کتنا اچھا منظر تھا۔ خدا معلوم اس کی اداؤں میں کیا شان دلفریبی تھی۔ کہ واللہ میں اگر سو برس بھی زندہ رہوں۔ تو اس دلفریب نظارہ کی یاد میرے دماغ سے محو نہ ہو سکے گی۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے میرے لوح دماغ پہ اسے کندہ کر دیا ہے۔۔ دائیں۔ بائیں۔ ہلاکت آفریں دلدل کے تنہا ویران قطعات زمین۔ حد نظر تک لامتناہی غیر مختتم میدان۔۔ یہاں وہاں گندلے سیاہ پانی کے تالاب نما گڑھے۔ ڈوبنے والے آفتاب کی سرخ شعاعوں سے عکس پذیر ہو کر آئینہ کی طرح چمک رہے تھے۔ ہمارے عقب میں اور سامنے سطح دریا کی چوڑائی۔ حد نظر تک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی۔۔ مڑ مڑ کر نظروں سے اوجھل معلوم ہوتی تھی۔ اس کے پانی پر دن کی آخری روشنی سواد شب سے اٹکھیلیاں کرنے میں اس طرح مصروف تھی۔ جیسے ہلکی باد نسیم۔ چھوٹے چھوٹے پودوں سے کھیلا کرتی ہے۔ مغربی سمت ڈوبنے والے آفتاب کا سرخ کرہ۔ بتدریج کہرہ اور ابخرات کی فضا میں غرق ہو رہا تھا۔ آسمان پر ہر طرف سارس۔ مرغابی۔ بط اور صدہا آبی جانور قطار در قطار اُڑتے نظر آتے تھے۔ شفق کی سرخی میں ان کی پرواز کا عالم طلائی منظر پیش کر رہا تھا۔ ان تمام باتوں کے درمیان ہم تین ہندوستانی باشندے۔ اور ایک عرب۔ محو حیرت۔ ٹکٹکی باندھے۔ مناظر فطرت پر نثار۔ بحر فنا کے دشت ناپیدا کنار میں کھڑے۔ سامنے ایک خوبصورت ہرن کا نظارہ کر رہے تھے۔

دنانے کی آواز؟... اور وہ جست کر کے بھاگا... اسد کا نشانہ خالی گیا... کہ معاً دوسرا دناکا ہوا... پھر خالی گیا... بس ایک اور... گو وہ تیر کی طرح اُڑا جاتا تھا... مگر یہ تیسرا فیر؟ ...... وہ گرا؟.... "تھیا اسد۔ نہ کہتا... میں نے اس وقت تمہاری اشک شوئی کر دی"۔ میں نے اس موقعہ پر خوش ہو کر محض اسد کو چڑانے کے لئے کہا۔

"جی ہاں... توبہ.. لاحول ولاقوۃ" اسد نے بگڑ کر کہا۔ مگر بلایک اپنی پرانی عادت کے مطابق تبسم کے ساتھ۔ جو اس کے حسین چہرہ کو دلربا بنا دیتی ہے۔۔ کہنے لگا۔۔ چچا جان معاف کیجئے گا... میں مبارکباد دیتا ہوں۔ کہ اس وقت آپ کا نشانہ قابل تعریف تھا۔ میرا قطعی ناکارہ"

ہم لوگ کشتی سے اُتر کر ہرن کی طرف دوڑے۔۔ جس کے ریڑھ پہ گولی لگی تھی۔۔ اس کو ذبح کر کے صاف کرنے اور عمدہ گوشت نکالنے۔ دھرنے دھرانے میں تقریباً آدھ گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اور اتنے ہی عرصہ میں شام کی تاریکی اتنی بڑھ گئی۔۔ کہ اس پایاب حصہ زمین تک پہنچنے کے لئے کشتی کو کھینا مشکل ہو گیا۔۔ اس جگہ دلدل میں ایک کھوکھلی سی جگہ پیدا ہو کر پانی زیادہ پھیل گیا تھا۔ چنانچہ اس جھیل نما قطعہ سے تقریباً ۳۰ گز فاصلہ پر ہم نے اپنی کشتی ٹھہرا دی۔۔ ہم ساحل پہ اُترنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ خدا معلوم وہاں کوئی خشک جگہ ٹھہرنے کے قابل تھی یا نہیں۔ اس کے علاوہ دلدل سے اُٹھنے والے زہریلے ابخرات کیا کم تھے۔ ان سے بچنے کی یہی واحد ترکیب ہماری سمجھ میں آئی۔ کہ دور پانی ہی میں قیام کیا جائے۔ ہم نے لالٹین جلائی۔۔ اور سفری چولھے میں گوشت بھون کر نمک مرچ۔ لگا کر خوب کھایا... اس کے بعد اللہ کا شکر بجا لا کر سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔۔ حالانکہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہم کو یہ واضح ہو گیا۔ کہ اس جگہ سونا قطعی ناممکن تھا... خدا معلوم کیا وجہ تھی۔ آیا لالٹین کی روشنی کی کشش سے۔۔ یا کسی ہندوستانی آدم زاد کی خوشبو پا کر جن کی خون آشامی کے لئے وہ ہزار ہا برس سے منتظر و آرزومند تھے.... یا کیا.... میں صحیح عرض نہیں کر سکتا... مگر یہ حقیقت ہے۔ کہ لیٹتے ہی ہم پہ یکایک لکھو کھا خون آشام۔ زہریلے۔ اور جسیم مچھروں نے دھاوا بول دیا۔۔ یقین جانئے اتنے زبردست مچھروں کو نہ میں نے اپنی عمر میں کبھی دیکھا۔ نہ کسی کتاب میں حال پڑھا.... بادل کے بادل آتے۔۔ منمناتے۔۔ پنپناتے۔۔ کان کے پاس باجہ بجا کر اس بری طرح کاٹتے۔ کہ الٰہی توبہ۔ حواس بگاڑ دیئے۔ دیوانہ کر دیا۔ تمباکو کے دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی خوش مذاقی اور سرور بڑھ جاتا۔۔ اور روح میں مزید تازگی آجاتی... آخر کار سب میں کمبل نکال کر۔ اس میں اچھی طرح لپٹ کر۔ منہ ڈھانپتا

تھا ... تاہم کبھی ہاتھ کھجانے کے لئے پیٹھ پر جاتا .. کبھی گال پر - کبھی پیٹ اور کبھی کنپٹی پر - گھبرا کر اُٹھ بیٹھے - کہ رات کی مہیب و خاموش تاریکی میں فضا کو چیرتی ہوئی - دل ہلانے والی شیر کی گرج سُنائی دی .. اور اس کے بعد ایک دوسرے شیر کی .. جو ساحل کی جھاڑیوں میں ہم سے سا ٹھ گز فاصلہ پر متحرک نظر آیا ..

" دیکھئے " اسد نے کمبل سے ذرا سا منہ کھول کر کہا "کتنا اچھا ہوا - کہ ہم کنارے پر نہیں اُترے .. ورنہ چچا جان قلعی کھل جاتی .. (اسد کبھی کبھی پیار میں ایسے فقرے بھی استعمال کر جاتا ہے .. جسے میں بالکل نہیں سمجھتا) - ارے .. اف .. توبہ توبہ .. دیکھئے .. ایک مچھر نے میری ناک پر ڈنک مار ہی دیا .. " اور اس نے پھر اندر منہ چھپا لیا ..

کہ یکایک ماہتاب عالمتاب نمودار ہوا - باوجودیکہ ساحل کی طرف سے شیروں کی گرج خون کو منجمد کرنے والی صداؤں کی صورت میں ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی - تاہم ہم نے اپنے کو ہر طرح محفوظ سمجھ کر اونگھنا شروع کیا -

خدا معلوم کونسی وجہ تھی؟ ... کسی مچھر نے کاٹا .. یا کھجانے کی نوبت آئی - کہ یک بیک مجھے اپنے کمبل باہر منہ نکالنا پڑا - یا شاید یہ وجہ ہو .. کہ مچھر کمبل کے اوپر سے بھی اُسی تیزی سے ڈنگ مار رہے تھے .. بہرحال وجہ کچھ ہو . بس نکالتے ہی میں نے جہانگیر کو سہمی ہوئی آواز میں یہ کہتے سنا -

" ہائے .. ہائے .. غضب ہو گیا ... ذرا دیکھئے تو .. "

ہم سب منہ نکال کر دیکھنے لگے ... چاند کی روشنی میں کیا دیکھتے ہیں - کہ ساحل کے قریب پانی میں دو متحرک چیزیں چکر بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں ... اور سطح آب میں ان کی حرکت سے شور برپا ہے -

" ہائیں ...... یہ کیا تازہ بلا نمودار ہوئی .. " میری زبان سے نکلا -

" حضور یہ وہی کمبخت شیر ہیں .. " جہانگیر نے ایک ایسے مشترکہ لہجہ میں جس میں خوف - ادب - اور ذاتی نقصان جان کا اندیشہ شامل تھا - جواب دیا - اور وہ تیرتے ہوئے ہم لوگوں کی طرف آ رہے ہیں .. تاکہ ہمارا ناشتہ کریں "

میں نے پھر نظریں گڑ گڑا کر دیکھا .. تو اس کا بیان لفظ بہ لفظ صحیح تھا -

مجھے اُن کی خشمگیں آنکھوں کی چمک نظر آئی .. یہ تازہ شکار کئے ہوئے ہرن کے گوشت کی خوشبو تھی .. یا خود ہم لوگوں کی شامت اعمال . یہ دونوں خونخوار درندے ہماری کشتی کی طرف منہ پھیلائے بڑھ رہے تھے .. اسد نے اپنی بندوق سنبھال لی تھی - میں نے زور سے چلا کر کہا .. کہ وہ ذرا اُن کے دم لینے تک انتظار کرے .. اسی اثنا میں میں نے بھی رائفل درست کر لی .. ہم سے ۵ا گز فاصلہ پر پانی تقریباً ۱۵ انچ گہرا تھا .. اور زمین قریب قریب کھلی نظر آتی تھی - یہاں ایک نے پہلے قدم جمائے ... یہ غالباً شیرنی تھی .. زمین پر کھڑے ہو کر اُس نے اپنا بدن جھاڑا - اور ایک دلخراش چیخ لگائی .. کہ معاً اسد نے بندوق کا فیر کیا .. واہ واہ .. کیا نشانہ تھا - کہ گولی کھلے ہوئے حلق میں لگی .. اور گدی کے پار ہو گئی . بس .. ایک جست تو لگائی .. اور گرتے ہی مردہ ہو گئی .... دوسرا شیر نر نہایت جسیم اور بلا کا مہیب اس سے دو گز پیچھے تھا - چشم زدن میں اس نے بھی اپنے اگلے پیر اس حصہ زمین پر جمائے - کہ عین اس موقعہ پر ایک عجیب حیرت زا واقعہ پیش آ گیا ... پانی کی سرسراہٹ .. اور رد کا جھپاکا اس طرح ہوا ... جیسے ہمارے ہندوستان میں تالابوں کے کنارے لڑکے کود کر نہایا کرتے ہیں - یا پڑکی اوپر سے تاک کر مچھلی کا شکار کیا کرتی ہے .. ہاں - اس کی نوعیت ضرور ہزار گنا تیز اور زیادہ تھی .. کہ یکایک شیر نے بلا کی خوفناک - دلخراش اور جگر دوز چیخ لگائی - اور جھٹکے کے ساتھ پایاب حصہ میں کودا - مگر کوئی سیاہ چیز اسی کے ساتھ لپٹی ہوئی باہر نکل آئی ..

" اف - خدایا .. " الیاس نے گھبرا کر کہا " لے ہے ... یہ تو کسی گھڑیال نے اس کی ٹانگ پکڑ لی ہے .. "

واقعی صورت یہی تھی .. ہم اس مہیب جانور کی لمبی دانتوں کی قطار - اور طویل جسم بخوبی دیکھ رہے تھے .. اس کے بعد کتنا اعلیٰ اور عدیم النظیر نظارہ پیش آیا .. میں صحیح طور پر حوالہ قلم نہیں کر سکتا .. دو ایسے خونخوار جانوروں کا مقابلہ تھا .. جو اپنی شہ زوری کا جواب نہیں رکھتے - ایک بری ... ایک بحری ... دونوں وہ خونخوار عفریت .. جن کے مقابلہ کی کوئی تاب نہیں رکھتا - جن کی گرفت میں آ جانا - یقینی موت کے

مصداق ہے .. ایسے دو درندوں کی زور آزمائی کا منظر تھا.. واللہ کیا کشمکش ... کیسی جدوجہد ... اور کتنی پر لطف جنگ تھی ... کہ بیان میں نہیں آسکتی ..

شیر یہ کوشش کر رہا تھا. کہ کسیطرح پایاب حصہ زمین پر اپنے پیر جمالے .. اور گھڑیال نصف جسم سے کھڑا ہوا۔ اور نصف پانی میں تیرتا ہوا .. اس کی پچھلی ٹانگیں دانت پیوست کئے۔ اپنی طرف گھسیٹ رہا تھا. شیر کی خشم آلود چیخوں سے ایک قیامت برپا تھی ... فضائے خاموش میں یہ مہیب گرج نمونہ حشر پیدا کر رہی تھی .. کہ یکایک بلا کی وحشیانہ خشمگیں چیخ کے ساتھ وہ مڑا .. اور گھڑیال کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا .. کہ پٹاخہ کی طرح ایک آواز ہوئی۔ گھڑیال نے اپنی گرفت ذرا اور کڑی کردی .. مگر ایک ہی طمانچہ نے یہ کام کیا .. کہ گھڑیال کی ایک آنکھ صاف حلقوں سے نکل کر خدا معلوم کہاں جا پڑی .. وہ ذرا گھوم گیا .. مگر سارا منہ خون میں شرابور ہوگیا.... ادھر اس کا گھومنا تھا... کہ شیر نے اس کی گردن پکڑ لی .. اور مضبوطی سے تھام لیا .. اس کے بعد زور آزمائی اور اپنی اپنی طاقت۔ اور داؤ پیچ کا جو مظاہرہ ہوا .. وہ بلا کا مہیب تھا۔ دونوں پایاب حصہ میں ایک دوسرے پر حملہ کر کر کے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اس بری طرح گتھے تھے کہ تمیز کرنا دشوار تھا. حرکات کا پتہ ہی نہ چلتا تھا .. شیر کے حملوں نے گھڑیال کو بُری طرح زخمی کر دیا تھا .. اور ہماری سمجھ میں اُس کی دوسری آنکھ بھی ضائع ہو چکی تھی۔ اسکے علاوہ شیر کے دانتوں نے اُس کے سر کی ہڈیوں کو اپنی جگہ سے ہلاکر بھیجا تک نکال دیا تھا .. مگر گھڑیال نے بھی پچھلی ٹانگیں اس بری طرح پکڑی تھیں .. کہ وہ نہ چھوٹیں۔

۵ ہی منٹ میں اس عظیم الشان کشتی کا فیصلہ ہوگیا .. اور جس وقت دوبارہ ہماری نظروں نے مطمئن ہو کر دیکھا .. تو معاملہ قریب الختم تھا۔ ہم کیا دیکھتے ہیں .. کہ گھڑیال کا سر خون میں لت پت .. شیر کے جسم کو اپنے مہلک دانتوں کے درمیان دابے ہوئے۔ ٹانگوں کو پچھلے حصہ تک چبا چکا تھا ۔ اور غصہ میں بھرا ہوا ادھر اُدھر جھنجھوڑ رہا تھا۔ دوسری طرف مجروح شیر حالت نزع میں پنجوں اور دانت سے اپنے دشمن کے سر کا کچومر نکالے دے رہا تھا اور اپنی پچھلی ٹانگوں سے بھی گھڑیال کا منہ اس طرح جکڑے ہوئے تھا جس طرح کوئی ہاتھ سے چری ہوئی لکڑی کے دو حصے تھامے ہو ..

مگر خاتمہ کا وقت آگیا۔ شیر کا سر گھڑیال کے پیٹھ پر گرا .. اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ اُس کا دم نکل گیا ... گھڑیال نے بھی دم آخر اپنے منہ کو حرکت دی .. اور ذرا ہی دیر بعد ہم نے دیکھا۔ کہ اس نے شیر کے مردہ جسم کو کاٹ کر دو حصوں میں منقسم کر دیا تھا ۔ اس کے دو ہی منٹ بعد۔ اس نے بھی زور کی پھنکار ماری ... اور غالباً مردہ ہو کر سیدھا لیٹ گیا۔

یہ خونی دنگل نہایت عجیب اور ہیبتناک منظر تھا۔ اور غالباً بہت کم انسان کی فانی آنکھوں نے اس طرح دیکھا ہوگا .... اور یوں المناک طریق پر۔ دونوں پہلوانوں کی زندگی پر اس کا خاتمہ ہوا۔

جب یہ ہو چکا .. تو ہم نے الیاس کو نگران بنا کر رات بھر آرام سے بسر کرنیکا ارادہ کر لیا ... مگر حرامزادے مچھر اب بھی کاٹ کاٹ کر منہ سجائے دیر ہے تھے ...

معاف کیجئے گا .. بیان طویل ہوگیا .. مگر کیا کروں۔

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم۔ مسعود مبصری

راز کی بات

"عورت پر جب شوق اور اشتیاق سے بھری ہوئی نگاہیں بیتابانہ پڑتی ہیں تو اس کا دل زور زور سے خود بخود دھڑکنے اور اُچھلنے لگتا ہے ۔ چہرے پر حجاب کی سُرخی دوڑ جاتی ہے اور وہ کچھ کھوئی ہوئی سی نظر آنے لگتی ہے ۔ چاہے آنکھیں دوچار ہوں یا نہ ہوں ۔ چاہے اُسے معلوم ہو یا نہ ہو کہ اُسے کوئی دیکھ رہا ہے

عورت کو چھپ کر دیکھئے جب بھی یہ تمام کیفیتیں نظر آسکتی ہیں"

(خیر بھوروی)

یتیم بچہ کی عید

از نقاش درد سید کاظم صاحب نشتر لکھنوی۔

آج سب نے عید میں اپنا سنوارا ہے لباس — اک پرانا اور پھٹا کرتہ ہمارا ہے لباس
ہیں کہیں نغمے پہ نغمے، قہقہے پر قہقہے — غم کے آنسو میرے رخسار پہ آ کر بہے!
سب کے کپڑے ہیں نئے، اور میرے کپڑے ہیں پھٹے — سب کے گیسو صاف ہیں، اور میرے مٹی میں اٹے
لڑکے اٹھلاتے ہوئے جاتے ہیں میرے پاس سے — دیکھتا ہوں انکی صورت میں نگاہ یاس سے
پہنے ہے زنجیر اور کوئی لگائے ہے گھڑی — میری آنکھوں میں بندھی ہے آنسوؤں کی اک لڑی!
انکے رخسارے ہیں پوڈر کی مہک سے تابناک — میرے رخساروں پہ پوڈر کی جگہ جنگل کی خاک
پھول سے جامے پہن کر سارے لڑکے باغ باغ — میرے کرتے میں لگے ہیں سینکڑوں کیچڑ کے داغ
جا رہے ہیں باغ وہ چھتری کے نیچے چھاؤں میں — پڑ گئے ہیں آبلے کانٹوں سے میرے پاؤں میں
اڑ کے جاتا ہے کوئی غبارہ سوئے آسماں — قلب پر غم سے مری آہوں کا اٹھتا ہے دھواں!
چومتی ہے ماں کوئی بچہ جو لطف و پیار سے — اشک ہو جاتے ہیں جاری میری چشم زار سے
دیکھتا ہوں پاس ماں کے جب کسی بچہ کو شاد — مادر خلد آشیاں کی مامتا آتی ہے یاد!
خاک میں گیسو بھرے، کنگھی سے اب سلجھائے کون؟ — اچھے اچھے عید میں کپڑے مجھے پہنائے کون؟
غیر ذات خالق اعلیٰ مرا کوئی نہیں — اس جہاں میں پوچھنے والا مرا کوئی نہیں
کوئی [illegible] عشرت [illegible] کے خارستان میں — کوئی آبادی میں ہے، میں اجڑے ہوئے میدان میں
زمزمہ ان کا ہے جیسے خندہ گل کی ادا — نوحۂ غم میرا ویرانہ میں قمری کی صدا!

عید اسکی جس کے سر پر باپ کا سایہ قرار
عید کیا اس کی جو بچہ ہو یتیمی کا شکار

اُٹھو سکھی پھر سو لینا

(ترانۂ یگانہ)

ساجن کو سکھی منا لو پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو پھر سو لینا
سوتا سنسار، سُننے والا بیدار
اپنی بیتی سُنا لو پھر سو لینا
اُٹھو سکھی پھر سو لینا

(مرزا یگانہ لکھنوی)

سلطان محمد علاء الدین خلجی شہنشاہِ ہند

قرون وسطیٰ کا ایک زبردست فاتح

ہدیۂ عالمگیر عید نمبر

از جناب پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم اے (علیگ)

شاہان دہلی میں علاؤ الدین خلجی ایک خاص شان و شوکت کا بادشاہ ہوا ہے۔ اس کی مثال صفحات تاریخ میں ملنی محال ہے۔ گو اس سے پیشتر کئی زبردست فاتح گذر چکے تھے۔ مگر جن جن فتوحات کے ڈرونڈے تیغ علائی نے کھولے۔ ان کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے کشورکشا میں پایا نہیں جاتا۔ شمس الدین التمش کی فتوحات بہت مشہور ہیں۔ بلبن کا تدبر زبان زد خلائق ہے مگر جب ان کا موازنہ علاؤ الدین سے کیا جاتا ہے تو تمام دلانگیز داستانیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ امیر خسرو نے علاؤ الدین کے متعلق کس قدر درست لکھا ہے؎

بعہدش کارہائے یافت بنیاد

کہ ماند تا بہ بنیاد جہاں یاد

خاندانی حالات خاندان غلامان کے آخری ایام میں دو بھائی وارد ہند ہوئے۔ ان میں سے بڑے کا نام جلال الدین فیروز اور چھوٹے کا نام شہاب الدین مسعود تھا۔ جلال الدین کیقباد کی وفات کے بعد دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اور خاندان خلجی کا بانی قرار پایا۔ شہاب الدین اگرچہ خود کسی جلیل القدر عہدے پر سرفراز نہ ہوا۔ مگر اس کے دونوں بیٹے نہایت زبردست فاتح اور کشورکشا نکلے۔ ان میں سے بڑے کا نام الماس بیگ الغ خاں تھا۔ اور چھوٹے کا علاؤ الدین۔ جس کا تذکرہ مندرجہ ذیل صفحات کی زینت بن رہا ہے؏

بھیلسہ کی فتح جب جلال الدین سریر آرائے ہند تھا۔ تو علاؤ الدین کڑہ کا ناظم تھا۔ ۶۹۲ھ میں سلطان جلال الدین مسند پر گیا۔ علاؤ الدین نے اس سے بھیلسہ پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے اس باب میں فرمان عطا کر دیا۔ علاؤ الدین نہایت شدومد سے بھیلسہ پر حملہ آور ہوا۔ راجہ شکست کھا کر بھاگا۔ بہت سا مال غنیمت علاؤ الدین کے ہاتھ آیا۔

اس میں کالسنی کا ایک بت بھی تھا۔ یہ بت وہاں کے لوگوں کا معبود تھا۔ چنانچہ اسے چھکڑے پر لاد کر دہلی روانہ کیا گیا۔ جلال الدین نے حکم دیا کہ اسے بدایوں کی جامع مسجد کے دروازہ میں ڈال دیا جائے۔ تاکہ آنے جانے والے اسے اپنے پاؤں تلے روندیں ؛

بادشاہ ضعیف ہو چکا تھا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کا رعب داب امرائے سلطنت کے دلوں سے اٹھ رہا تھا۔ علاؤ الدین جوانسال اور جواں ہمت تھا۔ وہ سلطان کا داماد بھی تھا۔ مگر امرائے سلطنت میں سے اکثر اسکو مخدوش نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس لئے وہ کڑہ چلا آیا۔ یہاں چند سیاحوں نے اسے دیوگڑھ (دولت آباد) کے علاقہ کی داستانیں سنائیں۔ اور بتایا کہ وہ علاقہ مال و دولت سے بھرپور ہے۔ خزانے لعل و جواہر سے لبریز ہیں۔ اور راجہ کے پاس اس قدر ہاتھی ہیں کہ ان کا شمار ناممکن ہے۔ علاؤ الدین نے وہاں جانے کی راہ دریافت کی۔ اور تہیہ کر لیا کہ وہ اس جگہ ضرور پہنچے گا۔ اس نے سواروں اور پیادوں کی بھرتی شروع کی۔ اور جب وہ اس کام سے فارغ ہو چکا تو بادشاہ کو خط لکھا کہ چندیری اور اس کے گرد و نواح کے علاقے ابھی تک سر نہیں ہوئے اگر اجازت ہو تو انہیں سلطان دہلی کے حلقہ بگوش بنایا جائے۔ چونکہ راجے بہت امیر ہیں اس لئے اگر ان علاقوں پر حملہ کیا جائے تو اس قدر مال و دولت ہاتھ آئے گا کہ بادشاہ کو کسی مزید لگان کی ضرورت نہ رہیگی ؛

ان ایام میں علاؤ الدین اور اسکی ساس یعنی ملکہ جہان ایک دوسرے سے بگڑے ہوئے تھے۔ علاؤ الدین اپنی بیوی سے بھی آزردہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پایۂ تخت سے دور کسی اور علاقہ میں چلا جائے تاکہ دوبارہ اسے

دہلی نہ آنا پڑے ۔

امراء کا اضطراب بادشاہ نے اسے چندیری وغیرہ کی فتح کی خاطر مزید سوار اور پیادے بھرتی کرنے کی اجازت دیدی۔ علاؤالدین ۱۲۹۴ء میں کڑہ پہنچا۔ اور تین چار ہزار سوار اور دو ہزار پیادے لیکر نہایت شدومد سے دکن کی طرف بڑھا۔ اپنی عدم موجودگی میں اس نے علاؤالملک کو کڑہ میں نائب مقرر کیا۔ اور یہ حکم دیا کہ وہ وقتاً فوقتاً بادشاہ کو اس امر کی اطلاع دیتا رہے کہ علاؤالدین آجکل چندیری اور اس کے گرد و نواح میں متمردوں کی سرکوبی میں مصروف ہے۔ اور عنقریب فتح کی عرضداشت حضور والا میں پہنچنے والی ہے۔ بادشاہ کو علاؤالدین پر پورا اعتماد تھا۔ اس کے دل میں علاؤالدین کے متعلق کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ وہ علاؤالدین کے متعلق کسی اور کی زبانی کچھ سننا چاہتا تھا۔ البتہ دربار میں چند امراء ایسے تھے جو خیال کرتے تھے کہ علاؤالدین کی کڑہ سے غیر حاضری ایک نہ ایک دن رنگ لاکر رہیگی ۔

دیوگڑھ کی فتح علاؤالدین کڑہ مانک پور اور برار کے درمیانی جنگلوں کو طے کرتا ہوا دو ماہ کے عرصہ میں ایلچ پور پہنچا۔ وہاں سے گھٹی لاجورہ میں گیا۔ اور دو تین دن قیام کرنے کے بعد یلغار کرتا ہوا دیوگیر کی جانب بڑھا۔ رام دیو وہاں کا راجہ تھا۔ وہ قوم کا مرہٹہ تھا۔ اکثر راجپوت راجے اس سے دبتے تھے۔ رام دیو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ علاؤالدین اتنی جلدی دیوگیر پہنچ جائے گا۔ جب علاؤالدین نے شہر کا رُخ کیا تو رام دیو نے دو تین ہزار آدمی اس کی مزاحمت کے لئے روانہ کئے۔ دیوگڑھ سے دو کوس کے فاصلہ پر دونوں لشکروں کا تصادم ہوا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ دکنیوں کو اسلامی حملہ آوروں سے پالا پڑا تھا۔ چنانچہ وہ معمولی سی چپقلش کے بعد دیوگڑھ کی طرف بھاگ گئے۔ اسلامی لشکر نے ان کا تعاقب کیا۔ راجہ سراسیمہ ہو کر قلعہ بند ہو گیا۔ علاؤالدین نے شہر پر قبضہ کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ چالیس ہاتھی۔ ہزار گھوڑے۔ اور بیشمار دولت علاؤالدین کے قبضہ میں آئی۔

صلح کیلئے سلسلہ جنبانی علاؤالدین اپنی کمزوریوں سے واقف تھا۔ وہ جانتا کہ محاصرہ جس قدر طول پکڑے گا۔ اسی قدر اس کے حق میں مضر ثابت ہوگا۔ اس لئے اس موقع پر یہ مشہور کر دیا کہ اس کے پیچھے ۲۰ ہزار سواروں کا ایک اور زبردست لشکر آ رہا ہے۔ رام دیو یہ خبر سنکر بہت گھبرایا اور صلح کا ملتجی ہوا۔ اس نے پہلے چند برہمنوں کو یہ سکھا پڑھا کر بھیجا کہ وہ علاؤالدین پر یہ بات واضح کر دیں کہ اس کا یہاں آنا قرین مصلحت نہیں۔ کیونکہ گرد و نواح کے راجوں کو اگر اسکی آمد کا پتہ چل گیا تو وہ اپنا ٹڈی دل لشکر لے کر اس پر ٹوٹ پڑینگے۔ اور اسے جان بچانی مشکل ہو جائیگی۔ مگر علاؤالدین ایسے بھتروں میں کیا آتا تھا۔ اس لئے ان باتوں کی پرواہ تک نہ کی ۔

برہمنوں نے جب حالات کو اس طرح بگڑتے دیکھا تو انہوں نے دوبارہ عرض کی کہ آپ تمام قیدیوں کا معاوضہ لیکر انہیں رہا کر دیں۔ اور راجہ کے ساتھ صلح کرلیں۔ علاؤالدین نے ۵۰ من سونا۔ کئی من موتی۔ اور نہایت نفیس نفیس کپڑے لیکر اس بات کا اقرار کیا کہ وہ پندرہ دن کے بعد تمام قیدیوں کو چھوڑ کر یہاں سے چلا جائیگا ۔

راجکمار کی خوفناک غلطی رام دیو کا بڑا لڑکا کچھ سوار اور پیادے لیکر دیوگڑھ سے باہر گیا ہوا تھا۔ اسے جب اس بات کا علم ہوا تو وہ فی الفور واپس لوٹا۔ اور اس دن دیوگڑھ پہنچا جس دن علاؤالدین کو وہاں سے کوچ کرنا تھا۔ رام دیو نے اپنے بیٹے کے نام پیغام بھیجا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم بال بال بچ گئے۔ اب مناسب یہی ہے کہ جنگ جدال سے بچے رہو۔ کیونکہ یہ "ترک" لوگ بڑے بہادر اور دلیر ہیں۔ ان سے لڑنا آسان کام نہیں۔ مگر بیٹے نے باپ کی نصیحت پر کوئی توجہ نہ کی۔ کیونکہ ایک تو وہ نوجوان تھا۔ دوسرے قرب و جوار کے راجے اسکی کمک کے لئے آ رہے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا اپنا لشکر علاؤالدین کے لشکر سے دُگنا تھا ۔

خونریز جنگ چنانچہ اس نے علاؤالدین کے نام پیغام بھیجا کہ اگر تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو جو کچھ تم نے رعایا اور شہر سے لیا ہے واپس کر دو اور چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ علاؤالدین اس بات سے سخت غصہ میں آیا۔ اس نے راجکمار کے ایلچیوں کا منہ کالا کر کے تمام لشکر میں پھرایا۔ اس کے بعد ملک نصرت کو ایک ہزار سوار دیکر قلعہ کے محاصرہ کے لئے متعین کیا اور خود باقی ماندہ سپاہ لیکر راجکمار سے لڑنے گیا۔ سخت خونریز لڑائی ہوئی اور عین اسوقت جبکہ اسلامی فوج پسپا ہونیوالی تھی ملک نصرت قلعہ کا محاصرہ چھوڑ کر غنیم پر ٹوٹ پڑا۔ دکھنیوں نے خیال کیا کہ یہ وہی بیس ہزار سوار ہیں جو علاؤالدین کے پیچھے آ رہے تھے۔ ان کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ اور وہ بہت بُری طرح بھاگے۔ علاؤالدین مظفر و منصور ہو کر بدستور سابق قلعہ کے محاصرہ میں

مشغول ہوگیا۔

قلعہ کی تسخیر اب علاؤالدین نے محاصرہ میں زیادہ سختی سے کام لینا شروع کیا۔ اس نے مہاجنوں اور برہمنوں کی ایک جماعت کو قتل کر دیا۔ اور رام دیو کے اعزا و اقارب کو جو اسکی قید میں تھے طوق و زنجیر پہنا کر قلعہ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ رام دیو گلبرگہ۔ تلنگانہ۔ خاندیس اور مالوہ کے راجاؤں سے طالب امداد ہوا۔ مگر عین اسوقت اسے اطلاع ملی کہ قلعہ میں غلہ کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ اس خبر سے اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور وہ نہایت عاجزی سے صلح کا خواہاں ہوا۔ علاؤالدین نے چھ سو من سونا۔ سات من موتی۔ دو من جواہر لعل۔ یاقوت۔ الماس اور زمرد۔ ایک ہزار من چاندی اور دیگر اجناس لیکر صلح کر لی۔ راجہ نے ان چیزوں کے علاوہ ایلچپور اور اسکے گرد و نواح کا علاقہ بھی علاؤالدین کے سپرد کر دیا۔ اور وعدہ کیا کہ اگر یہ علاقہ میرے کسی آدمی کے انتظام میں رہا تو میں اس کا سالانہ خراج کڑہ بھجوا دیا کرونگا۔

قابل فخر دلیری علاؤالدین یہ بیشمار دولت لیکر واپس لوٹا۔ کڑہ اور دیوگیر کے درمیان تقریباً سات سو میل کا فاصلہ تھا۔ اور تمام علاقہ خطرناک پہاڑوں اور خوفناک جنگلوں سے پٹا پڑا تھا۔ راستے بے حد تنگ اور دشوار گذار تھے۔ سارا علاقہ ان لوگوں کے قبضہ میں تھا جو مسلمانوں کے دشمن تھے۔ اور جنہیں اپنی بہادری پر بے حد ناز تھا۔ علاؤالدین کا اس علاقہ کو تہ و بالا کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس سے علاؤالدین کی جوانمردی۔ بہادری اور اولوالعزمی کا پتہ چل سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینہ میں فتح و ظفر کے جوش کا ایک طوفانی سمندر موجزن تھا۔

یورپی مؤرخوں کی غلط بیانی بعض مغربی نثراد مورخین نے اس کی بہادری اور شہرت کو بٹہ لگانے کی غرض تاریخ فرشتہ کے حوالہ سے یہ داستان گھڑ لی ہے کہ جب وہ دیوگیر کی طرف جا رہا تھا تو اس نے یہ بات مشہور کر رکھی تھی کہ وہ اپنے چچا سے خفا ہو کر راجہ مندری کی ملازمت میں جا رہا ہے۔ مگر یہ بات پایۂ ثبوت سے گری ہوئی ہے۔ کیونکہ فرشتہ نے یہ واقعہ طبقات ناصری کے حوالہ سے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ حالانکہ طبقات ناصری اس واقعہ سے بہت پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ اس کا مصنف

اس سے ۳۵ برس پیشتر ۱۲۵۹ء میں فوت ہو چکا تھا۔ مزید براں اس وقت کے مسلمان ایسے اخلاق باختہ نہ تھے کہ معمولی معمولی باتوں کے لئے جھوٹ بولتے۔

بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت جن دنوں علاؤالدین نہایت تزک و احتشام سے کڑہ کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔ سلطان جلال الدین گوالیار میں مقیم تھا وہ علاؤالدین کی فتوحات کو اپنی فتح سمجھ کر جی ہی جی میں خوش ہو رہا تھا ایک دن اس نے چند معتبر امیروں مثلاً ملک احمد چپ اور ملک فخرالدین کوچک وغیرہ کو جمع کر کے پوچھا کہ علاؤالدین بیشمار دولت لے کر آ رہا ہے۔ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ ملک احمد نے کہا کہ مناسب یہی ہے کہ بادشاہ چندیری میں خیمہ انداز ہوں۔ علاؤالدین کو جب اس بات کا علم ہوگا تو چار و ناچار اسے اپنا تمام مال و اسباب بادشاہ کے حضور میں پیش کرنا پڑیگا۔ اور اس طرح ایک زبردست فتنہ کا سد باب ہو جائیگا۔ بادشاہ نے یہ نصیحت نہ مانی اور دہلی چلا گیا۔ علاؤالدین کڑہ پہنچا۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع بادشاہ کو بھیجی اور لکھا کہ میں خود درگاہ معلی میں حاضر ہوتا لیکن بادشاہ کے عتاب سے ڈرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے ایک سال تک پایۂ تخت میں کوئی عریضہ نہیں بھیجا۔ اور دیوگیر کا علاقہ حضور کی اجازت کے بغیر فتح کر لیا۔ اگر میری خطا بخشی ہو جائے تو میں مع مال غنیمت درگاہ میں حاضر ہونے کیلئے تیار ہوں۔

جلال الدین کا قتل ادھر تو یہ نامہ و پیام ہو رہا تھا۔ ادھر علاؤالدین لکھنوتی میں ایک آزاد سلطنت قائم کرنے کے منصوبے گانٹھ رہا تھا۔ دربار میں اس کا بڑا بھائی الماس بیگ بادشاہ کو اس بات کے لئے اکسا رہا تھا کہ وہ مراحم خسروانہ سے کام لیکر علاؤالدین کی ملاقات کیلئے کڑہ پہنچے۔ بادشاہ اس کے دھوکہ میں آ گیا۔ اور کیلوگڑھی سے سوار ہوکر ڈبائی آیا۔ یہاں سے وہ کشتی پر سوار ہو کر رمضان ۶۹۵ھ میں کڑہ پہنچا۔ علاؤالدین بادشاہ کی پیشوائی کیلئے آیا۔ اور ابھی وہ دونوں بغلگیر ہی ہوتے تھے کہ چند سواروں نے جھپٹ کر اس کا کام تمام کر دیا۔

الزام قتل کی حقیقت تمام مورخین اس قتل کا الزام علاؤالدین پر عاید کرتے ہیں۔ مگر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس قتل میں علاؤالدین سے بڑھ کر اس کے بڑے بھائی الماس بیگ الغ خاں کا ہاتھ تھا کیونکہ وہی

بادشاہ کو اکسا کر کڑہ لایا تھا۔ وہ آخیر دم تک غیر مآل اندیشانہ مشورے دیتا رہا تھا ۔

تخت نشینی جب جلال الدین کے قتل کی خبر دہلی پہنچی تو اس کی بیوی ملکہ جہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے قدر خاں کو رکن الدین ابراہیم خاں کا خطاب دیکر تخت پر بٹھا دیا۔ جلال الدین کا بڑا لڑکا ارکلی خاں اس وقت ملتان میں تھا۔ ملکہ جہاں کی اس جلد بازی نے علاؤ الدین کے ہاتھ اور بھی مضبوط کر دئے۔ چنانچہ ۱۵۔ رمضان المبارک ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵ء کو اس نے کڑہ مانک پور میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

زروزہ رفتہ نصفے با ہمیں فال
زہجرت شش صد و نود سال
کہ در دولت شد از عون الٰہی ۔
بہ مانک پور تخت آرائے شاہی ۔

زر پاشی اپنے چچا کے خون کا دھبہ دھونے کے لئے اس نے بے تحاشا زر پاشی شروع کی۔ اس نے ایک چھوٹا سا منجنیق بنوایا اور ہر منزل پر پانچ من سونے کے سکے اس میں بھر کر اڑاتا رہا۔ حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ ؎

زر آں ریز شد منزل بمنزل
ززر کردہ کلید کار مشکل
بہر منزل بہ پیش تخت تا دور
فشاندہ گنجہا بے منع گنجور

جلال الدین کی اولاد کا استیصال اسی شان سے وہ دہلی جا پہنچا۔ اور معمولی سی جھڑپ کے بعد شاہی تخت پر قابض ہو گیا۔ اس نے لال کوٹھک اپنا پایۂ تخت بنایا۔ تین شبانہ روز جشن ہوتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنی تمام توجہ سلطان جلال الدین کی اولاد کے استیصال کی طرف مبذول کی۔ چنانچہ وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد اس میں کامیاب ہو گیا ۔

مغلوں کی شکست ۶۹۶ھ میں مغل حاکم ماوراء النہر نے ایک لاکھ مغلوں کا لشکر لیکر ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہ پنجاب، سندھ۔ اور ملتان کو فتح کرکے اپنے علاقہ میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ علاؤ الدین نے الماس بیگ الغ خاں اور ملک شیخ الدین ظفر خاں کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ جالندھر کے مقام پر دونوں لشکر متصادم ہوئے۔ سخت خونریز لڑائی کے بعد مغلوں کو شکست فاش ہوئی۔ اور وہ بارہ ہزار لاشیں چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ گئے۔ اس فتح سے علاؤ الدین کی سلطنت اور بھی مستحکم ہو گئی ۔

مغلوں کو شکست دینے کے بعد اس نے ان جلالی امراء کی سرکوبی شروع کی جو طمع زر اور طمع دنیا کا شکار ہو کر اسکی اولاد سے پھر گئے تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ سب کے سب کیفر کردار کو پہنچ گئے ۔

فتح گجرات علاؤ الدین کے ۳ سنہ جلوس میں الماس بیگ الغ خاں اور نصرت خاں جالیسری مہم گجرات کے لئے مامور ہوئے۔ انہوں نے ایک زبردست لشکر سے راجہ کرن والئ گجرات پر حملہ کیا۔ راجہ شاہی لشکر کی تاب نہ لا کر اپنے صدر مقام نہر والے (انلواڑہ) سے بدحواسی کے ساتھ بھاگا اور راجہ رام دیو والئ دیوگیر کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ مال غنیمت کے ساتھ راجہ کرن کی خوبصورت رانی کنولا دیوی اور چند دیگر عورتیں اسیر ہو کر دہلی آئیں۔ رانی حرم سرائے شاہی میں داخل کر لی گئی اور اپنی خوبصورتی اور سلیقہ شعاری کی بدولت بہت جلد سلطان کی منظور نظر بن گئی ۔

قتلغ سے نبرد آزمائی اسی سال ظفر خاں نے سیوستان کا علاقہ مغلوں سے چھین لیا۔ قتلغ خاں مغلوں کی ایک زبردست جمعیت لے کر ہندوستان پر چڑھ آیا۔ اور بڑھتے بڑھتے دہلی تک پہنچ گیا۔ بادشاہ نے مغلوں کی مہم کے متعلق امرائے دربار سے مشورہ کیا۔ علاء الملک نے بھرے دربار میں کہا کہ "اشتر دز دیدن وکوشر فتن راست نیاید"۔ بہتر یہی ہے کہ نہایت جی داری سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ علاؤ الدین اس کی تقریر سے پھڑک اٹھا اور کہنے لگا کہ "اے علاء الملک تو آج سے کوتوال شہر ہے۔ میں اپنا گھر بار اور خزانہ سب کچھ تیرے سپرد کرتا ہوں۔ جس کی فتح ہو اسکو خزانہ کی چابیاں دیدینا۔ اور اسکی فرمانبرداری کرنا"۔ اس کے بعد وہ ایک زبردست لشکر کے ساتھ سیری سے کیلی آیا۔ دونوں لشکر جنگ آزما ہوئے۔ سخت خونریز لڑائی ہوئی۔ علاؤ الدین کا سب سے بہادر سردار ظفر خاں اس معرکہ میں کام آیا۔

قتلغ خاں شدید نقصان اٹھا کر پسپا ہوا۔ اور بیس بیس کوس کی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی ولایت کو واپس لوٹ گیا ؛

نشۂ فتح کی سرشاری ان کامیابیوں سے علاؤ الدین کے دماغ میں عجیب و غریب خیالات پیدا ہوئے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ دہلی کو اپنے کسی معتبر امیر کے سپرد کر دے اور خود سکندر ثانی بن کر عالمگیری اور اقلیم کشائی میں مصروف ہو۔ تا آنکہ ساری دنیا فتح کر لے۔ اس کے دل میں نئے مذہب کی ایجاد کا خیال بھی پیدا ہوا۔ اس نے دوستوں۔ امیروں اور عہدیداروں سے ان باتوں کے متعلق مشورے کئے۔ تمام امیر اس کے سوالات سے گھبرا گئے۔ آخر علاء الملک کوتوال نے نہایت جرأت سے کام لے کر بادشاہ کو سمجھایا کہ مذہب کا اجرا صرف نبیوں کا کام ہے۔ بادشاہ صرف جہانبانی اور جہانداری کیلئے ہوتے ہیں۔ آپ اس خیال کو اپنے دماغ سے بالکل نکال دیں۔ اکشور کشائی کا معاملہ۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ حضور کے پاس بے انتہا دولت اور سپاہ ہے مگر جب تک آپ ہندوستان پر پوری طرح قابو نہ پالیں گے کسی اور جانب قدم بڑھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ خزانہ تو ہندوستانی مہمات کے لئے بھی ناکافی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سکندر کے وقت میں لوگ مکرو فریب سے ناواقف اور نقض عہد سے بے خبر تھے۔ لیکن اب حالت اور ہے۔ آپ جس کو بھی دہلی میں اپنا نائب بنا کر جائیں گے۔ آپ کے آنے تک وہی باغی ہو چکا ہوگا۔ آپ اپنی توجہ فی الحال دکن کی تسخیر اور مغلوں کی تاخت و تاراج سے ملک کے تحفظ میں صرف فرمائیں۔"

علاء الدین کوتوال کے اس نیک مشورہ سے بہت خوش ہوا اسے خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کیا۔ اور اسی وقت اپنے گناہوں سے تائب ہو گیا ؛

اب اس نے دیپالپور۔ ملتان اور تمام دوسرے قلعے جو مغلوں کے راستے میں پڑتے تھے مستحکم کرنے شروع کئے۔ اس نے ان کے گرد خندقیں کھدوائیں۔ اور ان کے اندر دانہ۔ چارہ۔ اور غلہ کے ذخیرے جمع کئے ؛

رنتھنبور کی لڑائی ان امور سے فارغ ہو کر اس نے دکن کی تسخیر کا عزم کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ رنتھنبور کی جانب متوجہ ہوا۔ اور اپنے بھائی الماس بیگ الغ خاں اور وزیر نصرت خاں کو ایک زبردست فوج دیکر اس طرف بھیجدیا۔ انہوں نے جھائن کا قلعہ فتح کر کے رنتھنبور کا محاصرہ کر لیا۔ ایک روز ملک نصرت خاں قلعہ کے قریب کھڑا تھا کہ ایک پتھر اندر سے آکر اسے لگا اور وہ شہید ہو گیا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد راجہ ہمیر دیو بہت بڑی سپاہ سے محاصرین پر حملہ آور ہوا۔ الغ خاں حملہ کی تاب نہ لا کر جھائن اٹھ آیا۔ بادشاہ کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو وہ خود ایک لشکر جرار لیکر رنتھنبور کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے تلپت کے مقام پر قیام کیا ؛

بھتیجے کی بغاوت ایک دن وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شکار کھیل رہا تھا کہ اس کے بھتیجے سلیمان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح علاؤ الدین اپنے بوڑھے چچا کو مار کر تخت کا مالک بن گیا تھا۔ اسی طرح میں بھی اس کا کام تمام کر کے تخت حاصل کر لوں۔ چنانچہ وہ اپنے ۱۰۰ نومسلم مغل سوار لے کر بادشاہ کے پاس گیا۔ اور شیر شیر کہہ کر اس پر تیر برسانے لگا۔ جاڑے کا موسم تھا بادشاہ دگلا اور پاپہنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اسی کرسی کو سپر بنایا۔ اور ایکے تیروں کو روکا۔ بہت سے تیر بادشاہ کے بازو پر لگے۔ مانک نامی ہندو غلام بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے تیروں کو اپنے بدن پر روکنا شروع کیا۔ اتنے میں اور پیادے بھی آگئے۔ انہوں نے اپنی ڈھالوں سے بادشاہ کو بالکل ڈھانپ لیا۔ اور ساتھ ہی شور مچا دیا کہ "بادشاہ مارا گیا"۔

سلیمان پیادوں کی بات میں آگیا۔ اور خوشی خوشی خیمہ میں جا کر بادشاہ بن گیا۔ علاؤ الدین کے حواس بجا ہوئے تو اس نے تاج شاہی زیب سر کیا۔ اور خیمہ میں پہنچا۔ سلیمان کی مجلسِ عیش علاؤ الدین کی شکل دیکھتے ہی درہم برہم ہو گئی۔ وہ جان بچانے کے لئے بھاگا مگر قتل ہو گیا ؛

بھانجوں کی بغاوت اس واقعہ کے بعد بادشاہ نے اپنی توجہ رنتھنبور کی طرف مبذول کی اور ایک سال کے محاصرہ کے بعد سنہ ۱۳۰۱ء میں اس پر قابض ہو گیا۔ اسی دوران میں دہلی سے اطلاع ملی کہ اس کے دو بھانجے امیر عمر اور منگو خاں جو بدایوں اور اودھ کے حاکم تھے اس سے باغی ہو گئے ہیں۔ بادشاہ نے چند امیروں کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ قید ہو کر آئے۔ اور سارے لشکر کے سامنے قتل کر دئے گئے ؛

اسباب بغاوت کی تحقیقات اس کے بعد بادشاہ دہلی آیا۔ اس نے مشیران سلطنت سے بغاوتوں کے اسباب دریافت کئے۔ انہوں نے کہا کہ بغاوتوں کے چار اسباب ہیں۔ اولاً رعایا کے نیک و بد سے بادشاہ کی بے خبری۔ ثانیاً علانیہ شراب نوشی۔ ثالثاً امراء اور وزراء کی باہم رشتہ داری۔ رابعاً مال و زر کی کثرت۔ بادشاہ نے رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لئے جاسوس مقرر کئے۔ اور اس محکمہ کو یہاں تک ترقی دی کہ امراء کے گھروں کی بھی باتیں تک اسے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے اندر امن و امان قایم ہوگیا۔ مسافر تن تنہا سونا اچھالتے ہوئے سفر کرنے لگے۔ علانیہ شراب خوری قطعاً بند کر دی گئی۔ شراب کے تمام برتن توڑ پھوڑ دئے گئے۔ اور تمام ممالک محروسہ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص شراب پئے گا۔ اسے سخت سزا دی جائے گی ۔

اس نے یہ فرمان بھی نافذ کیا کہ کوئی امیر اس کے حکم کے بغیر ایک دوسرے سے ملاقات نہ کرے۔ ایک دوسرے کی دعوت میں شریک نہ ہو۔ اور بغیر تحریری اجازت نامہ کے ایک دوسرے سے رشتہ ناطے نہ کرے۔ دولت کی فراوانی کو روکنے کی خاطر اس نے تمام گاؤں جو وقف تھے یا کسی کو جاگیر میں ملے ہوئے تھے ضبط کر لئے۔ اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ محض قلاش رہ گئے ۔

رعایا کی خبرگیری جب علاؤ الدین متذکرہ بالا بغاوتوں سے فارغ ہو چکا تو اس نے رعایا کی فلاح و بہبودی کیلئے چند نئے قوانین نافذ کئے۔ سب سے اول اس نے متصدیوں اور چودھریوں کا استیصال کیا۔ اس کے بعد یہ حکم جاری کیا کہ مساحت کے بموجب تمام رعایا نصف محصول بلا قصور خزانہ شاہی میں داخل کرے۔ اور کوئی آدمی چار بیل۔ دو بھینسیں۔ دو گائے۔ بارہ بھیڑ یا بکری سے زیادہ اپنے پاس نہ رکھے۔ ایک قانون یہ بھی نافذ ہوا کہ ہر دودھ دینے والے جانور کی چرائی لی جائے۔ آباد گھروں سے کرایہ وصول کیا جائے۔ اور جو محصل اس کام پر متعین ہو اسکی نگہداشت نہایت سختی سے کی جائے۔ عہدیداروں کو معمولی سی معمولی خیانت پر سخت سزا دی جاتی۔

غلہ کی ارزانی مغلوں کے انسداد کے لئے اس نے قوانین و ضوابط مقرر کئے۔ ان قواعد و ضوابط کا اثر یہ ہوا کہ خفیف سی رقم خرچ کرنے پر ایک زبردست لشکر اس کے جھنڈے تلے جمع ہوگیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اسباب معیشت بہت ارزاں تھے۔ لوگ چند ٹکوں پر بسر اوقات کر سکتے تھے۔ ان ضوابط میں ارزانی غلہ کا قانون خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بادشاہ غلہ کا نرخ خود مقرر کرتا تھا۔ اناج کی منڈیوں میں سچے او معتبر اشخاص مقرر کئے جاتے تھے۔ بنجاروں کا ایک دفتر بنایا گیا۔ اور اسے شحنہ کے سپرد کیا گیا۔ دلی اور دوآبہ کے سو سو کوس تک کی رعایا سے اتنا خراج وصول کیا جاتا کہ وہ دس من غلہ بھی بمشکل تمام اپنے پاس جمع رکھ سکتے تھے۔ منڈیوں کے لئے مخبر مقرر تھے۔ وہ غلہ کی درآمد و برآمد اور نرخ کے اتار چڑھاؤ کے متعلق بادشاہ کو اطلاعات بہم پہنچاتے رہتے تھے۔ امساک باراں کے دنوں میں کوئی شخص بلا حاجت غلہ نہ خرید سکتا تھا۔ بادشاہ نے حکومت کی طرف سے غلہ کا ایک زبردست ذخیرہ بھی جمع کیا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام چیزیں نہایت سستے داموں فروخت ہونے لگیں ۔

علاؤ الدین نے کپڑوں اور جانوروں کی خرید و فروخت کے متعلق بھی ضابطے قائم کئے۔ مگر یہ تمام باتیں تفصیل طلب ہیں۔ جو کسی آئندہ فرصت میں بیان کی جائیں گی ۔

مغلوں نے پھر ہندوستان پر یورش کی۔ مگر اب کے علاؤ الدین نے ان کے ایسے دانت کھٹے کئے کہ انہوں نے پھر کبھی ہندوستان کا رخ نہ کیا ۔

تسخیر چتوڑ سنہ ۷۰۳ھ میں علاؤ الدین نے چتوڑ گڑھ پر حملہ کیا۔ یہ میواڑ کا مشہور قلعہ تھا۔ اور اس وقت تک اہل اسلام سے فتح نہیں ہوا تھا۔ چھ مہینہ کے محاصرہ کے بعد بادشاہ نے اسے فتح کیا۔ اور اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو جاگیر میں عطا کر کے اس کا نام خضر آباد رکھ دیا۔ اس کی ولیعہدی کی رسم بھی اسی جگہ ادا ہوئی۔ راجہ قید کر لیا گیا۔ اور اس کے اہل و عیال کوہستان کی طرف بھاگ گئے ۔

پدمنی کا افسانہ تسخیر چتوڑ کی داستان جلنے داستان طراز مورخین کی بدولت ایک نہایت دلچسپ رومان بن گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب راجہ علاؤ الدین کے پاس قید تھا تو کسی خوشامدی نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ راجہ کی رانی پدمنی حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ سنکر بادشاہ اس پر ایک دیدہ عاشق ہوگیا۔ اس نے راجہ کو مجبور کیا کہ وہ پدمنی کو دربار میں طلب کرے۔ راجہ بادل ناخواستہ اپنے اہل و عیال کو لانے کے لئے آدمی روانہ کئے۔ راجپوتوں کو جب صورت حالات کا پتہ چلا تو وہ بہت سٹپٹائے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مٹھائی میں زہر ملا کر راجہ کے پاس بھیجا جائے تاکہ اس کا کام تمام ہو جائے۔ مگر اس تجویز کو راجہ کی ایک بیٹی نے ناپسند

کیا۔ اس نے کہا کہ نمک حلال سپاہی زنانہ لباس پہنیں اور پالکیوں میں بیٹھ کر دہلی جائیں۔ جب شہر کے قریب پہنچیں تو رات کو وقت شہر میں گھس جائیں۔ سیدھے قید خانہ کا رخ کریں اور جس طرح ہو سکے راجہ کو چھڑا لائیں۔ یہ رائے سب نے پسند کی۔ چنانچہ سات سو سپاہی ڈولیوں میں سوار ہو کر دہلی روانہ ہوئے۔ ہر مقام پر ان کی خاطر تواضع ہوتی۔ رفتہ رفتہ یہ پردہ نشین قافلہ پہر رات گئے دہلی پہنچا۔ تمام شہر میں غل مچ گیا۔ کہ پدمنی رانی کی سواری آ گئی۔ جب یہ ڈولیاں اس قلعہ کے نزدیک پہنچیں۔ جہاں راجہ مقید تھا تو راجپوت ننگی تلواریں لے کر محافظوں پر ٹوٹ پڑے۔ اور چشم زدن میں راجہ کو نکال کر لے گئے۔

بادشاہ کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ پھر چتوڑ کی طرف بڑھا۔ اس نے پدمنی کی جھلک آئینہ میں دیکھ کر اس بات کا تہیہ کر لیا کہ جب تک اسے اپنے قبضہ میں نہ کر لیگا چین نہ لے گا۔ راجہ چند جاں نثاروں کے ساتھ قلعہ سے باہر نکل آیا۔ اور شاہی افواج سے لڑ کر مر گیا۔ بادشاہ قلعہ پر دوبارہ قابض ہوا۔ مگر پدمنی اس سے پیشتر ہی چتا میں جل کر بھسم ہو چکی تھی۔

قصہ کا ماخذ یہ داستان تاریخی نقطۂ نظر سے ایک شاعرانہ قصہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس واقعہ کو نہ تو امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں بیان کیا ہے۔ اور نہ ہی ضیاء برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں درج کیا ہے۔ حالانکہ اول الذکر علاؤ الدین کا معاصر اور موخر الذکر اس کا قریب العہد مؤرخ ہے۔ مابعد کے مورخین بھی اس واقعہ کے متعلق ساکت ہیں۔ ہاں ملک محمد جائسی (جو شیر شاہ کے زمانہ میں ہوا ہے) کی پدماوت میں یہ قصہ من وعن موجود ہے۔ مگر پدماوت نہ تو کوئی تاریخی مثنوی ہے۔ اور نہ ہی اس کے مصنف نے کبھی اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ وہ کوئی سچی تاریخی کہانی قلمبند کر رہا ہے۔ واقعات میں چند ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جو صرف مصنف کے اپنے زمانہ ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ڈولیوں کا واقعہ۔ اور قلعہ کنبھلمیر کی تسخیر وغیرہ۔ یہ ہر دو واقعات شیر شاہ کے زمانہ کے ہیں۔

سب سے زبردست دلیل جو اس قصہ کی تکذیب کر رہی ہے یہ ہے کہ راجہ رتن سین جسے اس قصہ کا ہیرو بیان کیا جاتا ہے کوئی تاریخی شخصیت نہیں۔ چتوڑ میں اس نام کا کوئی راجہ کبھی ہوا ہی نہیں۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے۔ کہ چتوڑ ایک ہی بار فتح ہوا۔ اور فتح ہونے کے بعد وہ علاؤ الدین کے زیر تسلط رہا۔ راجہ کا دہلی سے بھاگنا۔ اور چند سورماؤں کی مدد سے دوبارہ اپنی راجدھانی میں پہنچ کر قلعہ کو ترکوں سے چھیننا محض بناوٹی باتیں اور جھوٹی کہانیاں ہیں۔ جو کسی جنونی دماغ کی اختراع کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

رام دیو کی اطاعت گذاری رام دیو والئی دیوگیر نے تین سال سے خراج نہیں بھیجا تھا۔ علاؤ الدین نے ملک کافور کو اس کی وصولی اور دکن کی تسخیر کیلئے نامزد کیا۔ الپ خان حاکم گجرات اور عین الملک ملتانی کو کافور کی مدد کیلئے روانہ کیا۔ ملک کافور دکن پہنچا اور اس نے اپنے مشفقانہ رویہ سے اہل دکن کو اپنا مطیع کر لیا۔ اس کے بعد وہ ۷۰۶ھ میں خاندیش سے ہوتا ہوا رام دیو کے سر پر پہنچ گیا۔ رام دیو نے اپنے بیٹے سنگل دیو (جسے امیر خسرو نے سنکھن دیو لکھا ہے) کو تحفے تحائف دیکر ملک کافور کی خدمت میں بھیجا۔ ملک کافور نے فتح نامہ لکھ کر دہلی روانہ کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی راجہ رام دیو بہت سا نذرانہ لے کر دہلی پہنچ گیا۔ علاؤ الدین نے اس کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ اور اسے رائے رایاں کا خطاب عطا کر کے ایک لاکھ تنکہ انعام دیا۔ راجہ کچھ عرصہ بعد اپنی راجدھانی میں چلا گیا۔

دیول دیوی ۷۰۷ھ کے اوائل میں بادشاہ نے الف خان اور ملک نائب کو تسخیر گجرات کیلئے بھیجا۔ راجہ کرن کو سوائے راہ گریز کے اور کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہ آئی۔ وہ فوراً دیوگیر کی طرف بھاگا۔ راجہ سنکھن دیو کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے راجہ کی آؤ بھگت کی۔ وہ راجہ کی بیٹی دیول دیوی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی بھیلم کو پیغام دیکر راجہ کے پاس بھیجا۔ جسے راجہ نے مجبوراً قبول کر لیا۔ مگر دیول دیوی ملک نائب کے قبضہ میں آ گئی۔ جس نے اسے علاؤ الدین کے پاس بھیج دیا۔ اس کی شادی خضر خاں سے کر دی گئی۔

فتح ورنگل انہی ایام میں بادشاہ نے سیوانہ اور جھالور کے علاقے بھی فتح کر کے ممالک محروسہ میں شامل کر لئے۔ ۷۰۹ھ میں ملک کافور دوبارہ عازم دکن ہوا۔ سب سے اول اس نے تلنگانہ کے چند قلعے فتح کئے۔ اس کے بعد ورنگل کے قلعہ کی طرف بڑھا۔ راجہ اور اس کے ہمراہی قلعہ بند ہوئے۔ کئی مہینے کے محاصرہ کے بعد قلعہ فتح ہوا۔ راجہ نے بہت سا روپیہ اور خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ ملک کافور فتح کے شادیانے بجاتا ہوا دہلی واپس آ گیا

فتح کرناٹک ۱۳۱۰ھ میں ملک کافور اور خواجہ حاجی کرناٹک کے علاقہ فتح کرنے کیلئے نامزد ہوئے۔ کرناٹک کے راجہ بلال دیو نے ان کا بڑی توڑ کر مقابلہ کیا۔ مگر شکست کھا کر بھاگا۔ اس کی راجدھانی دوارسمندر حملہ آوروں کے قبضہ میں آئی۔ راجہ قید ہوگیا۔ راجدھانی میں ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ جہاں علاؤالدین کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ فرشتہ نے اس مسجد کو دیکھا ہے اور لکھا ہے کہ اسے "مسجد علائی" کہتے تھے۔ ملک کافور تین سو بارہ ہاتھی۔ بیس ہزار گھوڑے۔ ۹۶ من سونے کی قیمتی جواہرات لیکر ۱۳۱۱ھ میں دہلی پہنچا۔ بادشاہ اس خزانے سے بہت خوش ہوا۔ اس نے ہر ایک امیر کو گراں قدر انعام دلائے ؛

یہاں ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ کرناٹک کی فتح میں چاندی کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ بے حد متمول تھے۔ اور چاندی پہننا توہین خیال کرتے تھے ؛

دیوگڑھ کے راجہ کا خاتمہ ۱۳۱۲ھ میں راجہ رام دیو مر گیا۔ اور اس کا بیٹا گدی پر بیٹھا۔ اس نے دربار میں خراج بھیجنا بند کر دیا۔ علاؤالدین نے ملک کافور کو اسکی سرکوبی پر مامور کیا۔ کافور نے دیوگڑھ کے راجہ کو قتل کرکے مہاراشٹر۔ کرناٹک اور دکن کے بہت سے دیگر راجوں کو باجگذار بنایا ؛

کافور کی شرارتیں اب دربار میں ملک کافور کا طوطی بول رہا تھا۔ بڑا بہادر۔ جری۔ اور کاردان شخص تھا۔ علاؤالدین کی فتوحات میں اس کا بہت بڑا دخل تھا۔ مگر وہ حریص وطامع بھی تھا۔ اور چاہتا تھا کہ خود بادشاہ بن جائے۔ اس غرض کیلئے اس نے اپنی مکاری اور دغا شعاری سے کام لیکر بادشاہ اور ولیعہد سلطنت میں بگاڑ پیدا کرنا شروع کیا۔ اور بڑے شہزادے خضر خاں اور اس کے چھوٹے بھائی شادی خاں کو حبس دوام کا حکم دلوا کر گوالیار کے قلعہ میں بھجوا دیا ؛

علاؤالدین کی وفات علاؤالدین روز بروز کمزور ہو رہا تھا۔ اطبا کا علاج اس پر کارگر نہ ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں ملک کے اندر شورش برپا ہوگئی۔ بدنظمیوں کی ان وحشت انگیز خبروں نے بیمار بادشاہ کو اور بھی کمزور کر دیا۔ آخر وہ ۶ شوال ۷۱۶ھ مطابق ۱۳۱۶ء کو گلستان عالم علوی ہوگیا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ اسے ملک کافور نے زہر دے دیا تھا ؛

عام اخلاق و حیثیت علاؤالدین سخت گیر مگر نہایت پُرشوکت بادشاہ تھا۔ اسکی سیاست اپنے اور بیگانے میں تمیز نہ کرتی تھی۔ ملکی معاملات میں اس کا حکم سب کے لئے یکساں ہوتا تھا۔ اس کا عہد اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ تمام ملک امن و امان کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ وہ خود ان پڑھ تھا۔ مگر اس کے عہد میں اسلام نے جس قدر ترقی کی اسکی مثال ہندوستانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کا دربار علماء اور فضلاء سے بھرا ہوا تھا حضرت امیر خسرو اسی کے دربار سے وابستہ تھے ؛

علائی عہد کے خصائص علاؤالدین کے عہد میں بعض باتیں ایسی ظہور پذیر ہوئیں جو اس سے پہلے یا بعد میں کبھی سننے میں نہیں آئیں:-

(۱) غلہ اور کپڑے کی حیرت انگیز ارزانی ؛
(۲) جنگوں میں مسلسل فتح ؛
(۳) مغلوں کا استیصال ؛
(۴) معمولی رقم سے ایک لشکر کثیر کا اجتماع ؛
(۵) متمردوں اور باغیوں کا سخت سزا کے باعث مطیع و فرمانبردار رہنا ؛
(۶) عام آدمیوں کا سچ بولنا ؛
(۷) بہت سی عمارتوں کا عالم وجود میں آنا ؛
(۸) راستوں کا پُرامن ہونا ؛
(۹) مسلمانوں کا احکام شریعت پر عمل پیرا رہنا۔
(۱۰) علوم و فنون کی حیرت انگیز ترقی ؛

تعمیرات و ایجادات علاؤالدین نے مسجد قوت الاسلام کو بہت وسعت دی اور اس میں ایک مینارہ بنانا شروع کیا۔ جو نامکمل رہا۔ اس نے دہلی میں حوض علائی۔ مدرسہ علائی۔ اور دکن میں مسجد جامع تعمیر کرائی۔ اس کی طبیعت میں اختراع کا مادہ بھی تھا۔ چنانچہ ہاتھی کی عماری سب سے پہلے اسی نے ایجاد کی ہے ؛

علاؤالدین کی سلطنت علاؤالدین جس شان کا بادشاہ تھا اور جس سرعت سے اس نے اپنی سلطنت کو ترقی دی۔ اسکی مثال نہیں ملتی۔ مگر ہم یہ دیکھ کر سخت حیران ہیں کہ اس کی عظیم الشان سلطنت کے مٹنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگی۔ جتنی دیر اسے وسعت دینے میں لگی تھی۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ اسکی حکومت کا ہر شعبہ فوجی قوانین اور

نظم و نسق کے ماتحت حرکت کرتا تھا۔ اور ملک سول سرے سے مفقود تھا۔ ایسی سلطنت جس کی بنیاد فوجی قوانین پر ہو اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے۔ جب تک اس کے حکمران میں فوج کو سنبھالنے اور اس سے کام لینے کی قدرت موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی علاؤ الدین فوج کا نظم و نسق ملک کافور کے سپرد کرتا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت اور شورش کے آثار پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور جوں جوں اس کا اقتدار فوج سے کم ہوتا جاتا ہے۔ بغاوت اور غداری بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی وفات کے چند یوم بعد تمام ملک بغاوت کے شعلوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور یہ عظیم الشان سلطنت چشم زدن میں تہ و بالا ہو جاتی ہے۔

بہر حال علاؤ الدین قرون وسطیٰ کا ایک زبردست شخصیت تھا۔ جس نے بیس سال کی مدت قلیل میں بڑی کوشش اور بڑی شرکت سے سلطنتوں کو زیر و زبر کر کے ہندوستانی سیاست اور معیشت میں ایک خاص سلطانی حکومت پیدا کی جس نے بہت دور رس نتائج پیدا کیں ۔ ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جذبات سالک

بل جو ابرو پہ ترے او ستم ایجاد آیا
مرغ دل کھنچ کے تہ خنجر بیداد آیا

نہ ہے اندیشۂ صیاد نہ خوف گلچیں
اس چمن میں صفت سرو میں آزاد آیا

مست ایسا نشۂ فصل بہاری نے کیا
اڑ کے میں خود طرف خانۂ صیاد آیا

ہم پہ کیا کیا نہ کئے اس بت کافر نے ستم
لب پہ لیکن نہ کبھی شکوۂ بیداد آیا

آنکھ جھپکی تھی ذرا یونہیں کہ آئی یہ صدا
کھولئے رخت سفر ملک عدم آباد آیا

انجم و مہر و مہ و شمع سے ہے صاف عیاں
عادت تو نے لئے حسن خداداد آیا

کبھی جنت میں نہ خوش وقت کیا ہم نے قیام
جب تری وصل کی باتوں کا مزا یاد آیا

لب بدنداں جو تبسم سے کیا سینہ فگار
ہو نہ ہو اس ستم گر کو کوئی یاد آیا

کہہ کے یہ پھر انہیں جاتے ہوئے روکا میں نے
ٹھہرئے ٹھہرئے ہاں خوب مجھے یاد آیا

چمن دہر میں آتے ہی ہوئی تلخ حیات
میں جہاں پہنچا وہیں گھات میں صیاد آیا

منزل دہر میں غفلت ہی سالک ایسی
نہ مجھے یاد وطن نہ کبھی گھر یاد آیا

جیل چلو گے؟

حضرت "کوئی" کے قلم سے

"دیکھو تو کیسا مارا ہے کمبختوں نے، دشمنوں کے سارے بدن پہ نیل پڑ گئے ہیں؟"

بیگم نے محبت بھری نگاہوں سے ہمارے زخموں کا اندمال کرتے ہوئے کہا۔

خیریت گذری بیگم کہ جیل سے زندہ واپسی ہوگئی ورنہ چھ مہینہ میں تو آدمی کے چار چہلم ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جب تک ہماری آزاد خیالی کو "بڑے گھر" کی ہوا نہیں لگی تھی ہم بزعم خود سمجھا کرتے تھے کہ اگر کہیں ہمارے "دشمنوں کو" (بقول بیگم) گرفتار کر لیا گیا تو ہندوستان میں ایسی آگ لگ جائیگی جسے اگلے آدمیوں کی زبان میں کم از کم "غدر" کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ ممکن یہ بھی ہے کہ بمبئی کو اگلے ہی دن انگریزوں کی روانگی کے وہ عبرت انگیز نظارے دیکھنے پڑ جائیں جو جون ۱۹۲۹ء میں "پایہ تخت" بادشاہ غازی امان اللہ خاں کو الوداع کہتے ہوئے انہیں ہمارے انگریز بھائیوں نے دیکھے ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ کچھ بھی نہیں ہوا، اور ہم ساتھ اپنی ایک ناک دو کان کے ہز مجسٹی کی ٹکسالی یعنی سنٹرل جیل میں داخل کر دیئے گئے۔

ہمارے آپ کے بزرگوں نے جنہیں آجکل اپنی دیسی زبان میں "اگلے زمانہ والے" کہا جاتا ہے بعض بات تو ایسی اپ ٹو ڈیٹ کہدی ہے کہ مشاعرہ کی طرح داد دینے کو جی چاہنے لگتا ہے مثلاً سعدی صاحب کا یہ شعر کہ ؎

"کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

یادش بخیر ہمیں اپنی جیلانہ زندگی میں کیا چکی پیستے ہوئے، کیا بان بٹتے ہوئے کیا جیلر کی گالی سنتے ہوئے اور کیا جمعدار صاحب کی ٹھوکر کھاتے ہوئے رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ دراصل شدت سے یاد آتا تھا کہ بعض مرتبہ تو آنسو نکل آتے تھے۔ جسے جیل کا فیرسٹ عر اسٹاف، مذاق سلیم کے فقدان کی وجہ سے یہ سمجھا کرتا تھا کہ ہم اپنی مصیبت پہ رو رہے ہیں۔

اب اس میں کوئی مبالغہ سمجھے یا مغالطہ ہم تو اس شعر مندرجہ بالا کا یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ تحریک حاضرہ کی وہ ایک ادا ہی تھی جس پر ہمارے سیکڑوں سرحدی بھائی جان سے گئے، ہزاروں دیسی بھائیوں کو جیلخانہ کا پانی پینا پڑا اور کروڑوں تماشائی بھائیوں کو پولیس کے ڈنڈوں کا بھاگتے ہوئے "خاموش مقابلہ" کرنا پڑا (اب یہ اور بات ہے کہ اس خاموش مقابلہ کے دوران میں آپنے کہیں سے چھپ کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی کمر پر ایک آدھ اینٹ ماردی یا کوتوال صاحب کو لوڈی بچہ کہدیا یا بندے ماترم کہکر کسی سرکاری عمارت کے شیشے توڑ دیئے۔ ان باتوں سے خاموش مقابلہ میں نقص واقع نہیں ہوتا)

تو آمدم برسر مطلب اس تمام جملہ معترضہ سے مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم بھی تحریک کی اسی ایک ادا کے شہیدوں میں سے ہیں جس پر مسٹر سلوکم صاحب سے لیکر حضرت ریمزے میکڈانلڈ تک رقص کر رہے ہیں اور فدائے ہند جناب حضور سائمن گو بیگ صاحب کو تبدیل آب و ہوا کے لئے ذرا امریکہ تک جانے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔

ہماری سیاسی زندگی کا دوسرا دور (جسے ہم اپنے دیسی بھائیوں کی رعایت سے ان کو آپریشن کا آدا گول سمجھنے کے لئے تیار ہیں) ۶۔ اپریل ۱۹۳۰ء کو ٹھیک بارہ بجے شروع ہوا جب یکایک ایک بڑے لیڈر کا ڈاک منشی کے پاس یہ تار آیا کہ: ——

"رات مجھے انگریزوں نے گرفتار کر لیا ہے"

اول اول جب ہم نے یہ خبر وحشت اثر سنی تو سمجھے کہ یہ ہوائی کسی

دشمن نے اُڑائی ہوگی" مگر جب اس پر بھی بول مذا نے قوم کی جے" سڑکوں پر کسی طرح کم نہیں ہوئی تو سمجھے کہ ڈاک منشی نے شہر والوں کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ اپریل کی پہلی تاریخ کو انگریز آپس میں مذاق کرتے ہیں ڈاک منشی ہندوستانی ہے اگر مہینہ بیس دن کی دیر ہی ہوگئی تو کیا ہے مذاق میں تو جدت ہے۔

یہ خیال کرتے ہمیں خود بخود ہنسی آگئی بیگم پوچھنے لگیں:۔

"کیوں ہنس رہے ہو؟"

"وہ بڑے لیڈر پکڑے گئے!" ــــــ ہم نے ذرا منہ بنا کر کہا

"پھر تمہیں کیوں خوشی ہوئی؟" ــــــ بیگم نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ ڈاک منشی کو خوشی ہوئی؟"

"ڈاک منشی سے کیا مطلب؟"

"سارا مطلب تو اُسی سے ہے اس لئے کہ خبر اُسی کی اُڑائی ہوئی ہے اتم نے وہ مثل سُنی ہے بیگم "پھس میں چنگاری ڈال جمالو دور کھڑی" بس ہمارے ڈاک منشی صاحب اس وقت بالکل جمالو بنے ہوئے ہیں۔

"تو کیا یہ جھوٹ ہے۔ سچ کہنا میاں تمہیں ہمارے سر کی قسم!"

"خوب! تمہارے سر کا ان سیاسی معاملات میں کیا دخل ہے؟ یہ بھی کوئی شانہ کا عہدنامہ ہے کہ جی چاہا جس سرکاری آدمی نے اُس کی قسم کھالی میں آج سے کہے دیتا ہوں بیگم اگر تم نے اپنے سر کی اتنی بیقدری کی تو میں آئندہ اپنے حق شوہری کی بنا پر اُس کی قسم کھانے کی مطلق اجازت نہیں دے سکتا۔"

"توبہ! تمہیں ہر وقت مذاق ہی رہتا ہے۔ بات کیوں نہیں بتاتے؟" بیگم نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

مشکل سے بیگم نے فقرہ ختم کیا ہوگا کہ سڑک پر سے پہلے تو صرف ایک آواز "جے!" ...... کی آئی پھر معہ مبالغہ کے کوئی دو ہزار مختلف آوازوں میں ــــ "بھارت ماتا کی جے!" ــــ اور پھر ــــ "دے ...... دم" قسم کے نعروں نے گھر کی دیواریں تک ہلادیں۔

ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ دیوار کی تصویریں اور میز کے گلدان تو اس زلزلے سے شہید نہیں ہو گئے۔ بیگم نے چوکنا ہو کر بیساختہ دوپٹہ سنبھالا اس لئے کہ غدر کا پڑنا اور باغیوں کا گھروں میں گھس آنا اُن کے خیال میں بالکل ایک ہی بات ہے۔ شیرخوار ننھے نے ایک دو مرتبہ اوں اوں کر کے باقاعدہ پنچم کے سروں میں "بچے اور کتی" کی لڑائی کا ریکارڈ سنانا شروع کر دیا۔

سوسن باورچی خانے سے نکل کر دروازے کی طرف دوڑی اور برتن کی ٹوکری سے ٹھوکر کھا کر اپنی جھپٹ میں چبوتری پر سے پانی کا بھرا ہوا گھڑا لڑھکاتے ہوئے خود بھی دھم سے زمین پر آ رہی۔ غرض گھر میں رونق آگئی۔

ہم ابھی وائسرائے صاحب کی طرح امن قائم کرنے کی تدبیر سوچ ہی رہے تھے کہ نیچے سے آواز آئی:ــــ

"کل سب بھائیوں کو مکمل ہڑتال کرنی چاہئے۔ شام کو پانچ بجے پیپلی میدان میں جلسہ ہوگا۔"

اس کے بعد پھر وہی ــــ "جے!" "بھارت ــــ ماتا کی جے" ــــ "دے ــــ دم"

ان پُرجوش نعروں سے جو ہماری قومی اور ملکی حمیت میں جوش آیا تو بلا بیگم سے صاحب سلامت کئے زینہ سے اُتر قومی جھنڈے کے نیچے۔

ہماری صورت دیکھتے ہی کانگریس کے سکریٹری صاحب نے ایک شاندار "جے" سے ہمارا استقبال کیا اور مجمع کی نگاہیں اپنے قدیم خادم ملک وقوم کی طرف جو نان کوآپریشن کے زمانے میں اُن کا شریک کار تھا لیکن اب کچھ زمانہ سے ڈاکٹر انصاری کی طرح خاموش زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُٹھیں۔ پھر ایک بار سب نے مل کر ہماری "جے" کا نعرہ لگایا اور ہم بلا ارادہ ایسا محسوس کرنے لگے گویا انگریزوں سے واقعی ہماری سات پشت کی دشمنی ہے اور آزادی نہ صرف ہندوستانیوں کا بلکہ افریقہ کی اُن مردم خور قوموں کا بھی پیدائشی حق ہے جو ہر سال دو چار سیاحوں کا ناشتہ کر لینا اپنا قومی فرض سمجھتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے ذرا اپنا جوش دباتے ہوئے لڑائی کونسل کے سکریٹری صاحب سے پوچھا:ــــ

"کیا واقعی گرفتار ہو گئے؟"

"آپ کو اس خبر میں شبہ بھی ہے؟"

"کچھ نہیں، بس یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تصدیق بھی ہو گئی؟"

"جی ہاں مولانا کئی جگہ سے تار آ چکے ہیں۔"

"حد ہو گئی بھئی۔ اب واقعی حد ہو گئی ------ اچھا آپ اعلان کر دیجئے کہ شام کے جلسے میں میری بھی تقریر ہو گی (گویا ہمارے نزدیک ایک ایسا الٹیمیٹم تھا جس پر گورنمنٹ کو سوائے ہتھیار ڈال دینے کے چارۂ کار ہی نہیں ہو سکتا تھا)

ہم نے پورے زور کے ساتھ لب ---- اعلان کر دیجئے کہ شام کو میں اپنے ہاتھ سے وہی قانون توڑوں گا جس پر گرفتاری عمل میں آئی ہے"

تمام مجمع نے پوری قوت سے ہماری مختصر مگر جامع تقریر پر تحسین اور اختتام پر انتہائی متانت کے ساتھ قومی نعرہ لگا کر آگے بڑھنا۔ اب جو ہم نے مڑ کر دیکھا تو بازار ارجویٹ آدم زاد سے یہ معلوم ہو رہا تھا گویا صرف سربراہان سامان کے آنے کی دیر ہے۔

ان پے در پے واقعات سے ہمارا خون ابل گیا اور انتہائے غیظ و غضب کی حالت میں زینہ طے کر کے اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔

بیگم سراپا استفسار بنی ہوئی تھیں اور ان کی ہر ادا میں ایک (؟) ایسی چیز نگاہوں کو کھٹکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے سوچا بیوی بھی جو چیز ہی کہ غالب کی بیوی کی طرح "چین جبین سے" بھی "غم پنہاں" سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

مگر ہمیں زیادہ تنقید کا موقع نہ ملا بیگم نے یک لخت گھبرا کر پوچھا:—

"کیا ہوا؟"

"ہوا تمہارا سر"

"خیریت ہے؟"

"لعنت ایسی خیریت پر"

"بات کیوں نہیں بتاتے؟"

"بتائیں خاک؟"

"توبہ!"

"اس توبہ تلا ہی نے تو ہندوستان کو اس درجہ پر پہنچایا ہے!"

بیگم نے جل کر منہ پھیر لیا۔ اور اس طرح ہمیں حالات حاضرہ پر ایک آزادانہ تبصرہ کا موقع مل گیا۔ کہنے لگے:—

"ارے لعنت ہے ایسی زندگی پر! ارے تف ہے اس غلامی پر! انسان ایسا بھی بے حس نہ ہو کہ ملک میں چاروں طرف آگ لگ رہی ہو۔ دنیا تباہ ہوئی جا رہی ہو اور ہماری بیگم صاحبہ کو توبہ و استغفار ہی سے فرصت نہ ہو۔ میں پوچھتا ہوں آخر تم نے اس گھر کو کیا سمجھ لیا ہے یا یہ خیال ہے کہ کل ہی قیامت ہونے والی ہے اس لئے جتنی توبہ کی جائے اگلے پچھلے رشتہ داروں کے حصہ کی بھی آج ہی کر لی جائے۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

"توبہ! تم تو آج ہوا سے لڑتے ہوئے آئے ہو۔ میں کہے دیتی ہوں میرے سر میں درد ہے، مجھ میں اس قومی لیکچر کے سننے سنانے کی طاقت نہیں ہے، اور اگر آپ اس لیڈرانہ بخار کو دل سے نکالنے پر مجبور ہی ہیں تو آیا کر خدا کے لئے دیکھئے وہ پہلے مجھے میکے لے جائیں پھر شوق سے آپ چاہے گھر کو خلافت کمیٹی کا دفتر بنائیں یا کچھ اور مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

بیگم کی اس ٹوڈیانہ تقریر سے جسم میں آگ ہی تو لگ گئی۔ لیکن تیور دیکھ کر خون کا سا گھونٹ پی لینا پڑا اس لئے کہ بیگم کے انداز سے بھی اس وقت "قانون شکنی" کے وہی جذبات عیاں تھے جو ہمارے الفاظ سے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہم "ملکی قانون" توڑنے پر آمادہ تھے اور وہ "خانگی قانون" کی دھجیاں اڑا دینے پر تیار۔

خدا کسی کو نیم تعلیم یافتہ بیوی کے پلے نہ ڈالے۔

بالآخر اس کا فیصلہ اس طرح ہوا کہ ادھر ہم خاموشی کے ساتھ اٹھ کر مردانے میں چلے آئے اور شام کی تقریر کے لئے اخبارات اور سیاسی کتابوں کے حوالے نوٹ کرنے لگے، ادھر بیگم اپنا سروتہ لیکر چھالیہ کاٹنے کے لئے دالان کی طرف خراماں ہو گئیں اور میدان جنگ شیر خوار ننھے کے ہاتھ رہا۔ کھانا نہ کرنے کے بیگم نے صرف ایک مرتبہ دریافت کرایا اور جب ہم نے احتجاج کے طور پر کھانے سے صاف انکار کر دیا تو پھر شام تک ہمارے گھر میں کسی کے منہ سے یہ نہ نکلا کہ آخر بیگم نے آج کس تقریب میں بھوک ہڑتال کر دی ہے۔

چار بجتے ہی والنٹیروں کا ایک جتھہ ہمارے گھر پر موجود تھا جس

ہمراہ بڑی عزت و توقیر کے ساتھ قومی نعروں کے شور میں ہم پہلی میدان پہونچ گئے اور لگے تقریر کرنے:—

ہماری تقریر اس قدر باغیانہ تھی اور ہمارے الفاظ اس درجہ گورنمنٹ شکن تھے کہ ایک بھوکے آدمی سے زیادہ سے زیادہ اتنی ہی اُمید کی جاسکتی تھی۔

سی آئی ڈی کے انسپکٹر صاحب کی کاپیاں کی کاپیاں بھری جارہی تھیں پولیس کے جوان رہ رہ کر کوتوال کا منہ تک رہے تھے کہ کب فائر کا حکم دیتے ہیں مگر ہم اس لاپروائی سے تقریر کر رہے تھے گویا دفعہ ۱۴۴/۱۰۸ کی نظیریں پڑھ رہے ہیں۔ ہمارے ہر جملہ کے اخیر میں بندے ماترم کا نعرہ اس زور شور سے بلند ہوتا تھا کہ خیال اگلی تاریخ میں گورنر صاحب کے رخصتی مناظر اور ہمارے چارج لینے کے دلکش سین دکھانے لگتا۔

آخر کسی نہ کسی طرح ہماری تقریر ختم ہوئی اور نمک قانون توڑنے کی باری آئی۔

ایک بڑا سا کڑھاؤ چڑھا ہوا تھا جس میں کیچڑ اُبل رہی تھی اور پانی بھاپ بن بن کر اس طرح اڑ رہا تھا جس طرح کسی کوتوال صاحب کے ہوش۔ ہم مع چار درجن والنٹیروں کے کڑھاؤ کی طرف بڑھے اور قبل اس کے کہ ہم اُس کے نزدیک پہونچیں کوتوال صاحب کے حکم سے پولیس کے سپاہیوں نے اُسے اپنے حلقہ میں لے لیا اور اعلان کر دیا کہ یہ سب چیزیں بحق گورنمنٹ سرکار ضبط کرلی گئیں ہیں کوئی صاحب ان کے قریب آنے کا قصد نہ کریں مگر وہاں صاحب، کون تھا؟ سب اپنے دیسی بھائی تھے جو کوتوال صاحب کو زیادہ سے زیادہ لوڈی سمجھ رہے تھے۔ ہم نے کڑھاؤ پر حملہ کا حکم دیا، پولیس نے روکا، ہم نے زور لگایا، انہوں نے دھکے دیئے، ہم نے گھونسے لگائے انہوں نے ڈنڈے سنبھالے اور پھر ہی ہوا جو سائمن گو بیک صاحب کی سلامی میں ہوا تھا۔

اس دھینگا مشتی میں کڑھاؤ جو لوٹا ہے تو کیا پولیس اور کیا والنٹیر کیا کوتوال صاحب اور کیا لڑائی کونسل کے ڈکٹیٹر، ہر ایک کی زبان پر ہائے ہائے کے نعرے نکلنے لگے۔ کسی کا پیر جلا کسی کا ہاتھ، کسی کی ٹوپی گری کسی کی پگڑی، کسی کا ڈنڈا اڑا کسی کی چھتری، کسی کی داڑھی جھلسی کسی کی مونچھ، کسی کا پاجامہ خراب ہوا کسی کی دھوتی—

—— اچھا خاصہ قیامت کا ریہرسل ہوگیا۔

ہمارے صرف پنڈلی پر کچھ چھینٹے پڑے اور کمر پر دست بخیر دو ڈنڈے ایک جوتا بھاگ دوڑ میں کہیں رہ گیا اور ایک تکلی کوتوال صاحب کے کوٹ میں اُلجھی ہوئی چلی گئی۔ باقی سب خیریت تھی۔

اسی حال میں افتاں و خیزاں خدا جانے مجمع کے دھکوں سے یا اپنے پیروں سے گھر تک پہونچ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کنڈی بند ہے! بہت پیٹے، بہت چلائے، آوازیں دیتے دیتے سارا محلہ سر پر اُٹھا لیا مگر نہ اُٹھیں تو ہماری بیگم ———— ہم نے کہا اس سے تو کوئی ہمیں جیل ہی لیجاتا، حفاظت سے پیر پھیلا کر سونا تو ملتا

آخر خدا خدا کر کے ایک ہمسایہ کو ہماری حالتِ زار پر رحم آیا اور کچھ بڑبڑا کر کچھ سوتی کچھ جاگتی ہوئی سی آواز میں کہنے لگا۔ بابوجی اتنی رات گئے کہاں سے آتے ہے؟ ہم نے کہا:—

"لالہ جی؟ اچھا! ارے بھائی کیا پوچھتے ہو۔ بقول شاعر؎

"ذرا فرصت ہو تو سن لیجئے بڑی ہے داستاں میری"

اس وقت تو اپنی لڑکی کو ہماری چھت پر بھیجدو کہ ہمارے گھر کے آدمیوں کو ذرا جگادے — بڑی مہربانی ہوگی لالہ۔ اچھا لالہ ذرا جلدی بھیجدو۔

لالہ پہلے تو کچھ کھانستے کھنکارتے رہے پھر کواڑ کی دراز سے دیکھ کر ہمیں خوب پہچاننے کی کوشش کی پھر کچھ بڑبڑاتے ہوئے لڑکی کو جگایا اور چھت پر چڑھا دیا۔

اس تدبیر سے مجبور ہوکر بیگم کو بھی ہتھیار ڈال دینے پڑے اور ہمیں اپنے گھر میں گھسنے کی اجازت مل گئی۔

گھنٹہ میں سوا بارہ بجے تھے، بھوک بڑی ہی لگ رہی تھی جتنی دو وقت کے بھوکے کو لگنی چاہئے کھانا بھی ایک طرف دسترخوان سے ڈھکا ہوا میز پر رکھا تھا مگر کچھ بیگم کے تیور دیکھ کر اور کچھ اپنی وضعداری کا پاس کرتے ہوئے دل ہی دل میں یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ:—

"وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں"

اس کے بعد بادلِ ناخواستہ اپنے بستر پر جو آج بڑے تکلف سے سب سے علیحدہ بچھا ہوا تھا، ایک ہجراں نصیب عاشق کی طرح پڑ کر آہ سرد بھرنے لگے، بیگم علیحدہ کسی سنگدل مغرور شباب کی طرح خواب نوشیں کے

مزے لینے لگیں۔ ہمیں نیند کہاں تھی ——؟ بھوک کروٹوں پر کروٹیں بدلوا رہی تھی، جلے ہوئے پاؤں کے پھپولے آگ کی طرح سلگ رہے تھے۔ کمر میں ڈنڈوں کی چوٹ سے ٹیسیں لگ رہی تھیں۔ بقول پنڈت نانک چند صاحب چند ؎

"جو جل اُٹھتا تھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے تھے"

اسی حال میں پانچ بجے ہم نے سوچا کہ اُٹھ کر ذرا نماز ہی پڑھ لیں کہ دروازے پر کسی نے دستک دی، ہمارا ماتھا ٹھنکا، چپکے چپکے اُٹھ کر کواڑ کھولے کیا دیکھتے ہیں کہ کوتوال صاحب بہ نفس نفیس موجود ہیں۔ ہم نے دل میں کہا لاحول ولاقوۃ۔ دیکھئے آج بھی روٹی کی صورت نظر آتی ہے یا نہیں۔ دوسرے دن کے فاقہ کا خیال کر کے ہمیں پسینہ آگیا۔ پھر جب انہوں نے چپکے سے وارنٹ دکھایا ہے تو کہنے والے کہتے ہیں کہ ہمارا چہرہ ایسا ہو گیا تھا جیسے کسی مہذب ملک کے باشندے کا۔ اب یہ اور بات ہے کہ کوتوال صاحب نے سلامی اُتارنے کے بجائے ہمیں اپنی گاڑی پر چڑھا لیا اور باوجود اس اصرار کے کہ "ذرا منہ ہاتھ تو دھو لینے دیجئے" —— ذرا اچکن تو گلے میں ڈال لینے دیجئے" —— ذرا بالوں میں کنگھا تو کر لینے دیجئے" —— اُنہوں نے مسکرا کر صرف اتنا کہا: ——

"وکیل صاحب ان تکلفات کو کچھ زمانے کے لئے آپ ترک ہی کر دیں تو بہتر ہو"

کچھ دیر بعد ہم جیل میں تھے۔

مقدمہ کی پیروی کرنا ہمارے قومی عقائد کے خلاف تھا، چنانچہ ہم نے کسی وکیل کو محنتانہ حاصل کرنے کی تکلیف نہ دی لیکن چونکہ خود وکیل تھے اس لئے خاموش بھی نہ رہا جا سکا اور کوتوال صاحب سے ایسی ایسی جرح کی کہ کئی مرتبہ عدالت کو ڈانٹ بتانے کی ضرورت پیش آئی اور حالانکہ ہمیں یاد نہیں مگر کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا معلوم ملک کی تباہی کا تصور کر کے یا اپنی بے بسی کو دیکھ کر ہماری آنکھوں سے بھی پنڈت مالویہ کی طرح برسرِ عدالت آنسو جاری ہو گئے تھے۔ دورانِ مقدمہ میں جب عدالت نے ہم سے پوچھا کہ "آپ نے نمک قانون توڑا" تو ہم نے نہایت دلیری سے کہہ دیا:—

"ہم نے نہیں توڑا"

"کوتوال صاحب کا رپورٹ ہے آپ نے توڑا"

"کوتوال صاحب جھوٹ بولتا ہے اور آپ بھی تجاہل عارفانہ کرتا ہے، تمام دنیا جانتی ہے کہ نمک قانون گاندھی جی نے توڑا ہے اور جب وہ اُن کے ہاتھ سے ٹوٹ جانا تسلیم ہو چکا ہے تو پھر ہمارے لئے کیا چیز رہ گئی تھی جسے ہم توڑتے؟"

اس منطق آزما دلیل پر عدالت نے بھی بتیسی کھول دی اور تمام کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

اس کے بعد جب عدالت نے ہمیں چھ ماہ قید سخت کا حکم سنا دیا تو پنڈت موتی لال نہرو کی طرح ہم نے بھی جیل میں اخبارات پڑھنے کی علم نما اجازت چاہی اور اس کا جواب پنڈت موتی لال نہرو کو عدالت نے کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر ہم سے یہ ضرور کہا گیا کہ کانگریس تو اخباروں کی اشاعت بند کرنا چاہتی ہے پھر آپ کیوں اخبار پڑھنا چاہتا ہے"

ہم نے ذرا کان کھجاتے ہوئے جواب دیا:—

"سب لیڈر پڑھتا ہے یہ قانون اخبار والوں کے لئے ہے۔ اگر وہ شائع نہ کریں گے تو پھر کوئی نہ پڑھے گا"

جیل میں جیسی گذری اس کی باقاعدہ ڈائری جیلر صاحب کے پاس ہو گی۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جیل سے واپسی پر بیگم کا پارہ مزاج بالکل ڈھل گیا ہے اور اب وہ ہم پر ویسی ہی مہربان ہیں جیسی کبھی ننھے کی ولادت سے قبل تھیں۔ ہمیں بھی اب ان کی کوئی بات قابل اعتراض معلوم نہیں ہوتی سوائے اس بات کے کہ وہ اکثر ہم سے مسکرا کر پوچھ لیا کرتی ہیں —— "جیل چلو گے؟"

"کوئی"

* * *

صرف عالمگیر کے مستقل خریداروں اور ان اصحاب کیلئے ہے، جو رسالہ عالمگیر کو ایجنٹ حضرات سے خریدتے ہیں،
چونکہ کتاب کی یہ رعایتی قیمت **بالکل مفت** کے برابر ہے، اس لئے اسکا بہت تھوڑے عرصہ میں ختم ہو جانا یقینی ہے،
اگر آپ بھی اس قابل دید کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی فرمائش خریداری بھیجدیجئے، ہمیں یقین ہے
کہ اس کتاب کو **وہی خوش قسمت اصحاب** حاصل کر سکیں گے، جو اعلان ہذا ملاحظہ فرماتے ہی
فرمائش خریداری بھیجدیں گے، مدت ختم ہونے کے بعد دس روپیہ میں بھی ہم اسکو نہ بھیج سکیں گے،
واضح رہے، کہ کتاب نہایت دلچسپ ہے، اور ایسے عمدہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے، کہ آپ کو ختم کئے بغیر چین
نہ آئے گا، اور جو لوگ علامہ ابن القیم کی بلند پایہ شخصیت و قابلیت سے واقف ہیں، وہ تو جانتے ہی
ہیں، کہ جو کتاب علامہ ممدوح کے زور دار قلم سے لکھی گئی ہو، وہ موتیوں سے تول کر لینے کے
قابل ہے، یہ سطور محض ان حضرات کے لئے لکھی گئی ہیں، جن کی نظروں سے علامہ ممدوح کی کسی تصنیف کا
کوئی اردو ترجمہ نہیں گذرا،

یقین جانئے کہ اس گرانقدر کتاب کے **پونے آٹھ سو صفحات** میں ایسے گراں قیمت اور بیش بہا موتی بکھرے پڑے
ہیں، جن کی قیمت کا اندازہ صرف مرتبہ دان علامہ ابن القیم ہی لگا سکتے ہیں،

آج سب سے پہلی فرصت میں کتاب کی خریداری کیلئے کارڈ بھیجکر اس لاجواب اور ہنگامہ پرور کتاب کو حاصل کیجئے اور اس بڑی بھاری رعایت اٹھائیے ورنہ

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

نیاز مند
منیجر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور

صرف خریداران عالمگیر کیلئے

بجائے تین روپے بارہ آنے کے صرف ایک روپیہ آٹھ آنے میں!

علامہ ابن القیم کی معرکتہ الآرا عربی تصنیف کا اردو ترجمہ

حجم پونے آٹھ سو صفحات

مینیجر رسالہ عالمگیر لاہور کی طرف سے ایک ضروری اعلان

علامہ ابن القیم کا مرتبہ عربی علم و ادب میں جسقدر بلند ہے، اس سے تمام دنیائے اسلام بوجہ احسن واقف ہے، مسئلہ تقدیر جیسے اہم اور ضروری مسئلہ پر آپ نے عربی زبان میں ایک بلند پایہ اور ضخیم کتاب "**کتاب التقدیر**" کے نام سے لکھی، جسکا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور ریٹائرڈ پبلشر مولوی کرم بخش صاحب میونسپل کمشنر مرحوم نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا، کتاب طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دان علامہ ابن القیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی، افسوس کہ مولوی صاحب بتقضائے الٰہی راہئی ملک بقا ہوئے۔ اسکے بعد اس کتاب کا کسی نے اشتہار نہ دیا، اب ہمارے پاس **صرف دو ہزار** کے قریب اسکی جلدیں موجود ہیں، اور ہم نے اس کو جلد از جلد فروخت کر دینے کے لئے اسکی قیمت پونے چار روپے کی بجائے ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک کر دی ہے، ورنہ اسکا اشتہار اس سے پیشتر بھی سوا تین روپے اور پونے چار روپے کا عالمگیر میں شائع ہو چکا ہے، یہ رعایتی یا برائے نام قیمت

حضرت اسیر لکھنوی کی ایک غیر مطبوعہ غزل

نتیجۂ فکر استاذ الاساتذہ مدبر الدولہ دبیر الملک حضرت اسیر لکھنوی مرحوم

قتل کرتے ہیں وہ ہنگام تکلم مجھکو
قہقہہ تیغ ہے خنجر ہے تبسم مجھکو

صبر منظور ہے دیدار بتاں سے چپکے
اسمیں کیا کہتے ہوئے دیدہ و دل تم مجھکو

میکشو طرفہ مزا ہی ہو کسی کام کو جائے
سونپ کر میکدے میں پیرِ مغاں خم مجھکو

کوئے قاتل کو جو چلتا ہوں تو سایہ ڈر کر
پوچھتا ہے لئے جاتے ہو کہاں تم مجھکو

بے اثر اشک مری دیکھ کے کہتا ہے وہ شوخ
کیا اُبھاریں گے یہ ڈوبے ہوئے انجم مجھکو

وہ بھی دن ہوں کہ کروں پیرِ مغاں سے بیعت
تہنیت دیں لب جام و دہنِ خم مجھکو

مال سے جان سوا، جان سے ایمان سوا
مال سے جان سے ایماں سے سوا تم مجھکو

نہ سہی تیغ مرے قتل کو کھینچیں وہ چھری
ڈوب مرنے کو ہے یہ نہر ہی قلزم مجھکو

آسماں مجھ کو مٹاتا ہے مجھے ہے یہ خیال
کس پہ بیداد کرو گے جو کیا گم مجھکو

ہوں وہ کشتہ وہ جلانے کا جو دیں حکم اسیر
خود مسیحا یہ کہیں یاد نہیں قم مجھکو

کلام نفیس

از جناب مولوی محمد یوسف صاحب نفیس بنگلوری تلمیذ رشید جناب امیر مینائی و حضرت جلیل مدظلہ

نہ دیکھو گھور کر مجھ کو خدارا تنگ ہوں ٹیڑھی چتون سے
یہ پی کر پھول دم بھر میں نکل جائیں گے گلشن سے

پڑی ہے یہ نئی افتاد بلبل تیرے شیون سے
لگی ہے آگ گلشن میں دھواں اٹھا ہے گلشن سے

یہ بجلی کیا گری اے باغباں تقدیر چمکی ہے
چمن کا نام روشن ہو گیا میرے نشیمن سے

عوض پھولوں کے دامن میں ہیں کچھ پرزے گریباں کے
ترے دیوانے خالی ہاتھ کب آئے ہیں گلشن سے

نکالو شمع محفل سے بجھا دو شمع محفل کو
مری جاں! تم نقاب اپنی الٹ کر روئے روشن سے

چمن میں آج کس گل رو کی بلبل آمد آمد ہے
نکالے جا رہے ہیں خار چن چن کر جو گلشن سے

دیا حسن ہیولیٰ سے اعلیٰ فیض پاتا ہے
جوانی سیکھتی ہے سادگی انکے لڑکپن سے

تصور کی بدولت یہ مزے اب روز رہتے ہیں
کہ دست شوق میرا کھیلتا ہے انکے جوبن سے

تقاضا ہے یہی اٹھتی جوانی کا تقاضا ہے
گلے مل کر ابھی سے ہو لیں وہ رخصت لڑکپن سے

ترا وحشی جو بھولے سے کبھی گلشن میں آتا ہے
عوض پتھر کے پھول اس پر برس پڑتے ہیں گلشن سے

یہ محشر ہے کہ اس میکدہ سے کچھ نہیں کھلتا
ہزاروں مست اٹھ اٹھ کر چلے آتے ہیں مدفن سے

گھٹا وہ کالی کالی جھوم کر تربت سے اٹھی ہے
نفیس اب دیر کیا ہے کاگ بوتل کا اڑے دن سے

موسمِ زمستان!

پلا بادہ ساقی اٹھا رسم شرم
کہ ہو جب ہی آہٹ مری طبع گرم

نئے جا مجھے جام تو بید رنگ
تو پھر دیکھ میری طبیعت کا رنگ

مخالف ہوستی ہیں جو روزگار
لطے کی صورت ہو وہ بھی شکار

چھپے غار میں گرگ یوز و پلنگ
کہ بدلا ہے قدرت نے موسم کا رنگ

ڈھکی چوٹیاں برف سے سربسر
کہ چاندی چڑھائی ہے کہسار پر

کھلے پھول گیندے کے وہ زرد زرد
چلی آتی ہے کیا ہوا سرد سرد

وہ گل مہندی چھوٹی کھلے گل فرنگ
چمکتا ہوا وہ ہزارے کا رنگ

وہ نیلم کے ساغر لیے کاسنی
وہ سورج کی ہم شکل سورج مکھی

وہ گوبھی کے پتے اکڑنے لگے
بتاشے بھی دو چار پڑنے لگے

اناروں میں کلیاں بھی ہو آ گئیں
وہ کیلو کی پھلیاں بھی گدرا گئیں

بہی سیب امرود پکنے لگے
وہ شہتوت میں کولی ٹمکنے لگے

وہ پک کر شریفے بھی سب کھل گئے
ٹپک پڑتے ہیں کچھ بھی جو ہل گئے

لدی ہیں درختوں میں نارنگیاں
جھکی پڑتی ہیں بوجھ سے ڈالیاں

ہزارہ لٹکتے ہیں کیا لال لال
جڑی ہیں زمرد کے جھاڑوں میں لال

چھپی عشق پیچاں میں ساری منڈیل
وہ نازک وہ باریک پتوں کی بیل

تراشے ہیں قدرت نے کیا بے مثال
کرن پھول یاقوت کے لال لال

وہ کچھ پھول سرسوں میں آنے لگے
ذرا کھیت جوبن دکھانے لگے

کہیں چھوٹے چھوٹے وہ چھپر کے پھول
کہیں اودے اودے وہ السی کے پھول

نظر آتی ہے صنع رب انام
زمرد کی چھڑیوں پہ نیلم کی شام

ہوا جب اٹھی ہے جنگل کی ریت
تو کیا لہلہاتے ہیں گیہوں کے کھیت

غمامہ کا چلتا نہیں زور و پیچ
ہر سردی کے آگے دلائی بھی ہیچ

یہ سالی ہے بیکھر ہو لیٹے ہیں آج
گلوبند سر سے لپیٹے ہیں آج

تھا جن جن کو نازک مزاجی پہ لاف
ہیں لائے ہوئے وہ بھی توشک لحاف

نہیں اور جاڑے کا چارہ کوئی
گزرتی ہے اس کو دونی پاروئی

ہم آغوش لبریز ہے شام سے
اسی کی گذرتی ہے آرام سے

وہ عاشق تھا جن کا نفس شعلہ بار
وہ ہیں شاکی سرد مہری یار

گری برف ٹھری جو ٹھنڈی ہوا
رگوں میں لہو جمنے لگا

دم صبح ہے زور سردی کا اور
جدھر دیکھو ہے چائے قہوہ کا دور

رکھے ہیں وہ شیشوں کو نشتر حسیں
کسی میں برانڈی کہیں شامپیں

پلاتا ہے بھر بھر کے ساقی ایاغ
ہوا آتش تر سے روشن دماغ

کوئی مست ہے کوئی مخمور ہے
کوئی نشۂ عشق میں چور ہے

چلی زور سے کیا ہوا رات کو
قیامت کا پالا پڑا رات کو

کوئی شال اوڑھے دوشالہ کوئی
کوئی جامہ وار اور چوغا کوئی

جو کہتے تھے اپنے کو آتش مزاج
چڑھائے ہیں دستانے ہاتھوں پہ آج

وہ کل جن پہ ڈھاکے کی ململ تھی بار
وہ ڈالے ہیں اب صدریاں تین چار

نباتی گراں جن پہ تنزیب کی
پہنے ہیں اب کوٹ اچکن دبی

کہیں گرد نمیں تاپتے ہیں حسیں
کوئی ہاتھ ہی سینکتا ہے کہیں

وہ رنگین کپڑے چمکتے ہوئے
انگیٹھی میں کوئلے دہکتے ہوئے

نہیں چھینٹ سے کوئی خالی دکاں
نزاکت بھری لکھنؤ کی وہ فن
نظر آتے ہیں جتنے تالاب جام
میسر نہیں یہ بھی کپڑا اگر
وہ پانی پہ کائی بھی جمنے لگی
سوات جیتی لدکے بطِ کسیح پر

اُترتے ہیں بانات تیور کی تھان
کہیں سرخ و سبز اور کہیں زرد زرد
وہ اوڑھے ہیں کہنی کی چادر تمام
سنگھاڑوں کی بیلوں سے ڈھکے ہیں
بہت دہانہ دریا کی تھمنے لگی
چلے آتے کہسار کو چھوڑ کر

کلنگ اور سرخاب باندھے قطار
ٹھہری ممولا و بگلے تمام
وہ مرغابیاں اور وہ لال سر
گرا جھنڈ پانی میں آکر اگر
پئے سیراب لوگ جلنے لگے
بنظیر شاہ ۔۔۔۔

گرے آکے جھیلوں پہ وہ بسیار
وہ پھیلے ہوئے ہیں جہاں تک کلام
برابر وہ بیٹھے جو صف باندھ کر
کبھی جدولیں صفحۂ آب پر
شکاری بھی جھیلوں پہ آنے لگے
(مرسلہ حضرت اروی)

کلامِ شمیم!

حضرت شمیم خیرآبادی تلمیذ خدائے سخن حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

یہیں مسکن یہیں مدفن بھی ہو قاتل میرا
بیٹھ کر تیری گلی میں نہ اُٹھے دل میرا

ہو گا کیوں دعوئے خوں حشر میں باطل میرا
زخم دل دینگے شہادت یہ ہے قاتل میرا

میں بھی دم لوں تو شمشیر جو دم لے شمشیر
ٹھہری شمشیر ستم ٹھہرے جو قاتل میرا

بے نقاب آتے نہیں قتل کو وہ اس ڈر سے
کہیں منہ دیکھ نہ لے دیدۂ بسمل میرا

ناتوانی کا برا ہو میں رہا جاتا ہوں
پاؤں اُٹھتا نہیں اے دوریٔ منزل میرا

حسرتیں اسکی نہ مٹی میں ملاؤ ایجان
نہ ملو پاؤں سے ارماں بھرا دل میرا

پھنس گیا زلف میں کمبخت یہی ڈر ہے مجھے
کان میں اسکے نہ کچھ کہدے کہیں دل میرا

پہلے نظروں میں سمایا تھا یہ بجلی بن کر
گر گیا آنکھ سے اُس شوخ کی اب دل میرا

نکہتِ گیسوئے مشکیں جو صبا لائی شمیم
صفتِ غنچہ دمِ صبح کھلا دل میرا

گولکنڈہ کا پہلا شاعر بادشاہ

از جناب محمد وزیر صاحب وزیر حیدرآبادی

نام - یار قلی جمشید خان - قطب شاہ - تخلص جمشید

ولادت سنہ ۹ ہجری میں گہوارۂ سلطنت بیدر میں تولد ہوا۔ اس کا باپ سلطان قلی چنگیزیہ خاندان کا شہزادہ تھا جس نے آذربائیجان سے ہندوستان میں آنکر پناہ لی تھی۔ سلطان محمود بہمنی نے اس ہونہار نوجوان کو اپنے آغوشِ شفقت میں لے لیا۔ شاہی خاندان میں اس کی شادی ہوگئی اور حسنِ تدبیر سے تھوڑے ہی عرصہ میں سلطنت گولکنڈہ کا مالک بن بیٹھا۔

تعلیم | جمشید قطب شاہ نے بیدر میں شہزادوں کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی عربی فارسی میں یکتائے روزگار ہوا۔ شعر و سخن کا عاشق تھا۔ مضمون کے آخری حصہ میں اس کا کلام درج ہے جس کو ناظرین ملاحظہ فرماکر خود اچھی طرح اندازہ کرسکیں گے۔

سلطنت | سنہ ۹۵۰ ہجری میں تخت گولکنڈہ پر جلوہ آرا ہوا۔ اور جشن جلوس منعقد ہی تھا کہ قاسم برید والی بیدر نے گولکنڈہ کا محاصرہ کرلیا۔ یکایک دشمن کا مقابلہ ہونے سے گو وہ تھوڑی دیر کے لئے پریشان تو ہوگیا مگر اس نے نہایت استقلال سے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور آنا فاناً میں دشمن کو فرار پر مجبور کردیا

[illegible] شاہ والی احمدنگر [illegible] کی خوشی میں ایک جشن منعقد کیا اور جمشید کو دعوت [illegible] امرا دولت کو اپنا قائم مقام بناکر جمشید قطب شاہ نے احمدنگر کی جانب [illegible] کو جب نظام شاہ نے [illegible] کی خبر سنکر وہ [illegible] کے استقبال کے لئے آیا اور جلوس کے ساتھ شہر [illegible] [illegible] گیری کا جو بادشاہوں کے [illegible]

[illegible] جمشید پر سایہ کیا اور خطاب مستطاب قطب شاہ سے مخاطب کیا جمشید نے بربنائے علو ہمت و مردانگی و شجاعت قبول نہ کرکے نظم میں جواب دیا

نظم

مرا نیست با چتر شاہی نیاز | خطابی نخواہم بہ عمر دراز
کہ شاہانِ ملک دکن بالتمام | گزشتند از آں چتر شاہی بنام
کہ از روئے مردی و مردانگی | ہماں زور شمشیر و فرزانگی
ربودند گوی از سپہر و درنگ | ز میدانِ مردی بچوگان جنگ
چو من هم بہ دستِ شجاعت پناہ | نمایم بگیرم خطاب و کلاہ
من آں گہ کنم چتر شاہی قبول | کہ گیرم ز دشمن بہ عونِ رسول

نظام شاہ ان دلیرانہ اور فی البدیہہ اشعار سے بیحد متاثر ہوا۔

جمشید قطب شاہ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ میدان جنگ میں ایک ادنےٰ سپاہی کی طرح کام کرتا اور تختِ سلطنت پر عادل حکمران کی طرح دادخواہی کرتا تھا۔ اس نے بعض اوقات اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں دیکھکر اس کی مدد کی چنانچہ امیر برید جس نے متواتر اس سے جنگ کی جب [illegible] شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ اور عاجزی کے ساتھ [illegible] کا طالب ہوا تو دشمن کی بے دست و پائی سے [illegible] متاثر ہوکر اس [illegible] قید سے رہا کردیا اور بیدر کے تخت پر بٹھا دیا۔

ہمارے مضمون کا چونکہ صرف اس کی مختصر سوانح [illegible] پر مبنی ہے اس کی زندگی کے ہر پہلو پر غور کرنے سے یہ مسئلہ نفسِ مضمون سے الگ ہوجاتا ہے۔ ناظرین اس کی اور کامل قطب شاہیہ خاندان

کی تاریخ معلوم کرنے کے لئے مولوی سید خواجہ محی الدین صاحب چشتی ذہین حیدرآبادی کی کتاب بہار دکن کا انتظار کریں جو زیر ترتیب ہے۔

وفات ۹۵۰ھ ہجری میں یہ خورشید سلطنت عدم آباد کے سطح مغرب میں بعارضہ دق غروب ہوا مورخین اس کی وفات کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں کہ جمشید قطب شاہ امور مملکت سلطنت سے فارغ ہوکر عیش و طرب کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ ہر خط حسینان پری پیکر سے ہم بغل رہتا تھا۔ آخر کثرت اختلاط زہرہ جبیناں سے چند دنوں کے بعد اس کی مشرات عشرت کا پیالہ دنیا سے دور دوراں الم کی طرف منعطف ہوکر دو سال کے عرصہ میں رحمت اللہی میں پیوست ہوگیا۔

شعر و سخن جمشید قطب شاہ پہلوان اور بہادر ہونے کے علاوہ میدان سخن بھی تھا طبع موزوں میں آمد ہی آمد تھی سخت زمینوں میں شعر کہنا اس کے لئے نہایت آسان کام تھا گویا اس کی شاعری معراج کمال تک پہونچی ہوئی تھی افسوس ہے کہ ذیل کی چند غزلوں کے علاوہ اور کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

قصیدہ

اے بتو ختم ملک زیبائی   کار عشق از تو یافت بالائی
دورہ عشق ہر کہ پا بنہاد   آخر او سر کشد بہ رسوائی
شدہ شرمندہ از رخت خورشید   میرود زیں سپہر مینائی
چشم شوخ تو دل ربود از من   عقل و ہوش و دگر شکیبائی
عملش ہاں نشستہ در کویت   منتظر تا تو رخ بیارائی
آفتاب از رخ تو شرمندہ   ابر کردہ است پردہ آرائی
من بہ دیوانگی شدم مشہور   تو بخوبی دو عالم آرائی
تو ہماں آفتاب بے ہمتا   من ہماں عاشق تماشائی
چند گردم بگرد کوئے من   نظرے کن بہ بے سر و پائی
چند باشم ز دست تو جاناں   شہرہ بودن چنیں بہ شیدائی
نظرے کن بہ حال من ورنہ   داد خواہم زدن بدانائی
پیش شاہیکہ در جہاں ہرگز   کس بدو خود نکردہ ہمتائی
شاہ مردو سرا علی ولی   بندۂ اوست چرخ خضرائی
من غلام توام شہا از جان   کار من زاں گرفتہ بالائی

آں بشیر تو کہ خضر از دل و جاں   می کند بر درِ تو سقائی
خاکپائے ترا من مسکیں!
سرمہ سازم بہ عین بینائی!

غزل

بے لب لعل بتاں بادہ حرام است مرا   لب میگوں بتا چوں سر جام است مرا
بر سر زلف تو سودائے سیاہی دارم   اینچہ سر رشتہ کہ با زلف چو شام است مرا
بر سر کاکل تو مرغ دلم بند شدہ است   خال تو دانہ و آں زلف چو دام است مرا
ہر زماں از پئے دیدار تو آیم بدرت   بر سر کوئے بلائے تو مقام است مرا
ترک ایں کار نخواہم من بیدل کردن
من کہ جمشیدم و ایں کار تمام است مرا

اشکم از دیدہ ببینید کہ چوں می آید   کوکب بخت من است ایں کہ بدان می آید
ایں نہ اشک است کہ از دیدہ رواں است مرا   قافلہ مست کہ از شہر جنوں می آید
چند از عشق بتاں شہرہ شوی اے جمشید
گر کند غیر تو ایں کار زہرن می آید

آں پری روئے ببینید حیاں می آید   دل ز من بردہ کنوں از پئے جاں می آید
جاں بسودائے تو دادیم کہ سودی بردم   اینچہ سر داست کہ دائم بزباں می آید
زاں سبب آرزوئے سوختن شمع شد   کہ چو من شعلۂ آتش بزباں می آید
چوں ببینند بتاں از سر نازم گویند
عاشقی دل شدہ جمشید جہاں می آید

اے پیخ نوردہ دیدہ صاحب نظراں   خوں شد از محنت ہجر تو دل خونین جگراں
عمرہا رفت کہ رفتی ز براہ تو ہنوز   ہمچناں چشم ترم ماندہ بہ حیرت نگراں
زندگی بے تو حرام است نمی خواہم عمر   گر چنیں می گذرد باقی عمر گذراں
ہمچناں مہر تو در سینۂ ما ہست کہ بود   ما براینم کہ بودیم تو ہم باش براں
خبر از درد ندارند بتاں اے جمشید
آں بلائیں بے خبراں آہ ازیں بے خبراں

محمد عنایت وزیر
حیدرآبادی

گویا!

از حضرت محمد حنیف صاحب فروغ مرحوم و مغفور تلمیذ رشید داغ دہلوی مرحوم

ہر اشارہ بیان ہے گویا — آنکھ اُن کی زبان ہے گویا
ہجر میں ایسے بے قرار ہیں ہم — آگئی لب پہ جان ہے گویا
بزمِ دشمن مجھی سے روشن ہے — شمع میری زبان ہے گویا
خانۂ دل میں شوق سے آجاؤ — یہ تمہارا مکان ہے گویا
خاکساروں کی کچھ نمود نہیں — بے نشانی نشان ہے گویا
آہ لب تک بھی آ نہیں سکتی — اسقدر ناتوان ہے گویا
تیرے در سے مجھے اُٹھاتی ہے — یہ زمین آسمان ہے گویا
مرے خوں کا جواب کیا دیگی ؟ — تیغ کی کب زبان ہے گویا!
سنتے ہیں کس خوشی سے میرا درد — غیر کی داستان ہے گویا
ہر رگ و پے میں درد ساری ہے — عاشقوں کی یہ جان ہے گویا
کہتے ہو غیر کو نہ دیکھو تم ! — یہ تو میرا بیان ہے گویا
گالیاں کچھ سمجھ کے دیجئے گا ! — کہ مری بھی زبان ہے گویا
آئے کس وقت ہو سرِ بالیں — جبکہ آنکھوں میں جان ہے گویا
بخشوا لو کہا سنا اپنا — ابھی منہ میں زبان ہے گویا

دیکھ تو دل کے غیر سے بھی فروغ
یہ بھی ایک امتحان ہے گویا

عالمگیر کے عید نمبر کیلئے

عید پر عید

از جناب محمد منصور حسین نصرت آروی

فرض کیجئے کہ میں آج سے صرف ایک سال قبل کلکتہ کے "ڈیڈلیٹر آفس" محکمہ لاوارث خطوط کے دفتر میں ملازم تھا تو میں دنیا سے تنگ آچکا تھا اور سچ کیوں نہ کہہ دوں کہ آج سے چند سال قبل میں اپنا دل کسی کی شمع حسن پر پروانہ وار نثار کر چکا تھا۔ اور مایوسی کے عالم میں وطن سے دور آکر بذریعہ ملازمت ایک گمنام زندگی اس طرح بسر کر رہا تھا جس طرح ایک زخمی ہرن شکاری سے جان بچا کر کسی جنگل میں روپوش ہو جاتا ہے۔۔۔ جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں وہ میری زندگی کا عجیب یادگار دن تھا۔ یہ مارچ کی ۲۵ تاریخ سنہ ۲۹ء سوموار کا دن تھا۔

موسم سرما کے کوچ کا نقارہ بج چکا تھا موسم بہار کی آمد کے دھوم سے درختوں میں سبز و سرخ کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ جشن کی طیاریوں کے لئے کوئل اور پپیہے بلبل اور مور سبزہ زاروں میں منادی کر رہے تھے۔ ہوا خوشگوار اور فضا دلفریب ہو چلی تھی۔۔۔ مگر میں زندگی سے بیزار تھا۔ میرا دل جو حسرتوں اور ارمانوں کے بارگراں سے دبا پڑا تھا اسے بھلا قدرت کی یہ ستم ظریفیاں کب لبھا سکتی تھیں۔ اگر کوئی خواہش پیدا بھی ہوتی تھی تو وہ اس ناکارہ زندگی کے جلد ختم ہو جانے کی دعا تھی جس سے مجھے ایک گونہ تسکین پیدا ہو جاتی تھی۔

دن کے دس بجے حسب دستور دفتر آیا۔ میرے ذمہ جو کام تھا اس کی تفصیل کے لئے اتنا کافی ہے کہ اردو کے وہ بیرنگ (با محصول) خطوط جو خواہ پتہ کی غلطی یا کسی دیگر بے عنوانی کے سبب اصلی مخاطب الیہ تک نہ پہونچ سکے ہوں اور اس دفتر میں برائے تفتیش لوٹا دیئے گئے ہوں ان کو کھول کر اول سے آخر تک پڑھوں اور اگر کوئی سراغ اس کے تحریر کنندہ کا اس کے مضمون سے لگ سکے تو اس کو ایک پرزہ پر لکھ کر دفتر کے دیگر ملازموں کو سپرد کر دوں۔ آج میری طبیعت کچھ زیادہ مضمحل ہو رہی تھی کیونکہ گذشتہ شب مجھے خواب میں میرا وطن اور میرے اعزا مجھے تلاش کرتے نظر آئے تھے۔ ممکن ہے کہ میرا وہم ہو کیونکہ میرے نزدیک خواب کی کوئی اہمیت نہیں۔ عالبًا رات کھانا نہ کھانے کی وجہ سے خلو معدہ کے باعث پیدا ہوئے ہونگے۔ اس روز کی ڈاک میں معمول سے زیادہ خطوط آئے تھے۔ میں محض سرسری طور پر خطوط کے بے ترتیب انبار سے ایک ایک لفافہ کھینچتا اور ایک طرف پیپر ویٹ سے دباتا جاتا۔ خطوط کے مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف تھے۔ کسی میں کسی مصیبت زدہ کی فریاد تھی تو کسی میں عورت نامہ کسی میں فسانۂ غم تھا تو کسی میں اظہار مسرت۔ کسی خط میں کوئی عاشق اپنی الم ناک کہانی سناتا ہے تو کسی دوسرے خط میں کوئی معشوق غیض و غضب میں دھمکی دیتا ہے۔ کسی میں دس روپئے کا کرنسی نوٹ نکلا تو کسی میں کسی نو آموز کی ایسی تحریر نکلی جو پڑھی بھی نہ گئی۔ الغرض میری مشتاق نظریں ان خطوط اور تحریروں پر سے اس طرح گذرتی چلی جا رہی تھیں جس طرح ہوائی جہاز دریا۔ کوہ۔ دشت۔ قریہ۔ شہر۔ جنگل کے اوپر سے اطمینان سے گذرتا چلا جاتا ہے۔ کوئی تحریر جذبات سے خالی نہ تھی۔ مگر دل کسی جذبہ سے متاثر نہ ہوتا تھا۔۔۔۔۔ میں

سگریٹ سلگانے کو رک گیا۔ اسوقت ایک خط جو میرے سامنے پڑا تھا کچھ دیر تک پڑا رہ گیا۔ یہ ایک زرد رنگ کا پرزہ تھا اس پر کی تحریر بھی مٹی مٹی سی تھی۔ پرزہ کسی عاشق نامراد کے دل کی طرح جابجا سے پھٹا اور شکنوں سے چور تھا۔ تحریر غالباً کوئلے یا پنسل کی قسم کی کسی چیز سے لکھی گئی تھی۔ جابجا سے مٹی ہوئی ہونے کی حالت میں بھی بمشکل اسقدر پڑھی جاسکتی تھی

جناب والد صاحب . . .

میں . . . . قید کی . . . . ہوں ۔ موٹر . . . رشید نے . . .

غالباً کلکتہ ہے ۔ جلدی . . . . ورنہ یا تو میری جان . . . . بمشکل

. . . کامیاب ہوئی . . . . . خدا کرے . . . . آپ کو . . .

جائے ۔ آپ کی . . . . . بیگم

میں بار بار اس پرزہ کو روشنی کے سامنے لیجاتا اور تمام پڑھنے کی انتہائی کوشش کرتا رہا۔ نہ معلوم اس خط میں وہ کون سی جاذبیت تھی کہ مجھے ایک بیقراری سی معلوم ہونے لگی۔ میں نے ٹیبل پر سے محدب شیشہ اٹھایا ہزار جتن کئے مگر سب ہی بے سود رہے . . . میں نے خالی لفافوں میں سے اس پرزہ کا لفافہ نکالا اس پر غور کرنے لگا۔ یہ الفاظ پڑھے جاتے تھے۔

نواب . . . افتخار . . . کی حب
محلہ او لکھنؤ

اس پہچی ہوئی مہروں سے اسکا کلکتہ ہی کے ایک انٹالی نامی پوسٹ آفس سے چھوڑا جانا ثابت ہوتا تھا . . . . دوران ملازمت میں یہ پہلا موقعہ تھا جبکہ میں نے کسی خط کے بارے میں اسقدر تفتیش کی ہو۔ اس خط میں خدا معلوم کون سی کشش تھی جس نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کر دیا۔ میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ قلب میں ایک حرارت سی محسوس ہونے لگی۔ لکھنؤ کے ساتھ لفظ نواب کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ مگر یہ عورت کی تحریر اور پھر والد صاحب کا القاب۔ اور آخر میں لفظ "بیگم" اور اس کے اندر "رشید" اور "موٹر" کا ذکر میرے دبے ہوئے جذبات اور بھولی ہوئی بہتیری باتوں کی یاد کو تازہ کر دینے کو کافی تھے میں . . . . خط کو جیب میں مع لفافہ منتقل کر لیا۔ پھر اپنے دفتر کے افسر کے پاس جاکر . . . کے . . . کا . . . کیا . . . . اور اپنے کمرہ میں آکر . . . اس خط کو سامنے رکھ کر غور کرنے میں منہمک ہوگیا۔ . . .

(۳)

اس روز شام کو چائے بھی نہ پی اور نہ کھانا ہی شب کو کھا سکا۔ رات بھر عجیب بے چینی کا عالم طاری رہا میں جتنا غور کرتا میرے خیالات پختہ ہوتے جاتے اور میرا شک رفع ہوتا جاتا۔ میں نے خیال کیا کہ کیا یہ واقعی وہی رشید ہے جو اکثر میری طالب علمی کے زمانہ میں ملا کرتا تھا۔ اور مجھ سے میری مدار زندگی ریحانہ بیگم کے حسن کی تعریف اپنی انتہائی طاقت گویائی سے کام لے کر رقیبانہ انداز میں کیا کرتا تھا۔ اور جس سے میں محض اسی وجہ سے ملا کرتا تھا کہ وہ مجھے ریحانہ کی کوئی نہ کوئی بات ضرور ہی سنائیگا۔ گو مجھے اسکی باتیں زہر سے زیادہ تلخ معلوم ہوتی تھیں مگر چونکہ میں خود تاب نظارہ نہیں لاسکتا تھا لہذا اسی کو غنیمت سمجھ کر زہر مار کر لیا کرتا تھا . . . . ہاں خوب یاد آیا۔ یہ موٹر ٹیکسی بھی چلاتا تھا اس کی موٹر سرخ رنگ کی بڑی سی تھی . . . . ہاں . . نواب صاحب . . ریحانہ کے والد صاحب کا نام تو نواب افتخار علی تھا۔ میں نے پھر وہ لفافہ نکالا اب تو مجھے پورا یقین ہوگیا کیونکہ الفاظ صاف "افتخار علی صاحب" بتا رہے تھے میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت میرے دل میں کیا ہیجان پیدا ہوگیا تھا رات بھر کبھی خط کو پڑھتا کبھی لفافہ پر کی تحریر پر غور کرتا۔ میں نے سوچا کہ یہ تحریر ضرور پولیس کے حوالے کر دینی چاہیئے تاکہ اگر واقعی ریحانہ بیگم کو بدمعاشوں نے کلکتہ میں لاکر چھپا رکھا ہے تو جلدی اس کو ڈھونڈ نکالے مگر پھر یہ خیال آیا کہ آخر میں خود کیوں نہ یہ کام سر انجام دوں ممکن ہے کہ خدا میری سن لے اور میری امیدیں اسی ذریعہ سے پوری ہوجائیں " یا اللہ تو ہی اس کا محافظ حقیقی ہے " میں نے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ یہ جملہ کہا

. . . . . صبح سویرے ہی میں صاحب کے بنگلے پر پہونچا اور ان سے بمشکل ایک ہفتہ کی رخصت منظور کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا پہلا کام اس سراغرسانی کے سلسلہ میں یہ ہوا کہ میں سیدھا لکھنؤ پہونچا۔ میں نے ٹائم ٹیبل دیکھ کر ایسی گاڑی انتخاب کی تھی جو شب ہی کو لکھنؤ پہونچے۔

یہاں پہونچکر تب اناب گمنام سرائے میں ٹھہرا ۔ ۔ ۔ ۔ خفیہ دریافت اور تحقیقات سے میرے سب شبہات بھی جاتے رہے کیونکہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ نواب صاحب اپنی لڑکی کے پتہ لگانے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیں گے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس واقعہ کو تقریباً ایک ہفتہ گذر چکا ہے ۔ ۔ ۔ اور پولیس کا شبہ رشید ہی پر ہے ۔ کیونکہ جسقدر سراغ ابھی تک ان کو مل سکا ہے وہ ان کو کچھ گمراہ بھی کر رہا ہے کیونکہ وہ موٹر جو رشید بطور ٹیکسی چلاتا تھا ریاست کشمیر کے کسی افسر کی ملکی جیسے ان کا بیان ہے رشید کو بطور انعام یا عطیہ انہوں نے دیدی تھی ۔ یہ بات بعید از قیاس تھی ۔ کیونکہ موٹر ایک دم اچھی حالت میں تھی اور آٹھ ہزار سے کم کی مالیت نہ تھی ۔ دوسری بات یہ کہ موٹر پر غلط نمبر پلیٹ لگا ہوا تھا ۔ جو کسی بنگالی بابو کے موٹر کا تھا جو ایک عرصہ سے ٹوٹی ہوئی کسی مرمت خانہ میں پڑی ہوئی تھی ۔ رشید لاہور کا باشندہ ہوکر لکھنؤ میں ٹیکسی چلاتا تھا ۔ رشید اور ریحانہ کے غائب ہونے کے بعد لکھنؤ سے دو اسٹیشن پیچھے کی جانب ایک مقام پر سڑک کے کنارے یہ موٹر پائی گئی اور اس کے پائیدان میں ایک رومال دستیاب ہوا جو ریحانہ کا شناخت کیا گیا ۔ ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں پولیس نے یہ اطلاع بھیجدی اور رشید کا حلیہ چھپ کر مشتہر ہو گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اتنی خبر کافی سمجھی پھر صبح ہونے سے پیشتر اپنے وطن کی سرزمین کو بصد حسرت الوداع کہا اور کلکتہ کی جانب ڈاک گاڑی سے روانہ ہو گیا ۔ گویا پانچ سال کی طویل جدائی کے بعد پیارے وطن کو اس آسانی سے خیرباد کہدینا کوئی معمولی دل کا کام نہ تھا مگر دل کی تقدیر بری ہوتی ہے میرے آگے صرف دو ہی راستے تھے ۔ "کامیابی" یا "موت"

(۳)

دوسرے دن صبح کو میں کلکتہ پہونچ گیا ۔ میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی تھی ۔ اسٹیشن سے سیدھے دیوانہ وار اپنے کمرے کی جانب روانہ ہو گیا ۔ ۔ ۔ میرا چھوٹا سا کمرہ ہرسن روڈ پر سڑک کے سامنے ہی واقع تھا ۔ کبھی یہی کمرہ میرے لئے کنج عزلت تھا مگر اب کال کوٹھری معلوم ہو رہا تھا ۔ کبھی یہی کوٹھری مجھے ماں کی شفیق آغوش معلوم ہوتی تھی مگر اب اس وقت جیل خانہ کی خوفناک کوٹھری کی طرح کاٹے کھاتی تھی ۔ کبھی یہی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں بوسیدہ بستر باعث عافیت اور تسکین تھے مگر اب کوڑے کرکٹ کے بے ترتیب انبار نظر آ رہے تھے ۔ یہاں پہونچ کر مجھے سخت وحشت محسوس ہو رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در و دیوار پر ریحانہ کی شکل ایک بیکسانہ انداز میں مجھ سے اپنی رہائی کی ملتجی نظر آ رہی تھی ۔ میں نے سڑک کی جانب اپنی کھڑکی کھولدی اور ایک کرسی کھینچ کر اپنے جسم کو اس پر ڈال دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی موٹروں اور ٹریم کی گھما گھمی وہی انسانوں کی چہل پہل وہی رونق اور وہی شان تھی جو کبھی میرے دل کے بوجھ کو اپنی محویت میں جذب کر لیا کرتی تھیں اب محض بے رونق اور تکلیف دہ ہنگامہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں ۔ میں نے نظر پھیر لی اور کمرے کے اندر کی جانب گھوم کر بیٹھ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سامنے دیوار پر نور الہی جوہری کا کلنڈر لٹک رہا تھا ۔ اسے میں نے بڑے شوق سے لٹکایا تھا اس میں ایک حسین دوشیزہ کی تصویر کسی ماہر مصور نے اپنے کمال فن یا شاہکار کے طور پر پیش کی تھی یہ حسینہ ایک فوارے کے سامنے صحن چمن کی روش سے لگی محو تخیل کھڑی تھی ۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑی پارسی خواتین جیسے انداز میں پہن رکھی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ میرے تخیل نے اسکے چہرے کو بدل کر ریحانہ کی شکل پیش کر دی ۔ اسوقت مجھے ریحانہ کی پیاری پیاری صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی ۔ اسکی وہ ہلکی نیلے رنگ کی ساری جس پر کسی زردوز نے چھوٹے چھوٹے بوٹے اس طرح کاڑھے تھے گویا آسمان میں تارے لگائے تھے اور جس کی نیلگوں اوٹ سے ریحانہ کا بلوریں رخسار چمک چمک کر قمر چہار دہم کو مات کر رہا تھا ۔ اس کا وہ پارک میں خرام ناز ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی وہ شرمیلی جادو گر آنکھیں جن کی ایک ہی فسونگری پر میرا دل آج تک مجھ سے بیزار ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ زندگی سے کنارہ کش ہو گیا ۔ ۔ ۔ آہ وہ بھی کیا شام تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے خیالات اپنی رو میں مجھے یہیں تک بہالے گئے تھے کہ سڑک پر ایک غیر معمولی ہنگامہ نے برپا ہو کر مجھے جلدی سے ادھر مخاطب کر لیا ۔ جب میری نظر سڑک پر پڑی تو میں چونک پڑا ۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر ایک گلی کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہیں اور سارجنٹ لوگوں کو ہٹاتا ہوا

اندر داخل ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب کچھ لوگ منتشر ہوئے تو میں نے ایک زخمی شخص کو جس کے پیٹھ سے خون جاری تھا منہ کے بل زمین پر پڑے ہوئے دیکھا ۔ سارجنٹ کی سیٹی کے جواب میں چار چھ سپاہی دوڑتے ہوئے نظر آئے ۔ مجمع بھی منتشر ہونے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ میں جلدی سے غیر ارادی طور پر اُٹھا اور بغیر کچھ سوچے ہوئے اتر کر سیدھے موقعہ پر جا پہونچا ۔ جب یہ زخمی شخص سیدھا کیا گیا اور سپاہی لوگ اسے اُٹھا کر سُرخ موٹر کی جانب جس پر صلیب احمر کا نشان بنا ہوا تھا لے چلے تو مجھے بالکل قریب سے دیکھنے کا موقعہ مل گیا ۔ ۔ ۔ ۔ میرے منہ سے بیساختہ ایک چیخ نکلتے نکلتے رک گئی اور میں نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو حاصل کیا ۔ میں نے اسے پہچان لیا یہ رشید موٹر ڈرائیور تھا ۔ گو اسوقت اسکی ہیئت بہت کچھ بدلی ہوئی تھی تاہم میری غائر نظروں نے ایک دم اسے پہچان لیا ۔ اب میری الجھن اور بھی بڑھ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ آخر اس کا یہاں کون دشمن نکلا اور وہ بھی ایسا جو اس دن دہاڑے دس بجے دن کو شارع عام پر چھرا مار گیا ۔ ۔ ۔ اف ۔ میرے سر میں چکر آنے لگا ۔ میں نے جلد ہی اپنے حواس درست کئے کیونکہ پولیس والے موٹر کے چلے جانے کے بعد تفتیش شروع کر چکے تھے ۔ میں نے آہستہ سے ٹل ہی جانا مناسب سمجھا کیونکہ میں کیا بتا سکتا تھا ۔ اب میرا وقت بہت قیمتی تھا ۔ کیونکہ اگر رشید میں کچھ بھی جان ہوگی تو وہ مجھے ایسے وقت میں ریحانہ کا پتہ بتانے سے غالبًا دریغ نہ کریگا اور کیا عجب کہ وہ پولیس والوں کو اب بھی نہ بتائے اور غریب ریحانہ نہ معلوم کن سفاکوں کے ہاتھ لگ جائے ۔ میرا پہلا خیال یہی گذرا کہ ضرور رشید کے دشمن اس کے رقیب ہی ہونگے یا ہوگا جو ریحانہ کو حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام رہ کر رشید کی جان تک لینے سے دریغ نہ کر سکے ۔ ۔ ۔ ۔

(۴)

ڈاکٹر گوکل چند آئی ایم ڈی میرے کالج کے ساتھی تھے ہم دونوں نے لکھنؤ کرسچین کالج سے ایک ہی ساتھ بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی تھی مگر چونکہ یہ یونیورسٹی میں اول آئے تھے لہذا گورنمنٹ کے خرچ سے ولایت بھیجے گئے تھے اور میں ان کی واپسی کے قبل ہی دنیا سے منہ موڑ چکا تھا اور وطن عزیز کو اپنے والد کی غیر حاضری میں جبکہ وہ حج کے لئے عازم مکہ معظمہ ہو چکے تھے خیرباد کہہ کر کلکتہ چلا آیا تھا جہاں سے میں اپنے افسانہ کی ابتدا کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

آج محض اتفاقیہ طور پر میری اور ان کی ملاقات کلکتہ میڈیکل کالج ہسپتال کے سرجیکل وارڈ میں جہاں رشید زخمی ہو کر لایا گیا تھا ہو گئی ۔ انہوں نے مجھے فورًا پہچان لیا اور نہایت تپاک سے ملے ۔ گوکل چند ولایت سے واپسی کے بعد اسی ہسپتال میں ملازم ہو گئے تھے ان کی قابلیت نے انہیں سرجیکل وارڈ کا افسر انچارج بہت ہی قلیل عرصہ میں بنا دیا تھا انہوں نے میری سراسیمگی سے متاثر ہو کر پے در پے سوالات شروع کر دیئے جن کے جواب میں میں نے مختصرًا کل واقعات بیان کر دیئے اور ساتھ ہی رازداری کا حتمی وعدہ بھی لے لیا ۔ گوکل نے میری امداد کا پورا وعدہ کر لیا ۔ اور کامل رازداری کا بھی یقین دلایا بعدہٗ جب مجھے لیکر رشید کے پاس پہونچے تو پولیس والے جا چکے تھے کیونکہ رشید کی حالت مخدوش بتائی گئی تھی اور وہ کسی قسم کا بیان دینے کے لائق نہ سمجھا گیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم گھبراؤ مت میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے ہوش میں لاتا ہوں گو اس کا بچنا محال ہے تاہم میں ضرور اس سے دو باتیں کرا سکوں گا ۔ اس وقت دن کے دو بجے ہونگے جبکہ ڈاکٹر نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش شروع کی انجکشن تین بار ہو چکا اور ہم لوگ قریب ہی کرسیوں پر بیٹھے اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہے تھے ۔ ۔ قریب تین بجے رشید نے حرکت کی ۔ اس کی سانس کی رفتار میں سکون پیدا ہونے لگا ۔ تھوڑی دیر میں رشید بہت ہی نحیف آواز میں کراہنے لگا ۔ ڈاکٹر نے کوئی "دوا" اس کے حلق سے اُتاری ۔ ۔ ۔ رشید نے آنکھیں کھول دیں ۔ ڈاکٹر نے کہا "جلدی کرو اس سے نرم لہجہ اور دھیمی آواز میں پوچھو ۔ پہلے پکارو" ۔ ۔ میں نے اپنی سراسیمگی اور جذبات کی جز رومد کو روکتے ہوئے پکارا "رشید ۔ رشید" ، رشید نے زردی مائل آنکھیں میرے چہرے پر جما لیں ۔ اور بدستور آہستہ آہستہ کراہتا رہا ۔ میں نے کہا "میں ہوں تمہارا دوست انور علی ۔ گھبراؤ مت تم اچھے ہو جاؤ گے تمہارے دشمن گرفتار ہو گئے ہیں" ۔ رشید نے آہ کی ۔ ڈاکٹر نے پھر دوا

چلائی۔اس مرتبہ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے بولنے لگا۔ اس کی آواز بہت دھیمی ہوگئی تھی جسے میں بمشکل سمجھ سکتا تھا۔ اس نے کہنا شروع کیا ’الوو میں سخت گناہگار ہوں۔ میں مجبور تھا۔ میرا دشمن کبھی سنگھ ہے۔ . . . یہ کشمیر سے آیا ہے . . . . اُف میں مرا ہائے . . سخت تکلیف ہے‘۔

ڈاکٹر نے جلدی سے انجکشن دیا اور نبض پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا ”پوچھو“ ”جلدی کرو“ اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ رشید جلدی بتا دو ریحانہ کہاں ہے“ میں نے کہا۔۔ رشید نے پھر حرکت لی اور اس مرتبہ اس نے بڑی کوشش سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا“ وہ بو . . . بوس . . پ۔ پ۔ پاڑہ نمبر . . . . پ۔ پ۔ پانچ . . ہائے . . اُف۔ اس کی آواز یک بیک رُک گئی اور اس کی گردن داہنی جانب جھک گئی . . ڈاکٹر نے ایک لمبی سانس کے ساتھ نبض چھوڑ دی۔ اور ایک وحشتناک آواز میں مجھے ہٹ جانے کو کہا۔ میں اسقدر محو تھا کہ ڈاکٹر کی آواز سے چونک پڑا . . . رشید مر چکا تھا . . . . . .

(۵)

باوجودیکہ گوکل مصر تھا کہ مجھے پولیس کی مدد سے کام لینا چاہئے مگر میں نے نہ مانا۔ بلکہ میں نے رشید کے متعلق بھی کل احوال اس وقت پوشیدہ رکھنے کا وعدہ لے لیا جبتک میں خود اسے اجازت نہ دوں۔ گوکل مجھے کسی طرح چھوڑتا ہی نہ تھا وہ کہتا تھا کہ اب کیا ہے اب ہم لوگ فوراً ریحانہ کو تلاش کر لیں گے تم گھبراؤ مت مگر جب میں نے مجبور کیا کہ میں تنہا اس کام کو سرانجام دوں گا تو اس نے مجبوراً مجھے رات کے کھانے کے بعد تقریباً ۹ بجے اپنی پستول اور برقی جیبی بتی (ٹورچ) بطور حفظ ماتقدم دیکر چھوڑ دیا میں گوکل کے مکان سے نکل کر سیدھا سڑک پر آیا۔ ایک ٹیکسی بلائی اور بوس پاڑہ نمبر پانچ بتا دیا۔ ٹیکسی ڈرایور نے کہا کہ حضور بوس پاڑا کے اندر موٹر کا راستہ نہیں وہ گلی میں ہے میں سڑک تک چل سکوں گا میں نے کہا ’جلدی چلو کوئی حرج نہیں‘۔

موٹر روانہ ہوگئی۔ میں برابر کہتا ”تیز چلاؤ“ ”تیز چلاؤ“۔ موٹر اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھی مجھ پر ایک نیم غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ پاس سے گذرتی ہوئی موٹریں اور ٹریم۔ برقی روشنی کے ستون اور دوکانوں کی بڑی بڑی لالٹینیں جب بالکل قریب سے گذرتیں تو مجھے محسوس ہوتا کہ گویا وہ میرے سینے کے اندر سے داخل ہو کر پشت سے نکل رہی ہیں . . . یا جب کبھی موٹر کسی موڑ پر تیزی سے گھومتی تو مجھے معلوم ہوتا کہ میں آسمان سے زمین پر گر رہا ہوں . . . الغرض میں اچھی طرح نہیں بیان کر سکتا کہ یہ چار میل کی مسافت کیونکر گذر گئی جب موٹر رُکی تو میں نے اپنے منتشر خیالات کو اکٹھا کیا اور اُتر پڑا۔ ڈرایور کو بغیر کچھ کہے ہوئے دس روپیہ کا ایک نوٹ حوالہ کیا اور اسے قریب ہی ایک مخصوص جگہ پہ ٹھہرنے کو کہہ کر اسکی بتلائی ہوئی گلی کی طرف مڑا۔ گلی کے نکڑ پر ایک سارجنٹ کھڑا تھا۔ کلکتہ میں سارجنٹ کوئی نئی چیز نہیں مگر اس ویرانے مقام پر رات کے ساڑھے نو بجے سارجنٹ کا کھڑا ہونا تعجب سے خالی نہ تھا۔ اس نے میری طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا مگر میری انگریزی وضع سے کچھ مطمئن ہوگیا میں جلدی سے گلی میں گھس پڑا۔

(۶)

گلی بہت تنگ اور تاریک تھی۔ سڑک کے گوشہ پر کی روشنی نے کچھ دور تک تو میری رہبری کی مگر اب میں ایک تیرہ و تار گلی میں یکہ و تنہا تن بتقدیر بغیر یہ جانے ہوئے کہ آگے خندق ہے یا موڑ گلی سیدھی ہے یا ٹیڑھی چل کھڑا ہوا گلی کی زمین پر نم تھی۔ اس سے عجیب طرح کی بدبو نکل رہی تھی . . . دونوں جانب کی اونچی اونچی عمارتیں تاروں کی ہلکی روشنی کو بھی اندر آنے نہ دیتی تھیں۔ میں مصلحتاً برقی لیمپ سے کام نہ لیتا تھا۔ حالانکہ میرے ربڑ کے تلے والے جوتے نے مجھے کئی بار گرتے گرتے بچایا۔ البتہ کہیں کہیں کسی کسی یا روشندان سے روشنی کی زرد شعاعیں نکل کر مقابل کی دیواروں پر پڑ رہی تھیں جنکے عکس سے گلی کا کچھ حصہ معلوم ہوتا تھا اور یہی میری رہبری کا واحد ذریعہ تھیں۔ ایک ہو کا عالم طاری تھا۔ نہ تو یہاں موٹروں کی بھر بھراہٹ تھی نہ ان کے کرخت ہارن کی مہیب صدائیں۔ نہ انسانوں کی کہما گہمی کی کوئی آہٹ تھی نہ کوئی زندگی کے آثار . . میرا دل ڈوبا جا رہا تھا اور ایک نامعلوم خطرہ کا احساس میری روح پر مستولی ہوتا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں ڈاکٹر کا کہا مان جاتا اور پولیس کی امداد حاصل کر لیتا . . اگر یہاں دو چار بدمعاش مل گئے تو کیا ہوگا اس اندھیری رات میں تو اللہ ہی ہے جو میں تنہا کچھ کر سکوں۔ بہرکیف میں نے اپنا سیدھا ہاتھ جیب میں ڈال دیا اور پستول کے دستہ کو مضبوط پکڑ لیا

مجھے نہیں معلوم کہ اپنی خیالات میں کہاں تک چلا گیا کہ یک بیک تھوڑے فاصلہ پر سے ایک سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میرا دل دھک سے ہو گیا میں نے سمجھ لیا کہ یہ پولیس والے پہرہ دے رہے ہیں۔ اب اگر یہ اسوقت مجھے اندھیرے میں اس مشکوک حالت میں پائیں تو یقینی گرفتار کر لیں گے خواہ پیچھے جو بھی ہو۔ میں رُک کر بغور اندھیرے میں سامنے دیکھنے لگا۔۔۔

یک بیک، ایک برقی شعاع گلی کے بائیں جانب سے نکل کر ایک سپاہی کی خاکی وردی پر پڑی پھر سپاہی نے جوابا سامنے شعاع ڈالی۔ یہ بھی کوئی خاکی وردی والا شخص گلی کے موڑ پر کھڑا تھا۔ میں ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں یہ خاکی وردی والا کھڑا تھا اس جگہ پر گلی دو حصوں میں منقسم ہو گئی تھی۔۔۔ ایک سیٹی کی آواز آئی پھر بڑے بڑے بوٹ کھٹ کھٹ دوڑتے ہوئے سنائی دیئے جا بجا دونوں جانب سے برقی شعاعیں چمکنے لگیں۔ میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے گلی کے دونوں رخ نمایاں تھا۔ میرے عقب کی جانب کسی مکان کی سیڑھیاں تھیں۔ میں دو تین زینہ اوپر چڑھ گیا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ ابھی میں اچھی طرح سمجھ بھی نہ سکا تھا کہ سامنے ہی کی طرف سے کسی چیز کے زور سے پھٹنے کی ایک مُہیب صدا بلند ہوئی جس کے بعد ہی متواتر دو تین فیروں کی آوازیں کسی عمارت کے اندر گونجتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں عجب کشمکش میں مبتلا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا۔ کہ میرے عقب سے دروازہ کھلنے کی ہلکی سی صدا آئی۔ میں نے سانس روک دیا۔ اور بغور سننے لگا۔

دو تین شخص اسی زینہ سے اُتر رہے تھے جس پر میں کھڑا تھا۔ میں نے اپنے دانتوں کو زور سے بھینچ لیا۔ آہستہ آہستہ گلی میں اُتر آیا اور جلدی سے پستول اور ٹارچ دونوں ہاتھوں میں لے کر زینے کے داہنی جانب دبک کر دیوار میں چپک گیا۔ اب اُتر نے والے قریب آ گئے۔ میری آنکھیں کافی طور پر اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ میں نے تین اشخاص دیکھے۔ زینہ سے اُتر کر ان لوگوں نے پہلے ادھر اُدھر دیکھا پھر بہت آہستہ آہستہ بولنے لگے "چھمی تم عجیب گدھے ہو۔ پولیس والے دوسرے مکان میں گئے ہیں۔" دوسری آواز "چپ بیوقوف۔ میں نے اپنی سیڑھی پر کسی کو دیکھا تھا" "اچھا عبدل تم اگلے موڑ پر بڑی ہوشیاری سے موڑ لے آؤ۔ میں چھُپ کر پولیس والوں کی نگرانی کرتا ہوں" اور میں بائیں طرف کے کو ملنے پر خبرگیری کرتا ہوں"

جب میں نے تینوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ تو مجھے یقین ہو گیا۔ یہ ضرور وہی چھمی سنگھ رشید کا قاتل ہے۔ اور غالباً دوسرے ساتھی بدمعاش ہوں گے۔ موقعہ غنیمت دیکھ کر میں جلدی جلدی زینہ پر چڑھ گیا۔

(۷)

اوپر پہنچ کر میں نے دروازہ کو ہاتھ لگایا۔ جو بالکل آسانی سے کھل گیا۔ اور میں اندر داخل ہو گیا۔ یہاں میں نے اپنے ٹارچ کے شیشہ کو رومال سے چھپا کر روشن کیا۔ دھیمی روشنی نے مجھے دکھایا۔ کہ میں ایک وسیع ہال میں کھڑا ہوں۔ اس کمرے میں کوئی متنفس نہ تھا۔ نہ ہی کوئی سامان کسی طرف نظر آیا اس کمرے کے دونوں جانب دو دروازے تھے جن میں کا ایک جو میرے داہنی جانب تھا وہ کھلا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اس میں داخل ہو گیا۔ کوئی چیز بڑے زور سے گری۔ میں چونک پڑا۔ پھر میری روشنی نے مجھے دکھایا کہ یہ ایک کرسی تھی۔ جسے بدمعاشوں نے عجلت میں اس طرح چھوڑا تھا۔ کہ ذرا سی حرکت میں لڑھک گئی۔ سامنے کمرے میں میز پر دو بوتلیں دو گلاس اور تاش کے پتے پھیلے پڑے تھے۔ میز کے پاس دو بوسیدہ کرسیاں رکھی تھیں۔ دیوار پر دو تین لمبے لمبے کوٹ لٹک رہے تھے۔ زمین پر کچھ کمبل نہایت بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ میں نے ایک ہی نظر میں کمرے کا جائزہ لیا۔ اور ایک ہاتھ میں پستول لئے ہوئے دوسرے دروازے سے اندر صحن میں نکل آیا۔ پہلے تو میں چپکے کچھ دیر کھڑا ہوا یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ یہاں اندر کوئی متنفس بھی موجود ہے کہ نہیں۔ مکان میں بلا کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں بغور سن رہا تھا۔ مگر بجز چند آہٹوں کے اور سیٹیوں کی صداؤں کے جو کسی دوسرے مکان سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔۔۔۔۔

گو مجھے کامل یقین تھا کہ رجانہ اسی مکان میں کہیں موجود ہے۔ مگر آخر اس گھُپ مکان میں کس طرح اور کس طرف تلاش کروں۔ ابھی میں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ پاس کے کمرے سے کسی کے کھانسنے کی آواز محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے اس طرف لپکا۔ کیونکہ یہ کھانسی بہت مختصر اور ہلکی تھی۔ جو مرد کی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ جب میں نے زنجیر کھولی تو اندر سے بھی بند پایا۔ اب میں عجیب مشکل میں پھنسا۔ یا اللہ کہیں کوئی دوسرا بدمعاش نہ ہو۔ بہرحال وقت نازک

تھی میں نے زور سے پکارا " ریحانہ " " ریحانہ " جلدی کھولو میں ہوں ... لکھنؤ سے تمہاری امداد کو آرہا ہوں جلدی بھاگو . . . . .

دروازہ کھٹ سے کھلا اور ایک مجسمہ یاس میرے سامنے تھا - دیوار پر لگا ہوا لیمپ دیا سلائی سے صحن میں ایک دم روشنی ہوگئی اور میں نے ریحانہ کو پہچان لیا گو اس نے مجھے فوراً نہ پہچانا تاہم لفظ لکھنؤ سے اس کی ہمت تازہ ہوگئی - وہ آہستہ سے بولی - خدا کا شکر ہے کہ آپ عین موقع پر پہنچے ورنہ میری جان و آبرو کا اللہ ہی حافظ تھا - کیا بدمعاش گرفتار ہوگئے - میں نے کہا ابھی نہیں مگر تم جلدی چلو - ہم لوگ سراسیمگی کی حالت میں صحن طے کرکے ایک کمرے میں داخل ہوئے جس میں کرسیاں اور میز پڑی تھیں آگے آگے میں اور پیچھے میرے عقب میں ریحانہ تھی - ابھی میں میز کے پاس سے گذر رہا تھا کہ مجھے دروازہ کے سامنے روشنی ہوتی نظر آئی - اور پیروں کی چاپ بھی سنائی دی - میں نے فوراً پستول سنبھالا اور کھڑا ہوگیا - ایک بدمعاش جو شلوار پہنے تھا - کھلے ہوئے دروازے کے سامنے آیا - میں نے کہا " خبردار جو آگے کی طرف بڑھے ورنہ تمہاری موت یقینی ہے " ابھی میں نے بمشکل یہ جملہ ختم کیا ہوگا کہ ریحانہ نے میرے عقب سے ایک چیخ ماری اور میرے کوٹ کا پچھلا حصہ زور سے کھینچا - میں نے جلدی سے ایک نگاہ اس طرف ڈالنی چاہی مگر قبل اس کے کہ میں ماجرا سمجھوں کوئی شے بڑے زور سے میرے کھلے ہوئے سر پر کھٹ سے پڑی - میری آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی محسوس ہوئیں - میں نے سر جھکایا ہی تھا کہ پھر ایک چیخ کی صدا کے ساتھ دوسرے بار بھی کوئی چیز میرے شانے پر تڑ سے پڑی اس بار میری انگلی پستول کے گرفت پر ذرا زیادہ سخت جو ہوئی تو فیر ہوگیا - یہ آواز آنی تھی - اب مجھ سے دو بدمعاش لپٹ پڑے - میز اور کرسیوں نے مجھے موقعہ نہ دیا کہ میں اپنی طاقت سے کام لے سکوں - اس گتھم گتھا میں میرے ہاتھ سے پستول اور ٹارچ چھوٹ گئی . . . . جبکہ دو بدمعاش گھونسوں اور طمانچوں سے میری تواضع کر رہے تھے - میں نے دیکھا کہ تیسرا اندر داخل ہوا - اور ریحانہ کو کھینچتا ہوا باہر کی جانب لے گیا - میں نے پھر ایک بار جان توڑ کوشش کی مگر کیا ہوتا تھا - اس مرتبہ میری کنپٹی پر دو تین گھونسے پے در پے اس طرح پڑے کہ جس کی تاب نہ لا کر میں بیہوش ہوگیا . - - - -

- - - - - -

(۸)

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو باغ بازار تھانہ میں ایک کوچ پر پایا - ڈاکٹر گوکل میرے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے میری تشفی کی اور بتایا کہ ریحانہ معہ الخیر ہے اور بدمعاش گرفتار ہوچکے ہیں تھانہ دار مسٹر رگھناتھ چیٹرجی بھی حسن اتفاق سے میرے اور ڈاکٹر کے ہم جماعت ہی نکلے ان کے والد بابو نرسنگھ چیٹرجی لکھنؤ میں وکیل تھے اسی وجہ سے وہیں بود و باش اختیار کرچکے تھے . . . گو اس وقت رات کے دو بجے تھے مگر ہم لوگ اس عجیب واردات اور عجیب ملاقات کے قصہ میں اس طرح محو تھے کہ کوئی پرواہی نہ تھی . . . . دوران گفتگو میں ڈاکٹر نے بتایا کہ جب میں اُن سے رخصت ہوکر تنہا روانہ ہوگیا . . . .

ت . . . . . تو اُن سے نہ رہا گیا اور وہ سیدھے باغ بازار پولیس اسٹیشن پہونچے - تھانہ دار کی ان کی ملاقات اول بار ہوئی اور دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان بھی لیا - ڈاکٹر نے کل احوال بیان کیا اور اُن کو لیکر معہ چند سپاہیوں کے موقعہ واردات پر جا پہونچے - وہاں معلوم ہوا کہ لال بازار کی پولیس اور خفیہ پولیس کے چند افسران کسی مکان کی تلاشی لے رہے ہیں - ان لوگوں نے تمام ناکہ بندی کردی تھی لہذا جب بدمعاش ریحانہ کو لیکر فرار ہونا چاہتے تھے گرفتار کرلئے گئے - اب میری تلاش شروع ہوئی - مگر یہ مشکل بھی بہت جلد آسان ہوگئی کیونکہ خفیہ پولیس والوں نے پانچ نمبر میں ایک فیر کی آواز کے ساتھ کچھ گڑبڑ کی آوازیں مشکوک طریقہ پر سنی تھیں اسوجہ سے انہوں نے اس مکان کا بھی جائزہ لیا مگر بدمعاش معہ ریحانہ نکل چکے تھے صرف میں ہی دست و پابستہ غشی کی حالت میں ایک کوٹھری میں بند پایا گیا - آگے باتیں سمجھنی آسان ہیں - بدمعاشوں نے جو اظہار دیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ ریاست کشمیر کے کپتان احمد بیگ کے صاحبزادے جمیل بیگ کے ایما سے یہ واقعات رو پذیر ہوئے - کیونکہ اسکے شادی کے پیغام کو ریحانہ اور میزبان کے والد نے اس بنا پر رد کردیا تھا کہ وہ شرابی ہے - اور اسی روز سے اس نے بدمعاشوں کو نوکر رکھ کر ریحانہ کو اس وقت تک غائب رکھنے کی کوشش کی تھی جبتک اسکے والد شادی کے لئے رضامند نہ ہوجائیں . . . - یہاں بدمعاشوں نے ریحانہ کو خود ہی آپس میں تقسیم کرلینے کی طے کرلی اور خود جمیل بیگ سے

غداری کر گئے۔ صرف ایک رشیدی تھا جس نے ریحانہ کی جان اور عزت پر اپنی جان قربان کر دی کیونکہ وہ خود غالباً اس پر عاشق تھا۔ یہ آخری باتیں مجھے ریحانہ نے بتائی تھیں . . . . مسٹر چیٹرجی کی بیوی بڑی نیک دل خاتون تھیں انہوں نے ریحانہ کا لباس بدلوایا منہ ہاتھ دھلا کر کچھ کھلایا اور جب ریحانہ نے مجھ سے کہا کہ اب ہمیں بہت جلد یہاں سے لکھنؤ چلنا چاہیئے تو ڈاکٹر نے بھی اتفاق ظاہر کرتے ہوئے مسٹر چیٹرجی سے رخصت طلب کی جسے انہوں نے بخوشی منظور کر لیا کیونکہ وہ کہنے لگے "ابھی آپ لوگوں سے ملاقات دوران مقدمہ میں پھر ہوتی ہی رہے گی صرف آپ لوگ ایک کاغذ پر اپنے دستخط کر دیں کیونکہ میں قانون سے مجبور ہوں" ہم لوگ ڈاکٹر کی موٹر میں اسٹیشن آئے اور ساڑھے تین بجے کی ایکسپریس سے لکھنؤ کو روانہ ہو گئے۔

(۹)

میرے الفاظ ہرگز اس مسرت و خوشی کے جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے جو نواب افتخار علی صاحب اور ریحانہ کی والدہ صاحبہ کو ریحانہ کے ملنے سے ہوئی . . . رات کے بارہ بجے ہم لوگ "افتخار محل" پہونچے یہ رمضان شریف کی ۲۹ تاریخ تھی اور عید کی چاند رات۔ مجھے یا ریحانہ کو بالکل یاد نہ تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ایسے واقعات کی رو میں ایک انسان کیا کیا خیال رکھ سکتا ہے . . . .

جب ذرا اطمینان ہوا اور نواب صاحب کا مزاج ٹھکانے ہوا تو ریحانہ ہی نے والدہ سے کہہ کر اُن کو باہر بھیجا کہ میری مزاج پُرسی کریں . . . میں باہر کے کمرے میں چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور اپنی فتحمندی پر جسے میں محض حسن اتفاق پر محمول کرتا تھا تعجب کر رہا تھا کہ نواب صاحب باہر تشریف لائے۔ میں نے بقیہ حصہ سگریٹ زمین پر ڈال کر پیر سے کچل دیا اور اُٹھ کر آداب بجالایا۔ اول انہوں نے مجھے گلے لگایا اور پھر مصافحہ کیا۔ ہاتھ پکڑے ہوئے ایک صوفہ پر لے گئے اور پاس بٹھا کر تفصیلی احوال پوچھنے لگے۔ میں نے مجملاً حالات بیان کیے بہت سی سچی باتیں چھوڑ دیں اور بہت سی جھوٹی بہادریوں کو جوڑ دیا۔ اور افسانہ مکمل کر دیا۔ میں نے اپنے دل کا لگاؤ اس امر میں صرف اسی قدر ظاہر کیا کہ یہ میرا فرض منصبی تھا اور اس میں انسانی ہمدردی کا جذبہ کام کر رہا تھا . . . . نواب صاحب میرا نام سُنکر کچھ گھبرائے مگر پھر میرے والد کا نام سُن کر مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ میں ان کی اس حرکت کو کچھ نہ سمجھ سکا . . . انہوں نے مجھے اپنے کمرے کے متصل کمرے میں جگہ دی اور آرام کرنے کو کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے (وقت اُس وقت) رات کے دو بج چکے تھے . . . . مجھے رات بھر نیند نہ آئی۔ کیوں . . میں نہیں بیان کر سکتا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ کے پردہ پر سینما کی تصاویر کی طرح آتے اور غائب ہو جاتے . . . صبحدم ذرا دیر کو آنکھ لگ گئی مگر پھر وہی۔ مایوس کن خوابوں نے آگھیرا جنہیں میں ہمیشہ دیکھا کرتا تھا . . . . جب میری نیند ٹوٹی تو دن کے سات بج چکے تھے۔ تکان اور کسلمندی سے چور ہو رہا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے اتنے میں نواب صاحب تشریف لائے اور اپنے ہمراہ مجھے موٹر پر بٹھایا اور عیدگاہ روانہ ہو گئے . . گذشتہ شب سے نواب صاحب کی اکثر حرکات مجھے پریشان کر رہی تھیں مثلاً صبح سے جتنے لوگ عمائدین و رؤسا شہر مبارکباد دینے کو آئے اُن سے مجھے نہ ملایا بلکہ کہہ دیا کہ میں آپ لوگوں سے اپنے محسن کو بعد میں کسی اچھے موقعہ پر ملاؤں گا۔ آخر کیوں اور وہ اچھا موقعہ کب آئے گا اور کس طرح ہوگا . . . . پھر عیدگاہ سے کچھ دور ہی مجھے موٹر سے اتار دیا اور اپنے ایک نوکر سے کچھ آہستہ کہہ کر مجھ سے کہا کہ میاں صاحبزادے مجھے معاف کرنا کسی مصلحت کی بنا پر تم سے چند باتیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ اور عیدگاہ تک پیدل چلنا باعث ثواب بھی ہے میں ضعیف ہوں مجھے معاف کرنا۔ تم آجاؤ بعد میں میرے اس رویہ کو خود سمجھ سکو گے۔ میں عید کی سچی خوشی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں" . . . . وغیرہ۔ پھر اُن کی موٹر چلی گئی . . . . عیدگاہ پہونچ کر ملازم نے مجھے نواب صاحب سے کچھ فاصلہ پر الگ بٹھا دیا میں سوچنے لگا کہ نواب صاحب کا دماغ ضرور مارے خوشی کے چل گیا ہے ورنہ اس طرح کی باتوں میں کوئی مدعا نظر ہی نہیں آتا۔

(۱۰)

نماز ختم ہو گئی اور خطبہ بھی ختم ہو چکا۔ لوگ گلے ملنے لگے۔ میں چپکا بیٹھا اہل وطن کے بھولے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس جم غفیر میں کسی کی تلاش بھی مدنظر تھی۔ یعنی اپنے والد بزرگوار کی جن کی بابت دریافت سال

کے لئے میں بے چین تھا۔ کاش وہ بھی یہیں بحسن اتفاق اسی طرح مل جائیں جس طرح میرے افسانے کی گمشدہ کڑیاں ملتی گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ اب نواب صاحب بھی اس انسانی موج میں غرق ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے ۔ ۔ ملازم نے مجھے ایک بڑا ہٹا دیا اور اس انسانی سیلاب کو ہاتھوں سے الگ کرتا ہوا ایک خاص سمت میں جانے لگا میں بھی اسکے پیچھے اس طرح جارہا تھا جس طرح ایک تنکا دریا کی روانی میں بہتا ہوا ایک مجبورانہ اور غیر ارادی طور پر چلا جاتا ہے ۔ ۔ اب میں ایک مجمع کے پاس پہونچا جہاں بہت سے رؤسا شہر باقاعدہ نواب صاحب کو حلقہ میں لئے بیٹھے آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے ۔ میری نظر جب نواب صاحب کے داہنے بازو کی طرف بیٹھے ہوئے ضعیف شخص پر پڑی جو بہت مغموم معلوم ہو رہے تھے تو میں بے ساختہ بول اٹھا "یا اللہ" ۔ یہ میرے والد بزرگوار تھے ۔ میرا مجمع کے قریب پہنچنا تھا کہ سب کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں ۔ ۔ میں اپنے جذبات کو بالکل نہ روک سکا اور نواب صاحب اور دیگر معززین کی پروا کئے بغیر ایک بجلی کشش کی تحت میں بے ساختہ دوڑ کر والد صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑے "انور" ان کے منہ سے ایک چیخ کے ساتھ نکلا ۔ میں رونے لگا ۔ اور میں نے اپنا سر اُن کے قدموں پر ڈال دیا ۔ ان کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں اور اُنہوں نے مجھے اُٹھا کر گلے لگایا ۔ ۔ ۔ ۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور میرے ہوش بجا ہوئے تو میں اُٹھا اور مجمع کی طرف مخاطب ہو کر آداب تسلیمات بجالایا ۔ نواب صاحب کھڑے ہوئے اور مجھے گلے لگایا پھر میرا تعارف کراتے ہوئے ایک چھوٹی سی جذبات میں ڈوبی ہوئی تقریر کی اُنہوں نے دوران تقریر میں کہا کہ مولوی امجد علی (میرے والد) انکے اپنے خالہ زاد بھائی ہیں اور ان کا آبائی وطن دہلی تھا جہاں سے انہوں نے گردش زمانہ کے ہاتھوں تنگ آکر نقل مکان کر کے لکھنؤ میں قیام کر لیا ہے ۔ اور چونکہ ان کے خالو صاحب مرحوم سے اور والد صاحب مرحوم سے ان بن ہو گئی تھی ۔ اسی وجہ سے کوئی مراسم ان دونوں خاندانوں میں باقی نہ تھے بلکہ عورتیں تو ان لوگوں کا ذکر تک کرنا پسند نہ کرتی تھیں ۔ آج جبکہ میرے بچھڑے ہوئے بھائی نے مجھے معاف کر دیا ۔ اور چونکہ ان کے گمشدہ فرزند آج پانچ سال کے بعد اُن سے ملے ہیں اور میری گمشدہ عزیزہ کی جان اور عزت اُنہی کے ہاتھوں بچ سکی ہے اور انہوں نے میرے نام و ناموس کی لاج رکھ لی ہے ۔ لہذا میں ریحانہ کی شادی انور کے ساتھ اپنے اور اپنے خاندان کیلئے بہتر سمجھتا ہوں اس پر تمام حاضرین نے اظہار تحسین و آفرین کیا ۔ اسی روز میرا نکاح ریحانہ سے ہو گیا ۔ گویا یہ میرے لئے ایک عید کے بعد دوسری عید تھی لہذا میں اپنے اس افسانہ کا عنوان عید پر عید قائم کرتا ہوں۔

ریحانہ مجھ سے اس افسانہ کے آخر میں اتنا اور زبردستی لکھوا دیا ہے "میں پردہ چھوڑ کر نئی روشنی میں آنے کا تجربہ کر رہی تھی اور گویہ تجربہ تلخ تھا مگر نتیجہ محض اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے شیریں ہوا"

(محمد نصرت حسین نصرت آروی)

غزل

از جناب صاحبزادہ
محمد معراج الدین صاحب
شامی

عالمگیر کے
عید نمبر
کیلئے

ممکن نہیں کہ چھوڑ دوں اُس سنگ کو میں — اُٹھونگا نذرِ جوشِ وفا کر کے سر کو میں

بیدرد لا چکا مرے مکتوب کا جواب — کیا جانتا نہیں روشِ نامہ بر کو میں

یہ وقت آگیا ہے کہ اب دیکھنے لگا — حسرت سے چارہ گر مجھے اور چارہ گر کو میں

یہ بتکدے کی راہ ہے وہ ہے حرم کی راہ — ذوقِ طلب بتائے کہ جاؤں کدھر کو میں

کیا کیا نہیں سہے ستم و جورِ ناروا — کیا بھول جاؤنگا کسی بیدادگر کو میں

خواہانِ دادِ حسن وہ، میں محوِ بیخودی — کیونکر نظر سے اُسکی ملاؤں نظر کو میں

مشکل ہے رنج و یاس و مصیبت سے چھوٹنا — کمبخت ساتھ ہیں جاؤں جدھر کو میں

گلگوں قبا بنا ہوں دُعا کس لئے نہ دوں — خونابہ ریزیٔ مژہ چشمِ تر کو میں

شامی یہ اپنے حسنِ عقیدت کا فرض ہے
چھوڑوں کبھی نہ صحبتِ اہلِ ہنر کو میں

دولتِ غزنویہ

ایڈیٹر روزنامہ انقلاب کے قلم سے!

غیر مسلم مورخین ہند نے اپنی مختلف اغراض کے لئے اسلامی تاریخ کے بعض عالم رجال کے متعلق جو غلط بیانیاں کی ہیں وہ محتاج بیان نہیں اس سلسلہ میں سلطنت غزنویہ کے عظیم الشان تاجدار سلطان محمود غزنوی کو بدنام کرنے اور خلاف واقعہ صورت میں دنیا کے سامنے لانے کی سرگزشت ہر پڑھے لکھے مسلمان پر واضح ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں سلطان مرحوم اور دولت غزنویہ کی تاریخ کو تفصیل کے ساتھ صحیح رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور غالباً اردو زبان میں غزنوی سلاطین کی یہ پہلی مستند اور قابل ذکر تاریخ ہے۔ آغاز میں ہندوستان پر عربوں کے حملے اور تسلط کے واقعات بھی اجمالاً بیان کر دیئے گئے ہیں سلطان کے حالات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کے ہر حملے کے اسباب اسکے خلاف ہندوستان کے راجاؤں کی سازباز اور مفتوحین کے ساتھ سلطان کے اچھے سلوک کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ سلطان کے تمام جانشینوں کے حالات غوریوں کی آخری کامیابی اور خاندان غزنویہ کے خاتمہ تک درج ہیں۔ اس طرح یہ تاریخ سلطان محمود کی ایک مفصل سوانح عمری کے علاوہ خاندان غزنویہ کی مستند تاریخ بن گئی ہے۔

کتاب کا انداز تحریر اچھا ہے۔ سرسری مطالعہ سے ہم جس حد تک معلوم کر سکے ہیں، حالات بہت مستند معلوم ہوتے ہیں۔ کاغذ اور چھپائی بہت عمدہ ہے۔ سلطان محمود کی سہ رنگی اور امیر سبکتگین کی دو رنگی تصاویر کے علاوہ سلطان کے مقبرہ غزنوی کی مسجد اور سومنات کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ضخامت چار سو صفحے، سرورق پر ایک عمدہ نقشہ ہے جس میں وہ تمام مقامات دکھائے گئے ہیں جن کا دولت غزنویہ میں ذکر آتا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے (عہ)

ایڈیٹر مسلم آؤٹ لک کے قلم سے!

اس کتاب کا بیشتر حصہ مجاہد اعظم سلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت اور اس کے واقعات پر بحث کی نذر کیا گیا ہے۔

آج کل اس امر کا احساس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ متعصب مورخین کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے یہ ظاہر کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ مجاہدین اسلام نہایت ہی تنگ دل اور متعصب تھے جن کا کام فقط غارتگری تھا لیکن ایسے غلط واقعات کا جو کچھ مدعا ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کے مصنف نے حقیقت میں ان بے انصافیوں کا قلع قمع کرنے والی ایماندارانہ سعی کی ہے جو ہندو اور نصرانی مورخین نے غزنویوں سے روا رکھی ہے مصنف نے کئی اصلی اور قلمی نسخوں سے نہایت وسیع مطالعہ کے بعد غزنوی تاریخ کو مرتب کر کے مارکیٹ میں ایک ایسی کتاب رکھی ہے جو تاریخ کے شائقین کی نظروں میں ضرور قبول عام کا شرف حاصل کرنے کے قابل ہے۔

(کتاب میں سلطان محمود رح کی سہ رنگی اور امیر سبکتگین کی دو رنگی کے علاوہ سلطان کے مقبرہ غزنی کی مسجد۔ اور سومنات کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ضخامت چار سو صفحات قیمت دو روپے (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔)

ملنے کا پتہ

مہتمم کتب خانہ دار الادب اندرون بھاٹی دروازہ لاہور

عالمگیر احکامِ عالمگیری میں

از جناب مولانا احمد ایم اے میرٹھی

تمہید

اورنگزیب عالمگیر کے حالات کے ماخذوں میں ایک فارسی کتاب "احکام عالمگیری" حال میں دستیاب ہوئی ہے۔ اس کی تصنیف کو حمید الدین خان بہادر نیمچۂ عالمگیری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ نامور بنگالی مؤرخ پروفیسر سر جادوناتھ سرکار نے اس کو شائع کیا ہے۔ اس سے قبل یہ کتاب کسی مورخ کے علم میں نہیں آئی - اس کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے - یہ کتاب ۷۲ احکام میں منقسم ہے - جن میں اورنگ زیب عالمگیر کی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات و واقعات نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اس کے مطالعہ سے عالمگیر کے خصائل - سیاست - طرز حکومت - رعایا و امراء - اور اہل و عیال سے سلوک - مذہبی عقائد اور اقوال پر کافی روشنی پڑتی ہے - اس مضمون میں "احکام عالمگیری" کی بناء پر عالمگیر کے شاہانہ اور خانگی زندگی پر تبصرہ کیا جائیگا ؛

اورنگ زیب عالمگیر کے نزدیک بادشاہت کا تصوّر

اورنگ زیب کے نزدیک بادشاہ کے لئے تمام اعلیٰ اوصاف - مثلاً شجاعت - استقلال - حزم - دُور اندیشی - جفاکشی - عدل و انصاف وغیرہ لازمی تھے - یہ تمام فضائل بارہا اس سے ظہور میں آتے ؛

شجاعت

جنگ کھجوہ میں جس میں شجاع اس کا مقابل تھا - اورنگ زیب نے حسب معمول اپنی شجاعت کا مظاہرہ کیا - جب اس نے شجاع کی فوج کو پیش قدمی کرتے دیکھا تو اپنے پیلبان کو حکم دیا کہ جس طرح ممکن ہو میرے ہاتھی کو شجاع کے ہاتھی کے قریب پہنچاؤ - مرشد قلی خاں نے مشورہ دیا کہ اس قسم کی جرأت بادشاہوں کے لئے غیر مناسب ہے ؟

اورنگ زیب نے جواب دیا -

" ما ہیچکدام بادشاہ نشدہ ایم - مردم بعد ازیں طور جرأتہا بادشاہ میشوند - بعد از بادشاہی ہم اگر در جرأت تفاوت شود آں سلطنت نمی ماند " (احکام ۷)

(ہم میں سے کوئی (ابھی تک) بادشاہ نہیں ہوا ہے - آدمی اسی قسم کی جرأت کے بعد بادشاہ بنتے ہیں - بادشاہ بننے کے بعد اگر کسی میں جرأت کم ہو جائے تو اس کی سلطنت قائم نہیں رہیگی ؛)

عروس ملک کسے در کنار گیرد چست
کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند

بڑے سے بڑے خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا - خواہ اس میں جان جانے کا امکان ہو - اس کے زمانۂ شہزادگی کا ایک واقعہ مشہور ہے - کہ ایک دفعہ شاہجہاں ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھ رہا تھا - لڑائی کے دوران میں ایک مست ہاتھی شہزادوں پر حملہ آور ہوا - تمام شہزادے بدحواس ہوکر ادھر اُدھر بھاگ گئے - صرف اورنگ زیب جس کی عمر اسوقت چودہ سال کی تھی اپنی جگہ ثابت قدم رہا - اور ہاتھی پر اپنے نیزہ سے وار کیا - ہاتھی نے اس کو گھوڑے سے گرا دیا - لیکن باوجود اس کے وہ سنبھل کر پھر ہاتھی کے مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا - اسی اثناء میں ملازم آ پہنچے - اور شہزادہ کو علیحدہ لے گئے - شاہجہاں نے اس کو دیکھ کر کہا ! خدا کا شکر ہے کہ خیریت ہوگئی ورنہ اگر نتیجہ دگرگوں ہوتا تو بڑی

رسوائی ہوتی" اورنگ زیب نے عرض کیا "اگر نتیجہ دگرگوں ہوتا تو رسوائی نہ ہوتی - رسوائی یہ تھی جو بھائیوں سے ہوئی - ع

پردہ پوش بادشاہاں مرگ است"

جفاکشی بیحد سرگرم اور جفاکش تھا - حصول مقصد کے لئے سخت سے سخت محنت سے بھی گریز نہیں کرتا تھا - بخلاف اپنے باپ دادا اور بھائیوں کے آرام طلبی اور تن آسانی اس سے کوسوں دور بھاگتی تھی - اس کی زندگی کا زیادہ حصہ میدان جنگ کی جدوجہد اور کشمکش میں بسر ہوا - اور اسی حالت میں اس نے وفات پائی ؛

"دروقتیکہ از برم پوری کہ از حضور بنام اسلام پوری مقرر بود کوچ برائے گرفتن قلعجات منودند مقرر فرمودند کہ خواہ صحت باشد خواہ آزار بغیر از مقام جمعہ روز دیگر مقام نخواہد شد - چنانچہ تا رسیدن بخواصپور کہ آفت بزانوئے ایشاں رسید دوبار آثار سخت شد - یکبار تپ و یکبار اسہال لیکن غیر از جمعہ ہرگز مقام نشد" ؛ (احکام ۷۴)

(جب حضور نے برم پوری سے جس کا نام آپ نے اسلام پوری رکھ دیا تھا - قلعوں کی فتح کیلئے کوچ کیا تو حکم دیا کہ خواہ میں تندرست رہوں خواہ بیمار - جمعہ کے سوا کسی روز قیام نہ کیا جائے - چنانچہ خواصپور پہنچنے تک جہاں آپ کے زانو میں ضرب آئی آپ دوبار سخت علیل ہوئے ایک مرتبہ بخار آیا اور دوسری دفعہ اسہال - لیکن بجز جمعہ کے کسی دن قیام نہیں ہوا) ؛

اسی سلسلہ میں اس کی وصیت کا یہ حصہ قابل لحاظ ہے :-

"تا مقدور والی ملک خود را از حرکت معاف ندارد - و از نشستن دریک مکان کہ در ظاہر صورت آرام در واقع منجر بہزار مصیبت و آلام است محترز باشد" ؛ (احکام ۸)

(بادشاہ کو تا حد مقدور دورہ کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے اور ایک جگہ قیام کرنے سے جو بظاہر آرام لیکن در اصل ہزارہا مصائب اور تکالیف کا باعث ہے اجتناب کرنا چاہئے)

اپنے ولی عہد محمد معظم شاہ عالم (بہادر شاہ اول) کو نصیحت کرتا ہے :-

"بادشاہ ہرگز آرام طلبی و فراغت شعاری را برخود روا ندارد - کہ بدترین اسباب خرابی ملک و انہدام دولت این شیوہ نامرضیہ است ہمیشہ تا مقدور در حرکت باید بود" ؛

(بادشاہ کو چاہئے کہ آرام طلبی اور بے فکری کو اپنے لئے ہرگز جائز نہ سمجھے کیونکہ یہ بدعادت ملک کی خرابی اور سلطنت کی بربادی کا بدترین سبب ہے - جہاں تک ممکن ہو ہمیشہ دورہ میں رہنا چاہئے) ؛

بادشاہ و آب را دریک مکان بودن بد است
آب میگردد زبوں شہ رود کار ز دست
درسفر باشد شہاں را حرمت وعیش و وقار
فکر آرام و تنعم می کنند بے اعتبار

(احکام ۱۰)

اورنگ زیب نے تمام عمر اس مقولہ کو اپنا دستور العمل بنایا کہ "بادشاہ کو کبھی آرام نہیں کرنا چاہئے" بیجاپور اور گولکنڈہ کے سقوط کے بعد مدارالمہام نے درخواست کی کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے فضل سے دو وسیع سلطنتیں مسخر ہو گئیں - اب دہلی واپس جانا مناسب معلوم ہوتا ہے - تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ اب کوئی کام باقی نہیں رہا ؛

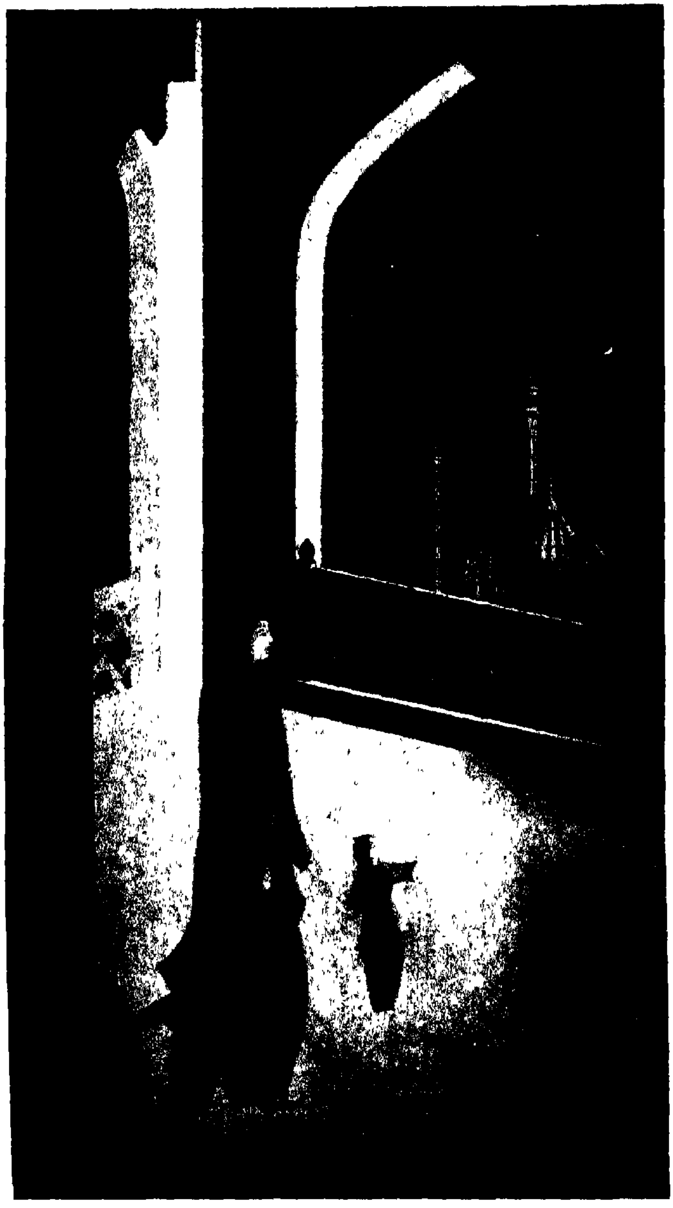
بادشاہ نے اس درخواست کے جواب میں لکھا :-

"عجب از آں خانہ زاد ہمہ داں کہ چنیں عرض نمودہ - اگر غرض آنست کہ بر مردم معلوم شود کہ کارے نماندہ است خلاف واقع است تا دمے از حیات فانی باقی است از شغل و کار خلاصی نیست" ؛

(تعجب ہے کہ ایسا تجربہ کار ملازم یہ درخواست کرتا ہے - اگر اس کی غرض یہ ہے کہ لوگ یہ خیال کریں کہ اب کوئی کام باقی نہیں رہا - تو یہ خلاف واقعہ ہے - جب تک فانی زندگی کا ایک سانس باقی ہے محنت اور کوشش سے خلاصی نہیں ہو سکتی)

رہرو طول امل را رہبرے درکار نیست
تا نفس باقیست راہ زندگی ہموار نیست
مشکل دل رسیدہ ہوائے وطن کند
شبنم چناں برفت کہ یاد از چمن کند

"اگر حضرت اعلیٰ بودن دار الخلافت و مستقر الخلافت اختیار نمیکردند و ہمیشہ در سفری بودند کار باینجا نمی رسید کہ رسید - واگر زراہ



پاس ادب عرض نمیکند و در تردد قلعہ گیری با مشقت میکشد آئندہ در محاصرہ قلعہا متوجہ می شویم"؛

(اگر اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) دار الخلافت و مستقر الخلافت (دہلی و آگرہ) میں سکونت اختیار نہ کرتے اور ہمیشہ دورہ میں رہتے تو یہ انجام نہ ہوتا جو فی الواقع ہوا۔ اگر دتم) از راہ پاس ادب (آئندہ) ایسی درخواست نہ کرو اور قلعہ فتح کرنے کی مشقت برداشت کر سکو تو ہم قلعوں کے محاصرہ کے لئے کمربستہ ہونگے)؛

غریق عشق چہ اندیشہ از خطر دارد ؟
سرگشتہ چہ پروائے درسر دارد ؟

"الحمد للہ در ہر مکان و ہر جا کہ ہستیم بمرور دل از تعلقات برداشتہ ایم و مردن را بر خود آسان کردہ ایم"؛

(الحمد للہ کہ میں جس مقام پر اور جس جگہ ہوں اُس کے متعلقات کی طرف سے دل پھیر چکا ہوں۔ اور موت کو اپنے لئے آسان کر چکا ہوں)

عقدۂ دل بستگی را اندک اندک باز کن
ورنہ مرگ این رشتہ را یک بار غافل بکشد

(احکام ۴۶)

بیدار مغزی

شاہان مغلیہ میں بیدار مغزی کے لحاظ سے اکبر کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کا درجہ ہے۔ اور یہ خصوصیت اس میں ابتداء ہی سے نمایاں تھی۔ چنانچہ شاہجہاں نے کئی مرتبہ اس کا اظہار کیا؛

"اعلیٰ حضرت می فرمودند کہ ما را بعضے اوقات اندیشہ می آید کہ ہمین پور عمدہ نیکو کاران واقع شدہ و مراد بخش بکار تشرب دلبستگی دارد و محمد شجاع جز سیر چشمی صفتے ندارد۔ مگر عزم و شعور اورنگ زیب اقتضای کند کہ متحمل این امر خطیر تواند شد"؛ (احکام ۳)

(اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) فرماتے تھے کہ بعض اوقات مجھ کو اندیشہ ہوتا ہے کہ (میرا) سب سے بڑا لڑکا (دارا) نیک لوگوں کا دشمن واقع ہوا ہے۔ اور مراد بخش کو مے خواری کا شوق ہے اور محمد شجاع میں سیر چشمی کے سوا کوئی صفت نہیں پائی جاتی۔ مگر اورنگ زیب کے عزم اور دانائی کا تقاضا ہے کہ وہ اس بار گراں (سلطنت) کا متحمل ہو سکتا ہے)

اورنگ زیب اپنی آخری وصیت میں کہتا ہے:۔

"عمدہ رکن السلطنت اطلاع اخبار ملکی است و غفلت یک لحظہ باعث ندامت سالہائے دراز میگردد۔ کہ مقدمہ گریختن سیوائے مقہور از غفلت شد و تا آخر عمر ہماں سرگردانی باقی بود"؛

(حکومت کا ضروری رکن ملک کے حالات سے باخبر رہنا ہے ایک لحظہ کی غفلت کئی سال کی ندامت کا باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ مجرم سیوا جی (مرہٹہ) غفلت کے سبب سے بچ نکلا اور آخر عمر تک مجھ کو پریشانی اٹھانی پڑے گی)؛

اگر دریافتی بر دانشت بوس
وگر غافل شدی افسوس افسوس (احکام ۸)

اصولِ سیاست

خاندان مغلیہ میں اکبر اور اورنگ زیب سیاسیات کے بڑے ماہر گذرے ہیں۔ اکبر کی طرح اورنگ زیب کے سیاسی اصول مردم شناسی۔ دور اندیشی حزم۔ مکر۔ ضبط و ربط اور مذہبی رواداری پر مشتمل تھے؛

مردم شناسی

اورنگ زیب پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ مذہبی تعصب کے ماتحت اپنے سے مختلف عقائد کے لوگوں کے کمالات کی قدر نہیں کرتا تھا۔ اس اعتراض کی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس نے تشیع کی بناء پر ایرانیوں سے بد سلوکی کی۔ اور ان کو اعلیٰ عہدوں سے محروم کر دیا۔ اورنگ زیب کی آخری وصیت کے یہ الفاظ اس اعتراض کو رد کرتے ہیں۔

"بہتر از ایرانی برائے متصدی گری دیگرے نیست۔ و در جنگ ہم از عہد حضرت جنت آشیانی تا حال احدے ازین فرقہ از معرکہ رو گرداں نہ شدہ و پائے استقامت اینہا نلغزیدہ۔ معہذا گاہے خود سری و حرام نمکی نکردہ اند۔ لیکن چوں بسیار عزت طلب اند با اینہا ساختن بسیار مشکل۔ بہر حال باید ساخت و کجدار مریز باید کرد"؛ (احکام ۲)

(متصدی گری کے لئے ایرانیوں سے بہتر کوئی دوسرا نہیں ہے، اور جنگ میں بھی حضرت ہمایوں کے زمانہ سے اب تک اس فرقہ کے کسی شخص

نے منہ نہیں موڑا - اور ان کا پائے استقامت متزلزل نہیں ہُوا اعلاؔ
ازیں انہوں نے کبھی نافرمانی اور بے وفائی نہیں کی - لیکن چونکہ یہ جاہ
طلب ہیں - اس لئے ان کے ساتھ نبھانا بہت مشکل ہے - بہرحال نبھانا
چاہئے - اور تدبیریں کرنی چاہئیں)؛

"فرقۂ تورانی سپاہی مقرری اند - برائے تاخت وتاراج
وشبخون وبندی کردن خوب اند - بہرصورت ایں جماعت را مل رعایت
باید داشت - کہ اکثر جاہا ایں مردم بکار می آیند کہ دیگرے بکار نمی آیند"
(احکام ۸)

(تورانی قوم سپاہ کے لئے مخصوص رہی ہے - تاخت وتاراج و
شبخون وگرفتاری میں بہت ہوشیار ہے - اس قوم کے ساتھ ہر طرح
رعایت کرنی چاہئے - کیونکہ اکثر موقعوں پر جہاں یہ لوگ کام آتے ہیں
دوسرے کام نہیں آتے)

شہزادہ معظم (بہادر شاہ اول) کو نصیحت کرتا ہے کہ :-

"در فکر تربیت نوکراں باشد وہر کدام را کہ لایق کارے
داند باں منصوب کند - وکار آہنگر از درودگر فرمودن از عقلا بعید است
کار بزرگاں بخورداں وکار خورداں بہ بزرگاں نباید فرمود - کہ بزرگاں از
کار خود تنگ کنند وخورداں را حوصلہ کار بزرگ نباشد خلل بتمام
در انتظام سرکار روی دہد"؛ (احکام ۱۰)

(ملازموں کی تربیت کا خیال رکھو - اور اُن میں سے ہر ایک کو وہ
کام سپرد کرو جس کا اس کو اہل سمجھو - لوہار کا کام بڑھئی کو دینا عقلا سے
بعید ہے - بڑوں کا کام چھوٹوں کے اور چھوٹوں کا کام بڑوں کے حوالہ
نہیں کرنا چاہئے - کیونکہ بڑے آدمی چھوٹا کام کرنے سے شرماتے ہیں اور
چھوٹے آدمیوں میں بڑے کام کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا - ایسا کرنے
سے سلطنت کے کام میں خلل واقع ہو جاتا ہے)؛

حزم واحتیاط حزم واحتیاط کے لحاظ سے عالمگیر کو اپنے
خاندان کے تمام تاجداروں پر فوقیت حاصل
ہے - یہ خصوصیت اس کے ہر فعل میں پائی جاتی تھی ؛

امیر خاں کو نصیحت کرتے ہوئے یہ شعر درج کرتا ہے ؎

چوں شود دشمن ملائم احتیاط از کف مدہ ؛ مکرہا در پردہ باشد آب زیر کاہ را

یعنی دشمن اگر نرمی کرنے لگے تو بھی احتیاط کو نہ چھوڑنا چاہئے
کیونکہ ممکن ہے کہ جس طرح گھاس کے نیچے پانی چھپا ہوتا ہے اسی طرح
دشمن کی نرمی کے پردہ میں مکر پوشیدہ ہو ؛

بعد ازاں اس کو آگاہ کرتا ہے کہ ؎

پائے بوس سیل از پا فگند دیوار را

دریا دیوار کے قدم اس لئے چومتا ہے کہ اس کو پیر کے بل
گرا دے - یعنی دشمن عجز کے پردہ میں تمہاری بیخ کنی کر سکتا ہے اس
لئے اس کی نرمی پر اعتماد نہ کرو ؛ (احکام ۵۲)

شہزادہ اعظم کی بے پروائی پر اس طرح افسوس کرتا ہے :-

"عجب از آں فرزند کہ صحبت ما ہیچ اثر نہ کردہ - از احتیاط
ودُور بینی ہزار مرحلہ دُور افتادہ - "الحزم سوء الظن" بخاطر نیاوردہ
واز آیت " ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ " بہرہ نیافتہ"

(مجھ کو اس لڑکے پر تعجب ہے - جس پر میری صحبت نے کوئی
اثر نہیں کیا - اور جو احتیاط اور دُور اندیشی سے ہزاروں منزل دُور پڑا
ہُوا ہے - اس نے اس قول کو دل سے نکال دیا ہے کہ "حزم بدگمانی
کا نام ہے" اور آیت " اپنے ہاتھوں سے اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو"
سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھایا")

مرغیکہ زیرک است دریں بوستاں سرا
گل را خیال چنگل شہباز مے کند
خون میچکد ز زخم نمایاں زخندہ اش
کبکے کہ بے ملاحظہ پرواز می کند
از صحبت نیکاں نشود طینت بد نیک
بادام ہماں تلخ بروں باشکر آید

مردی در تہوّر وبے باکی نیست بلکہ در خود شکنی است ؛ (احکام)
(مردانگی جسارت اور بے باکی میں نہیں بلکہ انکسار میں ہے)

کمال مردی ومردانگی است خود شکنی
بیوس دست کسے را کہ ایں کماں شکند

بدگمانی اس کا حزم بدگمانی کی حد تک پہنچا ہُوا تھا - زندگی
بھر اس نے اس قول پر عمل کیا کہ "الحزم سوء الظن" ؛

بنفس مباش بدگمان باش
وز فتنۂ مکرِ دہر اماں باش

داراشکوہ نے اپنے مکان میں اپنے باپ اور تینوں بھائیوں کی دعوت کی - چونکہ گرمی کا موسم تھا اس لئے آمد و رفت کیلئے دریا کے متصل ایک تہ خانہ بنایا گیا تھا - شاہجہاں اور شہزادے ضیافت میں شریک ہونے کے لئے اندر چلے گئے - لیکن اورنگ زیب دروازہ کے سامنے بیٹھا رہا - دارا نے بادشاہ سے اس کی شکایت کی - بادشاہ نے ہر چند اس کو دروازہ پر بیٹھنے سے منع کیا - مگر وہ نہیں مانا - شاہجہاں نے اس کا سبب دریافت کیا - تو اس نے کہا کہ یہ پھر کسی وقت بتاؤں گا - کچھ دیر بعد وہ نماز ظہر کا عذر کر کے وہاں سے اٹھ گیا - اور اپنے مکان میں چلا گیا - بعد میں اس نے ضیافت میں اپنی عدم شرکت کا سبب اس طرح بیان کیا :-

" آنروز کہ داراشکوہ ضیافت کردہ بودند اگر ایں معنی عمداً از برادر واقع شدہ بود کہ پدر را باسہ برادر در تہ خانہ یک دروازہ نشانیدہ مکرر برائے ضروریات ضیافت آمد و شد داشتند - پس اگر دروازہ را بند میکردند کار تمام بود - واگر سہواً بود در خاطر من مکرر رسیدہ بود کہ در وقتے کہ ایشاں اندروں باشند ایں خدمت را من بجا آرم " ؛ (احکام ۲)

(جس روز داراشکوہ نے ضیافت کی تھی - اگر یہ فعل عمداً اس سے صادر ہوتا کہ اپنے والد اور تینوں بھائیوں کو ایک دروازہ کے تہ خانہ میں بٹھا کر متعدد مرتبہ ضیافت کی ضروریات کے لئے اندر باہر آتے جاتے اور وہ دروازہ کو بند کر دیتا تو (ہمارا) کام تمام تھا - اگر اس نے یہ بھول کر کیا تھا تو مجھ کو کئی دفعہ خیال آیا کہ جبوقت یہ سب اندر ہوں تو یہ خدمت میں انجام دوں) ؛

بیٹوں سے سوءِ ظن

اس کی آخری وصیت کا یہ حصہ قابل غور ہے :-

" بر پسراں ہرگز اعتماد نکند و طور مصاحبت در زندگی نماید - کہ اگر اعلیٰ حضرت با داراشکوہ سلوک نمی کردند کار باینجا نمیرسید و " کلمۃ الملک عقیمہ " ہمیشہ مد نظر باید داشت " ؛ (احکام ۸)

(بیٹوں پر ہرگز اعتماد نہیں کرنا چاہئے اور اپنی زندگی میں ان سے مانوس نہیں ہونا چاہئے - اگر اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) داراشکوہ کے ساتھ (ایسا اچھا) سلوک نہ کرتے تو یہ حشر نہ ہوتا - اس مثل کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے - کہ " بادشاہ کی بات عقیمہ (غیر منتج) ہوتی ہے)

شاہجہاں کے انجام سے عبرت حاصل کر کے اورنگ زیب نے اپنے تمام بیٹوں پر سخت پابندیاں عائد کر دیں اور ان کی تادیب و تنبیہ کی نیت سے ان کو بعض دفعہ نظر بند بھی کیا ؛

شہزادہ معظم کی محلدار حمیدہ بانو نے نشان سے اورنگ زیب کو عرضی لکھی کہ بسا اوقات شہزادہ اپنے کرہ میں قلمدان اور بیاض اپنے ساتھ رکھتا ہے - اور محلدار یا اس کے نائب کو بے ادبی کے خوف سے اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی - اس مسئلہ میں حضور کا کیا حکم ہے ؟

اورنگ زیب نے جواب میں تحریر کیا :-

" آئندہ اصلاً و مطلقاً قلمدان را در اندرون نباید گذاشت و بناظر حکم رفتہ کہ در بیروں ہرگاہ ضرور باشد قلمدان را حاضر کند کہ بقدر دستخط ضروری در پیش ایشاں باشد - بعد ازاں ناظر سر بمہر خود نگاہ دارد - و بفرزند مجہول الحال ناظر بگوید کہ حبس چند سالہ باعث آگاہی نشد کہ اقدام بایں جرأتہا می شود - الحال ہم چیزے نرفتہ - دوری مانع تنبیہ نیست " ؛

(آئندہ قلمدان کو ہرگز ہرگز اندر نہیں چھوڑنا چاہئے - ناظر کو حکم دے دیا گیا ہے کہ (کمرہ کے) باہر جس وقت (شہزادہ کو) ضرورت ہو قلمدان پیش کر دے - تاکہ یہ (قلمدان) ضروری دستخط کرنے تک اس کے پاس رہے - اس کے بعد ناظر اس کو سر بمہر کر کے اپنے پاس حفاظت سے رکھے - ناظر کو چاہئے کہ میرے نادان فرزند سے کہدے کہ اتنی سال کی قید نے بھی اس کو ہوشیار نہیں کیا - جو وہ ایسی جرأت کے کام کا ارادہ کرتا ہے - اب بھی معاملہ (میرے اختیار سے) باہر نہیں گیا ہے - دُوری (مجھ کو تمہاری) تنبیہ سے نہیں روک سکتی) ؛

ایں گوے و ایں میدان
اے نافہم ہیچ مدان (احکام ۳۱)

قوت کا توازن

اپنی آخری وصیت کے دوران میں کہتا ہے:- "باسادات لازم السعادات بارہہ بموجب آیہ وآت ذی القربیٰ حقہ عمل باید نمود۔ در احترام و رعایت فرو گذاشت نباید کرد۔ ازیں راہ کہ بموجب آیہ کریمہ قل لا اسئالکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ محبت ایں جماعہ اجر نبوت است تقصیر نباید بود۔ کہ مثمر خیر دُنیا و آخرت است۔ لیکن با سادات بارہہ کمال احتیاط باید نمود۔ در محبت باطنی قصور نباید کرد۔ و بحسب ظاہر مرتبہ اینہا نباید افزود کہ شریک غالب بلکہ طالب ملک اند۔ اگر اندک استرخائی عنان شود ندامت خواہد شد"۔ (احکام ۸)

(بارہہ کے سادات با سعادات کے ساتھ آیت "وآت ذی القربیٰ حقہ" (رسول کے قرابت داروں کو ان کا حق دیدو) کے بموجب سلوک کرنا چاہئے۔ ان کی عزت اور رعایت کرنے میں فروگذاشت نہیں کرنی چاہئے۔ چونکہ بموجب آیہ کریمہ "لا اسئلکم الخ" (میں اپنے خاندان کی محبت کے سوا تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا) اس جماعت کی محبت نبوت کا اجر ہے اس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ یہ دُنیا و آخرت کی بھلائی کا باعث ہے۔ سادات بارہہ کے معاملہ میں کامل احتیاط کرنی چاہئے۔ دل میں اُن کی پُوری محبت ہونی چاہئے۔ لیکن بظاہر ان کا درجہ نہیں بڑھانا چاہئے۔ کیونکہ (ایسا کرنے سے) وہ (حکومت کے) غالب حصہ دار بلکہ سلطنت کے مدعی ہو جائیں گے۔ اگر وہ تھوڑی حد تک بھی (حکومت کی) باگ پکڑ لیں گے تو نتیجہ ندامت ہوگا)۔

اس نصیحت سے اس کی انتہائی عقل و فراست۔ عاقبت اندیشی۔ اور سیاست دانی ثابت ہوتی ہے۔ اس کے جانشینوں مثلاً بہادر شاہ اوّل۔ جہاندار شاہ۔ فرخ سیر۔ محمد شاہ۔ احمد شاہ۔ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم وغیرہم نے اسی زرین اصول کی صریح خلاف ورزی کرکے آپ اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔ جیسا کہ تاریخ ہند کے صفحات شاہد ہیں۔ اگر اورنگ زیب کے بعد اس کی وصیت کے اس حصہ پر عمل کیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ سلطنت مغلیہ اس قدر جلد برباد نہ ہوتی۔ اسی ضمن میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اختیارات کا توازن اکبر جیسے دانشمند مدبّر نے بھی نہیں قائم رکھا۔ اور اس خوفناک نازش سے اپنے جانشینوں کے حق میں کانٹے بوئے۔

ضبط و ربط

شاہی رعب و اقتدار کا حد سے زیادہ خیال رکھتا تھا اور ہر ایسے فعل کو تشدد کے ساتھ روکتا تھا جس سے شاہی شان و شوکت میں فرق آتا ہو۔ اس معاملہ میں بڑے سے بڑے امیر حتیٰ کہ شہزادوں کی بھی رعایت نہیں کرتا تھا۔

پلہ آنکس کہ ظل ذوالجلال است ؛ شریکش چوں شریک حق محال است

شہنشہ فردی باید در اقلیم ؛ دو یکتا بود در خورد دو نیم

کابل سے شکایت پہنچی کہ شہزادہ معظم نے دربار منعقد کرتے وقت چار طبل بجانے کا حکم دیا ہے۔

اورنگ زیب نے لکھا کہ شہزادہ کو چار طبل کی بجائے چار دہل بجوانے چاہئیں۔ کیونکہ دربار میں نقارہ بجانا بادشاہوں کا امتیاز ہے جب خدا شہزادہ کو بادشاہت دیگا اسوقت وہ نقارہ بجوا سکیگا۔ اضطراب کیا ہے؟ (احکام ۱۲)

کابل کے جاسوس نے بادشاہ کو عرضی بھیجی کہ شہزادہ معظم جامع مسجد میں قنات باندھ کر نماز پڑھتا ہے۔ بادشاہ نے عرضی پر لکھا:-

"در واقع از ترس و جبن کہ خلق آں فرزند است ایں مقدمہ بعید نیست۔ باوجود ایں جبن از ما ہم اند کے خوف باید داشت۔ امرے کہ مخصوص سلطنت باشد چگونہ اقدام باں تواں کرد؟ اعلیٰ حضرت غفران مرتبت در کار پسراں مساہلہ نمودند تا کار بجائے رسید کہ رسید .... ہر کارہ بازار زود تحقیق کردہ حقیقت را بنولیسد اگر واقعی است از صوبہ داری تغیر کردہ بحضور باید طلبید"۔ (احکام ۱۳)

(در حقیقت یہ بات خوف اور بزدلی سے جو اس لڑکے کی فطرت میں داخل ہے بعید نہیں ہے۔ اس بزدلی کے ہوتے ہوئے ہم سے بھی کچھ خوف کرنا چاہئے۔ اس نے کیونکر ایسے فعل کی جرأت کی جو بادشاہت سے مخصوص ہے۔ اعلیٰ حضرت (شاہجہان) نے اپنے بیٹوں کے معاملہ میں غفلت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ جو ہوا .... ہر کارہ کو چاہئے کہ دوبارہ بہت جلد تحقیق کرکے صحیح حالات لکھے۔ اگر شکایت درست ہے تو شہزادہ کو صوبیداری سے معزول کرکے ہمارے پاس بھیجے)۔

معظم کے ناظر کے خط سے معلوم ہوا کہ شہزادہ نے سرہند کے پاس ہاتھیوں کی لڑائی کرائی۔ اورنگ زیب کو سخت غصہ آیا اس نے مدار المہام

سے اس مضمون کا فرمان شہزادہ کے نام لکھوا دیا :-

"جنگ فیل مخصوص بادشاہان است - باین آرزوہائے لاطائل بے حاصل بادشاہی زود نخواہد رسید - ہرگاہ وقت آید وو نصیب باشد خواہد شد - آدمی را چیزے کہ خراب می کند طلب بیش از قسمت و پیش از وقت است ما را چرا متغیر و خود را مکدر باید ساختہ" ؛ (احکام ۲۱)

(ہاتھی کی لڑائی بادشاہوں کے لئے مخصوص ہے - اس قسم کی بے فائدہ اور بے سود آرزوؤں سے بادشاہت جلد نہیں ملے گی - جب وقت آئیگا اور نصیب ہوگا - (بادشاہ) ہو جائیگا - جو چیز آدمی کو خراب کرتی ہے - وہ قسمت سے زیادہ اور قبل از وقت خواہش کرنا ہے - (ایسی حرکتوں سے تم) مجھ کو ناراض اور خود کو پریشان کیوں کرتے ہو؟) ؛

کابل سے پرچہ موصول ہوا کہ شہزادہ معظم دربار میں زمین سے ایک گز اونچی مسند پر جلوس کرتا ہے - بادشاہ نے جواب تحریر کیا ؎

بہوس کار بر نمی آید
درہمہ کار لطف حق باید
تکیہ برجائے بزرگاں نتواں زد بگزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

عجب کہ قید چند سال دماغ پندار آں آمادہ کبر و حمق را باصلاح نیاورد؟ گرزدار شبیہ رفتہ از سر دیوان برخیزانند و چبوترہ را شکنند - اگر در وقتیکہ رسند کہ ایشاں بر دیوان نباشد صبر کنند تا دیوان نمایند و بموجب حکم عمل نمایند جزاء بما کانوا یعملون - اعلیٰ حضرت فردوس مرتبت آں قدرت اہل تغافل باپسراں کردند کہ رشتۂ سر دمن کا منعکوس گردید" ؛ (احکام ۱۵)

(تعجب ہے کہ اتنے سال کی قید نے اس متکبر اور احمق کے خود سر دماغ کی اصلاح نہیں کی - دو زوردار گرز دار بھرے دربار میں جا کر اس کو اٹھا دیں اور چبوترہ کو توڑ دیں - اگر (گرز دار) اس وقت (کابل) پہنچیں جب وہ (شہزادہ) دربار میں نہ ہو تو اس کے دربار کرنے تک توقف کریں - اور پھر (میرے) حکم کی تعمیل کریں - جزا اس کام کی جو وہ کرتے ہیں - اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) نے بیٹوں کے معاملہ میں اس قدر بے پروائی اور غفلت کی کہ تمام انتظام بے ترتیب ہو گیا)

محمد اعظم کے ناظم ڈیوڑھی بہروز خاں نے عرض کیا کہ شہزادہ نے کورا احمد آباد کے شاہی باغ میں محلدار کو ہمراہ لئے بغیر چلے گئے - محلدار نے اور میں نے ان کو بہت منع کیا - مگر انہوں نے محلدار کو اپنی مجلس سے خارج کر دیا ؛

بادشاہ نے شہزادہ پر ۵۰ ہزار روپے جرمانہ کیا ؛ (احکام ۳۰)

ایک روز شاہی دربار میں محمد اعظم نے کوئی سوال پیش کیا اور خاطر خواہ جواب نہ پاکر رنجیدہ کھڑا ہوا - اور اس قدر آگے بڑھا کہ اس کے قدم مسند شاہی سے چھو گئے - بادشاہ نے ناراض ہو کر اسی وقت دربار برخاست کر دیا - اور شہزادہ کو اپنے سامنے پیش نہیں ہونے دیا - شاہ سلیم اللہ نے شہزادہ کی سفارش کی اور کہا من عفی واصلح فاجرہ علی اللہ ؛

بادشاہ نے لکھا ؎

از ساحل نجات بہ بحر فنا فتاد
از حد خود کسے کہ قدم پیشتر گذاشت (احکام ۳۲)

اعتدال

اپنے ولی عہد کو یہ قیمتی نصیحت کرتا ہے :-

"بادشاہ باید کہ وسط باشد میان لطف و قہر ہر کدام کہ از دیگرے بیشتر باشد موجب انکسار سلطنت می شود کہ در لطف زیادہ مردم جرأت پیدا می کنند و در قہر افزوں مبائع ر انفرت بہم می رسد - چنانچہ عم ایں نحیف سلطان الغ بیگ باوجود فضل و کمال تسفک و ماہ جرأت داشتند کہ بر جریمۂ سہل حکم قتل می فرمودند - پسر ایشاں عبد اللطیف ایشاں را محبوس نمودہ بقلعہ نہادند فرستادند در راستاے راہ از شخصے پرسیدند کہ برہم خوردگی سلطنت ما را از چہ راہ دانستی؟ گفت از راہ تسفک ما و کہ مردم از شما تنفر پیدا کردند - آنچہ جد امجد ہمایوں بادشاہ کہ در مساہلہ بیجا و عفو و سستی در کار ہا کہ باوجودیکہ جرأتہا کہ شیر خاں در صوبہ بنگالہ میکرد مکرر بعرض رسید تغافل می فرمودند - و پدرش را کہ حسن سور بود سرزنش می نمودند کہ حرکات پسر خود را می بینی و باد می نویسی - او جواب داد کہ کار او از نوشتن گذشتہ است - نمی دانم کہ غفلت حضرت آخر چہ خواہد کرد" ؛ (احکام ۱۰)

(بادشاہ کو نرمی اور شدت کے درمیان عمل کرنا چاہئے - اگر ان دونوں خصلتوں میں سے ایک دوسری سے زیادہ ہوگی تو سلطنت کے زوال کا باعث ہوگی - کیونکہ زیادہ نرمی کی صورت میں لوگ بے خوف ہو جاتے ہیں - اور زیادہ سختی کی حالت میں دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے - چنانچہ اس عاجز (اورنگ زیب) کے عم سلطان الغ بیگ باوجود فضل

وکمال کے خونریزی میں اس قدر بیباک تھے - کہ خفیف جرم پر قتل کا حکم دیدیتے تھے - ان کے بیٹے عبداللطیف نے ان کو قید کرکے قلعہ بناوند میں بھیجدیا - اثنائے راہ میں انہوں نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ تیری رائے میں میری حکومت کی بربادی کا کیا سبب ہُوا ؟ اس نے جواب دیا کہ خونریزی جس کی وجہ سے لوگ تم سے نفرت کرنے لگے " میرے جدامجد ہمایوں بادشاہ نے جو کچھ کیا غیر مناسب غفلت - درگذر اور کاروبار میں سستی (کا مترادف) تھا - باوجود صوبہ بنگال میں شیر خاں کی گستاخانہ حرکتوں سے بار بار اطلاع پانے کے آپ نے بے پروائی کی - اور (صرف) اس کے باپ حسن سور کو ملامت کی کہ اپنے بیٹے کی حرکتوں کو دیکھتا ہے اور اس کو (نصیحت) نہیں لکھتا - اس نے جواب دیا کہ " اس (شیر خاں) کا فعل لکھنے کی حد سے گذر گیا ہے - میں نہیں سمجھ سکتا کہ حضور کی غفلت کا کیا نتیجہ ہوگا) ؛

ایک صوبیدار کو نصیحت کرتے ہوئے یہ قول نقل کرتا ہے :-

" فلاطوں باسکندر نوشتہ بود کہ ریاست راشد تے باید بے عنف و رخوتے باید بے ضعف " ؛ (احکام ۴۸)

(افلاطون نے اسکندر کو لکھا تھا کہ حکومت سخت ہونی چاہئے بغیر ظلم کے - اور نرم ہونی چاہئے بغیر کمزوری کے ؛

عدل عالمگیری

فیروز جنگ خاں نے ایک شخص مسمی محمد عاقل کو رہزنی کے الزام میں قتل کر دیا - اورنگزیب کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو اس نے اپنے قلم خاص سے رقم کیا :-

" عمدۃ الملک مدار المہام بخان فیروز جنگ بے فرہنگ بنویسد - کہ بر قتل کہ عبارت از ہدم بنیان الٰہی است بغیر از حجت شرعی اقدام نمودہ وائے بر آں روز کہ وارث ہم رسد و دیت نہ کند - ایں نحیف را بغیر از حکم قصاص چہ چارہ کہ ترحم در حدود ممنوع نص کلام اللہ است - ولا تاخذ کم بھما رافتہ فی دین اللہ " ؛ (احکام ۴۴)

(عمدۃ الملک مدار المہام کو چاہئے کہ نالائق خان فیروز جنگ کو لکھے کہ تم نے بغیر حجت شرعی قتل یعنی خدا کی پیدا کردہ مخلوق کو تباہ کرنے کا ارتکاب کیا ہے - اس روز کا افسوس ہے جب (مقتول کا) وارث آئیگا - اور خون بہا نہیں قبول کرے گا - اس عاجز (اورنگ زیب) کو دمنہک کے لئے قصاص کا حکم دینے کے سوا کیا چارہ ہے - کیونکہ حدود (شرعی) میں رحم کرنا کلام اللہ کی آیت (تعلیم) کے خلاف ہے - (اللہ کے دین (کے معاملہ) میں (ربے جا) مہربانی تم پر غالب نہیں ہونی چاہئے) ؛

عدل کے معاملہ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ بھی مطلق رعایت نہ کرتا تھا مرہٹوں کی ایک ٹولی نے احمد آباد سے چالیس کوس کے فاصلہ پر سورت کی سڑک پر چند سوداگروں کو لوٹ لیا - محمد اعظم کو جو احمد آباد کا صوبیدار تھا جب یہ اطلاع دی گئی تو اس نے کہا کہ " یہ واقعہ سورت کے متصدی امانت خاں کی فوجداری میں ہُوا ہے - مجھ کو اس سے سروکار نہیں ہے " اورنگ زیب کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے یہ فرمان ارسال کیا :-

" پنج ہزار از اصل منصب کم و بموجب اظہار تاجراں زر نقد از وکیل ایشاں بگیرند - اگر غیر بادشاہ زادہ بے بود بعد تحقیق حکم شد برائے بادشاہ زادہ سزا عدم تحقیق است - زہے بادشاہ زادگی کہ خود را کمتر از امانت خاں بدانند - ہرگاہ در حالت حیات ما دعوی وراثت ملک داشتہ باشند - پس چرا در حیات ما امانت خاں را شریک میراث نہ گردانند " (احکام ۲۱)

(شہزادہ کے) اصل منصب میں پانچ ہزار کی تخفیف کر دی جائے - اور تاجروں کے بیان کردہ (نقصان) کے مطابق شہزادہ کے ملازموں سے نقد روپیہ وصول کیا جائے - اگر شہزادہ کی بجائے کوئی اور ہوتا تو تحقیق کے بعد یہ حکم دیا جاتا - شاہزادہ کی سزا عدم تحقیق ہے - زہے شاہزادگی کہ خود کو امانت خاں سے کم سمجھتا ہے - جب تم میری زندگی میں سلطنت کی وراثت کا دعوی کرتے ہو تو میری زندگی میں امانت خاں کو میراث میں کیوں نہیں شریک کرتے) ؛

سید لعل مندسور کا منصب دار اور جاگیر دار تھا - چونکہ وہ " شرابی اور بدعتی " تھا - اس لئے شہزادہ اعظم نے عنایت اللہ کے وسیلے سے اسکی جاگیر کو اپنی ملکیت میں منتقل کرانے کی کوشش کی - اورنگ زیب نے اس کو یہ جواب لکھا :-

" کارے کہ تعلق بہ محتسب دارد بخود گرفتن و التماس تغیر جاگیر نمودن

تصرف تازہ و بامزہ است جاگیر یک پشتی تغیر نمودن محال است چہ جائے سہ پشتی؟ جاگیر کسے بگفتہ کسے تغیر نمی شود - در نوکری آں بابا با سید لعل مساوی و در سیادت طرف ثانی بہزار مرحلہ زیادہ - صدر الصدور بہ محتسب آنجا بنویسد کہ تحقیق وا رسیدہ مفصل معروض دارد - الحمد للہ کہ بطور اعلیٰ حضرت اولاد را مسلط ننمودہ ام کہ ندامت کشم" ۔ (احکام ۱۰)

(جو کام محتسب سے تعلق رکھتا ہے اس کو اپنے ذمہ لینا اور جاگیر کی تبدیلی کی درخواست کرنا ایک انوکھا اور دلچسپ تصرف ہے - یک پشتی جاگیر کا تغیر کرنا محال ہوتا ہے چہ جائے سہ پشتی - کسی کی جاگیر کسی کے کہنے سے تغیر نہیں ہو سکتی - نوکری کے لحاظ سے وہ فرزند (اعظم) اور سید لعل مساوی ہیں اور سیادت کے اعتبار سے موخر الذکر ہزار درجہ افضل ہے - صدر الصدور کو چاہیئے کہ اس مقام کے محتسب کو لکھے کہ اس امر کی تحقیق کر کے مفصل کیفیت سے ہم کو مطلع کرے - الحمد للہ کہ اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) کی طرح میں نے اپنی اولاد کو غلبہ نہیں دیا - کہ ندامت اٹھاؤں) ۔

مذہبی رواداری

اپنے اسلاف کی طرح اورنگ زیب عالمگیر نے مذہبی رواداری کو اپنا شعار بنایا - وہ اپنی تمام رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت و فرقہ ایک نظر سے دیکھتا تھا - اس نے عمر بھر کسی شخص کو جو اس سے اختلاف عقائد رکھتا ہو اپنا مذہب ترک کرنے اور اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا - وہ اگرچہ بذات خود سنی تھا - لیکن شیعوں کے جذبات کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ اپنی آخری وصیت میں اس نے صاف ہدایت کر دی کہ :-

" سہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن در صرف خاص است - روز وفات بفقرا بدہند - ازیں راہ کہ زر کتابت قرآن نزد فرقہ شیعہ حرمت دارد بکفن وما یحتاج آں صرف نکنند" ۔ (احکام ۸)

یعنی تین سو پانچ روپے جو میں نے کتابت قرآن سے کمائے ہیں میرے ذاتی اخراجات کے لئے ہیں - میری وفات کے روز ان کو خیرات کر دینا - کفن پر اس لئے صرف نہ کرنا کہ شیعہ فرقہ اس کو ناجائز مانتا ہے" ۔

اگر اورنگ زیب اس روپے کو اپنے کفن پر صرف کراتا تو کبھی کوئی شخص اس فعل کو تعصب اور عدم رواداری نہیں قرار دے سکتا تھا - کیونکہ یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا - اور اس کو حق حاصل تھا کہ اپنی رقم کو جس طرح چاہتا خرچ کرتا - دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

محمد امین خان اورنگ زیب کے مقرب اور یا امرا اہل دربار میں سے تھا - اپنی گرانقدر خدمات کی بدولت وہ پنج ہزاری کے اعلیٰ منصب پر پہنچا - اور بہت انعام و اکرام حاصل کیا - اپنے رسوخ سے فائدہ اٹھا کر اس نے اس مضمون کی عرضی بادشاہ کی خدمت میں پیش کی :-

" پیر و مرشد عالم و عالمیان سلامت! ہر دو خدمت بخشی بایرانیاں بدمذہب دیو صفت مقرر است - اگر یک بخشیگری باین فدوی قدیم الخدمت مرحمت شود باعث تقویت دین و انتزاع کار از کفرۂ لعین خواہد بود آیۃ یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء" ۔

(احکام ۳۹)

(پیر و مرشد عالم و عالمیان سلامت! بخشی کے دونوں عہدے بدمذہب دیو صفت ایرانیوں (شیعوں) کے سپرد ہیں اگر ایک عہدہ بخشیگری اس عاجز پرانے خادم کو عطا کیا جائے تو دین (سنی) کی تقویت اور کفار لعین کی برطرفی کا باعث ہوگا - اے وہ لوگو کہ ایمان لائے میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ خیال کرو) ۔

اس عرضی پر بادشاہ نے یہ جواب تحریر کیا :-

" آنچہ از قدم خدمت خود نوشتہ بیان واقعہ است - بقدر مقدور قدردانی بعمل می آید - و آنچہ از بدمذہب ایرانیاں نوشتہ امور دنیا را با مذہب چہ نسبت؟ و کارہائے نسبت مذہب را بہ تعصب چہ دخل؟ "لکم دینکم ولی دین" اگر ہمیں قاعدہ مقرر بودے بایست کہ جمیع راجہا و تبعہ انہا را مستاصل میکردیم - اختیار تغیر قابلاں نزد عقلا مذموم است" ۔

(احکام ۳۹)

(تم نے) جو کچھ اپنی قدیم الخدمتی کی بابت لکھا ہے بالکل صحیح ہے تا حد مقدور اس کی قدر دانی کی جا رہی ہے - اور جو کچھ تم نے بدمذہب ایرانیوں (شیعوں) کے متعلق لکھا ہے - (اس کا جواب یہ ہے کہ) دنیوی امور کو مذہب سے کیا نسبت؟ اور مذہبی امور کو تعصب میں کیا دخل؟ تمہارے واسطے تمہارا دین - میرے واسطے میرا دین - اگر یہی (تمہارا تجویز کردہ) قاعدہ (عدم رواداری) نافذ کر دیا جائے تو (ہمیں) چاہیئے کہ تمام

(ہندو راجاؤں اور ان کے ماتحتوں کو بھی نیست و نابود کر دیں۔ قابل لوگوں کی برطرفی عقلمندوں کے نزدیک مذموم ہے) ؛

اورنگ زیب کے اس نوشتے سے اس کے سیاسی طرزِ عمل پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ وہ تعصب مذہبی کو سلطنت کے حق میں مضر سمجھتا تھا۔ سرکاری عہدے صرف لایق لوگوں کو دیتا تھا خواہ وہ کسی مذہب اور فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اختلافِ عقائد کی بناء پر کسی کے درپے آزار نہیں ہوتا تھا۔ شیعہ اعلیٰ منصبوں پر مامور تھے۔ ہندو راجاؤں اور اُن کی رعایا کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی ؛

اسی ضمن میں خود اس کے یہ کلمات قابلِ غور ہیں:-

"مارا بمذہب کسے چہ کار است؟ عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود" ؛

(احکام ۷۰)

(ہم کو کسی کے مذہب سے کیا واسطہ ہے۔ عیسیٰ اپنے دین پر موسیٰ اپنے دین پر)

الفاظ مندرجہ بالا کسی تشریح کے محتاج نہیں ہیں۔ ان سے اورنگ زیب کا انتہائی بے تعصب۔ روادار اور صلح کُل ہونا ثابت ہوتا ہے ؛

تعجب ہے کہ پروفیسر سر جادو ناتھ سرکار نے تاریخ اورنگ زیب کی تالیف میں ان حالات و واقعات کو قطعاً نظر انداز کر دیا ؛

عام حالات اور خصائل

فنِ حرب اورنگ زیب نہ صرف دلیر اور شجاع تھا بلکہ بخلاف اپنے بھائیوں کے فنِ حرب کا بڑا ماہر تھا اور اسی سبب سے خانہ جنگی میں ان سب پر غالب آیا۔ شاہجہاں کی عین حیات میں ہی اُس نے ماوراء النہر اور دکن میں اپنے جنگی کارناموں کا سکّہ بٹھا دیا تھا ؛

سنہ ۱۶۵۸ء میں جب وہ دارا سے لڑنے کے لئے اورنگ آباد سے روانہ ہوا تو اس نے ہرتول میں قیام کیا۔ اور دس روز کے قیام کا حکم دیا۔ تاکہ اس عرصہ میں اس کے آدمی اپنی بقیہ ضروری اشیا مہیا کر سکیں۔ نجابت خاں نے عرض کیا کہ کوچ کرنے کے بعد قیام کرنا غیر مناسب ہے۔ کیونکہ غنیم کو جب ہمارے قیام کا حال معلوم ہوگا تو وہ ہم کو روکنے کے لئے اپنا لشکر بھیجدیگا

اورنگ زیب نے جواب دیا کہ اسی میں مصلحت ہے۔ اگر ہم کوچ کرنے میں جلدی کریں تو ہم کو دشمن کی ساری فوج سے لڑنا پڑیگا۔ اور اس جگہ توقف کرنے میں اُس کے پہلے حصہ سے مقابلہ ہوگا۔ فوج کے ایک حصہ کو شکست دینا تمام فوج کو شکست دینے سے زیادہ سہل ہے۔ اگر دارا خود نربدا کو عبور کر کے یہاں آئے تو اسکی حالت یہ ہوگی ؎

آنکس کہ زمامن و وطن دُور شود
بیچارہ و مستمند و مہجور شود
در آب ہزبر صید ماہی گردد
در خاک نہنگ طعمۂ مور شود

قلعہ ستارا کے محاصرہ کے دوران میں چار مسلمان اور نو ہندو گرفتار کئے گئے۔ اورنگ زیب نے ان کی بابت مفتیوں سے استفتا کیا۔ قاضی محمد اکرم نے فتویٰ دیا کہ ہندو اگر اسلام قبول کر لیں تو رہا کر دئے جائیں اور مسلمان تین سال تک قید میں رکھے جائیں ؛

اس فتوے سے اورنگ زیب کا اطمینان نہیں ہوا۔ اور اس نے لکھا:-

"این مسئلہ بطور مذہب حنفیہ۔ باید بطور دیگر آورد کہ ضبط سلطنت از دست نرود۔ ...... الحمد للہ چار مذہب برحق است و موافق مصر و وقت" ؛ (احکام ۷۱)

(یہ مسئلہ (فتویٰ) حنفی مذہب کے مطابق ہے۔ کسی دوسرے (مذہب) کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے۔ تاکہ نظام سلطنت ہاتھ سے نہ جائے ...... خدا کا شکر ہے کہ چار مذہب برحق ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے موقع کے مطابق ہے) ؛

اس پر علماء نے دُوسرا فتویٰ دیا کہ تمام ہندو اور مسلمان قیدیوں کو قتل کر دینا چاہئے۔ بادشاہ نے اس فتوے پر صاد کیا۔ چنانچہ وہ سب قیدی قتل کر دئے گئے ؛

اس واقعہ سے بھی اورنگ زیب کی دانائی۔ ہوشمندی اور سیاست دانی مترشح ہوتی ہے۔ پہلے فتوے پر عمل کرنا مخدوش تھا۔ کیونکہ اس بات کی کیا ضمانت ہو سکتی تھی کہ دشمن کے سپاہی جو گرفتار ہوئے تھے صدق دل سے اسلام قبول کرینگے اور آزاد ہو کر دوبارہ شاہی



اصفہان کا ایک منظر



تبریز کا ایک منظر

سلطنت سے نہیں لڑیں گے - اورنگ زیب سیواجی کی چالاکی کا خیالنہ اُٹھا چکا تھا - اور ڈرتا تھا کہ بہت ممکن ہے کہ یہ قیدی رہا ہونے کی غرض سے اسلام کا جھوٹا اقرار کریں - اور پھر اس کے خلاف تلوار اٹھائیں - اس کے یہ الفاظ کہ "ضبط سلطنت از دست نرود" اس کے مدعا اور حکمت عمل کا آئینہ ہیں۔

تحمل

تحمل مدبر کا سب سے بڑا جوہر ہے - تحمل اور بردباری اورنگزیب کے خمیر میں داخل تھیں "اکثر اوقات" دہن سگ بہ لقمہ دوختن " پر عمل کرتا تھا - ایک شاعر نے اس کی ہجو کہی - کوئی اور بادشاہ ہوتا تو شاعر کو سخت سزا دیتا - لیکن اورنگ زیب نے خلاف توقع اس کے انعام میں اضافہ کیا - ایک امیر نے جب اسکی شکایت کی تو بادشاہ نے جواب میں لکھا - "باید سوخت و باید ساخت و رفیقک من یوافقک ولا یفقک من یفارقک" ‌‌‌‌‌‌ (احکام ۵۹)

ایک امیر کو تحمل کی نصیحت کرتے ہوئے یہ شعر نقل کرتا ہے ؎

میدرد پردهٔ خود پیشتر از پردهٔ او
ہرکہ با کم ز خودی دست وگریباں گردد
بر سنگ خار زد گہر آبدار خویش
ہر عاقلے کہ بحث بنا قص عیار کرد ‌‌ (احکام ۴۰)

عفو

۱۶۵۸ء کی خانہ جنگی میں مرزا شاہ نواز خاں نے دارا کی طرف ہو کر اورنگ زیب کی مخالفت کی - باوجود اس کے اورنگ زیب نے اس کو معاف کر دیا - اور احمد آباد کا عامل مقرر کیا ‌ (احکام ۶)

اپنی آخری وصیت میں کہتا ہے :-

"بر والی ملک واجب باد کہ با خانہ زاداں بے سرو پا کہ ہمراہ ایں عاصی دوراز جیا در دشت وصحرا گشتہ اند مدارات نمایند واگر بتصریح تقصیرے ازینہا واقع شود بعفو جمیل وصفح جزیل مکافات فرمایند" (احکام ۸)

(والی ملک (میرے جانشین) پر واجب ہے کہ بیچارے ملازموں کے ساتھ جو اس تردامن گنہگار (اورنگ زیب) کے ہمراہ جنگلوں میں بھٹک رہے ہیں - رعایت کرے اور اگر ان سے صریحاً کوئی قصور ہو جائے - تو عفو اور چشم پوشی سے کام لے)

امیر خاں صوبیدار افغانستان کی مجرمانہ غفلت سے درگذر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"المخطی لا یعاقب والساہی لا یعاقب"

(خطا کرنے والا سزا نہیں دیا جاتا اور فروگذاشت کرنے والا عتاب نہیں کیا جاتا) ‌ (احکام ۹۴)

حُسن خُلق

اورنگ زیب کی کامیابی کا ایک بڑا سبب اس کا حسن خلق تھا - "احکام عالمگیری" سے ظاہر ہوتا ہے کہ بخلاف داراشکوہ کے وہ ایام شہزادگی میں بہت ہر دلعزیز تھا - اکثر امراء اہل دربار مثلاً علی مردان خاں - سعد اللہ خاں سید میراں اور افضل خاں جو دارا سے ناخوش تھے اورنگ زیب سے بوجہ اسکی مروت اور حسن سلوک کے بہت مانوس تھے - شاہجہاں کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے اورنگ زیب کو اس قدر بے تکلفی سے منع کیا - اورنگ زیب نے جواب لکھا :-

"بندہ بموجب حدیث صحیح کہ راوی آں انس بن مالک رضی اللہ عنہ باشد من اذل نفسہ اعزہ اللہ عمل می نماید و انکسار قلوب را اذنب ذنوب و افحش عیوب می شمارد" ‌ (احکام ۳)

(بندہ بموجب اس صحیح حدیث کے جس کے راوی انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں عمل کرتا ہے "جو اپنے نفس کو مطیع کرتا ہے اللہ اسکو عزت دیتا ہے" میں (لوگوں کی) دلشکنی کو سب سے بڑا گناہ اور بدترین عیب خیال کرتا ہوں)

دُور بینی

اورنگ زیب عالمگیر کی بعض حسرتناک تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی آنکھیں اس عذاب کو دیکھ رہی تھیں جو اس کے بعد سلطنت مغلیہ پر نازل ہوا - ایک امیر کو لکھتا ہے ؎

افسوس کہ عمر گشت بیہودہ تلف ‌ • ‌ دنیا بتعب گذشت و دیں رفت زکف
رنجیدہ خدا و خلق راضی نشدند ‌ • ‌ مستانہ کردیم پارهٔ آب و علف

اگرچہ ما بدیم و خود را بدمے دانیم لیکن حق تعالیٰ از بد بدتر حفظ کند کہ بعد از ما خواہد شد" ‌ (احکام ۴۵)

(اگرچہ ہم برے ہیں اور خود کو برا جانتے ہیں - لیکن حق تعالیٰ (مخلوق کو) اس سے بھی زیادہ برے سے محفوظ رکھے - جو ہمارے بعد ہوگا)

توہم

اپنی آخری وصیت میں بارہ [۱۲] نصیحتیں کرتا ہے - اور آخر میں لکھتا ہے "تبارک اللہ اشر اقسام توہم دوازدہ وصیت کردہ شد" ‌ (احکام ۸)

اکثر بادشاہوں کی طرح زائچوں کو مانتا تھا۔ شہزادہ معظم سے کہتا ہے:-

"احکام زائچہ مارا کہ فاضل خاں علاء الملک از روز ولادت تا بعد وفات نوشتہ بحسب تجربہ تمامش واقعہ آمدہ"؛ (احکام ۲)

"بارہ" عدد کی برکت کی یہ دلیل پیش کرتا ہے ؎

ساعات زماں و برج افلاک نگر
روز و شب و آسماں ہم اثنا عشریست

(احکام ۴۵)

"دختر دامن علامت افنا داست"؛ (احکام ۲۶)

اقوال

اس کے چند چیدہ اقوال کا درج کرنا اس جگہ مناسب ہے:-

"سر بریدہ سخن نگوید" (احکام ۶)

"آنقدر شور مباش کہ از دہن براندازند و آنقدر شیریں ہم مباش کہ فرو برند"؛ (احکام ۱۱)

"ہیچ عاقل نقد بہ نسیہ نمیگذارد۔ تا رسیدن وقت نقدی کہ زندہ و کہ مردہ؟ زر نقد باید داد و باید گرفت"؛ (احکام ۱۷)

"اخر بریا برائے سلاطین وارباب دول مصاحبت تمام بد گویا است۔ الفتنۃ اشد من القتل۔ بطور ان الحیۃ ظاہرہا و سیم و باطنہ سم حال تمام است۔ کہ ظاہرش خوش آہنگ و باطنش سم قاتل۔ الحذر۔ الحذر"؛ (احکام ۶۰)

عالمگیر کا مذہب

اورنگ زیب عالمگیر کی مذہبی رواداری اور تعصب فن حرب کے ضمن میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اس کے مذہبی عقائد کا کافی ترجمان ہے۔ اس لئے اس موضوع پر علیحدہ بہت کم لکھنے کی ضرورت ہے۔

ستارہ کے قیدیوں کی نسبت علماء کے فتوے پر اس نے جو رائے ظاہر کی وہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے:-

"این مسئلہ بطور مذہب حنفیہ۔ باید بطور دیگر بر آمدہ کہ ضبط سلطنت از دست نرود۔ مذہب تحت شیعہ نیست کہ ہمیں یک رہ دیک درخت باشد الحمد للہ چہار مذہب برحق است و موافق عصر و وقت"؛ (احکام ۱)

اس عبارت کا ایک ایک لفظ غور و خوض کا مستحق ہے اور بلند آہنگی سے اس کے مذہب کو واضح کر رہا ہے۔ وہ سنی حنفی المذہب تھا لیکن صرف اس حد تک کہ عموماً امام ابو حنیفہؒ کے مسائل پر عمل کرتا تھا۔ مگر ساتھ ہی چاروں آئمہ کو اسلام میں داخل ہونے کیلئے چار دروازے تصور کرتا تھا۔ ہر امام کو ضرورت اور وقت کے لحاظ سے قابل اتباع مانتا تھا۔ محض ایک امام کی پیروی کرنا اور باقی تینوں کو نظر انداز کرنا اس کے نزدیک مذہب کو سخت اور مشکل بنانے کا مترادف تھا۔ بالفاظ دیگر وہ مقلد نہیں تھا۔

"برائے (صندوق) ہاے پارچہ سفینہ کہ گزی گویند کوشش نمایند و از شاہانہ ... دست مغنیاں و مولودی احتراز کنند"؛ (احکام ۸)

ایک گلدستہ!

(از بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کا ایک شعر)

مترجمہ: ظفر قریشی دہلوی

میرے پھول "شراب و عسل و شیر" کی مانند تھے!
میں نے انہیں ایک ریشمی فیتہ میں باندھ کر گلدستہ بنا لیا۔
لیکن وہ میری احتیاط اور نگرانی کے باوجود ہوا میں منتشر ہو گئے!
اور میرے پاس صرف خوشبو وار باقی رہ گئی!
میرے گیت "شراب و عسل و شیر" کی مانند تھے!
وہ میرے دل میں محو ترنم تھے مگر طائران آزاد کی طرح وہ یکساں اڑ گئے!
میرے لمحات فرصت کے بہترین ہمنشیں —— میرے رفیق!
انہیں کون روک سکتا تھا! —— وہ طائران آزاد کی طرح اڑ گئے۔
—— پر پھیلا کر ایک ساحل نامعلوم کی طرف، اور میرا دل خاموشی کیسا تھ دھڑکتا رہا جس طرح موجیں کسی پرسکون سمندر کے ساحل سے ٹکرایا کرتی ہیں
میں جس **جمال** کی محبت میں سرشار تھا۔
اس کے لب ایسے تھے جیسے شفق! آنکھیں ایسی کالی جیسے بھونرا!
میں نے اپنے دل کی ضربات کو قابو میں کیا مبادا کہ وہ ڈر جائے۔
لیکن وہ پھر بھی مجھے "پھولوں" اور "گیتوں" کی طرح تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔
—— سوگوار اور رنجیدہ!

—— ٭ ——

"جواہرات"

از جناب کنور لطافت علی صاحب طالب باغپتی

دل زخمی ہوکر ہی زندگی کا لطف حاصل کرتا ہے، آرام و آسائش اُسے پتھر بنا سکتے ہیں، دولت اُسے مطلق تباہ کرسکتی ہے لیکن رنج و آلام اُسے برباد نہیں کرسکتے۔

عورت تصویر ہے، مرد مبصر۔ اگر تم واقعی عورت کی نفسیات کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہو (جو ایک خطرناک جرأت ہے) تو صرف اُسے دیکھتے رہو اس کی باتوں پر توجہ نہ کرو۔

عورت ذہنیت پر مادیت کی فتح کی یادگار ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مرد اخلاقیات پر ذہنیت کی فتح کا مجسمہ۔

مرد عورت کے جذبات کے ساتھ اس طرح کھیلتا ہے جس طرح ایک ناسمجھ بچے کے ساتھ۔ وہ ہمیشہ اُس کی توقعات اپنی طول وطویل بے معنی گفتگو کے فریب سے اُبھار دیتا ہے لیکن اپنی توقعات اُس سے کہیں زیادہ قائم کرلیتا ہے جتنا زبان سے اظہار کرتا ہے۔

اکثر ہمارے بدترین گناہوں میں ہی ہماری زندگی کے بہترین کارنامے پنہاں ہوتے ہیں۔

انسان جب تک زندگی کی اہمیت اور اپنے فرائض سے آگاہ نہیں ہوتا اُسے وہ ہر چیز حاصل ہوتی ہے جسے اس کا دل چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے فرائض سے آگاہ ہوجاتا ہے اور زندگی کی ذمہ داریاں اُس پر عائد ہوچکی ہیں اس وقت وہ صرف اُن چیزوں کو حاصل کرسکتا ہے جن کی دوسروں کو ضرورت ہوتی ہے۔ معیار مسرت کی اس تبدیلی کو ہم محسوس نہیں کرتے پھر بھی یہ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ ماضی اُس کا زریں زمانہ تھا۔

یہ حقیقت بھی کتنی افسوسناک ہے کہ زندگی کے بعض فریب وہ اسرار ہم پر اُس وقت واضح ہوتے ہیں جب ہمارے مستقبل کیلئے اُن کا علم لاحاصل اور بیکار ہوجاتا ہے۔

آنسو عام عورتوں کے لئے مزید موجبِ تسکین ہیں لیکن ایک حسین عورت کے لئے وہ مکمل سامانِ تباہی ہیں۔

جسقدر ممکن ہوسکے انسان کو مسرت، رنگینی اور مدہوشی میں وقت گذارنا چاہئے زندگی کی تلخی اور قسمت کی ستم ظریفی کو جتنا بھلایا جاسکے اتنا ہی بہتر ہے۔

مرد زندگی کی حقیقت سے بہت قبل آگاہ ہوجاتا ہے لیکن عورت ہمیشہ اُس کی اہمیت کو دیر میں سمجھتی ہے۔ عورت اور مرد کے مابین یہی فرق ہے۔

ماضی کی وہ بہترین خصوصیت جس کی بناء پر ہم اُسے سراہا کرتے ہیں صرف یہ ہے کہ وہ دُنیا کے اسٹیج پر ہمارے ایک کھیلے ہوئے

تماشے کا نام ہے۔ لیکن عورت اس کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے تماشے کا اختتام کب ہوا اور پردہ کس وقت گرا وہ ایک اور چھٹے ایکٹ کی منتظر رہتی ہے اور جب بظاہر کھیل کی تمام دلچسپیاں ختم ہو چکی ہیں اُس کی فطرت سیر نہیں ہوتی اور وہ یہی چاہا کرتی ہے کہ اسے بدستور کھیلتے رہیں۔

مرد فطرتاً عورت کی پہلی محبت کا خواستگار رہتا ہے لیکن عورت کی فطرت عجیب ہے وہ ہمیشہ مرد کا آخری رومان بننا پسند کرتی ہے۔

[illegible] ہم بات کرتے ہیں ہماری مثال اُس عزیز ذی روح [illegible] کی انگلیوں کے اشارے پر کام کرتا ہے لیکن جب ہم تشریح کرتے ہیں اس وقت ہمیں صحیح طور پر شاعر کہا جا سکتا ہے

دنیا میں بدنامی کا دوسرا نام ہردلعزیزی ہے جس چیز کو زیادہ ہردلعزیزی حاصل ہوتی ہے اُس میں یقیناً کوئی نہ کوئی غلطی ہوتی ہے۔

شراب کی واقعی قیمت سمجھنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ تمام شیشہ کو پی کر دیکھا جائے۔ زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ کا مطالعہ ایک کتاب کی اچھائی یا بُرائی پر قطعی حکم لگانے کے لئے کافی ہے۔

کسی وارفتگی سے مکمل خلاصی کا صرف ایک یہی طریقہ ہے کہ بلا تامل اُس کے تاثرات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے اور اپنے مغلوب ہونے کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔

ہمارا سب سے بڑا جہل کتابی معلومات ہیں۔ جو کچھ ہم خود محسوس کرتے ہیں یا جو ہمارے ذاتی تجربات سے تعلق رکھتا ہے حقیقی علم وہی ہے۔

جو شخص ہماری بُرائیوں کو الم نشرح کرتا ہے ہم اُسے اپنا دشمن خیال کرتے ہیں اور کسی طرح گوارا نہیں کرتے کہ ہماری زندگی کے تاریک پہلو کو روزِ روشن میں لایا جائے اسی طرح خود ہمارا ضمیر ہمیں خود پسند بنا سکتا ہے۔

وہ شخص جو صرف اپنے ماضی پر نظر رکھتا ہے کسی طرح اس کا مستحق نہیں ہے کہ فطرت سے کسی بہتر مستقبل کی توقع رکھے۔

اضطراب یا عدم اطمینان ہی کسی فرد یا قوم کی ترقی کی پہلی علامت ہے۔

"ضمیر" اور "بزدلی" حقیقتاً ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "ضمیر" بزدلی کی ایک مہذب اصطلاح ہے۔

سرور و انبساط ہماری فطری حالتیں ہیں اور فطرت کی طرف سے ہمارا ایک عجیب امتحان۔ اس لئے کہ جب ہم مسرور ہوتے ہیں ہم ہمیشہ نیکی کی طرف رجوع ہوتے ہیں لیکن جب نیکی کرتے ہیں تو ہمیشہ مسرور نہیں ہوتے۔

دنیا جسے "گناہ" کہتی ہے وہ شاہراہِ ترقی کی ایک ضروری منزل ہے اور قفلِ کامیابی کی زرین کنجی۔ بلا اس ضروری عنصر کے دنیا فرسودہ، بے رنگ اور ناقابلِ برداشت رہتی۔

کسی سے محبت کرنا حقیقتاً خود سے محبت کرنا ہے اور خود سے محبت کرنا عمر بھر کے لئے ایک رومان کی ابتدا کرنا ہے

تجربہ اُس پشیمانی کا نام ہے جو ہمیں غلطیوں کے بعد اُٹھانی پڑتی ہے۔

اپنی باتوں سے دوسروں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دینا آسان ہے لیکن خود میں انقلاب پیدا کرنا سخت مشکل۔

کام وہی کرنے کے قابل ہے جسے دنیا ناممکن سمجھتی ہو۔

زندگی مصائب و آلام کا دوسرا نام ہے یہی راز ہے جو ہر شے کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔

ایسا ارادہ جس میں کوئی خطرہ نہ ہو ارادہ کیے جانے کا مستحق نہیں۔

جہل ایک خوشبودار، نازک اور خودرو پھول کی مانند ہے۔ علم کی مادی شعاعیں مس ہونے کے بعد اس کی قدرتی خوشبو کافور ہو جاتی ہے۔

دنیا صرف دو ٹریجیڈی پر منقسم ہے اور اُنہیں کی بنا پر اُسے دارالمحن کہا گیا ہے۔ ایک تو یہ ٹریجیڈی کہ انسان جس چیز کو چاہتا ہے اُسے حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسری یہ کہ وہ اُسے حاصل کر لیتا ہے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں رنج یا پشیمانی ہے۔

دنیا میں اگر ہمدردی کا عنصر کم ہوتا تو مصائب بھی یقیناً کم ہوتیں۔

دنیا میں دو قسم کے انسان پائے جاتے ہیں۔ خوش مزاج اور بدمزاج۔ خوش مزاج انسان زندگی کی قدر کرتا ہے لیکن اُس کی قیمت نہیں سمجھتا۔ بدمزاج قیمت جانتا ہے مگر قدر نہیں کر سکتا۔

"پاکبازی" اخلاق کی ایک ایسی صفت ہے جس کا اظہار ہم صرف اُن لوگوں پر کرتے ہیں جنہیں حقیقتاً ہم پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔

کسی شخص کے ماضی کا اندازہ اس کی موجودہ حالت سے لگانا یہی ایک طریقہ ہے جس سے صحیح طور پر انسان کی تنقید کی جا سکتی ہے۔

کسی شخص کے ساتھ رواداری برتنا اکثر مصائب کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ رواداری سے خلوص کی ابتدا ہوتی ہے اور خلوص سے محبت کی۔ محبت بذاتِ خود مصائب کی ایک حسین صورت ہے۔

"حقیقت" کیا ہے؟ —— مذہبی معاملات میں اُس رائے کا نام ہے جو بحث و تمحیص، اعتراض و جوابات کے بعد بھی قابلِ تسلیم رہ گئی ہے۔ سائنس میں اُس احساس کا نام ہے جو انتہا پر پہنچ کر ضمیر کو منفعل کرتا ہے۔ آرٹ میں اُس حالت کا نام ہے جو ایک شخص کے آخری خیالات کی آئینہ ہوتی ہے۔

علم یقیناً ایک نعمت ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ حقیقی علم پڑھایا نہیں جا سکتا۔ وہ باتیں جو واقعی معلوم کئے جانے کے قابل ہیں کتابوں میں نہیں ہیں۔

(آسکر وائلڈ) طالب باغپتی

مفتاح العلوم
شرح
مثنوی مولانا روم

ی کے ادیب اوّل حضرت مولانا رُوم کی معرکتہ الآرا کتاب مثنوی مولانا رُوم سے شاید ہی کوئی
ا پڑھا انسان ہوگا جو واقف نہ ہو۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جسے فارسی زبان کا قرآن کہا جاتا ہے
ی ادب کے لحاظ سے تمام کتابوں پر ممتاز شریعت و طریقت کے بیان کرنے میں دوسری تمام
وں پر فائق فارسی علم ادب کے شائق اسے پڑھ کر زبان فارسی پر عبور حاصل کرتے ہیں۔ صوفی لوگ
ں کی صوفیانہ کلام سے فیض اٹھاتے ہیں۔ عالم اور واعظ اس کے اشعار کو پڑھ پڑھ کر مجالس
ظ کو گرم کرتے ہیں۔ مضمون نگار بھی اس کتاب کے اشعار کو اپنے مضامین کی دلچسپی بڑھانے کے
ے استعمال کرتے ہیں غرضیکہ
وہ کتاب ہے کہ مسلمانوں
۔ علاوہ ہر مذہب و ملت
۔ آدمی اسے پڑھنے کا شوق
کھتے ہیں۔ لیکن ایسی اعلیٰ
ر و منزلت کی کتاب کی
رح کو ہم نے بزبان اردو
ری زرکثیر سے شائع کیا ہے

آنریبل خان بہادر سر چودھری شہاب الدین صاحب
پریزیڈنٹ پنجاب کونسل نے
اس کتاب کو دفتر قریشی بک ایجنسی لاہور میں
خود تشریف لاکر خرید فرمایا۔ اور اسے نہایت ہی پسند کیا

س میں مثنوی کا شعر جلی قلم سے نہایت خوشخط اعراب دے کر لکھا گیا ہے پھر مشکل
لفاظ کی لغت اور صرفی نحوی ترکیب درج کر کے ایسی طرز سے سلیس اردو میں ترجمہ
لیا ہے۔ جو تحت لفظی بھی ہے۔ اور بامحاورہ بھی۔ اس کے بعد شعر کا مطلب قرآن و
حدیث و اقوال آئمہ کے حوالہ سے نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہندوستان
کے اخبارات اور بزرگان قوم کا اس شرح کے متعلق متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ یہ شرح
قدیم و جدید کی تمام شروحات سے اعلیٰ اور بہترین ہے۔

قیمت حصہ اول عاہ حصہ دوم عاہ حصہ سوم عاہ حصہ چہارم عاہ مجلد فی حصہ ... سوا تین روپے۔ حصہ اول و دوم یکجا مجلد چھ روپے حصہ سوم و چہارم یکجا مجلد چھ روپے
چاروں حصوں کے خریدار کو سوانح مولانا روم از مولانا شبلی مفت دی جائیگی محصول ڈاک بذمہ خریدار۔

وعدہ کتاب اگر اشتہار کے مطابق نہ ہو تو واپس بھیج کر قیمت منگالیں

محمد حفیظ اللہ قریشی تاجر کتب مالک قریشی بک ایجنسی لاہور

... کی خوشخطی میں علمی کتابوں کا

رعایتی اعلان

تصنیفات مولانا اشرف علی صاحب		
بہشتی زیور کامل ۱۱ حصہ	ۓ	عہ
مناجات مقبول	۸ر	۴ر
اعمال قرآن کامل	۸ر	۴ر
تصنیفات امام غزالی		
اکسیر ہدایت اردو	للعہ	عاہ
میزان عمل	عہ	عہ
بدایت الہدایت	۱۲ر	۱۰ر
قسطاس المستقیم	۱۰ر	۵ر
رسالہ علم لدنی	۳ر	۲ر
مجربات غزالی	عاہ	عہ
مکتوبات غزالی	عہ	عہ
مطبوعات قریشی بک ایجنسی		
تعلیم النسا کا قاعدہ	۱ر	۸ر
تعلیم النسا کی پہلی کتاب	۳ر	۲ر
،، دوسری	۶ر	۴ر
،، تیسری	۹ر	۶ر
،، چوتھی	۱۲ر	۹ر
،، پانچویں	۱۵ر	۱۰ر
،، چھٹی	عہ	۱۴ر
خلافت صدیقی	۵ر	۲ر
خلافت فاروقی	۵ر	۲ر
خلافت عثمانی	۵ر	۲ر
خلافت حیدری	۵ر	۲ر
فارسی بول چال	عہ	۱۰ر
انیس الذاکرین کامل	۱۰ر	۵ر
قواعد الصرف	۱۰ر	۸ر
قواعد النحو	۱۰ر	۸ر
احکام الاسلام	۵ر	۲ر

نور القلوب	۱۲ر	۶ر
تاریخ سلاطین آل عثمان	عہ	عہ
جنگ طرابلس	۸ر	۴ر
حیات صلاح الدین	۵ر	عہ
شہادت حسین	۴ر	۳ر
سوانح نبی کریم	۱۲ر	۱۰ر
باورچی خانہ	۶ر	۳ر
تاج خطوط نویسی	۵ر	۴ر
زنانہ اسلامی گیت	۵ر	۲ر
مجموعہ تصوف	ۓ	عاہ
تاریخ مدینہ منورہ	عہ	۱۰ر
تاریخ مکہ معظمہ	عہ	۱۰ر
تعبیر نامہ خواب صدیقی	عہ	عہ
مجموعہ فالنامہ صدیقی	۸ر	۶ر
کشمیری کوک شاستر	عہ	عہ
سیر پرند	عاہ	عہ
سوانح عمریاں اور تذکرے		
قصص الانبیا کلاں	عاہ	عہ
تذکرۃ الاولیا اردو	عاہ	عہ
تذکرہ اولیائے ہند	للعہ	ۓ
تذکرۃ الاکرام	ۓ	عاہ
سوانح رسول مقبول	عہ	۱۲ر
سیرت حضرت عائشہ	عاہ	عاہ
سیرت حضرت امام حسین	عاہ	عہ
سیرت حضرت غوث الاعظم	ۓ	عاہ
سیرت حضرت فاطمہ	عاہ	عاہ
سیرت امام ربانی	عاہ	عاہ
سیرت خواجہ معین الدین	۶ر	۴ر
سوانح غوث الاعظم	۶ر	۴ر

غازی مصطفیٰ کمال	۱۲ر	۶ر
خالدہ خانم	۱۲ر	۶ر
سیرت حضرت خدیجہ	عہ	۱۴ر
سیرت حضرت بلال	عہ	۱۴ر
خالد بن ولید	عہ	۱۲ر
حالات شمس تبریز	۶ر	۵ر
بستان حرم	۸ر	۶ر
ابراہیم ادہم	۴ر	۳ر
محمد بن قاسم	۴ر	۳ر
الہارون	عاہ	عہ
حسین بیتی	۸ر	۶ر
صحابیات	عاہ	عہ
سیرۃ الصحابہ	ھ	عہ
سیرۃ الحبیب	عہ	۱۲ر
تاریخی کتابیں		
تاریخ اسلام مولوی سید امیر علی	ۓ	عاہ
تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں	معہ	ۓ
تاریخ خلفائے عرب و اسلام	ۓ	عہ
تاریخ اسپین	عہ	عہ
بیگمات تیموریہ	عاہ	عہ
تاریخ الخلفا اردو	عاہ	عاہ
تاریخ افغانستان	عہ	عہ
افغانستان جدید	عہ	عہ
کابل میں چار بادشاہ	عاہ	عہ
بچہ سقہ کا خاتمہ	عہ	۴ر
کرنل لارنس مجلد	عہ	ھ
تاریخ عرب قدیم	۸ر	۶ر
الف لیلہ کلاں	عاہ	عہ
داستان امیر حمزہ کامل	عاہ	ھ

منگانے کا پتہ:۔ **منیجر قریشی بک ایجنسی (ع) لاہور**

آوارۂ صحرا

ایک انگلش لیڈی کی سیاحانہ سرگذشت

مترجمہ محمد عبداللہ صاحب قریشی

میرے [illegible] چند دن بعد قبیلہ سنوعلہ نے اپنے خیمے اکھاڑ لئے اور صحرائے حابد کی جانب کوچ کر دیا۔ سلطان نے مجھے اپنے ہمرکاب چلنے کی دعوت [illegible] اور تمام قافلہ میں حکم نافذ کر دیا کہ جہانتک ہو میری خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے۔ میری کسی فرمائش کی تعمیل میں تامل نہ ہونے پائے۔ میرا ہر حکم اس کا (سلطان) حکم سمجھا جائے۔ اور اگر دیکھا جائے تو یہ بھی سلطان کی مہمان نوازی اور عالی منشی تھی۔ ورنہ اس قسم کے احکام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بدو میرا ویسے ہی بحد احترام کرتے تھے۔ انہیں میری خاطر مدارات میں کبھی بھی عذر نہ تھا۔ ان کی مہربانیوں کا کہاں تک بیان کروں؟ میں ان کے ساتھ رہنے سہنے سے بہت خوش تھی۔ جیسا لطف مجھے ان میں حاصل ہوا۔ اس سے پہلے کبھی میسر نہ آیا تھا۔ مجھے ان کی زندگی کا ہر پہلو کچھ عجیب حیرت انگیز سا معلوم ہوتا تھا۔ جس میں دلچسپی اور انتہائی کشش پائی جاتی تھی۔ میرا دل محسوس کرتا تھا کہ شاید کسی گذرے ہوئے زمانہ میں میری زندگی ان کی آزادانہ زندگی سے وابستہ کی جا چکی ہے ؎

دُنیا کی کوئی چیز ان کی خاموش نقل و حرکت اور ان کی معزز زندگی کو منغض نہیں کر سکتی۔ ان میں رہنے سہنے سے میرا دل ہر روز پہلے سے زیادہ راحت محسوس کرتا تھا۔ میری آنکھیں روز بروز پُرنور ہو رہی تھیں۔ میرا قلب یوماً فیوماً مسرور ہوتا جاتا تھا۔ یہانتک کہ تھوڑے ہی عرصہ میں میری تمام حرکات و سکنات ان کی ہی طرح سنجیدہ اور متین ہو گئیں۔ ان کی زندگی کس قدر سادہ ہے؟ وہ کیسے پاک باطن لوگ ہیں! جس طرح اُن کے بھولے بھالے چہروں پر شجاعت برستی ہے۔ جیسی ان کی وجیہ صورتیں ہیں۔ ویسا ہی ان کا ہر فعل بھی ہے۔ اور ان کے عقائد تو بالکل معصوم بچوں کے سے ہیں ؎

یہ صحرا نشین بدوی جنہیں وحشی کہا جاتا ہے۔ مصری یا مراکشی عربوں کی طرح نہیں۔ جن میں دُنیا جہان کی اخلاقی خرابیاں اور تہذیب کی تمام برائیاں جمع ہو گئی ہیں۔ جن کی رگ رگ میں مکر و فریب اور ظلم و تشدد کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے ان کا اخلاص اور راستبازی قابل تعریف ہے۔ ان کے یہاں دروغگوئی کی سزا اونٹ چرانے سے زیادہ دی جاتی ہے۔ اور ایک بات سے تو مجھے بڑا ہی تعجب ہوا۔ وہ یہ کہ مذہبی اعتبار سے نہ تو میں نے انہیں سخت متعصب پایا نہ پکا دیندار۔ میرے خیال میں وہ کسی خاص خدا پر نہیں بلکہ فطرت اور اچھے اعمال پر تہ دل سے ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان کی مذہبی عظمت کا معیار بھی نہایت اعلیٰ و ارفع ہے ؎

صحرا کا سفر کرنے کے لئے میں نے سلطان سے چودہ چودہ پونڈ میں تین سدھی ہوئی سانڈنیاں خریدی تھیں۔ یہ ایک معقول رقم تھی۔ اس لحاظ سے کہ اس سے پیشتر میں بارہ پونڈ میں باربرداری کا ایک اُونٹ مول لے چکی تھی۔ سلطان نے مجھے ان سانڈنیوں کا نہایت فخر سے نسب نامہ دکھایا۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ واقعی اس نے مجھ کو اچھے کھیت کی سانڈنیاں دینے میں خاص توجہ سے کام لیا تھا۔ علاوہ ازیں کمال مہربانی سے ریشمی رسے اور سانڈنیوں کے گلوں میں ڈالنے کی سنہری رُوپہلی گھنٹیاں بطور تحفہ مجھے عطا کیں۔ اب اور تو سارا ساز و سامان درست ہو چکا تھا۔ صرف زین کاٹھیوں کی ضرورت رہ گئی تھی۔ ان کے متعلق بھی قبیلہ کے شیخ نے دو دن میں مہیا کر دینے کا وعدہ کیا تھا ؎

نقاروں کی آواز نے علی الصباح ہی جگا دیا۔ آنکھ کھلتے ہی میں سمجھ گئی کہ یہ قافلہ کی روانگی کا اعلان ہے۔ کیونکہ پہلے ہی سے سلطان

نے ڈیرا اٹھانے کے لئے یہ دن مقرر رکھا تھا - میں فوراً نہایت عجلت سے اٹھی بست پٹ کپڑے پہن قافلہ کی تیاری کا تماشہ دیکھنے خیمہ سے نکل کر باہر آ کھڑی ہوئی ؛

عجیب نظارہ تھا - عورتیں ڈیرے تنبو اکھاڑ کر باربرداری کے لئے لپیٹ چکی تھیں - کارواں کے اونٹ جو تقریباً چار ہزار سے کچھ اوپر ہی ہوں گے پانچ قطاروں میں کھڑے کئے گئے تھے - جن پر لڑکوں کی نگرانی تھی - مرد جلد جلد اونٹوں پر سامان لادنے میں مشغول تھے - عورتیں بچے سنبھالتے اور ہر چیز کو قرینہ سے لگانے میں مصروف تھیں انھیں اونٹوں پر چڑھنے اترنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی - بڑی آسانی سے اپنا بوجھ سنبھال سکتی ہیں - وہ اس بے تکلفی سے نقل و حرکت کر رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا اپنے گھروں میں پھر رہی ہیں ؛

آناً فاناً کوچ کا سامان درست ہو گیا - وہی مقام جہاں کچھ دیر پہلے خیموں کا شہر آباد تھا - اب اجاڑ بیابان نظر آنے لگا - یہ معاملہ کارروائی اس قدر سرعت سے انجام پائی کہ اس ساز و سامان اور اونٹوں کی تعداد کا لحاظ کرتے ہوئے ناممکن سی معلوم ہوتی ہے - سلطان کی مرضی تھی کہ میں اس کے ہمرکاب زین سواری پر سب سے آگے آگے چلوں - مگر مجھے چونکہ کوچ کا پُر لطف اور شاندار نظارہ دیکھنے کی آرزو تھی - اس لئے میں نے نہایت ادب سے پیچھے رہنے کی التجا کی ؛

اب ایک نہایت دلکش منظر میرے سامنے تھا - سب کے آگے اونٹوں کی بڑی بڑی قطاریں تھیں - جن کی نکیلیں مرد اور چست و چالاک بچے مستعدی سے تھامے ہوئے تھے - اس کے بعد باربرداری کے اونٹ تھے - جن پر خیمے - قناتیں - اشیاء خورد و نوش اور پانی کی بڑی بڑی پکھالیں بار تھیں - اُن ہی پر چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے ہوئے تھے - اور جلو میں پاپیادہ عورتیں جا رہی تھیں - وہ ننگے پاؤں تھیں اور برہنہ پائی نے ان کی رفتار میں ایک رعنائی اور لچک پیدا کر دی تھی - وہ اپنی صحرائی زبان میں کچھ گیت گاتی جاتی تھیں - جن کے پُر جوش اشعار سحر سامری کا اثر رکھتے تھے - ان کے نغموں سے فضا معمور تھی - اُن کی مدھ بھری اور مترنم آواز سے لحن داؤدی کا لطف آ رہا تھا - اُن کی پُر کیف خوش الحانی سے روح کو سرمدی سرور حاصل ہوتا تھا - اور کچھ ایسی بیخودی طاری تھی کہ میں اپنی گزشتہ زندگی کی تمام آسائشوں کو بھول گئی - اور لطیف محویت کے عالم میں بائیبل کی وہ آیات میرے پیش نظر ہو گئیں جن میں بنی اسرائیل کا ذکر آتا ہے - جبکہ وہ لق و دق صحرا میں حیران و سرگرداں پھر رہے تھے - حضرت ابراہیم کے زمانہ کی یاد میرے دل میں تازہ ہو گئی - اور کچھ دیر کے لئے میں اپنے آپ کو اسی عہد میں سمجھنے لگی ؛

دیکھتے ہی دیکھتے قافلہ کہیں کا کہیں جا نکلا - لیکن ہم نے بہت جلد اسے ملا لیا - اسی طرح دن بھر سفر جاری رہا - اثنائے راہ میں صرف دو گھنٹہ کے لئے ہم ذرا دم لینے اور کھانے پینے کی غرض سے ایک جگہ ٹھہرے ہم نے اپنے گھوڑوں کے ساتھ کھانے پینے کا اتنا کافی و وافی سامان لے لیا تھا کہ کارواں سے دور دور تک علیحدہ رہ کر بھی ہمیں کسی چیز کی احتیاج نہ ہو سکتی تھی - رات کے وقت ہم اپنی عبائیں اوڑھ لپیٹ کر کھلے میدان میں آسمان کے لاجوردی شامیانے تلے سو رہتے تھے ؛

میں اپنے گھوڑوں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتی - وہ دن بھر دوڑ دھوپ کرتے تھے - مگر کیا مجال جو کسی قسم کی تکان ان کے پاس پھٹکے - پھر لطف یہ کہ دوسرے دن از سرِ نو پہلے ہی کی طرح بالکل تازہ دم ہوتے تھے ؛

راہ چلتے کتنی ہی جگہ ہمیں ہرن اور خرگوش ملے - ان میں سے چند ہم نے شکار کئے - اور اپنے ساتھ لے لئے ؛

اس طرح سیر و تفریح کرتے ہم کارواں سے اتنی دور نکل گئے کہ وہ ہم سے ایک دن کی مسافت پر پیچھے رہ گیا - اب ہم صحرائے حماد کے شمالی ڈانڈے پر وادی فرات سے گذر رہے تھے - یہاں سے وادی مجسّر بھی قریب ہی تھی - یہاں پہنچ کر ہمیں اپنے قافلہ کا انتظار کرنا تھا ؛

آفتاب لب بام تھا کہ ہمارا کارواں منزلِ مقصود پر آ پہنچا - اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے تمام چھوٹے چھوٹے گھر دوبارہ تعمیر ہو گئے - سینکڑوں چولھے تھے جو خیمہ گاہ کو بقعۂ نور بنا رہے تھے - مگر ہم ایک دن اور ایک رات سے زیادہ وہاں قیام نہ کر سکتے تھے - کیونکہ نہ تو وہاں کافی پانی ہی موجود تھا اور نہ ہی اونٹوں کے لئے خوراک !

پڑاؤ ہمیشہ ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا جاتا تھا - شروع میں سلطان کا خیمہ جو سب سے الگ تھلگ نصب کیا جاتا تھا - اس کے بعد بڑے بڑے مشائخ کے خیمے ایستادہ کئے جاتے تھے - یہ بھی ایک دوسرے سے

کچھ فاصلہ پر ہوتے تھے۔ ان کے بعد دو لمبی قطاریں عام رعایا کی ہوتی تھیں۔ انھیں عادنار کہتے ہیں۔ یہ عادنار پندرہ یا بیس خانوادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو عام طور پر ایک دوسرے کے قرابت دار ہوتے ہیں۔ ان کے خیموں کی قطاریں دُور تک ایک دوسری کے متوازی چلی جاتی ہیں۔ ہر خیمہ کے بعد تیس تیس فٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ یہ تمام خیمے ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ زردی مائل خاکی ہوتا ہے۔ یہ اونٹ کی اون سے بُنے جاتے ہیں۔ ایک بڑا سا لٹھ ہوتا ہے جو درمیان سے انھیں اٹھائے رکھتا ہے۔ اور وہ مضبوط رسّوں سے جکڑ دئے جاتے ہیں۔ بعض بعض خیمے دو حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ ان کی حد بندی چھوٹے چھوٹے بانسوں سے کی جاتی ہے۔ ایک حصہ میں تو خاندان کے بڑے میاں بیوی رہتے ہیں۔ دوسرے حصہ میں قبیلہ کے باقی آدمی آرام کرتے ہیں۔ یہ خیمے عرض و طول میں چھ اور دس گز سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی مشائخ کے خیموں کی مانند نفیس وعمدہ! ان کا اندرونی حصہ اتنا سادہ ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن ہی نہیں۔ ایک یا دو چٹائیاں۔ ایک لکڑی کا صندوق جس پر نہایت چمکدار روغن پھرا ہوتا ہے۔ بعض بعض صورتوں میں ایک ٹوٹا پھوٹا آئینہ۔ ایک چھوٹی سی قنات۔ یہ پردہ کا کام دیتی ہے۔ جس کی اوٹ میں علی الصباح حوائج ضروری سے فراغت پائی جاتی ہے۔ ایک سِل بٹہ جس پر جَو پیسے جاتے ہیں۔ بکریوں کی چند کھالیں۔ پانچ یا چھ کاٹھ کے پیالے۔ ایک رائفل۔ کچھ خنجر۔ اور غالباً کسی کونے میں ایک مرغی اور اس کے بچے۔ بس یہی ان خیموں کی کُل کائنات ہوتی ہے۔

ہر عادنار ایک خیمہ علیحدہ رکھتا ہے۔ جس میں معلم رہتا ہے۔ اُسے اپنے کام کا معاوضہ چاول۔ مرغی اور قہوہ کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ جتنا عرصہ ہم خیمہ زن رہتے تو عمر بدو ہر صبح اپنے خیمہ میں جمع ہو کر قرآن کی تلاوت کرتے۔ وہ ہر روز ایک ہی سبق کو بار بار دہراتے۔ لیکن جونہی وہ بڑے ہو کر اس قابل ہو جاتے کہ بکریوں اور اونٹوں کی نگہبانی کر سکیں وہ درسگاہ کا نام بھی نہ لیتے۔ اور جو کچھ تھوڑا بہت حاصل کیا تھا اسے حرفِ غلط کی طرح لوحِ دل سے مٹا دیتے۔

طلوعِ آفتاب کے وقت عادنار میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی۔ عورتیں بکریوں اور اونٹوں کا دودھ دُوھ کر لاتیں۔ اس کے بعد مکھن نکالتیں اور جو تُرش سا دُودھ باقی بچ رہتا اس سے ناشتہ تیار کرتیں۔ اسی اثنا میں مرد روٹیاں پکا لیتے۔ اور فقط یہی ایک کام ہے جو وہ عملی طور پر انجام دیتے ہیں۔ باقی سارا سارا دن ایک دُوسرے کے خیمہ میں بیٹھ کر حقّہ پینے۔ گپیں ہانکنے اور قہوہ نوشی میں ضائع کرتے ہیں۔ نوعمر لڑکے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس عورتیں ہر وقت کام میں مشغول رہتی ہیں۔ وہ پہننے کے لئے کپڑا بُنتی ہیں۔ خیمے بنانے کے لئے سُوت کاتتی ہیں۔ پانی تلاش کر کے لاتی ہیں۔ اور اس سے شام کا کھانا تیار کرتی ہیں۔ ان کی عام خوراک دلیا ہے۔ وہ اسے قرقر کہتے ہیں۔ اس کے تیار کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ گندم کو اُبال کر اس میں بری بڑی پھلیاں۔ پیاز اور ایک قسم کا خربوزہ ملا دیا جاتا ہے۔ اور پھر ان سب میں بے اندازہ چربی ڈال دی جاتی ہے۔

سُورج کے ڈھلتے ہی وہ کھانا کھا لیتے۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے خیمہ کے اندر خاصہ تناول کرتا۔ کئی تو کھانے سے فارغ ہوتے ہی لمبی تان کر سو جاتے۔ کچھ آدمی سلطان کے خیمہ کے آگے حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے اور کئی ایک دوسرے عادنار میں چلے جاتے۔ جہاں وہ آگ کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے۔ کہانیاں کہتے اور حقّہ پیتے۔ مگر اکثر عادنار کھانے سے فارغ ہوتے ہی بالکل خاموش ہو جاتے۔ فقط ایک مدھم سی روشنی خیمہ کے باہر رہ جاتی۔ تاکہ شیطانی روحیں اُن کے قریب آنے پائیں۔

فقط ایک روز آرام کرنے کے بعد ہمیں یہاں سے کوچ کا سامان کرنا پڑا۔ کیونکہ وہاں اُونٹوں کے لئے اتنی خوراک اور اتنا پانی نہیں تھا۔ کہ زیادہ دیر تک قیام کیا جا سکتا۔ صحرائے لبیط کے مختلف حصّوں میں ہر صبح بیدار ہونے سے خاص خوشی حاصل ہوتی تھی۔ خیمہ چھوڑ کر قدرتی روشنی اور کھلی فضا میں غسل کرنے اور اُسی ہوا میں سانس لینے سے جو بالکل شراب کی سی تھی انسان اپنے آپ کو جوان اور طاقتور محسوس کرنے لگتا تھا۔ آنکھیں دیکھنے میں محو تھیں۔ رُوح وجد کرتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آخر کار میں اس حقیقی منزل پر پہنچ گئی ہوں جس کی تمنا میں اپنی گذشتہ زندگی میں کیا کرتی تھی۔

آہ! وہ شام کی کیف انگیزیاں اور وہ غروبِ آفتاب کے طلسمی

مناظر ——— کیا کہوں کہ وہ کیسے دلکش تھے - ہمارے لئے تو وہ بالکل ہی عجیب و غریب تھے - کیونکہ اس سے پیشتر ایسی چیزوں سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا - جب شفق پھولتی تھی اور سورج کی سنہری کرنیں بالو کے صاف و شفاف ذرّوں سے شرر افشانی کرتی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صحرائے لبیط پر ہُن برس رہا ہے - ہمارا خیمہ سونے کے پانی میں ڈھلا ہوا اور اونٹ سنہری جھول میں ملبوس نظر آنے لگتے - ان کے سروں پر سونا ان کی گردنوں میں سونا اور ان کے پاؤں سونے میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے - سیاہ آنکھوں والے عرب لڑکوں کے گھونگھر والے بال بھی سنہرے رنگ میں رنگے جاتے - میری ننھی سانڈنی کا بھی یہی حال تھا - جو میرے خیمے کے باہر کلیلیں کیا کرتی تھی - یہ خوبصورت سانڈنی آہستہ آہستہ اپنی رعنائی و زیبائی کھو رہی تھی - اپنی دلکشی ضائع کر رہی تھی - اور اس کے سفید ملائم بال اپنی ہیئت تبدیل کرتے جاتے تھے - وہ عمر میں بڑھ رہی تھی - اور دن بدن اپنی ماں سے مشابہ ہوتی جاتی تھی - لیکن اس کی آنکھوں میں ابھی تک وہ چمک دمک باقی تھی جس سے معصومیت ٹپکتی تھی - وہ کچھ عرصہ سے بالکل آزاد ہو رہی تھی - وہ نہ تو زیادہ دیر اپنی ماں کے پاس ٹھہرتی تھی اور نہ ہی میرے خیمے کے قریب کھیلتی تھی - بلکہ اونٹوں کے بڑے بڑے غولوں میں شامل ہو کر چرتی چُگتی پھرتی تھی - اور اپنی مرضی سے جدھر چاہتی چلی جاتی تھی - تھوڑے دنوں میں وہ بالکل اُن جیسی ہو جائے گی - الوداع اے ننھی سانڈنی الوداع! ؛

ہم جنوب مغرب کی جانب چھوٹے چھوٹے سفر کرتے ہوئے الوآپیان کے صحرا میں داخل ہوئے - آخری چند یوم میں ہم ایک نہایت ہی بھیانک صحرا عبور کر رہے تھے - یہاں بڑی بڑی سیاہ چمکدار چٹانیں اور ہر جگہ پتھر ہی پتھر تھے - میں انہیں آتش فشاں سمجھتی تھی مگر سلطان نے مجھے بتایا کہ یہ ریت کے ٹیلے ہیں جو تمازت آفتاب سے سیاہ پڑ گئے ہیں - اس کے بعد دفعتاً یہ سیاہ ریگستان سفید پتھروں والے علاقہ میں تبدیل ہو گیا - یہاں کسی قسم کی پیداوار نہیں ہوتی - بلکہ جس طرح پہلے تمام زمین سیاہ چمکدار پتھروں سے ڈھکی ہوئی تھی اسی طرح اب کروڑوں سفید پتھروں سے اٹی ہوئی تھی - اس سے آب دگیاہ علاقہ نے اپنی تمام ویرانیوں اور بے شمار چٹانوں اور پتھروں سے جو ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے میرے دل پر خاص اثر کیا - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی وقت میں یہاں پتھروں کی بارش ہو چکی ہے - اگرچہ ان دُور اُفتادہ اور خدا کی درگاہ سے رَدکی ہوئی چیزوں کی کوئی حقیقت نہ تھی - تاہم بدوؤں نے ہر چھوٹی سی چھوٹی پہاڑی کو جو راستہ میں پڑتی تھی خاص خاص نام دے رکھے تھے - کیونکہ جس طرح ستارے رات کے وقت بھولے بسرے مسافروں کی راہنمائی کرتے ہیں اسی طرح یہ چیزیں بھی اُن کے دشوار گذار سفر میں سہولتیں پیدا کرتی ہیں ؛

ہم دو چھوٹی چھوٹی وادیوں سے گذرے - ان میں ایک وادی القریع تھی - اور دُوسری ہبندرہ - یہاں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی وقت میں زمین کو پیداوار کے قابل بنانے کی کوشش کی جا چکی ہے - کہیں کہیں چند درخت تھے - جو ببول سے ملتے جلتے تھے - وہ بہت پُرانے معلوم ہوتے تھے - کچھ کانٹے دار جھاڑیاں بھی تھیں - ہمیں توقع تھی کہ یہاں صحرائی خرگوش بھی ملیں گے - مگر جانوروں میں سے جو چیز ہمیں نظر آئی وہ صرف صحرائی چوہے تھے ؛

اس رات ہمارے قیام کے دوران میں تقریباً بیس گھوڑے اپنی منزل سے بھاگ کر صحرا میں گم ہو گئے - اس سے بڑی پریشانی ہوئی - ڈاکو کا خیال قدرتی طور پر ہمارے دماغ میں چکر لگانے لگا - تمام اطراف و اکناف میں آدمی دوڑا دیئے گئے - اور گو زمین کی سطح سخت اور پتھریلی تھی جس پر گھوڑوں کے سُموں کا کوئی نشان نہ تھا تاہم وہ انہیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے - اور اپنے ساتھ واپس لے آئے - وہاں کوئی ڈاکو یا قزاق نہ تھا - گھوڑے خود بخود صحرا میں نکل گئے تھے - تاکہ تھوڑی دیر آزادی کا لطف اُٹھا سکیں - جب آدمی انہیں تلاش کر رہے تھے تو سلطان نے فال کھلوائی کہ آیا گھوڑے واپس آ جائیں گے یا نہیں - وہ بچوں کی مانند بالکل وہمی تھے - وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پیشتر ہر ممکن موقع پر فال دیکھا کرتے تھے - اس کا طریقہ نہایت آسان تھا - مشائخ جمع ہو کر ایک حلقہ بناتے - سلطان اس حلقہ میں داخل ہو جاتا - ان میں کا ہر ایک آدمی چند کنکر اٹھاتا جنہیں سلطان اکٹھا کر لیتا - اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے انہیں ہوا میں پھینکتا - مشائخ بلند آواز سے انہیں گنتے جاتے

اگر آخری تعداد طاق ہوتی تو وہ اپنے آپ کو صاحب قسمت سمجھتے اور اگر جفت نکلتی تو بد قسمت! شکار کرنے سے پیشتر اور اس بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے کہ کونسے کنوئیں کی سیر کرنی چاہئیے۔ غرضیکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے موقع پر فال پہلے لے لی جاتی تھی۔

ہنفر یٹ علاقہ کے کئی میل چلنے کے بعد اب ہم متھارا کے کنوئیں پر پہنچے۔ اور ہمارے خیمے چاروں طرف نصب کئے گئے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ یہاں کے کنوئیں کا پانی بہت مقوی اور کئی دکھوں کا علاج ہے۔ مگر اس کا رنگ بالکل سُرخ اور اس کا ذائقہ اور بُو بالکل گندھک جیسی تھی۔ کنوؤں کے گرداگرد بیسیوں سینکڑوں قبریں نظر آئیں۔ میں نے سلطان سے دریافت کیا کہ ان کا مطلب کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ غالباً کوئی چھوٹا سا کارواں صحرائی ڈاکوؤں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکا ہے۔ کیونکہ یہاں بدوؤں کے کئی گروہ ایسے بھی ہیں جو کسی قبیلہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ اور جن کا پیشہ فقط لوٹ مار ہے۔ وہ اکثر ایسے ایسے کنوؤں کے گرد و پیش منڈلاتے رہتے ہیں اور جہاں کوئی اکیلا دکیلا مسافر دیکھ پاتے ہیں وہیں اسے مار کر اس کا تمام مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ زیادہ عرصہ قیام کرنے میں کنوؤں سے زیادہ خطرناک کوئی مقام نہیں۔ کیونکہ عام طور پر یہی بنائے فساد ہوتے ہیں۔ متھارا کا شہر اور کنوئیں قبیلہ رو عدہ کی ملکیت ہیں۔ اور چونکہ چراگاہ اور پانی کے استعمال کے حقوق بھی ان کے پاس محفوظ ہیں۔ اس لئے کوئی دوسرا قبیلہ سلطان کی اجازت خاص کے بغیر وہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ اور بغیر اشد ضرورت کے زیادہ دیر تک قیام میں تو یقیناً لڑائی جھگڑے اور جنگ تک نوبت آ ہی جاتی ہے۔

دوپہر کے بعد میں ڈاکٹر کاہل اور سلطان کے ساتھ سیر کو گئی ہم گھوڑوں پر سوار تھے۔ اس مرغزار میں میلوں تک سبزہ ہی سبزہ اور رنگ برنگ کے پھول نظر آتے تھے۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ مشرقی سرزمین پہ بیدلی پھولوں نے مجھے دعوت نظارہ دی۔ بلا مبالغہ سبز پھولدار اطلس دکمخواب کا فرش بچھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آہوان صحرائی کے بڑے بڑے غول دو دفعہ ہمارے سامنے سے گذرے اور خرگوش تو جابجا لمبی لمبی گھاس پر اُچھل کود رہے تھے۔ یہ حصہ ملک اس عریاں صحرا سے بالکل مختلف تھا جسے ہم کل عبور کر چکے تھے۔

شام کے وقت ہم بہت دیر تک سلطان کے خیمہ میں بحث مباحثہ کرتے رہے۔ زیر بحث مسئلہ یورپ اور یورپی تمدن و معاشرت تھا۔ اس وقت سے اب تک میں خیال کر رہی ہوں کہ سلطان ہماری قابل رشک زندگی کو دل سے پسند کرتا تھا۔ کیونکہ وہ بحث میں نہایت دلچسپی اور شوق سے حصہ لے رہا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ اور میرے بیانات سے اُکتا نہ جاتا تھا۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی پسند سے بڑھ کر ہماری حالت پر افسوس اور ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ قاعدہ کے مطابق جب ہم بحث و تمحیص کے لئے سلطان کے خیمہ میں اکٹھے ہوتے تھے تو سلطان اور میں ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھا کرتے تھے۔ اور باقی مشائخ ہمارے گرد گھیرا ڈال لیتے تھے۔ سلطان کیساتھ میری براہ راست گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اپنے ترجمان کی معرفت۔ شروع شروع میں تو ترجمان کی ضرورت اس لئے بھی زیادہ مناسب تھی کہ وہاں کے لوگ جلیل القدر اور بلند مرتبہ ہستیوں میں براہ راست گفتگو کو اچھا نہیں سمجھتے بلکہ ہر وقت ترجمان سے کام لیتے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ ان دنوں گفتگو میں زبان اس قدر پُر تکلف۔ فصیح اور بلیغ اور رسمیات سے پُر استعمال کی جاتی تھی کہ میرے لئے اسی انداز اور انہیں الفاظ میں اس کا جواب دینا تو درکنار اس کا مفہوم سمجھنا بھی مشکل تھا۔ ہر تقریر کے آغاز اور انجام پر خدا کی حمد و ثنا اور ہر مجلس کے شروع اور اختتام پر ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر۔ اس کے گھر بار۔ اس کے شہر۔ اہل شہر اور شہر یار تک کی سلامتی کی آرزو ضرور کی جاتی تھی۔ عام طور پر بحث کا موضوع مختلف پھولوں کا مقابلہ یا مختلف قسم کے پرندوں کا موازنہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ تمام باتیں محض فضول معلوم ہوتیں۔ اگر تقریروں میں فصاحت و بلاغت کے دریا نہ بہائے جاتے اور طرز بیان میں رنگینیاں پیدا نہ کی جاتیں۔ وہ ہر وقت اسی قسم کی باتیں نہیں کرتے رہتے تھے بلکہ صرف اُسیوقت جب وہ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر سلطان کے خیمہ میں جمع ہوتے تھے۔ اسوقت تقریر ایک قسم کا فن سمجھی جاتی تھی اور کسی کسی دن ایک تار کے ستارے بھی سامعین کی

ضیافت طبع کا سامان کیا جاتا تھا۔

اس شام ہماری گفتگو اس قدر دلچسپی اختیار کر گئی کہ میں تمام آئین سے مستثنا ہو گئی۔ میں نے ترجمان کا واسطہ نہ رکھا۔ براہ راست سلطان سے ہمکلام ہونے لگی۔ اور جوابات بھی اسی تیزی سے فردوس سماعت ہونے لگے۔ ہم یورپ کا ذکر کر رہے تھے۔ سلطان نے تسلیم کیا کہ ہمارے شہر عرب کے شہروں سے زیادہ وسیع۔ زیادہ خوبصورت اور زیادہ بارونق ہیں۔ اُس نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ ہم اُن سے زیادہ مطالعہ اور زیادہ علم حاصل کر چکے ہیں۔" مگر اس سے فائدہ؟ یہ صنعت و حرفت اور یہ علم و حکمت کیا کر سکتے ہیں؟ کیا یہ تمہیں ہمارے مقابلہ میں عمر طبعی سے زیادہ دیر زندہ رکھنے میں مدد دے سکتے ہیں؟ کیا یہ تمہیں ہم سے زیادہ توانا۔ زیادہ مضبوط۔ زیادہ تندرست۔ اور زیادہ وجیہہ و شکیل بنا سکتے ہیں؟ کیا تمہیں ہم سے زیادہ قابل قدر اور زیادہ دیندار بناتے ہیں۔ اور زیادہ مطمئن ——— ؟"

" مگر ہمارے آدمی تمہاری طرح اپنی عمر آوارہ گردی۔ تمباکو نوشی۔ اور خواب آوری میں ضائع نہیں کرتے۔ وہ بہت زیادہ مطالعہ کرتے ہیں۔ بڑی محنت و مشقت سے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے تہذیب و تمدن کے عالیشان قصر تعمیر کئے ہیں۔ اور دنیا کی محیر العقول صنعتیں ایجاد کی ہیں"۔

" مگر اس سے حاصل؟ کیا وہ اس زندگی سے اتنے خوفزدہ ہو گئے ہیں کہ اپنے آپ کو خواب یا آوارہ گردی کے حوالے کرنا ہی نہیں چاہتے۔ بلکہ اپنے خیالات پریشان سے خلاصی پانے کی خاطر ہر وقت اپنے آپ کو کام اور مطالعہ میں مصروف رکھتے ہیں۔ اتنا تردد تو فقط وقت کاٹنے یا اپنے تفکرات کی زد سے محفوظ رہنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ ——— حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی خود اُن کے حق میں وبال جان ہو گی"۔

" اچھا! ہمارے تمدن و معاشرت۔ ہمارے اخلاق و عادات اور ہمارے مذہب کے متعلق آپکی کیا رائے ہے؟"

" عیسائیت کے متعلق میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا اور عادات کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ یورپ جرائم میں ہم سے بازی لے گیا ہے۔ اگر دیانتداری اسی کا نام ہے تو یورپی سوداگر ہر بار ہمیں لوٹنے اور دھوکا دینے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ اور ہاں۔ وہ اخلاق ——— یہ درست ہے کہ ہم کئی کئی بیویاں رکھتے ہیں۔ مگر وہ سب ہمارے خاندان سے ہوتی ہیں۔ گو آپ کے ہاں ایک بیوی کی جاتی ہے۔ مگر آپ دوسروں کی بیویوں پر بھی اپنا ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ جو کسی طرح بھی جائز نہیں"۔

" مگر کم از کم آپ یورپ کی اُن اشیاء کے تو معترف ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے آپ بڑی بے صبری کا اظہار کیا کرتے ہیں"؟

" نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ کیا ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ محض گندگی کی پوٹ۔ اور بے حد تکلیف دہ۔ یہ آفتاب پناہ بنایا ہے صرف اس لئے کہ اپنے آپ کو سورج سے چھپایا جائے۔ چھاتا ایجاد کیا ہے فقط اس لئے کہ باران رحمت سے اپنے آپ کو محروم رکھا جائے دستانے مروج کئے ہیں تاکہ ہاتھوں کو گرد و غبار سے بچایا جاسکے۔ یہ چھڑی چلنے کے لئے۔ یہ چھریاں۔ کانٹے اور چمچے کھانا کھانے کی خاطر ——— کیوں ——— ؟ ان تمام تکلیف دہ چیزوں سے جان عذاب میں مبتلا نہیں ہو جاتی"؟

" لیکن لباس میں ان کا مذاق اس سے بھی زیادہ پست ہے وہ اپنی آرائش و زیبائش کن وحشتناک طریقوں سے کرتے ہیں؟ وہ فتنۂ محشر کو جگانے کی خاطر کس ناز سے محو خرام ہوتے ہیں ——— اور کس بیہودہ پن سے ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں؟ ان کے چہرے ہر وقت تغیر پذیر اور بندر کی طرح بنے رہتے ہیں۔ اور وہ ہر وقت کھاتے پیتے اور چیختے چلاتے پھرتے ہیں"۔

" انجام کار دنیا کی ہر شے بیکار اور فضول ہے۔ ایک دن اسی طرف پھرنا ہے جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ مگر کم از کم ہمیں اتنا تو علم ہے اور ہم اس بات پر تو پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ خدا اپنے راستباز اور پیارے بندوں کو نظر انداز نہ کریگا۔ اُن سے کبھی مُنہ نہ موڑیگا اور انھیں اپنی رحمتوں سے کبھی محروم نہ رکھے گا"۔

عیاش قاتل!

(جاسوسی افسانہ)

از قلم عزیز رامپوری

رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ لیکن نواب ہاشم علی خاں بہادر ابھی تک میز کے قریب بیٹھے ہوئے لکھنے میں مصروف تھے کمرے میں گھنٹہ کی ٹک ٹک کے سوا ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ شیر خاں پردے کی آڑ میں کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔

نواب صاحب نے میز پر زور سے گھونسہ مار کر کہا۔ "اب کچھ نہیں ہو سکتا"۔

"نہیں اب بھی سب کچھ ہو سکتا ہے"۔ شیر خاں نے پردے کے عقب سے نکل کر کہا۔

اُہ میرے خدا۔ نواب صاحب نے اُچھل کر کہا۔ کون ——

شیر خاں —— شیر خاں —— کیا واقعی تم ہی ہو —— مری آنکھیں —— مجھے دھوکا —— تو نہیں دے رہیں۔

"نہیں، نواب صاحب جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں وہ واقعہ ہے"۔

"اُہ۔ تم ابھی تک —— زندہ ہو —— میں نے تو سنا تھا کہ —— تم نے واقعی —— اجل کو لبیک کہہ دیا۔

"ہاں نواب صاحب ایسی افواہ اُڑی ضرور تھی مصلحت وقت کے لحاظ سے میں نے خود ہی یہ مشہور کیا تھا۔ لیکن شیر خاں ابھی تک زندہ ہی نہیں بلکہ تندرست بھی ہے۔

نواب صاحب نے اپنی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا آدھی رات کے وقت چوروں کی طرح یہاں موجود ہونا کیا معنی رکھتا ہے"۔

"وہی پرانا معاملہ اسی نے آج پھر دو سال کے بعد یہاں آنے پر مجبور کیا۔

میں نہیں سمجھا تمہارا اشارہ کس معاملہ کی طرف ہے۔

"اُہ نواب صاحب اب آپ تجاہل سے کام لے رہے ہیں۔ کیا آپ حمیدہ کو بھول سکتے ہیں اور اگر یہ واقعہ بھول گئے ہوں تو میں دوبارہ مفصل عرض"۔

"اُہ۔ شیر خاں خدا کے لئے خاموش رہو اب اس واقعہ کا ذکر کر کے مجھے پریشان نہ کرو۔

نہیں نہیں سنئے اس غریب گھرانے کی دکھیا کنواری لڑکی ....

"بس خبردار۔ نواب صاحب نے کھڑے ہو کر میز کی کھلی ہوئی دراز سے پستول اُٹھا کر کہا۔ اگر ایک لفظ بھی اب تمہاری زبان سے نکلا تو خیال رہے گولی سینے کے پار ہوگی۔

"شیر خاں نے ایک قہقہہ مار کر کہا۔" نواب صاحب غصہ کو ضبط کیجئے اور معاملہ کی بات فرمائیے۔

نواب صاحب نے اور زیادہ برافروختہ ہو کر کہا۔ "بس میں کچھ کہنا سننا نہیں چاہتا۔ تم کو میرے مکان میں رات کے وقت اور وہ بھی چوروں کی طرح آنے اور مجھے دھمکانے کا کیا حق ہے۔

" نواب صاحب۔ ان دھمکیوں کو تو تہ کر رکھئے۔ کیونکہ شیر خاں ایسی دھمکیوں میں آنے والا نہیں۔ اور آپ کے تشریف لانے سے پہلے میں اس پستول کو دیکھ چکا ہوں۔ پہلے ملاحظہ تو فرمائیے کہ اس میں گولیاں بھی ہیں

نواب صاحب پستول کو خالی پاکر عالم یاس میں کرسی پر گر گئے۔

اور کہا "شیر خاں آخر تم چاہتے کیا ہو۔

نواب صاحب آپ گھبرائیے نہیں میں آپ سے رخصت ہونے سے اب تک . . . .

شیر خاں ذرا ٹھہرو۔ اور الماری سے سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر مجھے دیدو۔

بہت اچھا یہ خدمت بھی انجام دیئے دیتا ہوں۔ شیر خاں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اور الماری کے قریب پہنچ کر پٹ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اور نواب صاحب نے ایک پر زور قہقہہ لگا کر کہا "وہ مارا!"

(۲)

صبح کا وقت تھا کاؤس مرزا فریدوں مرزا کے ساتھ چائے پینے میں مصروف تھے۔ بابو نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"حضور والا انسپکٹر محمد خاں تشریف لائے ہیں۔"

آنے دو کاؤس مرزا نے چائے کی پیالی لبوں سے ہٹاتے ہوئے کہا

"آداب عرض کرتا ہوں مرزا صاحب۔

آئیے انسپکٹر صاحب۔ کاؤس مرزا نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا —— لیجئے چائے نوش فرمائیے۔

"شکریہ"

"خیر ہے صبح ہی صبح کیسے تکلیف فرمائی۔ کیا کوئی کیس ہو گیا۔

"جی ہاں۔ انسپکٹر صاحب نے کہا۔ کیس اور حیرت انگیز کیس۔

"کیا کوئی قتل

"جی ہاں

"کون اور کہاں۔

"ایک انیس بیس سالہ عورت۔ ہاشم منزل میں۔

"ذرا مفصل ارشاد فرمائیے۔

"واقعہ یہ ہوا کہ رات تین اور چار بجے کے درمیان۔ میں چند کانسٹیبلوں کی معیت میں گشت کر کے واپس آ رہا تھا جس وقت نواب ہاشم علی خاں کی کوٹھی کے قریب پہونچا تو اندر سے چیخ کے ساتھ فیر کی آواز سنائی دی۔ میں پستول ہاتھ میں لے کر اپنے شوق تجسس میں دیوانہ وار جنگلا پھاند کر اندر پہونچا۔ کوٹھی میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مکین خواب نوشین کے مزے لے رہے تھے میں اس کمرے میں داخل ہوا جہاں سے فیر و چیخ کی آواز آئی تھی۔

لیکن مرزا صاحب آپ خود میری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اندر جا کر دیکھا کہ نواب صاحب پستول ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں اور ایک جسم بے جان اُن کے قدموں کے قریب پڑا ہے۔

میرے اندر داخل ہوتے ہی نواب صاحب اُچھل پڑے اور پستول کا رُخ میری طرف کر کے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ لیکن میری سُرخ پگڑی دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اور کہا۔ آپ یہاں کیونکر آئے۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا "میں اپنے آنے کی وجہ عرض کروں گا لیکن یہ تو بتائیے یہ معاملہ کیا ہے۔

"میں کیا جانوں کیا معاملہ ہے۔ نواب نے ذرا اردو کے انداز سے کہا۔ جو میں دیکھ رہا ہوں وہی آپ کے بھی پیش نظر ہے۔

نواب صاحب نے تھوڑے تامل کے بعد کہا۔ "میں برابر کے کمرے میں سو رہا تھا پستول کی آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ فوراً ہی ایک چیخ سنائی دی میں پستول لے کر یہاں آیا تو یہ دردناک منظر پیش نظر تھا۔ ابھی میری حیرت دور نہ ہوئی تھی کہ آپ چوروں کی طرح داخل ہوئے اب فرمائیے آپ کو معلوم کیسے ہوا۔

مرزا صاحب میں نے وہی قصہ جو ابھی آپ سے عرض کیا نواب کو بھی سنا دیا۔

نواب صاحب نے آہ بھر کر کہا۔ انسپکٹر صاحب! اب کیا کرنا چاہیئے یہ تو بڑی بدنامی کی بات ہے۔

میں نے کہا قاتل کی تلاش کرنا چاہیئے وہ ضرور یہیں کہیں چھپا ہوا ہوگا کیونکہ۔ ایک تو اتنی جلدی بھاگ نہیں سکتا دوسرے میرے آدمی باہر کھڑے ہوئے ہیں وہ ضرور روکتے۔

الغرض میں نے معہ نواب کے مکان کا کونا کونا چھان مارا لیکن کوئی چیز ایسی ہاتھ نہیں آئی جس سے معلومات میں مزید اضافہ ہوتا مایوس ہوکر ہم دونوں پھر اسی کمرے میں آئے جہاں قتل ہوا تھا۔ لیکن مرزا صاحب یقین مانیئے ایسا ہوش ربا منظر کبھی مری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ وہاں آکر دیکھا کہ کمرہ صاف پڑا ہے اور لاش غائب۔

یہ حیرت خیز واقعہ دیکھ کر اصل تو یہ ہے کہ مرے ہوش بھی بجا نہ رہے۔ نواب صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ بت کی مانند کھڑے ہوئے مری صورت دیکھ رہے تھے۔

جب کسیقدر ہوش بجا ہوئے تو فرمانے لگے ـــــ انسپکٹر صاحب یہ ـــــ کیا طلسم ـــــ ہے ـــــ اول تو ـــــ مرے کمرے میں ـــــ قتل کا ہونا ـــــ دوسرے آنکھوں ـــــ ہی آنکھوں میں ـــــ لاش کا غائب ہوجانا ـــــ کتنی حیرت انگیز بات ہے۔

میں نے کہا نواب صاحب کمرے کو یونہی بند کرادیجئے گھڑی دیکھ کر ابھی چھ بجنے میں آٹھ منٹ باقی ہیں ہم انشاء اللہ تعالیٰ آٹھ بجے یہاں آکر باقاعدہ تحقیقات کریں گے۔ نواب صاحب کو خاموش دیکھ کر میں نے دو آدمی اپنے بھی وہیں تعینات کردیئے۔

اُف مرزا صاحب چائے تو بالکل ٹھنڈی ہوگئی۔

خیر لیجئے سگریٹ ملاحظہ فرمایئے۔ کاؤس مرزا نے مسکراتے ہوئے کہا . . . . . پھر آپ نے کیا کیا۔

"کرتا کیا سوائے اسکے کہ آپ سے آکر مدد کا طالب ہوں۔ یقین ہے آپ ضرور مری مدد فرمائیں گے۔

"خانصاحب آجکل میں بہت عدیم الفرصت ہوں ـــ لیکن ایک تو آپ کے تشریف لانے کے سبب دوسرے مقدمہ کی دلچسپی کے باعث۔ یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لئے لیتا ہوں۔

مرزا صاحب بہت بہت شکریہ۔ انسپکٹر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ اُوہو آٹھ بجنے میں چند منٹ باقی رہ گئے ہیں چلئے تشریف لیچلئے فریدوں مرزا موٹر کے لئے کہدو۔ کاؤس مرزا نے سگریٹ کے دھوئیں کو حلقوں کی صورت میں منہ سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا۔ فریدوں مرزا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

(۳)

"کاؤس مرزا نے کمرے کا معائنہ کرکے کہا۔ چلئے دوسرے کمرے بھی دیکھ لیں۔

"آیئے آیئے۔ نواب صاحب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

کاؤس مرزا نے معہ انسپکٹر فریدوں مرزا کے نواب صاحب کی ہمراہی میں باری باری ہر کمرے کو دیکھا۔ سب سے آخری کمرے میں داخل ہوکر کاؤس مرزا نے سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ بغلی کوٹھری اور رہ گئی ہے لایئے نواب صاحب چابی اس کو بھی دیکھ لیں۔

اس کی چابی نہ معلوم کہاں ہے کیونکہ اس کو کھولنے کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ مرے خیال میں تو فضول وقت کھونا ہے۔ یہ کہہ کر نواب صاحب باہر چلے گئے۔

"اس کو دیکھنے میں مرے خیال سے تو کوئی ہرج نہیں۔ کیوں انسپکٹر صاحب۔ کاؤس مرزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر ہرج نہیں تو نفع بھی نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ یہ کوٹھری مدت کی بند معلوم ہوتی ہے۔

کاؤس مرزا نے انسپکٹر کی باتوں پر توجہ کئے بغیر فریدوں مرزا سے کہا۔ "کھولو تو اس تالے کو۔

بہت اچھا کہہ کر فریدوں مرزا نے اپنی جیب سے ایک لوہے کا کانٹا نکالا اور بڑی آسانی سے تالا کھول دیا۔

کواڑ کھلتے ہی ایک آدمی کوٹھری سے نکل کر باہر کی جانب بھاگا۔ لیکن کاؤس مرزا نے جھپٹ کر اس کو پکڑ لیا۔

پستول نکالنے کی بیکار کوشش کرتے ہو۔ انسپکٹر نے ہتکڑی ڈالتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر صاحب میں بالکل بے قصور ہوں اجنبی نے کہا۔

اگر تم نے ٹھیک ٹھیک حال بتادیا اور اپنی بے قصوری کا ثبوت دیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں رہا کردیا جائے گا۔

"بہت اچھا فرمایئے آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

"تم کون ہو اور اس بند کوٹھری میں تمہارا پوشیدہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے"

انسپکٹر صاحب یہ قصہ بہت طویل ہے کہیں آپ لوگ بیٹھ جائیں تو میں عرض کردوں۔

ہاں ٹھیک ہے انسپکٹر نے کاوس مرزا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر یہ سب لوگ اسی کمرے میں چلے گئے جس میں قتل کی واردات ہوئی تھی ـــــ کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد کاوس مرزا نے کہا اب اپنا قصہ بیان کرو۔

اجنبی تھوڑی دیر گردن جھکائے ہوئے سوچتا رہا پھر سر اٹھا کر کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ایک اطمینان کا سانس لیکر کہنا شروع کیا۔

"میرا نام شیر خاں ہے میں اسی شہر کا باشندہ ہوں میرے والد کا انتقال ہوچکا ہے اب میری ماں اور ایک بہن ہیں۔ والد نے جسقدر دولت چھوڑی تھی وہ سب میں نے بُری صحبتوں میں پڑکر برباد کردی۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ ہمپر فاقہ ہونے لگے۔

میں اگر تنہا ہوتا تو جس طرح گذرتی گذار لیتا۔ لیکن اب سوال ماں اور بہن کا تھا۔ میں نے بہت سی تدبیریں روپیہ کمانے کی سوچیں لیکن ہر طرف سے مایوسی نے اپنا بھیانک چہرہ دکھایا۔ آخر میں ڈکیتی کرنے پر مجبور ہوگیا۔

"او ہو تم وہی شیر خاں ہو جس کا نام ایک قتل کے مقدمہ میں تھا۔

انسپکٹر نے شیر خاں کی بات قطع کرتے ہوئے کہا

"جی ہاں میں وہی بدنصیب شیر خاں ہوں۔

آگے کہو۔ کاوس مرزا نے کہا۔

"ہاں تو میں ڈکیتی کرنے پر مجبور ہوگیا۔ لیکن قسمت بھی خلاف میری یہ کوشش بھی بیکار ثابت ہوئی۔ کیونکہ میرے ہاتھ سے ایک خون ہوگیا جس کے مفصل حالات آپ صاحبان کو معلوم ہیں۔

گرفتاری کے خوف نے مجھے روپوش ہونے پر مجبور کیا۔ دو سال کے بعد میں نے ایک خط اپنی بہن کے نام لکھا جس میں میں نے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلاتے ہوئے ان لوگوں کی خیریت معلوم کی تھی۔

آٹھ روز کے انتظار کے بعد مجھے میری بہن کا خط ملا جس میں اس نے اپنی مصیبت کا حال لکھا تھا اور مجھ سے امداد کی طالب تھی۔

گو مجھے اپنی گرفتاری کا خوف تھا لیکن ان کی مصیبت کا حال پڑھکر آنے پر مجبور ہوگیا۔

جب میں گھر آیا تو میری ماں اور بہن مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میری بہن سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے نہ اس کی وہ جوانی تھی جو ایک انیس سالہ کی ہونا چاہئے نہ اس کا وہ رنگ روپ تھا جو ایک جوان عورت کا ہونا چاہئے میں نے مصیبت کی وجہ سمجھ کر ان باتوں کو نظر انداز کردیا۔

دوسرے روز رات کو میں سو رہا تھا کہ کسی نے آکر آہستگی سے مجھے بیدار کیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا میری بہن میرے پاس کھڑی تھی۔ میں نے کہا کیوں حمیدہ اسوقت کیسے آئیں۔ کیا میرے یہاں موجود ہونے کی کسی کو اطلاع ہوگئی۔

حمیدہ نے بجائے جواب دینے کے رونا شروع کردیا اور اسقدر روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

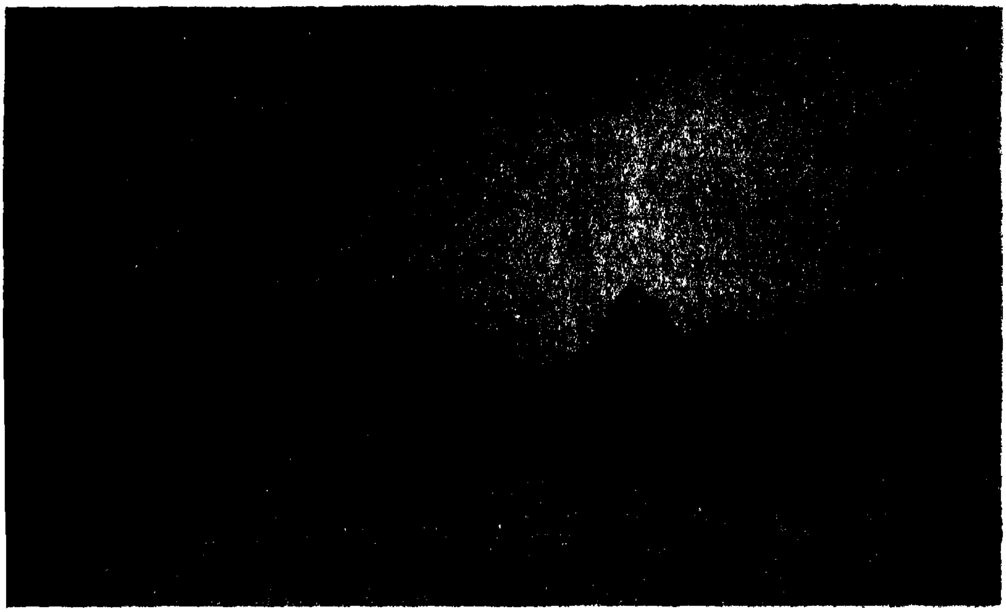
میں نے نرمی سے کہا۔ کیوں حمیدہ یہ تم کو کیا ہوگیا ہے آخر رونے کا سبب۔ حمیدہ نے بدقت تمام ضبط گریہ کرکے کہا۔

بھائی میں خطاوار ہوں پہلے میری خطا معاف کردو پھر میں سب حال عرض کئے دیتی ہوں۔

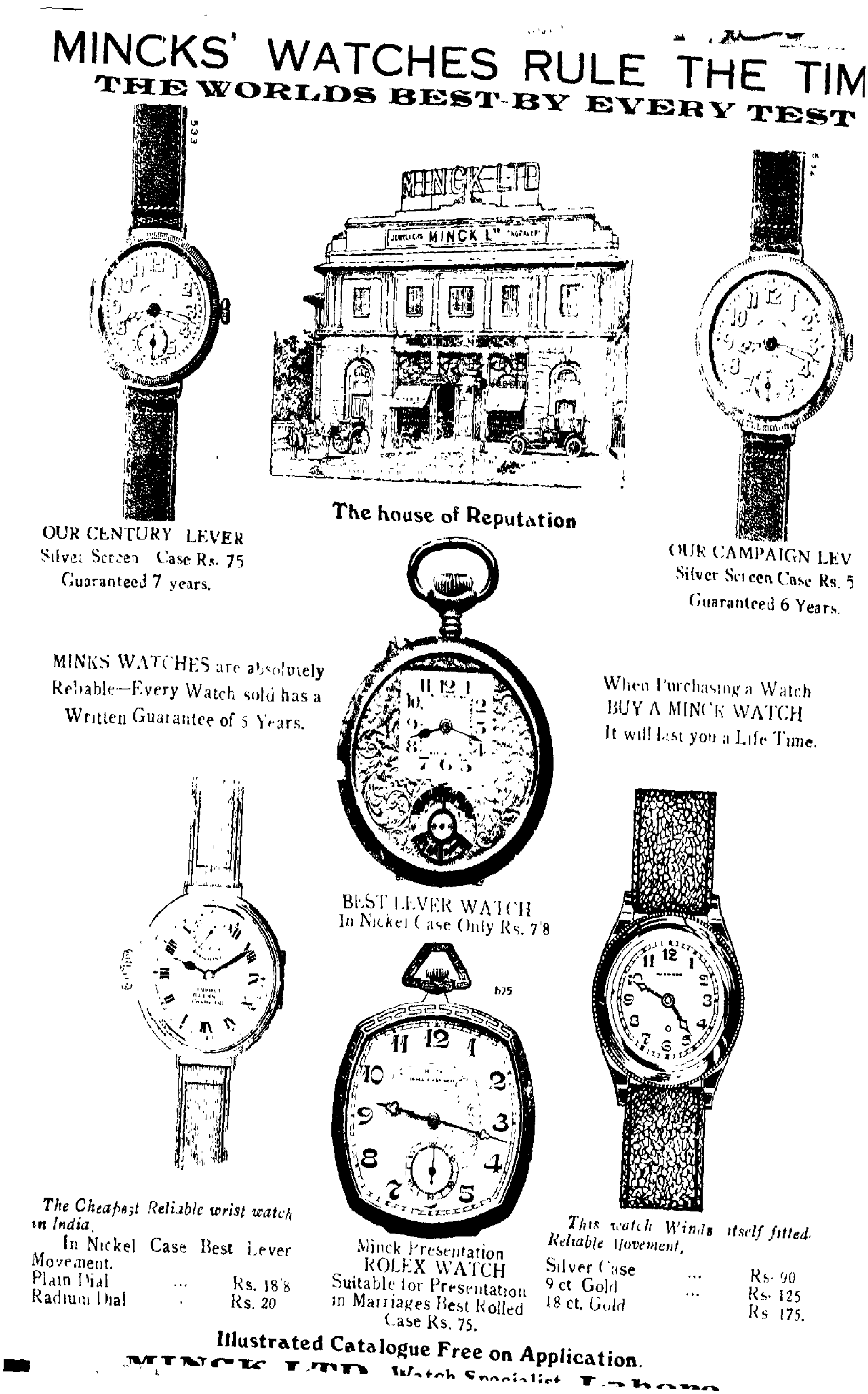
برادرانہ محبت نے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا اور میں نے کہہ دیا۔ حمیدہ اگر تم نے کوئی خطا کی ہے تو میں نے تم کو معاف کیا۔ اب برائے خدا جلدی کہو یہ معاملہ کیا ہے۔

حمیدہ نے گردن جھکا کر کہنا شروع کیا۔ بھائی تمہارے جانے کے بعد ہماری مصیبتوں کی کوئی حد نہ رہی۔ آخر ہم نے سلائی کا کام شروع کردیا ایک روز میں ایک جگہ سے سلائی کے دام لیکر واپس آرہی تھی۔ جس جگہ سے میں سلائی کے دام لینے گئی تھی وہ تھے نہیں ان کی بیوی نے مجھے بٹھا لیا تھا ہماری بسر چونکہ سلائی کے داموں پر ہی تھی اس لئے میں انتظار کرنے پر مجبور ہوئی جب وہ آئے اور دام ملے۔ رات زیادہ گذر چکی تھی۔ راستہ میں دو آدمی میرے پیچھے ہولئے پہلے تو میں ان کو راہگیر سمجھی لیکن جس طرف میں جاتی تھی وہ بھی میرے تعقب میں اسی طرف جاتے تھے آخر ان سے بچنے کے لئے میں ایک گلی میں مڑ گئی لیکن ان دونوں نے میرا تعقب نہ چھوڑا۔ اور گلی میں داخل ہوکر میرے

آواره صحرا (متعلقه مضمون آواره صحرا)






MINCKS' WATCHES RULE THE TIM
THE WORLDS BEST BY EVERY TEST
MINCK LTD
MINCK Lᵀᴰ
The house of Reputation
OUR CENTURY LEVER
Silver Screen Case Rs. 75
Guaranteed 7 years.
OUR CAMPAIGN LEV
Silver Screen Case Rs. 5
Guaranteed 6 Years.
MINKS WATCHES are absolutely Reliable—Every Watch sold has a Written Guarantee of 5 Years.
When Purchasing a Watch BUY A MINCK WATCH It will last you a Life Time.
BEST LEVER WATCH
In Nickel Case Only Rs. 7/8
The Cheapest Reliable wrist watch in India.
In Nickel Case Best Lever Movement.
Plain Dial ... Rs. 18/8
Radium Dial ... Rs. 20
Minck Presentation
ROLEX WATCH
Suitable for Presentation in Marriages Best Rolled Case Rs. 75.
This watch Winds itself fitted. Reliable Movement.
Silver Case ... Rs. 90
9 ct Gold ... Rs. 125
18 ct. Gold Rs 175.
Illustrated Catalogue Free on Application.

اور حملہ کرنا چاہا۔ آہ بھائی میں اس وقت کا منظر پیش نہیں کر سکتی۔ خوف سے میری بری حالت تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔ جب میرے ہوش بجا ہوئے تو میں نے اپنے کو ایک کمرے میں پلنگ پر لیٹے ہوئے پایا۔ اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت ۔ے قریب تخت پر بیٹھی ہوئی کچھ پڑھنے میں مصروف تھی۔ پہلے تو میں نے خواب سمجھ کر آنکھیں بند کر لیں لیکن دوبارہ آنکھیں کھولنے پر بھی وہی منظر پیش نظر تھا۔ میں نے اس ضعیفہ سے دریافت کیا۔ میں خواب دیکھ رہی ہوں یا یہ واقعہ ہے اگر یہ خواب نہیں تو براۓ مہربانی بتائیے کہ میں یہاں کیونکر آئی اور یہ مکان کس کا ہے۔

تم گھبراؤ نہیں یہ خواب نہیں بیداری ہے یہ مکان میرا ہے یہاں ایک شریف آدمی تمہیں پہونچا گئے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم کسی ناگہانی حادثہ کی شکار ہو کر بیہوش ہو گئی ہو۔

اب میری سمجھ میں ایک ایک کر کے سب واقعات سینما کی متحرک تصویروں کی طرح آنے لگے۔ میں نے پھر کہا۔

میرے مہربان کیا پھر آنے کو کہہ گئے ہیں۔

بڑی بی بولیں۔ ہاں بیٹی وہ کہتے تھے کہ میں صبح ہی آؤں گا۔ یقین ہے کہ اب آتے ہی ہوں گے۔

ابھی یہ ذکر تھا کہ ایک شریف صورت نوجوان شخص کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی بڑی بی نے کہا۔ لو وہ آگئے۔

نو وارد نے کمال مہربانی سے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ابھی لڑکی پہلے تو تم اپنے مزاج کی کیفیت سے آگاہ کرو اس کے بعد اگر کچھ مضائقہ نہ ہو تو یہ بتاؤ کہ تم کون ہو مکان کہاں ہے تاکہ تمہیں تمہارے مکان تک پہونچانے میں مدد مل سکے۔

میں نے گردن جھکا کر کہا۔ میں اچھی ہوں اور اپنا نام و پتہ بھی بتا دیا۔

تو چلئے میں آپ کو آپکے مکان تک پہنچا دوں۔ انہوں نے مشفقانہ انداز سے کہا۔

میں نے کہا۔ میں اب بالکل اچھی ہوں آپ کے تکلیف فرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن براہ کرم اتنا اور بتا دیجئے کہ میں یہاں تک کیونکر آئی۔

آپ کو وہ بدمعاش ستانا چاہتے تھے اتفاق سے میں اس طرف سے جا رہا تھا آپ کی چیخ سنکر موقع پر پہنچ گیا۔ وہ بدمعاش تو مجھے دیکھ کر فرار ہو گئے۔ لیکن آپ بیہوش ہو چکی تھیں اس وجہ سے مجبوراً آپ کو اس مکان میں آپ کے ہوش میں آنے تک پہونچا دیا۔

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور برقعہ منہ پر ڈال کر گھر کا راستہ لیا۔

(۴)

مکان پر آکر والدہ کو بہت پریشان پایا مجھے دیکھتے ہی۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ کہہ کر رات بھر مکان سے غائب رہنے کی وجہ معلوم کرنے لگیں۔

میں نے مفصل حال ان سے کہہ دیا۔ والدہ میرا حال سنکر آنکھوں میں آنسو بھر لائیں اور اس اجنبی شخص کے حق میں دعائے خیر کرنے لگیں۔

دوسرے روز ہم سینے میں مصروف تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہی کل والے شخص ہیں والدہ نے یہ معلوم کر کے ان کو مکان میں بلا لیا۔ اور مجھے ہٹا دیا۔ وہ ان کا بہت بہت شکریہ ادا کرتی رہیں۔ والدہ کے معلوم کرنے پر انہوں نے اپنا نام منو صاحب بتایا اور اپنے کو اسی شہر کا باشندہ ظاہر کیا۔ بہت دیر تک وہ بیٹھے رہے جاتے وقت کاغذ والدہ کے ہاتھ میں پھر آنے کے واسطے اجازت چاہتے ہوتے کہا۔ اگر آپ کا کوئی ہرج نہ ہو تو میں دوسرے تیسرے روز آکر آپ کی خیریت معلوم کر لیا کروں۔ ان کی باتیں کچھ ایسی جادو بھری تھیں کہ والدہ نے کہہ دیا کہ شوق سے آپ کا مکان ہے۔ ان کے جانے کے بعد وہ کاغذ سو روپیہ کا نوٹ ثابت ہوا۔

کئی روز کے بعد وہ پھر آئے۔ تو والدہ نے کہا۔ آپ اس روز غلطی سے یہ نوٹ دے گئے تھے۔

نہیں غلطی سے نہیں دے گیا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا

والدہ نے کہا۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے یہ کیوں دیا۔

صرف آپ کی غریبی کو دیکھتے ہوئے۔ انہوں نے کہا۔

والدہ نے کہا معاف کیجئے آپ کے ایک ہی احسان کا بار اس قدر ہے کہ سر نہیں اٹھ سکتا

الغرض بہت دیر تک ادھر سے انکار۔ اور اُدھر سے اصرار ہوتا رہا۔ آخر ان کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر والدہ نے لے لیا۔ غرض ان کا آنا جانا برابر رہا۔ اب ان کی آمد و رفت کو چھ سات مہینے گزر چکے تھے۔ ایک روز وہ آئے اور والدہ سے بہت دیر تک آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد والدہ نے مجھے بلا کر کہا۔

حمیدہ اب ماشاءاللہ تم جوان ہو گئی ہو۔ والد کا سایہ تمہارے سر سے اٹھ گیا۔ بھائی تمہارا لاپتہ ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔ منو صاحب جوان ہیں خوبصورت بھی ہیں وہ بھی تمہیں شریک زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ اب جیسی تمہاری رائے ہو

والدہ کے یہ درد بھرے فقرے سن کر بے اختیار رونا آ گیا۔ لیکن میرے پیارے بھائی مجھے معاف کرنا۔ یہ سُن کر کہ منو صاحب کے ساتھ میری شادی ہو گئی۔ میں اپنی مسرت کا حال بیان نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے بھی ان سے بے اندازہ محبت تھی میں نے ضبط کر کے کہا۔

جیسے آپ کی رائے ہو

المختصر منو صاحب نے بعض مجبوریوں کی وجہ سے دھوم دھام مناسب نہ سمجھی اور ایک مولوی صاحب کو بلا کر ہمیں مکان میں نکاح پڑھوا لیا تاہم دو تین مہینے خوب آرام سے گزر گئے وہ دن کو عام طور پر کام کاج میں رہتے اور رات کو گھر آ جایا کرتے۔

لیکن آہ بھائی قسمت ہی جب درپئے آزار ہو تو سب تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں۔ یہ فلک کج رفتار و گردون غدار ہمارا آرام نہ دیکھ سکا

یہ دو دل کو یک جا نبھاتا نہیں
کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں

اس کے بعد وہ لاپتہ ہو گئے۔ ایک تو ان کا فراق دوسرے خرچ کی تکلیف نے تمہیں بلانے پر مجبور کیا۔

شیر خاں نے تھوڑی دیر دم لینے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

غرض میں نے خوب اچھی طرح اس کے شوہر کا حلیہ معلوم کر کے خفیہ طریقہ پر تلاش شروع کر دی۔ دس گیارہ روز کی تلاش کے بعد مجھے اس کے شوہر کا پتہ معلوم ہوا۔ میں ان سے خفیہ طریقہ سے ملا اور حمیدہ کی مصیبت کا حال سُنا کر اس کی مدد کا طالب ہوا۔ پہلے تو انھوں نے بہت ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن جب میں نے کہا کہ اگر آپ نے اس غریب کی مدد نہ کی تو یاد رکھئے کہ صبح ہوتے ہی آپ کے افعال پبلک پر ظاہر ہو جائیں گے آخر مجبور ہو کر انھوں نے پانچ سو کے نوٹ دے دئے۔ اس شرط پر کہ حمیدہ کو ان کے اصلی نام و پتہ سے آگاہی ہو۔ آئندہ بھی خفیہ طریقہ سے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

"اور اصل میں وہ تھا کون" انسپکٹر نے قطع کلام کر کے کہا۔

آہ انسپکٹر صاحب وہی آپ کے شہر کے رئیس جن کو نواب صاحب کا خطاب آپ لوگوں نے دیا ہوا ہے۔ اور جن کی کوٹھی میں ہم لوگ اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں تھے۔

یہ سُن کر کاؤس مرزا کے سوا ہر شخص محو حیرت ہو کر رہ گیا

شیر خاں نے کاؤس مرزا کے اشارہ پر پھر سلسلہ کلام جاری کیا۔

میں نے اپنی بہن کو وہ روپیہ لا کر دیا اور اس کے بعید اصرار پر بھی اس کے شوہر کی بابت ایک حرف بھی مُنہ سے نہیں نکالا۔

چونکہ پولیس کو میری موجودگی کی اطلاع ہو گئی تھی اس لئے میں اپنی ماں و بہن سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ کہاں گیا اور کیا کرتا رہا۔ اس کے کہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ دو سال تک مجھے گردش زمانہ کے ہاتھوں ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ میں اپنی خیریت سے تو اپنی ماں و بہن کو آگاہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کی خیریت نہ ملنے سے پریشان رہتا تھا۔ دو سال کے بعد کچھ دنوں کے واسطے ایک جگہ بیٹھنے کا یقین ہوا تھا۔ لیکن قسمت کو یہ منظور کب تھا۔ کہ میں ایک جگہ آرام سے بیٹھوں۔ میں نے اپنی بہن کو خط روانہ کیا۔ کئی روز کے بعد اس کا جواب آیا جس میں اس نے اپنی پریشانی کے سوا اور کچھ نہیں لکھا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کے شوہر یعنی نواب صاحب نے جو وعدہ مجھ سے اس کی مدد کرنے کا کیا تھا۔ وہ فراموش کر دیا۔ انسپکٹر صاحب واللہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور میں فوراً مکان پر آیا۔ ماں اور بہن کی حالت بیان کرنا فضول ہے۔ کیونکہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں، مصیبت میں جو انسان کی حالت ہو جاتی ہے۔ وہ ان کی تھی۔

ایک معند میں نے آرام کیا اور دوسرے روز نواب صاحب سے ملنے کا ارادہ کر کے گھر سے روانہ ہوا۔

گو رات کے بارہ بجنے والے تھے لیکن میرے واسطے وہ وقت ملنے کا بہت اچھا تھا۔ میں پھلانگ پھاند کر کھڑکی کی راہ سے انکی نشستگاہ میں داخل ہوا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ نواب صاحب آرام میں ہوں گے لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ اور ان کو نشستگاہ ہی میں لکھنے میں مصروف پایا ساتھ ہی ساتھ میری نظر میز کی کھلی ہوئی دراز میں رکھے ہوئے پستول پر پڑی میں ایک پردے کی آڑ میں کھڑے ہو کر موقع کا منتظر رہا۔ نواب صاحب لکھتے لکھتے کچھ سوچ کر کھڑے ہوگئے اور آرام گاہ میں چلے گئے جو ڈرائنگ سے ملا ہوا تھا۔ دبے پاؤں پردے کی آڑ سے نکل کر میز کے قریب آیا اور سب سے پہلے جو کام کیا وہ پستول کو خالی کرنا تھا اس کے بعد میں اس خط کی طرف متوجہ ہوا جو نواب صاحب لکھتے لکھتے میز پر چھوڑ گئے تھے۔ لیکن پاؤں کی چاپ سنکر فوراً پردے کے عقب میں پوشیدہ ہوگیا۔

وہ آئے۔ بیٹھے۔ خط تمام کر کے لفافہ میں بند کیا اور میز پر زور سے گھونسہ مار کر بولے۔ آہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

میں نے یہ موقع ان کو مرعوب کرنے کا غنیمت جان کر پردے کے عقب سے نکل کر کہا۔ "نہیں اب بھی سب کچھ ہوسکتا ہے۔"

وہ پہلے تو مجھے دیکھ کر بہت گھبرائے لیکن فوراً ہی سنبھل گئے اور مجھے پستول سے دھمکانا چاہا انہیں کیا معلوم تھا کہ پستول پہلے ہی خالی ہوچکا ہے آخر پستول کی طرف سے مایوس ہو کر اپنا وعدہ ایفا کرنے کا عہد کیا۔ اور مجھے سگریٹ کا ڈبہ اٹھا لانے کو کہا مجھے ان کی اس حرکت پر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن سگریٹ کے لئے میں بھی بےچین ہو رہا تھا۔ اس وجہ سے ڈبہ اٹھانے کے واسطے اٹھا مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بھی انکی ایک چال ہے۔ میں الماری کے قریب پہنچ کر پٹ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے ایک جوف پیدا ہوگیا اور میں اس کے اندر تھا۔ گرنے سے میرے سخت چوٹ آئی۔ تھوڑی دیر تک بےحس و حرکت پڑے رہنے کے بعد میں اٹھا اندر قبر کی سی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے برقی لیمپ نکال کر بٹن دبایا۔ روشنی میں میں نے دیکھا کہ ایک گول کمرے میں قید ہوں۔ میرا سر چکرا رہا تھا اس وجہ سے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے ہوش و حواس درست کرنے لگا۔ یہیں سے آپ نواب صاحبان نے مجھے نکالا

ابھی شیر خاں اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ تمام کمرے میں فائر کی آواز گونج گئی۔ شیر خاں کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ کرسی سے کاؤس مرزا کے قدموں میں آ رہا۔

ہر ایک کی نظر باہر کی جانب اٹھ گئی۔ نواب صاحب ہاتھ میں پستول لئے ہوئے باہر کی جانب جا رہے تھے۔

"لینا انسپکٹر نواب صاحب کو" کاؤس مرزا نے کہا۔ اور خود ایک سرے سے ... تک سفید چادر میں لپٹی ہوئی جوان عورت کی طرف متوجہ ہوئے جو نامعلوم سے پیر برابر والے کمرے سے یکلخت اس کمرے میں آ کر شیر خاں کے قریب زانو ہو گئی تھی۔ لیکن اس کو مردہ پا کر بیہوش ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں انسپکٹر نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "مرزا صاحب نواب صاحب نے گرفتار ہونے سے پہلے ہی خودکشی کر لی"

(۵)

عورت کو جس کی چادر پر جابجا خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے فوراً اٹھا کر ہسپتال پہنچا دیا گیا اور دونوں لاشیں تھانے میں بھیجدی گئیں۔ دوسرے روز ہسپتال میں پولیس نے اس عورت کے بیانات لئے۔

وہ حمیدہ تھی جو اپنے بھائی شیر خاں کے پیچھے نواب کے مکان میں آگئی تھی۔ شیر خاں کے تہ خانے میں گرجانے پر وہ کچھ دیر تو برابر والے کمرے کے ایک پردے کی آڑ میں سے دیکھ کر یہ سوچتی رہی کہ کیا ہوا۔ لیکن نواب کے قہقہہ لگانے اور بھائی کی آواز نہ سننے سے خوف زدہ ہو کر نواب کے کمرے میں آگئی تھی یہ دیکھ کر نواب نے مقفل بکس میں سے جو میز پر رکھا ہوا تھا ایک اور پستول نکالا۔ اور پیشتر اسکے کہ حمیدہ اسے روک سکتی یا اپنے بھائی کا حال دریافت کر سکتی۔ اس پر فائر کر دیا۔ گولی بازو کے گوشت والے حصہ میں سے پار نکل گئی تھی۔ اور حمیدہ کو غش آگیا تھا۔ نواب اور انسپکٹر جس وقت اسے مردہ سمجھ کر قاتل کی تلاش میں کمرے سے نکل کر چلے گئے تھے تو حمیدہ کو ہوش آیا۔ اس کو بازو میں درد ہو رہا تھا اس نے اپنی چادر پھاڑ کر پٹی باندھ لی۔ اور اٹھکر سونے کے کمرے میں پلنگ کے نیچے چھپ گئی تھی۔ آخر میں جب نواب نے اسکے بھائی کے گولی ماردی تو نہ رہ سکی اور اس کمرے میں آگئی تھی جہاں سب جمع تھے۔

حمیدہ کو چند دن میں صحت ہوگئی اور چونکہ وہ تحقیقات پر نواب کی منکوحہ بیوی ثابت ہوئی اسلئے اُسے نواب کی جائداد میں سے ایک معقول رقم گذارے کے لئے ملنے لگی۔

(عزیز رامپوری)

ایک نرالا جادُو!

آج تک آپ نے کئی جادو سنے ہوں گے۔ لیکن حقیقی معنوں میں سر پر چڑھ کر بولنے والا کوئی نہیں دیکھا سنا ہوگا۔ سنئے ہم بتلاتے ہیں۔ دنیا بھر کی شہرۂ آفاق۔ پروفیسر ولسن صاحب کی ایجاد۔ امریکہ کی مشہور و معروف ایکٹینا ایپلائنس کمپنی کی ساخت

آلہ ایکٹینا میں

وہ بیشمار خوبیاں ہیں کہ دنیا بھر کے تمام جادو اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ اسکے اثرات اور نتائج اتنے زبردست ہیں کہ قلم میں بساط نہیں جو اس مختصر اشتہار میں ان کو پورے طور پر بیان کر سکے۔ ہم صرف اتنی سفارش کر سکتے ہیں کہ

دیکھئے اور آزمائیے

آنکھ کی سُرخی سے لیکر موتیا بند تک تمام امراض مثلاً خارش۔ کُکرے۔ پانی بہنا۔ دھند غبار۔ جالا۔ پھولا۔ پڑوال۔ ککری۔ ڈھینہ کا ورم۔ زخم۔ کم نظری۔ کمزور نظری۔ بعید نظری۔ موتیا۔ گلاکوما۔ رنگوں کا نہ پہچانا جانا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسکے استعمال سے

اس طرح دور ہو جاتے ہیں جیسے لاحول پڑھنے سے شیطان۔ نیز کانوں کی نقل سماعت۔ بہرہ پن۔ درد۔ سائیں سائیں کی آوازیں۔ شور و غل۔ اور حلق و نزلی بیماریاں مثلاً نزلہ۔ زکام کھانسی۔ درد سر۔ نیورلجیا۔ دمہ۔ انفلوئنزا۔ نزلی بخار۔ اور ورم حلق وغیرہ وغیرہ غرضیکہ

آنکھ۔ کان۔ ناک۔ سر اور حلق

کے تمام معلوم الامراض کا یہ آلہ ایکٹینا ایک نہایت مجرب بے دوا علاج ہے۔ نہ کوئی پرہیز نہ تکلیف نہ کسی اندرونی بیرونی دوائی کا استعمال۔ نہ جراحی چیر پھاڑ کی حاجت۔ نہ حکیموں ڈاکٹروں کی خوشامد۔ اس آلہ کی بدولت گزشتہ سترہ سالوں میں ہزارہا مایوس العلاج مریض اپنے آنکھ۔ کان۔ ناک۔ سر اور حلق

کے تمام امراض

دور کر کے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ باوجود بہم اس نادرالوجود آلہ قیمت صرف مبلغ بیس روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک وغیرہ مقرر ہے۔ مزید تسلی کے لئے فوراً مفت پروفیسر ولسن صاحب کا رسالہ اوامرِ صحت ہم سے طلب کر کے ملاحظہ فرمائیں۔ اس مفید رسالہ میں امراض کی وجوہات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح آلہ مذکور کے استعمال سے تمام امراض

کافور ہو جاتے ہیں

مرد۔ عورت۔ جوان۔ بڈھے۔ بچے سب اس آلہ کو یکساں طور پر آسانی سے ہر موسم۔ ملک میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس آلہ کا ہر گھر میں رہنا مغتنمات میں سے ہے اسواسطے ہم رسالہ عالمگیر کے جملہ ناظرین و ناظرات کی خدمت میں مؤدبانہ پر زور التماس کرتے ہیں۔ کہ دیگر فضول علاجوں پر روپیہ برباد کرنے کی بجائے فوراً اس طرف توجہ کریں۔

ایکٹینا ہاؤس متصل بٹالہ (پنجاب) یا لاہور

جنت کا اسلامی و مسیحی تخیل

از جناب مرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال
مراد آبادی

تمام مذاہب عالم کا سرسری مطالعہ بھی ہم کو اس حقیقت سے بآسانی آشنا کر سکتا ہے کہ ہر دور تمدن میں انسانی ذہنیت کے مطابق اگرچہ ہر مذہب نے جداگانہ اصول و عقائد مذہب وضع کر کے ہدایت و نجات کے فرائض انجام دیئے ہیں ——— لیکن "ترغیب و ترہیب" کا اصول باوجود اختلافات عقائد مذہبی۔ ہر ایک مذہب و شریعت میں مشترک ہی رہا ہے ؛

ہم ذیل میں جنت کے اس تخیل کو پیش کرتے ہیں۔ جس کو مسیحیت اور اسلام نے دنیا کے سامنے بیان کیا ہے۔ دونوں مذاہب کے تخیل کو یگانگت اور بعض جگہ یکسانی تعبیر کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا ؛

چنانچہ جنت کے متعلق یہ حقیقت کہ

"اس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔ کسی کان نے نہیں سنا۔ اور نہ اس کا تصور کسی انسان کے قلب میں پیدا ہوا ہے" ؛

———

اس مفہوم کو افراتیز اسحاق (عیسائی) اور امام غزالی اسلامی عالم نے اپنی تصنیفات میں متعدد مقامات پر ادا کیا ہے ———

مثلاً "جنت ایک مقام نور ہے" امام غزالی فرماتے ہیں :-

"اگر خلد بریں کی کوئی حور روئے زمین پر اتر آئے تو تمام دنیا نور سے جگمگا اٹھے اور زمین کی وسعتیں نکہتوں سے مہک جائیں" ؛

ایک جگہ حوران جنت کی جسمانی لطافت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ (ان کا (حوروں کا) جسم اس قدر شفاف اور آئینہ رنگ ہو گا کہ

"پنڈلیوں کی ہڈی کا مغز، گوشت میں سے صاف جھلکتا نظر آئے گا" ؛

اور ———

"جنت کے محل و مکان جواہرات کے ہونگے۔ ایک شخص اندر سے باہر اور باہر سے اندر کی تمام چیزوں کو بآسانی دیکھ سکیگا" ؛

"جنت" کے متعلق غزالیؒ کی یہ تعبیرات مسیحی خیالات کی ترقی یافتہ صورت ہیں۔ کیونکہ اسحاق (مسیحی عالم) بھی "جنت" کو مقام نور تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ ذیل کے فقرے اس کے مفہوم کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :-

"(جنت میں) نور سے معمور مکانات" "اپنے لئے نورانی مقامات خرید" "وہ (جنتی) حلہ ہائے نور میں ملبوس ہونگے" "ان کے لباس مخصوص نشان کے ہوں گے" وغیرہ۔ وغیرہ ؛

افراتیز کہتا ہے کہ :-

"ان بہشتیوں کو زیورات کے پہننے کی ضرورت نہ ہو گی کیونکہ وہ تو ہمیشہ نور کے لباس پہنے رہیں گے" ؛

———

بہشت کے پھل پھلواری کے متعلق امام غزالیؒ اسلامی تخیل کو اس طرح پیش کرتے ہیں :-

"اللہ تعالے "سدرہ" (بیری کے درخت) کے تمام کانٹوں کو دور کر کے، ہر کانٹے کی بجائے پھل لگا دے گا۔ یہ پھل بہتر قسم کی غذاؤں میں منقسم ہونگے۔ جن میں سے ہر پھل دوسرے پھل سے اپنے لطف و ذائقے

ں مختلف ہوگا"۔

اب دیکھئے کہ افلاطینز جنت کے ریاض و بساتین کے متعلق کیا
ہتا ہے :-

"جنت میں خوبصورت درخت ہیں۔ جن میں ہمیشہ پختہ پھل لگے
ہتے ہیں۔ اُن پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ اُن کی پتیاں شاداب ہیں۔
ن کی مہک روح پرور ہے۔ اور کوئی شخص ان پھلوں کے کھانے سے
بھی سیر اور دل تنگ نہ ہوگا"۔

انسانی مذاقِ طبیعت کے اختلاف کو پیش نظر رکھ کر نعمائے
ہشت میں بھی رنگا رنگی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً امام غزالیؒ فرماتے
یں :-

"اگر تم چاہوگے تو تمہیں یاقوت کا ایک گھوڑا ملے گا۔ اور تم اس
ر سوار ہوکر بہشت کی وسعتوں میں اڑتے پھروگے"۔

امام غزالیؒ کا مذکورہ قول افلاطینز کے قول کی شاندار تعبیر سے
زیادہ نہیں۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ :-

"بہشتیوں کے جسم ہلکے پھلکے ہونگے۔ اور وہ فاختہ کی طرح
پنے اپنے غرفوں میں سے پرواز کرسکا کرینگے"۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ "ہر جنتی کی نظر اس قدر تیز ہو جائیگی
کہ وہ بعید ترین فاصلہ کی چیزوں کو بھی بآسانی دیکھ سکیگا"۔ یہ
بیان بھی افلاطینز کے اس قول کے بالکل مشابہ ہے کہ :-

"بہشت وسیع ہے۔ بے چھت ہے۔ لیکن جنتی اس کے
ہر بُعد کو اس طرح دیکھ سکیں گے گویا وہ قرب ہی ہے"۔

اس ضمن میں یہ علمی حقیقت دلچسپی سے سُنی جائیگی کہ جنت کے
علاوہ اسلامی مفسرین نے دیگر امور عقائد میں بھی مسیحیت سے استفادہ
لیا ہے۔ مثلاً یہ عقیدہ کہ :-

"روح انسانی، پھر قبر کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور جسم کے ساتھ
مبتلائے عذاب ہوتی ہے"۔

اسلام سے بہت پہلے افلاطینز نے اس امر کے متعلق اپنے
خیالات کا یوں اظہار کیا تھا :-

"(مرنے کے بعد سے قیامت تک کا عرصہ رات کی طرح ہوگا)
اور اس طویل رات کی طوالت کا نیکوکاروں کو احساس تک بھی نہ
ہوگا۔ اور یہ تمام طویل عرصہ ان کو ایک گھنٹہ کی مدت جیسا مختصر
محسوس ہوگا ——— صبح صادق جیسے نورانی آثار کے ظہور کے
وقت وہ بیدار ہونگے۔ اور مسرت سی محسوس کرینگے ———
لیکن بدکاروں کی نیند ڈراونے، کابوسی خوابوں سے پریشان ہوگی۔
اور وہ تیز بخار میں مبتلا انسان کی طرح انتہائی کرب و اضطراب
کی حالت میں، قبر میں پڑے کروٹیں بدلا کریں گے، اور طلوع صبح
حشر کے خوف سے ترساں و لرزاں ہوں گے۔ جس صبح کو خدائے
ذوالجلال عقوباتِ معاصی کا حکم سُنائیگا ....
تمام اہلِ قبور انتظارِ قیامت کی طویل رات میں محوِ خواب رہیں گے
اور اس عرصہ میں اُن کو اپنے اعمال کے خوب و زشت کی جزا و سزا
کا مطلق احساس نہ ہوگا۔ یعنی جس طرح نیکوکار اپنے حُسنِ عمل کے
انعام سے بے خبر ہونگے۔ اسی طرح ریاکاروں کو بھی اپنے اعمالِ بد کی
پاداش کا بالکل علم نہ ہوگا۔

یہاں تک کہ قیامت کا دن آپہنچے گا"۔

ایک قدیمی شامی تصنیف میں ہے کہ :-

"روح کی جزا و سزا جسمانی ہوگی۔ کیونکہ روح ایک مدت تک
جسم سے وابستہ رہتی ہے"۔

اسی طرح دیگر مذاہب میں جسمانی عذاب کی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ علاوہ
ازیں ہمیں تو یہ سوچنا چاہئے کہ خیالات اور خصوصیت سے مذہبی خیالات کس طرح
سینہ بہ سینہ تعبیرات جدیدہ و تازگیہائے طرق ادا کیساتھ آجتک ہم تک
پہنچے ہیں۔ اور کس طرح ایک مذہب دوسرے مذہب سے قرابت و تعلق باطن
رکھتا ہے۔ بحیثیت مسلمان کے میرا فرض ہے کہ میں عرض کروں کہ اگر اسلام نے
مسیحیت سے کچھ سیکھا ہے تو یہ اسکی شکی اور بے مائیگی کی دلیل نہیں بنائی جاسکتی
بلکہ اسکے برخلاف یہ اسکی جامعیت اور ہمہ گیری کا روشن ثبوت ہے ———
میں اس مضمون کے ذریعہ کسی مذہبی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد تو
صرف ایک علمی لطیفہ کی طرف اربابِ نظر کی توجہ مبذول کرانا ہے۔

دیکھ اپنی آنکھ کا ظالم کبھی شہتیر بھی

از جناب محمد رفیق صاحب غوری

وہ انگیٹھی کے سامنے کرسی پر بیٹھا خطوط کے ایک انبار کو دیکھنے میں ہمہ تن محو ہے۔ جو کچھ تو اس کے زانو پر، کچھ فرش پر اور کچھ اس کے پاس میز پر پڑے ہیں ؛

کل یہی کمرہ حجرۂ عروس بننے والا ہے۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ لیکن آج۔ آہ آج!! اسکی اضطراب انگیز حالت دیکھنے کے قابل ہے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی فیروزہ اس کے پاس سے اٹھ کر گئی ہے۔ اس کے پیارے پیارے خطوط اس کے سامنے پڑے ہیں۔ جن کے محبت بھرے فقرے دل میں اترے جاتے ہیں۔ اور جو اس دوشیزہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ جس پر وہ جان و دل سے فدا ہے ؛

لیکن وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ وہ اس معاملہ پر اچھی طرح غور کر چکا ہے۔ وہ تمباکو پیتی ہے۔ جسے وہ گوارا نہیں کرتا۔ وہ آگ پھانکتی ہے جس سے اسکی روح جلتی ہے۔ اور آتش شوق ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ وہ اسے سیگرٹ پیتے خود دیکھ چکا ہے۔ اس لئے کسی گواہ کی حاجت نہیں۔ وہ اس کے بہانہ پر یقین نہیں کر سکتا کہ چند شرارت پسند لڑکیوں کے مجبور کرنے پر اس نے ایک آدھ کش لگایا تھا۔ وہ آتش پرست ہے۔ اس لئے مذہبی احترام کی بنا پر اپنی بیوی کو تمباکو پیتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ جان بوجھکر اپنے آپ کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتا۔ وہ اس لڑکی سے رشتہ ازدواج قایم نہیں کر سکتا جو آگ جیسی متبرک چیز کھا جاتی ہو۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسکا انجام کیا ہو گا!

ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ اس نے خطوط کو جلتے ہوئے کوئلوں پر ڈالدیا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے خوشامدانہ انداز میں بل کھاتے ہوئے جل کر راکھ ہو گئے۔ پھر وہ ساغر و مینا کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ہر وقت اسکی میز پر موجود رہتے تھے ؛

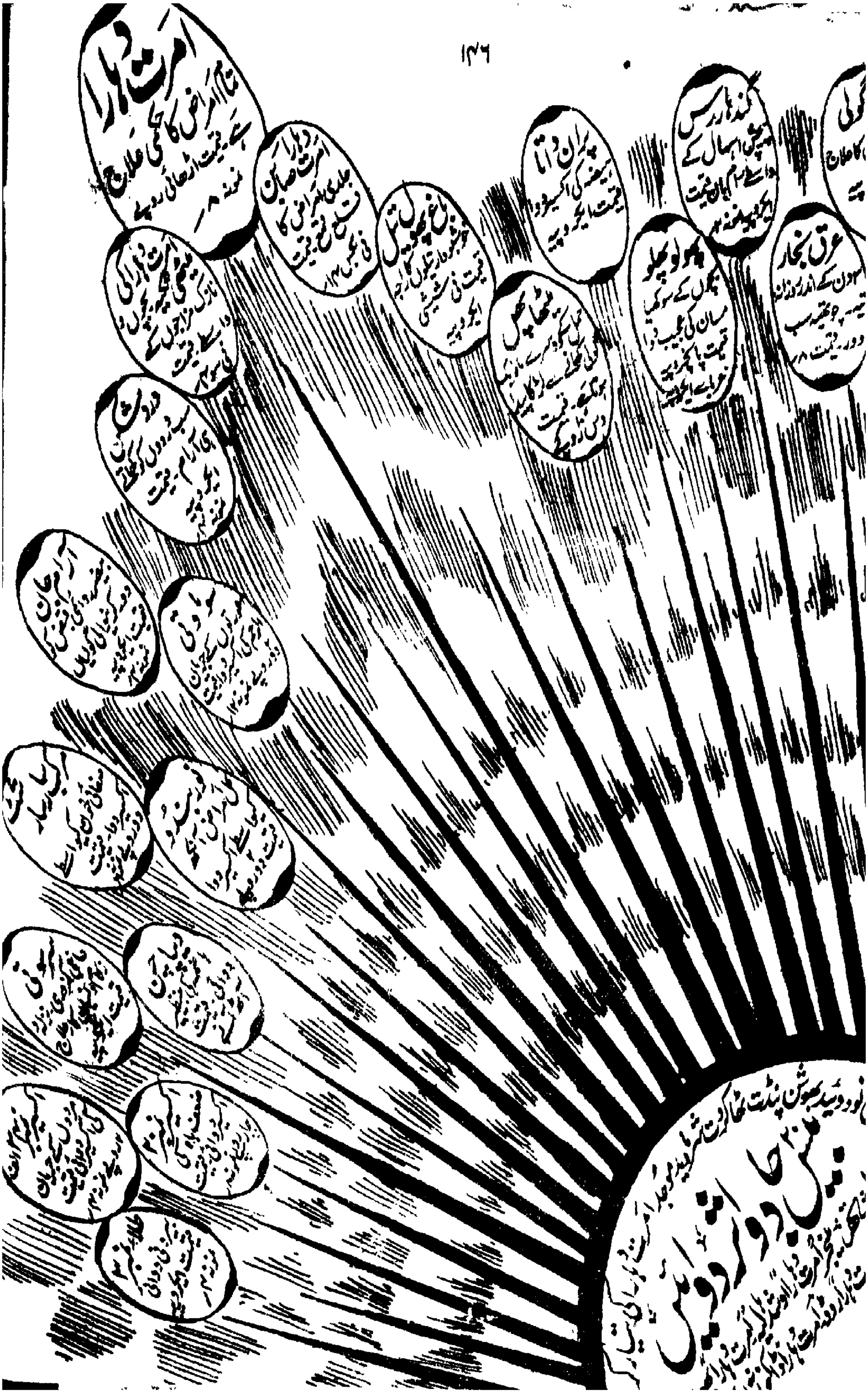
(۲)

کل ہونیوالی دلہن اپنے کمرہ میں آگ کے سامنے بیٹھی ہے۔ اسکے کالے کالے گھونگریالے بال سونے کی کلپ سے لٹککر شانوں پر بل کھا رہے ہیں ایک چھوٹے سے سٹول پر کوئی درجن کے قریب خطوط رکھے ہیں جو رستم جی نے لکھے تھے۔ وہی رستم جی جن پر یہ کبھی ہزار جان سے شیدا تھی ؛

اس نے ان پیارے خطوط کو اٹھایا۔ آنکھوں سے لگایا۔ محبت کی دبی ہوئی آگ روشن ہوئی۔ اور عشق کی نورانی کرنیں اسکی سرمگیں آنکھوں سے پھوٹنے لگیں۔ یہ خطوط اُسے ذی حس نظر آنے لگے۔ جو اس شخص کی سفارش کر رہے تھے۔ جسے وہ اب اپنے دل سے دُور کر چکی تھی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وہ دیوانوں کیطرح اس پر فدا ہوتی تھی اور اسکی الفت کا دم بھرتی تھی۔ ابھی تک پچھلی محبت کا کچھ دھندلا دھندلا سا نقش باقی ہو گا۔ اسی لئے وہ سر جھکا کر خطوط کو ہاتھ میں لئے عشق کا بھولا ہوا افسانہ دہرا رہی ہے ؛

آہ! وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اُسے نشہ کی حالت میں دیکھا ہے۔ اُف کتنا بھیانک منظر تھا ؛ اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ اٹھی۔ وہ شرابی سے شادی نہیں کر سکتی۔ لوگ اسے لاکھ یقین دلائیں کہ یہ محض اتفاقیہ بات تھی اور یہ اسکی عمر میں پہلا موقع تھا کہ ایک جلسہ میں اسکے دوستوں نے اسے زبردستی شراب پلائی۔ لیکن وہ اسے کیسے مان سکتی ہے وہ اسے خود نشہ کی حالت میں دیکھ چکی ہے۔ اس لئے اپنی قسمت ایک شرابی کی تقدیر سے وابستہ نہیں کر سکتی ؛

گرم گرم آنسو اسکی آنکھوں سے نکل کر خطوط پر گرے۔ جنہیں اس نے دہکتے ہوئے شعلوں کی نذر کر دیا۔ پھر اُس نے ایک سنہری سیگرٹ کیس میں سے سیگرٹ نکال کر مُنہ میں رکھ لیا جو ہر وقت اسکی جیب میں رہتا تھا ؛


امرت دھارا
تمام امراض کا حکمی علاج
قیمت اڑھائی روپیہ
عرق بنجار
پھولو پھلو
گندھک رس
امرت دھارا اشتہار



عید کا چاند -

ANUPBANS PRESS BLOCK MAKERS
& PRINTERS ANARKALI LAHORE

انتقام

از جناب غازی فیروز ابراہیم صاحب

ڈاکٹر ضیا نے مسکرا کر کہا۔

"میرے نشتر کی نوک جس وقت مصروفِ عمل ہوتی ہے تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ لیکن جس وقت اس عمل کا موقعہ نہیں ہوتا تو پھر میں اپنی نوکِ زبان کو استعمال میں لاتا ہوں۔ ان ہر دو میں سے شاید موخر الذکر کو میں زیادہ پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ زبان کا زخم نشتر کی کاٹ سے زیادہ گہرا اور غیر مندمل ہوتا ہے۔"

یہ الفاظ ڈاکٹر نے بڑے تحمل سے ادا کئے لیکن اس تحمل نے ان کو اور زیادہ خوفناک ظاہر کیا۔

نسیمہ۔ کیا آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر ضیا ہاں! جس وقت لوگ مجھے "جلاد ڈاکٹر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تو یقیناً وہ مبالغہ نہیں کرتے کسی انسان کی آنکھوں میں آنسو اور خصوصاً وہ آنسو دیکھ کر جو میری نوکِ نشتر یا نوکِ زبان کا نتیجہ ہوں۔ میرے دل میں ایک خوشی کی لہر اُٹھتی ہے۔ اور یہی میری زندگی کا انتہائی مقصد ہے۔

نسیمہ کسی انسان کو تکلیف دے کر خوش ہونے کی وجہ؟ دیکھئے میں اپریشن کا کوئی کیس نہیں لیتی۔ جراحی میں میرا ہاتھ ہی نہیں چلتا۔

ڈاکٹر ضیا (مسکراتے ہوئے) بنی نوع انسان نے مجھ سے ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ میں مردم گزیدہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میری زبان اور نشتر ہر وقت مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ سنئے میں آپ کو اپنی سرگذشت سناتا ہوں

"میں نے اوائل عمر میں ڈاکٹری کا ڈپلومہ حاصل کرلیا۔ میں اپنے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ میری ہم جماعت ایک دوشیزہ مجھ کو محبت کرنے لگی۔ وہ میری مشتاق تھی۔ مجھ سے بہت محبت کرتی۔ پہلے تو میں اُسے ٹالتا رہا۔ لیکن بتدریج اس کی خوبصورتی۔ اظہارِ محبت اور درد دل نے میرے دل پر اثر کیا۔ یہ اثر گہرا ہوتا گیا اس نے طالب علمی کے زمانہ میں مجھے اپنے خون سے خط لکھے۔ میں نے اسکا امتحان لیا جس میں وہ پوری اُتری۔ لیکن اس امتحان کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپنا دل کھو بیٹھا۔"

خدا جانے کیا وجہ تھی کہ ڈاکٹر کی پُرانی محبت کا تذکرہ سُنکر نسیمہ کا رنگ اُڑ گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈھلکنے لگے۔

"میں ایک کامیاب ڈاکٹر کا معاون بن گیا۔ اور تھوڑی ہی مدت میں مجھے کافی شہرت حاصل ہوگئی۔ میں نے چند ایک ایسے مریضوں پر کامیاب عمل جراحی کیا۔ جن کو بڑے بڑے کامیاب ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مجھے خاص طور پر بلانے لگے۔ میرا چیف جن کا میں معاون تھا مجھے حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ وہ میری شہرت اور کامیابی پر جلتا تھا۔ ایک بار جبکہ اُس نے ایک مریض کو لاعلاج سمجھ کر جواب دے دیا تو اس کے اعزہ نے مجھے بلایا۔ میں نے علاج کیا اور کامیاب ہوا۔ بس یہ آخری غلطی یا قصور تھا۔ جس کو اُس نے نہ بھلایا اور نہ معاف کیا۔

ایک دن مجھے ایک امیر گھر میں بلایا گیا۔ وہاں مجھے ایک معصوم بچے کے گلے پر اپریشن کرنا تھا۔ اپنے اکلوتے لاڈلے بچے کے لئے انہوں نے مجھے بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا۔ اپریشن کامیاب ہوا۔ لیکن میرے اُس چیف ڈاکٹر نے وہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ پٹی میں ملازموں سے کچھ ڈلوا دیا اور بچہ بارہ گھنٹے کے اندر اندر مرگیا"

بچے کے والد نے مجھ پر مقدمہ دائر کیا اور میرے چیف نے میرے خلاف لاپرواہی کی گواہی دی۔ اگرچہ میں بری ہو گیا۔ لیکن میری شہرت خاک میں مل گئی۔ اس واقعہ نے مجھے لوگوں کی نظروں سے بھی گرا دیا۔ اب مجھے اس کے سوا کوئی علاج نظر نہ آیا کہ میں اس شہر کو چھوڑ دوں۔

اس حسینہ نے بھی مجھ سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے۔ میں نے اس کے سامنے خون سے لکھا ہوا خط پیش کیا۔ اس نے کہا "وہ خون اب سفید ہو گیا ہے"۔ میں نے گذشتہ ایام کی یاد دلائی۔ وہ بولی "یہ وہ وقت نہیں"

نسیمہ۔ تو کیا آپ کے چیف ڈاکٹر کی گواہی نے آپ کو "جلاد ڈاکٹر" بننے پر مجبور کیا؟

ڈاکٹر ضیا۔ کیا یہ کافی نہیں؟ مجھے اپنی بربادی کی ذرا پرواہ نہیں لیکن وہ ذرائع جو مجھے برباد کرنے کے لئے اختیار کئے گئے تھے۔ ایسے نہیں کہ میں بھول جاؤں۔ اس نے مجھے برباد کرنے کے لئے جھوٹی قسم کھائی ایک معصوم بچے کو تلف کیا ...... میں اپنا گناہ تو معاف کر سکتا ہوں لیکن اس معصوم کا بدلہ ضرور لے کر چھوڑوں گا۔ کیونکہ اسکا علم صرف مجھے ہے اور یہ فرض مجھی پر عائد ہوتا ہے۔

نسیمہ۔ ہاں تو آپ نے پھر کیسے کام شروع کیا۔ اور موجودہ شہرت کیونکر حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر ضیا۔ میرے دوست ڈاکٹر مولراج اور ڈاکٹر حسین نے میری بہت مدد کی۔ وہ میری حالت کو دیکھ کر دل ہی دل میں جلتے تھے آخر انہوں نے مجھے معقول پونجی دی مجھے کسی دوسری جگہ جا کر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر میں اس شہر میں چلا آیا۔ یہاں میں نے بہت محنت سے کام کیا۔ بخت یاور تھا ..... آج آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں وہی ڈاکٹر ضیا ہوں جو آج سے بیس سال قبل جیوری کے سامنے مجرم کی حیثیت سے کھڑا تھا ......

آج میری شہرت آپ کے سامنے ہے ... ہاں اس بات کو بیس سال ہو گئے ... لوگ اسے بھول چکے ہیں لیکن مجھے ابتک یاد ہے۔

نسیمہ۔ اور تمہاری اُس معشوقہ کا کیا ہوا

ڈاکٹر ضیا۔ اُس نے اُس ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ جس نے میرے خلاف جھوٹی قسم کھائی تھی۔

نسیمہ۔ تو کیا آپ اسی لئے "جلاد ڈاکٹر" بن گئے۔

ڈاکٹر ضیا۔ ہاں اُس دغاباز عورت نے میرے دل کو صدمہ پہنچایا تو اُس چیف ڈاکٹر نے میری روح کو تکلیف دی۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں "جلاد ڈاکٹر" بننے پر مجبور ہوا ...... آہ خوبصورت معصوم بچے کی موت ...... انسان کسقدر ظالم ہے ...... ظالم ترقی کرتا ہے ...... میں "جلاد ڈاکٹر" بنا میں نے ترقی کی .. .. میں نے عہد کیا ہے میں ضرور انتقام لوں گا ...... بدلہ ...... نقد بنقد ...... میری اپنی موت میں کونسی کسر باقی تھی ....

نسیمہ سہم گئی۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ڈاکٹر سے آنکھیں ملا کر کہنے لگی۔ شرافت اس بات کی مقتضی ہے کہ آپ انتقام کے موقعہ پر درگزر اور عفو سے کام لیں اتنی سی بات آپ کو معراج پر پہنچا دیگی (مسکرا کر) کیا آپ مجھے خوش کریں گے۔

ڈاکٹر ضیا۔ نسیمہ! اب میرے سینہ میں دل نہیں۔ پتھر ہے۔ میں نے محبت کو بیس سال ہوئے خیرباد کہہ دیا تھا لفظ "محبت" سے مجھے نفرت ہے۔

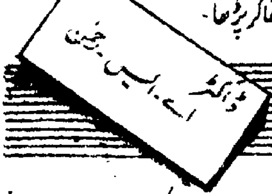
نسیمہ۔ ضیا صاحب یاد رکھئے۔ محبت ان بیس سالوں کے بعد ایک طوفان بنکر اُٹھے گی۔ اور مجھے یقین ہے اس وقت آپکا آغوش اس کے لئے کھلا ہوگا ...... یہ کہہ کر نسیمہ مسکرائی اور کمرے سے نکل گئی ......

نوکر۔ جناب عالی! ایک صاحب آپ کو ملنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر کو ابھی خبر کرو مریض کی حالت نازک ہے۔

ڈاکٹر۔ میں آدھی رات کو کہاں جاؤں۔ جاؤ کہدو صبح تشریف لائیں

نوکر تھوڑی دیر بعد پھر آیا اور ایک کارڈ میز پر رکھ کر بولا "جناب وہ کہتے ہیں کہ مریض کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ابھی اپریشن

نہ ہوا تو مریض کی جان کی خیر نہیں۔
ڈاکٹر نے کارڈ اٹھا کر پڑھا۔



اوہ! میرا چیف..... میری بربادی کا موجب..... میری جنت پر ہاتھ ڈالنے والا..... میرے اللہ اب میری باری آئی..... میری مدد کر.......

اتنے میں ڈاکٹر رحمٰن خود بخود کمرے میں آ داخل ہوا۔ اور ڈاکٹر ضیا سے کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب بدقسمتی سے یہ تاہل کا موقعہ نہیں۔ میری اکلوتی بچی مر رہی ہے۔ اگر ابھی ایک گھنٹہ کے اندر اندر اس کے گلے کا اپریشن نہ ہوا تو دم گھٹ کر مر جائیگی۔ خدا کے لئے جلدی کرو۔

ڈاکٹر ضیا۔ آپ کی لڑکی کے گلے پر اپریشن کرنا ہے..... اس کی زندگی اور موت میرے جانے یا نہ جانے پر منحصر ہے" یہ کہہ کر ڈاکٹر ضیا نے ایک قہقہہ لگایا۔

ڈاکٹر رحمٰن۔ میرا خیال ہے آپ انکار نہیں کریں گے۔ خدا کے لئے جلدی کرو— باہر ٹیکسی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

ڈاکٹر ضیا کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اُس نے ڈاکٹر رحمٰن کو گھور کر دیکھا اور کہا۔

"ڈاکٹر رحمٰن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میں تمہاری لڑکی کا اپریشن نہیں کروں گا۔ بلکہ میں جا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر رحمٰن اے خدا..... کیوں نہیں؟ میری امیدوں کا سہارا۔ میری اکلوتی بچی مر جائے گی.... ڈاکٹر! کیوں کیا وجہ ہے۔

ڈاکٹر ضیا۔ مجھے غور سے دیکھو۔ پہچانو۔ جب پہچان لو گے تو یہی تمہارا جواب ہوگا۔

ڈاکٹر رحمٰن غور سے دیکھنے لگا پھر ایک دم پیچھے ہٹ کر دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا" اے میرے اللہ..... ڈاکٹر ضیا..... کیا تم ہو۔

یہ سنکر ڈاکٹر ضیا نے پھر قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

"ڈاکٹر رحمٰن میں آپ کی لڑکی کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہوں سنئے... لڑکی کے والد اور والدہ کی دغا بازی بیس سالہ مہلک انتقام سے عرق میں گھول کر ایک ایک گھنٹہ بعد پلاؤ اور اُس کا اثر اپنی آنکھوں سے اس کے سرہانے بیٹھ کر دیکھو...

ڈاکٹر رحمٰن ہمارے گناہوں کا بدلہ ہماری لڑکی سے نہ لو..... خدا کے لئے چلو۔

ڈاکٹر ضیا۔ ہاں ازل سے یہی دستور ہے والدین کے گناہوں کا کفارہ اولاد ادا کرتی ہے۔ تمہیں وہ وقت یاد ہے جب تم نے مجھے برباد کرنے کے لئے ایک معصوم بچے کی جان لی تھی۔ تمہیں نے مجھے یہ راستہ دکھایا ہے۔

ڈاکٹر رحمٰن۔ ڈاکٹر ضیا! وہ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ انیس سال کی پلی پوسی..... آہ

ڈاکٹر ضیا۔ تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔

ڈاکٹر رحمٰن۔ ضیا خدا کے لئے رحم کر۔ میری بچی کی جان بچ جائے تو پھر میں حقیقت کو بے نقاب کر دوں گا۔ ضیا میری لڑکی کی جان تیرے ہاتھ ہے اُسے موت کے منہ سے بچا لے..... (یہ کہہ کر وہ رونے لگا)

ڈاکٹر ضیا میں نے تمہیں جواب دیدیا ہے اب جاؤ۔

ڈاکٹر رحمٰن کے بدن پر اب رعشہ طاری تھا۔ وہ لڑکھڑا کر کمرے سے باہر نکلا اور چلا گیا۔

ڈاکٹر ضیا خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ نسیمہ کو کیونکر بتائے...... اُس نے انتقام لے لیا۔ آج سے دو ماہ قبل میں نے نسیمہ سے کہا تھا کہ میں انتقام لے کر چھوڑوں گا...... یکایک اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا..... اس نے کچھ سوچا...... جھٹ بیگ اٹھا کر کمرے سے نکلا...... بازار میں کوئی سو گز کے فاصلہ پر ٹیکسی کھڑی تھی۔ ڈرائیور کو پتہ بتایا اور جلدی چلانے کی تاکید کی.... موٹر پوری رفتار سے جا رہی ہے..... ڈاکٹر رحمٰن کا مکان...... مسٹر رحمٰن میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے میں آپ کی لڑکی کا اپریشن کروں گا۔ ڈاکٹر رحمٰن

خاموشی سے ڈاکٹر ضیا کو لے کر لڑکی کے کمرہ میں آیا۔ ڈاکٹر ضیا نے لڑکی کو دیکھ کر ہلکی سی چیخ ماری اور ڈاکٹر رحمٰن کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا کیونکہ مریضہ باوجود زرد رو اور نحیف ہونے کے ڈاکٹر ضیا کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے لئے پھیلا دیئے۔ اس کی ماں اس کے سرہانے کھڑی رو رہی تھی ...... مریضہ نسیمہ ہی تھی۔

ڈاکٹر ضیا نے جھک کر نسیمہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

اپریشن کامیاب ہوا۔ نسیمہ چند ہی دنوں میں تندرست ہو گئی۔

شام کا وقت ہے۔ نسیمہ اور ڈاکٹر ضیا باغ میں چہل قدمی کر رہے ہیں یکایک نسیمہ ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

ضیا صاحب کیا میں کل سے اپنے مریضوں کو دیکھا کروں۔ اب میں تندرست ہوں۔

ڈاکٹر ضیا۔ ضرور! اور ایک مریض تو اب بھی آپ کا انتظار کر رہا ہے۔

نسیمہ۔ کیوں! اسے کیا ہے؟

ڈاکٹر ضیا۔ اس کے سینہ میں دل کی جگہ پتھر تھا۔ آپ نے اس کا اپریشن کیا اور اصلی دل اس کی جگہ رکھا۔ اس نے اپنے ہر دو نشتر توڑ دیئے ہیں۔ اب وہ آپ سے مرہم مانگنے آیا ہے۔

آج ہی شب سے مسلمانوں کے گھر گھر عید ہے

خیر مقدم ہلال رمضان المبارک

عید نمبر کیلئے

مرحبا! اہلاً وسہلاً! اے ہلال ماہ صوم | تیرے مقدم پر نچھاور کر دوں اکل و شرب و نوم
تو کلید باب رحمت بن کے نکلا چرخ پر | نفس بد کو خنجر براں مگر آیا نظر
کوکب ایمان مسلم کی چمک تیری ضیا | ابروئے خمدار تیرا، انکی محراب دعا
رحمت حق کا فلک سے یہ اشارہ ہو گیا | لو! وہ روشن دیدۂ مسلم کا تارا ہو گیا
تو جو یوں خالق کے آگے جھک گیا تسلیم کو | دیکھ! کتنی انگلیاں اٹھیں تری تکریم کو؟
اس ادا کے لیے تو آیا ہے فرمان صیام | ہاتھ میں تیرے ہے گویا بادۂ رحمت کا جام
پھر تو چمکے تو نظر آنے جو گھبرائے ہوئے | تو نہیں لینے کو نکلا گود پھیلائے ہوئے
موج عصیاں سے بچانے کو ہے کشتی، اے ہلال | قمری اسلام کا طوق بہشتی، تو ہلال
اس کے ڈھونڈنے میں تو نگاہیں انکی اُٹھا | لیکے نکلا مومنوں میں بانٹنے کو جابجا
سال بھر سے منتظر تیرے تھے سب اہل تمیز | آ گلے سے ہم لگا لیں تو ہے مہمان عزیز
دیکھ کر جلوہ ترا ہر آنکھ محو دید ہے | آج ہی شب سے مسلمانوں کے گھر گھر عید ہے
آسماں کی تیری آمد سے جو زینت بڑھی | اس زمیں پر بھی خدا کے گھر کی آرائش بڑھی
تیری آمد سے ہوا ایمان والوں پہ عیاں | آ گیا مسلم کا اب لا نہ وقت امتحاں
تجھ کو آتا دیکھ کر ساغر بکف ماہ صیام | بزم ایماں میں چھلکنے لگ گیا فرحت کا جام

دیکھے قابل ہے ہر مومن کا ذوق اہتمام | آج سے بدلا مسلمانوں کے کاموں کا نظام
کھانے پینے جاگنے، سونے کی سب طرز عمل | اے مہ صوم آتے ہی تو نے دیے سب کچھ بدل
تیری آمد سے ہر اک گھر میں سحر خیزی ہوئی | جوش ایماں سے رگوں میں خون کی تیزی ہوئی
نفس سرکش کے قدم اب کچھ نہ کچھ رکنے لگے | کتنے سر حق کی عبادت کیلئے جھکنے لگے؟
تیرے آنے سے ملیں دونوں جہاں کی نعمتیں | روزہ داروں پر ہوئیں نازل خدا کی رحمتیں
دن کو روزوں سے رضائے حق ہے تیرے سبب | اور تراویحوں سے شب کو رحمت محبوب رب
جب کبھی آیا ہے خالی ہاتھ کب آیا ہے تو؟ | خوان نعمت بھی خدا کے پاس سے لایا ہے تو
اپنے اپنے طور پر پاتے ہیں لطف بے قیاس | تیرے آ جانے سے دینداروں کے اعضا و حواس
ہے دہن کو لذت افطار اور لطف سحور | مژدۂ دیدار حق سے دل کو حاصل ہے سرور
دیدۂ حق بیں کو اب نظارۂ مصحف ہے عام | اور تلاوت سے زباں بھی ہو رہی ہے شادکام
لطف سے محروم کب رکھا ہے تو نے کان کو؟ | ہر مسلماں سن رہا ہے شوق سے قرآن کو
تیرے آنے سے ملا ہے دل کو رقت کا مزا | اور اعضا و جوارح کو عبادت کا مزا
دن تو کیا شے ہے؟ مہینے بھی اگر ہوں اک ہزار | ہم تو تیری ایک شب کی قدر پر کر دیں نثار
منزلت تیری ہمارے دل سے کوئی پوچھے | تجھ کو خوش رکھیں خدا اسکی ہمیں توفیق دے

حبذا! خوش آمدی، خوش باش اے ماہ صیام

کن پذیرا از دل مشتاق حافظ صد سلام

بچھڑے ہوئے نورِ نظر کی یاد

اللہ دکھائے نہ الم نورِ نظر کا | جو بہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب و جگر کا

آہ۔ ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے گذر گئے مگر او جدا ہو جانے والے تیری پیاری صورت مجھے نظر نہ آئی۔ تو تو ایک لمحے کو بھی جدا ہونا نہ چاہتا تھا پھر اب تجھے کس طرح صبر آگیا۔ آہ میں تجھ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مایوس ہو گئی ہوں۔ میری جان کیا سچ مچ تو مجھ کو نظر نہ آئیگا۔ کیا واقعی اب میں تیری میٹھی آواز نہ سنوں گی۔ نہیں نہیں میرے پیارے بابو میاں تو ایسا بے وفا نہیں۔ تو ضرور آئیگا اور میرے بیتاب اور غمزدہ دل کو تسکین دیگا اور روٹھ جانیوالے کاش تو آکر میری حالت دیکھے کہ تیری جدائی نے کیا حال کیا ہے کوئی گھڑی کوئی لمحہ تیری یاد سے خالی نہیں اس دنیا کے جھگڑے جبتک دم میں دم ہے چھوٹ نہیں سکتے۔ مگر ہاں یہ تمام باتیں تیری یاد کو کم نہیں کر سکتیں۔ تو میرے غنچۂ دل میں خوشبو کی طرح پوشیدہ ہے۔ تو میرے صفحۂ دل پر ایک ایسا نقش ہے کہ روزگارِ زمانہ اُس کو مٹانے سے عاجز ہے۔ سورج کا نکلنا ہوا کا چلنا پھولوں کا کھلنا یہ سب تیری یاد کو تازہ کرتے ہیں رات کو فراغت پاکر جب بستر پر لیٹتی ہوں تو تیری پیاری صورت میری آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ تیری پیاری پیاری باتیں دل میں چٹکیاں لیتی ہیں۔ میں آنکھ بند کر لیتی ہوں کہ شاید تو نظر آجائیگا۔ ہاتھ پھیلاتی ہوں یہ سمجھ کر کہ تو آرہا ہے مگر آہ تیرے خیال نے مجھے چونکا دیا کہ وہ کہاں۔ چاندنی رات تھی بادلوں کے ٹکڑے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ میں نے بادلوں سے پوچھا کہ میرے گم گشتہ ہیرے کو کہیں دیکھا ہے مگر وہ منہ موڑ کر کہیں چل دیے پھر چاند کیطرف دیکھ کر کہا کہ میرے چاند کی خبر ہے اس نے بھی سرد مہری کی بادلوں میں منہ چھپا لیا اے شبنم تو ہی بتا دے کہ میرا موتی کہاں پڑا ہے۔ آہ وہ بھی آنسوؤں سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہی ہے میں نے تجھے پھولوں میں تلاش کیا تو وہاں بھی نہ ملا تیری نازک کلیاں پھولوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نظر آئیں اور میرے غمگسار آکر دیکھ تیرے فراق میں تڑپ رہی ہوں۔ تیری جدائی میں آنکھیں اشکبار ہیں۔ آہ اب تو کیوں نہیں آتا۔ تو تو اپنی پیاری پیاری باتوں سے ان کو خوش رکھتا آہ میرا کلیجہ تو پتھر کا ہو گیا کہ اپنی آنکھوں سے تجھے دم توڑتے دیکھا۔ مگر اے راحت دل و روح تو نے بھی اپنا دل سخت کر لیا کہ مجھے تڑپتا چھوڑ کر چلا گیا۔ آہ او جانیوالے۔ جدائی نے پہلا ایک رنگ دکھایا

یہ دنیا فانی یہ زندگی چند روزہ پھر اس عارضی جدائی پر اسقدر واویلا کیوں اتنی بیتابی کیسی۔ ہاں سچ ہے کہ سب کو مرنا ہے موت لابدی ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ہے مگر آہ عمر ہی تیری ہوتی موت کا صدمہ ہے تیرے اس دنیا کو ناشاد نامراد جانیکا۔ آہ اے مرنیوالے یہ کھیلنے کی فصل تھی مرنے کے دن نہ تھے۔ اسکا افسوس نہیں کہ بہار کے بعد خزاں کیوں آئی کوئی غم نہیں کہ پھول کھل کر فضائے عالم کو معطر کر کے مرجھا گیا مقام حسرت نہیں۔ کہ پیر صد سالہ اس دار فانی سے رخصت ہوا آہ ماتم ہے اس کلی کا جو بہار سے ناآشنا ہے اس گلشن ہستی سے ناپید ہوا۔ وہ ہونہار غنچہ جو کھل کر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ریاضِ ہستی کو معطر کرنیوالا تھا۔ آہ بادِ صرصر کے تند جھونکوں نے خاک میں ملا دیا۔ اے موت اے ظالم موت تیرا کوئی وقت مقرر نہیں۔ آہ تو نے میرے غنچۂ امید کو پامال کر دیا۔ آہ تجھے اُس کی بھولی صورت پر رحم نہ آیا اس کے ارمان بھرے دل پر اس کی امنگوں پر ترس نہ آیا اُف وہ محبت کا پتلا مجھے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تو نے زبردستی الگ کر دیا اسکی خوبصورت آنکھوں کو جو میری طرف دیکھ رہی تھیں ہمیشہ کیلئے بند کر دیا آہ اب میری آہ و زاری نے اس کو نہ جگایا میرے تڑپنے نے اُسے خبردار نہ کیا اس کا نرم و نازک جسم خاک میں مل گیا۔ وہ چھوٹا سا قد اور وہ چمکتے ہوئے رخسار وہ چاند سی پیشانی۔ مطلعِ انوار وہ ابروئے خمدار وہ آنکھیں جنہیں دیکھ کے دشمن بھی پیار کریں تیغِ اجل نے اک آن میں سب کو خاک میں ملا دیا

پھول تو کھل کر بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

میرے نورِ نظر یہ آنکھیں جو تجھے پھولتے پھلتے دیکھنا چاہتی تھیں اب تجھ کو خاک میں ملا ہوا دیکھ رہی ہیں۔ تیرا اس دنیا میں آنا تیری باتیں اب ایک افسانہ بن گئی ہیں۔ مگر ہاں اب تو تو میری روح کی غذا ہے۔ تیری یاد بھلانے کو نہیں تیرا غم غلط کرنے کیلئے نہیں بلکہ اس کو سینے سے لگا کر دل میں چھپا رکھوں گی جس طرح سے تو میرا دل بہلاتا تھا اب تیری یاد تنہائی میں میری مونس ہے۔ یہاں تک کہ تو بھی ہمارے درمیان کر مفارقت کا پردہ اُٹھائے۔ اے میرے مولا میں تیری رضا پر راضی ہوں اگرچہ یہ آنکھیں خون کے آنسو رو رہی ہیں مگر سر تسلیم خم ہے تو بھی توفیق دے کہ میں تیری منشا کے ماتحت یہ فانی زندگانی گذاروں اور جب بلائے تو لبیک کہنے کیلئے تیار رہوں۔ فقط

ہلال عید

حافظ محمد رحیم چمن دہلوی

میں ساحل دریا پر قدرت کے دلفریب اور خوشگوار مناظر میں مدہوش تھا۔ فضائے ارضی میں سکوت تھا۔ کبھی کبھی ہوائے مغربی کے سرد اور خنک جھونکے ہمہ نغمہ اور ہمہ موسیقی پیدا کر دیتے ؛

صحرا خاموش تھا۔ مگر کبھی طیور کی سرود در کنار صدائیں خلائے سماوی کو نغمہ زار بنا دیتے۔ میں سطح آب پر حباب کا کون و فساد دیکھتا۔ تو انقلاب روزگار کا ایک بہترین مرقع پیش نظر ہو جاتا۔ جب دریائی شور انگیز باں سامعہ نواز ہوتیں۔ تو کسی فریادی عشق کا خیال دل میں گذر جاتا۔ اس وقت میرا وسیع تخیل حدوث ایام کے ناپیدا کنار محیط میں غرق تھا۔ جب میں قیودات انسانی پر عمیق نگاہیں ڈالتا۔ تو میرے جسم میں ایک برقیت سرائیت کر جاتی اور میں ہمتن بے اختیار ہو جاتا ؛

اس وقت آفتاب اپنے دور دراز سفر کی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اس کا تابناک اور منور چہرہ سفر کی غیر قابل برداشت صعوبتوں سے زعفران زار بنا ہوا تھا۔ جس کے عالمگیری اثر نے افق خاور کو شفق رنگ بنا دیا ؛

ماہتاب کی ٹھنڈی اور دلفریب چاندنی کی یاد اس کو کپکپا رہی تھی۔ اور وہ اپنا زعفرانی چہرہ لئے ہوئے جلد سے جلد مغرب میں چھپ جانے کی امکانی کوشش کر رہا تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا آفتاب کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تاریکی ہر چہار طرف پھیلنے لگی لیکن میری آنکھیں ہلال عید کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ آخر میں نے اس کو تلاش کر لیا۔ وہ آیا۔ اس کی ہلکی روشنی آسمانی فضا میں مسکرا رہی تھی۔ اور اسکی فرحت بخش اور دلفریب چاندنی نے زمین آسمان اور تمام موجودات عالم میں ایک کیف پیدا کر دیا تھا۔ دریا کی لہریں سرور آگیں ادا سے ترنم و دلربائی کے ساتھ بہ رہی تھیں۔ ہواؤں میں سرور تھا۔ جن کے چھیڑ سے درختوں کی سبز پوش نازک نازک شاخیں جھوم رہی تھیں۔ سر بفلک پہاڑ اس پر کیف بہار میں نقش حیرت بنے کھڑے تھے۔ شہروں میں عالیشان اور خوش منظر عمارتیں مسرور تھیں۔ گویا قدرت نے مسرت کی بارش کا آغاز کر دیا تھا۔ آخر وفور شوق کے پے در پے تقاضوں نے مجھے مجبور کر دیا۔ اور میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا :۔

" اے نیلگوں بام فلک سے جھانکنے والے ہلال ! تیری روشن صورت بیشمار آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور ہے۔ گو تو خاموش ہے لیکن ہمارے ماہوسانہ چہرے تیری دید اور جستجو میں سال بھر بے چین رہتے ہیں۔ لیکن اے منازل ماہ کو بسرعت طے کرنیوالے تیز گام جب تیرا روشن اور شاداب ابروئے خمدار گلستان دہر کی وادیوں میں نظر آ جاتا ہے۔ تو وہ غمگین انسان جو دنیا بھر کی گوناگوں خوشیوں سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ صرف تجھے دیکھ کر مسرت و کامرانی سے ہم آغوش ہو جاتا ہے " ؛

وہ بولا :۔

" اے مسرور انسان ! یہ مانا کہ تو مجھے دیکھ کر مسرت و کامرانی سے ہم آغوش ہو گیا ہے۔ لیکن ذرا ان حرمان نصیب شخصوں کی بھی رائے لے۔ جو عید کی خوشی میں ضرور سرشار رہیں۔ لیکن کل ان کے پاس پہننے کیواسطے کپڑے نہ ہونگے۔ اور نہ خورد و نوش کیلئے کچھ دام ——— اور ذرا ان سے بھی جاکر پوچھ جو بوسیدہ جھونپڑیوں میں پڑے ہوئے تین تین وقت سے بے آب و دانہ ہیں " !

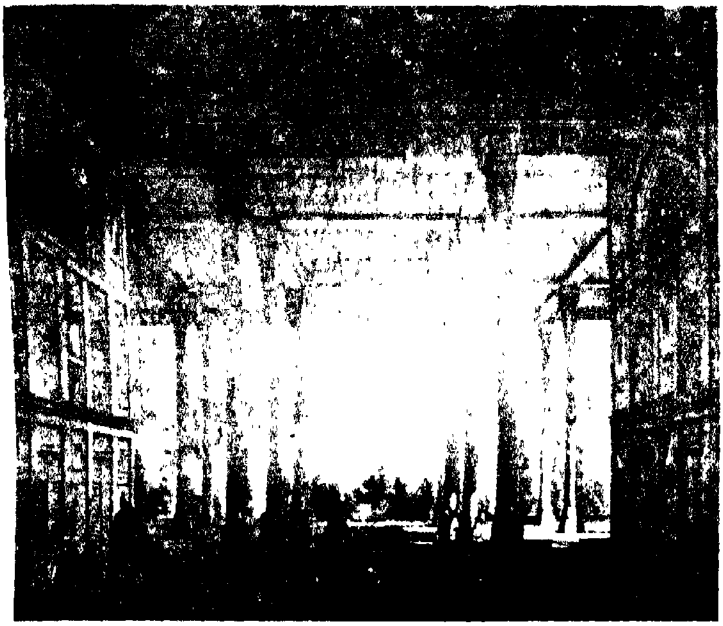
میں نے ہندوستان کی بدنصیبی پر سرد آہ کھینچی ؛

اس نے پھر کہنا شروع کیا :۔

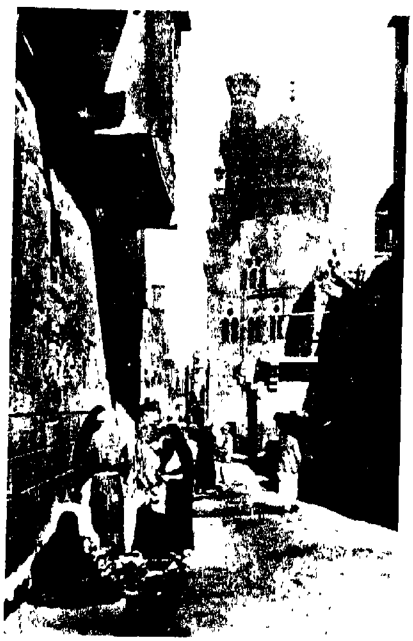
" اے کم نصیب انسان افسوس ! ——— ان عبرت افسوس کرنا بے سود ہے۔ ہر ایک چیز یکساں نہیں رہتی۔ مجھے دیکھو کہ ماہ تمام

محرم میں رنج و الم کی دعوت کا پیغام پہنچاتا ہوں۔ اور کبھی میرا افق پر نمودار ہونا کسی خوشخبری کی علامت ہوتی ہے۔ میرا پیغام اس کم ہمت انسان کو بھی جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے کل کا انتظار کر رہا تھا۔ معلوم کرتے کہ کل کی بجائے آج اور آج کی بجائے ابھی کمر ہمت کس لے۔ اگر اس نے افسوس کرنے کی بجائے عمل شروع کر دیا۔ تو پھر یہ عید اس کے لئے حقیقتاً عید ہے ـــــــ اور اُن مغرور انسانوں سے بھی کہدے۔ جو غرور کیوجہ سے کبھی سر نیچا نہیں کرتے۔ کہ وہ مجھے دیکھیں کہ شہنشاہ شب کے معزز لقب سے ملقب ہوں لیکن دنیا والوں کے سامنے اپنے پیکر نوری کو کمان خمیدہ کیطرح جھکا کر نہایت عجز و انکسار سے اپنی خدمات پیش کر دیتا ہوں۔ اور آج عالم اسلامی کیلئے نوید مسرت یا عید کے جشن و انبساط کا پیغام لایا ہوں"

عید کے تحفے



چهل ستون اصفهان



مصر کی ایک مشہور مسجد جو آسمانی مسجد
کے نام سے مشہور ہے۔

گمشدہ تارے

از جناب امیر حبیب اللہ خاں صاحب نظامی!

"جناب!" میرے نوکر نے اندر آکر کہا۔ اُس وقت میں ایک بند کا چوتھا شعر لکھ رہا تھا۔ "دو فرشتے آپ کو ملنے آئے ہیں!"

"تمہیں انہوں نے اپنے نام نہیں بتائے؟"

"جناب ایک کا نام سیفائیل ہے اور دوسرے کا ریفائیل"

بلاشبہ یہ دونوں فرشتے تھے ——— میں نے نوکر کو انہیں اندر لے آنے کے لئے کہہ دیا۔

ان نورانی ہستیوں کو مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ان کے سفید بازو بہت بڑے بڑے اور شاندار تھے اور ہر ایک بازو میں سات چھوٹے چھوٹے پر لگے ہوئے تھے۔ جن کے نیچے اُن کی جلد کے خوشنما رنگ بالکل اسی طرح چمک رہے تھے۔ جس طرح علی الصباح ہلکی ہلکی کہر میں سے قوس قزح کے سات رنگ نظر آتے ہیں۔ اُن کا نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا جسم صاف شفاف برف کی طرح تھا۔ جس میں بہت ہلکا گلابی رنگ ملا ہوا تھا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا ——— میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھ جانے کی استدعا کی۔ اور بڑے ادب سے دریافت کیا کہ مجھے شرفِ ملاقات بخشنے کا باعث کیا تھا۔

"ہم تمہارا زیادہ وقت ضائع نہیں کریں گے" سیفائیل نے کہا۔ سولہ برس ہوئے کہ جولائی کی ایک سہانی رات کو ہم دونوں — ریفائیل اور میں — آسمان کے سبز غالیچہ پر آنٹے کی کھیل کھیل رہے تھے"

"معاف کیجئے گا" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں تو اب تک یہی سمجھتا تھا کہ آسمان نیلگوں ہے!"

"آسمان کی وسعت بے پایاں اور اس کے بہت سے حصے نیلگوں ہیں۔ لیکن بعض حصوں کا سبز رنگ بہت خوشنما ہے خصوصاً وہ حصے جو مملکتِ ایران پر واقع ہیں۔"

میں بالکل خاموش رہا۔

سیفائیل نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

"ہمارے پاس گیند تو تھے نہیں۔ ہم نے کھیلنے کیلئے نہایت خوبصورت تارے چن رکھے تھے!"

"اور آپ چھڑی کا کام کس سے لیتے تھے؟" میں نے پوچھا

"اوہ! دُمدار تاروں سے! ——— ہمیں کھیل میں بہت لطف آیا — میں جیتنے والا تھا کہ اسی خوشی میں میں نے اس زور سے چوٹ لگائی کہ دو تارے کنارے سے باہر جا گرے۔ . . . ."

"کنارے سے باہر؟"

"ہاں! افق کے کنارے سے! یہ ہمارے لئے بہت المناک تھا تم سمجھ سکتے ہو کہ آسمان میں دو سب سے خوبصورت تاروں کا نہ ہونا کتنی بڑی کمی ہے۔ ہمیں حکم ملا کہ جب تک ہم گمشدہ تاروں کو تلاش کر کے نہ لا دیں گے ہمیں آسمان کی مسرتوں میں شامل ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔

"تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ہم نے ان سولہ برس میں کتنی تلاش کی ہوگی ہم نے آسمان اور زمین کا کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن . . . . آہ! — ہماری سب کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ قریب تھا کہ ہم مایوس ہو کر شہنشاہِ فردوس کی ملازمت سے مستعفی ہو جائیں اور اس طرح جنت کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دئے جائیں۔ کہ ہم نے آسمانوں میں ایک دوشیزہ کی بے مثال آنکھوں کی تعریف سنی۔ ہم نے

فرشتوں سے یہ بھی سنا کہ وہ تمہاری محبوبہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اس کی نمائی آنکھیں نہیں بلکہ وہی گمشدہ تارے ہیں اور ہم یہی امید لے کر تمہارے پاس آئے ہیں کہ وہ ہمیں واپس دیئے جائینگے۔"

میں حیران تھا۔ کچھ نہ سوجھتا تھا۔ یہ خیال ہی مجھے بے چین کر دینے کو کافی تھا کہ میری پیاری سلمٰی کی آنکھیں مجھ سے چھین لی جائیں گی..... لیکن دو فرشتے میرے پاس خود آئے تھے.... ..... میں اُن کو آسمانی سزا سے رہائی دلوا سکتا تھا ---

میں نے سلمٰی کو بلایا اور اُسے ساری بات سمجھا دی۔

اُس کے چہرے پر نہ حیرانی ظاہر ہوئی اور نہ غم، بلکہ چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر اُس نے فرشتوں کی طرف رخ کیا اور جہاں تک ممکن تھا اپنی پلکوں کو اوپر اُٹھا کر کہا۔ "خوبصورت اور پیارے فرشتو! دیکھو تو۔ کیا یہی تمہارے کھوئے ہوئے تارے ہیں؟"

فرشتے زیادہ قریب آ گئے۔ انہوں نے سلمٰی کی روشن آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ تھوڑی دیر تک وہ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے جس طرح دو جج ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد سیفائیل نے کہا۔ "نہیں یہ وہ تارے نہیں جو سولہ سال پہلے گم ہوئے تھے۔ وہ تارے اگرچہ اس عالم کی رات میں سب سے زیادہ خوبصورت اور روشن تھے۔ لیکن وہ اسقدر خوبصورت اور نورانی نہ تھے!"

شکستہ دل اور مایوس فرشتے آہستہ آہستہ غائب ہو گئے۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ لیکن میں خوش تھا --- لا انتہا خوش۔ انہوں نے پیاری سلمٰی کی آنکھوں سے مجھے محروم نہیں کیا۔

اور سلمٰی؟ وہ کھِل کھلا کر ہنسی۔ "میں نے انہیں کس قدر دھوکا دیا!" اُس نے ذرا دھیمی آواز سے کہا۔ "یہ سچ ہے --- اماں مجھے ہزار بار بتا چکی ہیں --- کس طرح میرے پیدا ہونے کے تھوڑے دن بعد کھُلی ہوئی کھڑکی میں سے دو تارے سیدھے میری پلکوں کے درمیان آ کر گرے تھے --- لیکن جب فرشتے میری آنکھیں دیکھ رہے تھے۔ تو میں نے اُس روح پرور لمحے کا خیال کیا جب پیارے تم نے پہلے پہل محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اس مسرت کے تصور سے میری آنکھیں ..... کسی زمانے کے گمشدہ تاروں میں ..... سب سے خوبصورت تاروں سے زیادہ چمک آ جائیگی۔"

تمناؤں کو میں نے یاس پر قربان کر ڈالا

(از بدر الشعراء حضرت منیر بھوپالی!)

الٰہی کون ہے مظلوم ایسا غم سہنے والا — جہنم سوز ہیں آہیں قیامت خیز ہیں نالا
تمناؤں کو میں نے یاس پر قربان کر ڈالا — نہ مجھ سا کوئی بے دل ہے نہ مجھ سا کوئی دل والا
وہ دل جو تھا کبھی صہبائے خودداری کا متوالا — اُسی کو تیری قدموں میں میری ہمت نے لا ڈالا
جسے برسوں کھائل میں جسے جان کی طرح پالا — خبر کیا تھی وہی ارمان بنیگا قلب کا چھالا
نہ روک اے چارہ گر اس مضطرب کو چیخ لینے دے — یہ وہ نالا ہے مر جاتا ہے جس کا روکنے والا
گیا وہ وقت جب تیری جفاؤں کی تمنا تھی — ستمگر ہم نے انداز طبیعت ہی بدل ڈالا
الٰہی جب مجھے سچی محبت تو نے بخشی ہے — تو پیدا کر کوئی میری وفا کا دیکھنے والا
خبر کیا تھی ترا غم اس کی آنکھوں میں بھی کھٹکیگا — مجھے حرف غلط کی طرح قسمت نے مٹا ڈالا
تمہیں سمجھا رہا ہوں ہو سکے جب تک مجھے رو لو — جو نکلی آہ دل سے کون ہے پھر روکنے والا
میں اپنے قتل کا الزام اپنے سر پہ لے لونگا — مگر یہ تو بتا دو تم نے وہ دامن بھی دھو ڈالا
منیر اچھا ذریعہ ہے علائق قطع کرنے کا --- اجل کا آسرا گویا ہے جاں کا پالنے والا

مصور کی بڑی خصوصیات

از جناب تاتاری دہلوی

موجودہ زمانہ میں جبکہ دُنیا ترقی کی طرف تیزی سے جارہی ہے ہندوستانیوں کی آرٹ سے بے توجہی قابلِ افسوس ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری مشرقی تہذیب کے مطابق دستکاری ایک خاص طبقہ میں محدود کر دی گئی تھی۔ اور بتدریج رواج چلنے اس طبقہ کو حقیر نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اخیر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دستکار لوگ نیچی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ اور تمام دستکاریاں غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں محدود ہو گئیں۔ تعلیم یافتہ اور معزز خاندان اس کا سیکھنا عیب خیال کرنے لگے۔ جس کا لازمی نتیجہ ان کا (دستکاریوں کا) زوال ہوا۔ لیکن دیگر ممالک کی ترقی کو دیکھ کر پھر اس طرف توجہ ہوئی اور تعلیم یافتہ طبقہ نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ اُن کی ترقی کا راز بھی اسی میں پنہاں ہے۔ مشرقی ہندوستان میں پنجاب اس معاملہ میں پیش پیش رہا ہے۔ اور یہاں اکثر قابل آدمی بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اور مختلف آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تعلیم یافتہ اور معزز خاندانوں نے بھی توجہ شروع کر دی ہے ۔

فنون لطیفہ بھی اس گرداب میں آگئے تھے۔ جن میں سے اس وقت ہمارے زیر بحث فن مصوری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راجپوتانہ میں مذہبی عقیدت اور ضرورت کیوجہ سے اس فن پر توجہ رہی اور مغل بادشاہوں نے صرف فن کی حیثیت سے اسکی قدردانی کی۔ اور انہی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ اس فن میں نمایاں ترقی اور تبدیلی ہوئی۔ مگر اس کے باوجود اگر کانگڑہ اور ایجنڈا وغیرہ بہت پُرانے زمانہ کے کاموں کو علیحدہ کر دیا جائے تو ہمارے پاس ایسے قابل قدر اور عام ذخیرے نہیں ہیں جن پر ہم بجا طور سے فخر کر سکیں۔ نہ عوام میں یہ دلچسپی ہے کہ اپنے اپنے ذخیرے اکٹھے کریں اور لٹریچر تو بالکل ناپید ہے۔ یہی وجہ عوام میں دلچسپی نہ ہونے کی ہے کیونکہ لٹریچر ہی عوام کی دلچسپی کا محرک ہوتا ہے۔ اور اسی کی بدولت ہر کس وناکس فن کی خوبیوں سے ایک حد تک واقف ہو جاتا ہے۔ عوام کی بدمذاقی کی بھی یہی وجہ ہے کہ لوگ اچھی سے اچھی تصویر سے حظ نہیں اٹھاتے اور ایک لال سبز رنگوں والی تصویر سے بہت خوش ہوتے ہیں ۔

اس لئے مقدم یہ کوشش ہے کہ پہلے عوام کو یورپ کے مسلمہ نقادوں اور مصوروں کے خیالات سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ ہماری واقفیت میں اضافہ کریں اور مصوری کے مذاق کے صحیح ہونے میں مدد دیں۔ دوسرے اس سے یہ بھی امید ہے کہ اُردو زبان میں آرٹ پر ایسا لٹریچر پیدا ہو سکے جس سے مشتاقان فنون لطیفہ بدرجہ اتم مستفیض ہو سکیں۔ اور آئندہ عوام کی توجہ اس جانب مبذول ہو سکے ۔

(۱)

سر جوشا رینلڈ نے اپنے ایک لیکچر کے دوران میں اس امتیاز کا سرسری طور سے ذکر کیا تھا۔ جو ایک مصور میں بہ نسبت دوسرے لوگوں کے ہوتا ہے۔ کہ مصور کی وہ اعلیٰ طاقت ہی قابل ستائش ہے جس سے وہ جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ نہ کہ وہ چیز یا بات خود جس کو مصور نے بنایا۔ لیکن یہ فرق اتنی توضیح سے بیان نہیں کیا گیا۔ جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر سلسلہ گفتگو میں انہوں نے ایک سرسری ذکر کر دیا ہے۔ لیکن اس مختصر سی تعریف سے ہر طرح کی غلطی کا احتمال ہے۔ اور مختلف اعتراضات پیدا

ہوسکتے ہیں۔ کام کی حیثیت کا مناسب اعتراف اور اعلیٰ قابلیت جو مصوّر کے شایاں ہو اسی پر مبنی ہے ✦

پینٹنگ اور دیگر آرٹ معہ اپنی خصوصیات، مشکلات اور نتائج کے جو وہ پیدا کرتے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک عمدہ اور مؤثر زبان ہیں۔ جو خیالات کے اظہار کے لئے نہایت مفید ہے۔ لیکن بذات خود کوئی چیز نہیں۔ وہ شخص جس نے یہ سیکھ لیا کہ کسی چیز کو صحت کے ساتھ نقل کردے۔ جس کو عام طور پر مصوّری کا معیار خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے ابھی صرف زبان ہی سیکھی ہے۔ جس سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرسکے۔ جس نے اتنا سیکھ لیا۔ ہم کو بحیثیت مصوّر کے اسکی اتنی عزت کرنی چاہئے جتنا کہ ایک معمولی شاعر یا ناثر اپنے خیالات کا اظہار قواعد کی پابندی سے اور روانی سے بیان کرنا سیکھ لے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ کہ مصوّری میں زبان کا حاصل کرنا بہ نسبت شاعری کے زیادہ مشکل ہے۔ اور مصوری میں ان جذبات کو جن کو دماغ محسوس کرتا ہے برانگیختہ کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے۔ پھر بھی اسکی اس سے زیادہ کچھ قیمت نہیں۔ کہ وہ صرف زبان ہے اور یہ تمام خوبیاں جو مصوّر کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ ویسی ہی ہیں۔ جیسا کہ شاعر اور مقرر کے لئے الفاظ کی روانی۔ جوشِ بیان۔ صحت زبان۔ اور یہی ان کے اعلیٰ ہونے کے لئے ضروری چیزیں ہیں لیکن یہ باتیں اُن کی بڑائی کا معیار نہیں ہوسکتیں۔ کسی مصوّر اور مضمون نگار کی قابلیت کا فیصلہ ان کے طریقۂ عمل اور طرز بیان سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے اور کہا ہے اس سے کیا جاتا ہے ✦

اس لئے بڑا مصوّر اس شخص کو کہنا مناسب ہے جو نقوش کی زبان میں صحیح اور مؤثر طریقہ سے جذبات کی ترجمانی کرسکے۔ اور اسی طرح بڑا شاعر بھی اسکو کہنا چاہئے جو صحیح الفاظ میں اور مؤثر طریقہ سے جذبات ادا کرنے میں دوسروں پر سبقت لے جائے۔ ان معنوں میں "بڑا شاعر" ایسا وسیع کلمہ ہوگا۔ جو ایک ہی مفہوم میں دونوں کے ساتھ (شاعر اور مصوّر) استعمال ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ تصاویر یا خیالات کی حیثیت جن کو ہر ایک نے اپنی اپنی زبان میں ادا کیا ہو۔ اس بات کا مستحق قرار دیں ✦

مثال کے طور پر ایک جامع نظم یا تصویر جس کو موجودہ زمانہ میں عام شہرت حاصل ہے۔ یعنی "Old shepherd's Chief mourner" اس میں کتے کے گھونگر والے چمکدار بال۔ ان کے پیچھے سبز رشاخیں۔ تابوت کی لکڑی کا شفاف رنگ اور کمبل کی سلوٹیں نادر طریقہ سے بنائی گئی ہیں۔ یہی زبان ہے اور زبان بھی انتہا درجہ کی صاف اور مؤثر۔ لیکن جہاں کتا اپنی چھاتی لکڑی پر زور سے ٹیکے ہوئے ہے وہاں خمیدہ سلوٹوں کا اظہار۔ اینٹھے اور رگڑے ہوئے پنجے جنہوں نے میز کے ڈھانچے سے کمبل کو گھسیٹ لیا ہے۔ سر کا انتہائی کمزوری سے اس کے قریب سلوٹوں پر بے حس و حرکت گرا ہونا ناامیدی کی حالت میں ڈبڈبائی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے پڑا ہونا۔ اس کے علاوہ اس کی خود لیٹنے کی حالت جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مالک کی جانکنی کے وقت کی بے چینی کے بعد سے تابوت کے ڈھکنے کی آخری کیل ٹھوکنے کے وقت تک اس نے کوئی جنبش نہیں کی۔ پھر کمرے میں تاریکی اور خاموشی کا سماں اور عینک سے یہ ظاہر ہونا کہ آخری مرتبہ بائبل کہاں تک پڑھی گئی تھی۔ ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص کس قدر تنہائی کی زندگی بسر کرتا رہا اور کوئی دوسرا اسکی موت کیوقت اسکی خبرگیری کرنے والا نہ تھا۔ جو اب تنہائی کی نیند سو رہا ہے۔ یہ تمام تخیلات ہیں۔ یہی تخیلات اس تصویر کو اس حیثیت کی سینکڑوں تصویروں سے جن میں صرف پینٹنگ ہی پینٹنگ ہو علیحدہ کردیتے ہیں۔ یہ تصویر ان ہی تخیلات کی وجہ سے آرٹ میں بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اور اپنے بنانے والے کے نام پر قابلیت کی مہر ثبت کردیتی ہے۔ کہ وہ صرف جلد کے مساموں اور کپڑے کی سلوٹوں کی ایک صاف ستھری نقل کرنیوالا ہی نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ دماغ کا مالک ہے ✦

لیکن مصوّر ہو یا انشاء پرداز۔ دونوں کو اس بات کا فیصلہ کرنا آسان کام نہیں ہے کہ زبان کا اثر کہاں ختم ہوتا ہے اور تخیلات کا اثر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ بہت سے تخیلات زبان پر اتنے مبنی ہوتے ہیں کہ اگر ان کو زبان سے علیحدہ کرکے تنہا پیش کیا جائے تو اُن کی خوبصورتی آدھی رہ جاتی ہے۔ لیکن عمدہ خیالات وہی ہیں جو زبان کے کم محتاج ہوں ✦

الغرض کسی مضمون کا رتبہ اور تعریف جس کا وہ مستحق ہے صرف اُس کے جذبات اور زبان کے تناسب پر منحصر ہے۔ عام طریقے سے ایک مضمون نہایت مکمل سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ اس میں جذبات کی حقیقی خوبیوں کو مؤثر اور موزوں بنانے کے لئے کچھ اور بڑھا دیا جائے۔ لیکن ہر بلند پایہ کسوٹی پر یہ اضافہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ہم کو سیدھے سادے فقروں سے جو اپنے اندر کھلے جذبات رکھتے ہوں زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ بہ نسبت اُس ملبوس اور سجی ہوئی عبارت کے جو اس کی حقیقی خوبیوں کو بھی اپنے میں ڈھانک لے۔ اس سجاوٹ کے نہ ہونے سے ہم کو زیادہ خوشی حاصل ہوتی اور اس کے ہونے سے بہت سی خوبیوں کو برباد کر دیا۔

اس لئے اس بات کا امتیاز کرنا چاہئے کہ زبان میں سجاوٹ کے لئے کیا ہے؟ اور جذبات کے اظہار کیلئے کیا ہے؟ وہ حصہ جو خیالات کے اظہار کیلئے ضروری ہے۔ وہ قابل قدر ہے۔ کیونکہ خیالات کے بلند پایہ ہونے کے لئے اس کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن پھر بھی یہ بذات خود بلندیٔ خیال کا صحیح معیار نہیں۔ اور زبان کا وہ حصہ جو صرف سجاوٹ کے لئے ہے وہ تصویر کی حقیقی خوبیوں میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ اس کی قیمت صرف اتنی ہے جتنی کہ تصویر کے فریم یا اُس پر وارنش کر دینے کی۔ یہ احتیاط جس سے تاثرات اور سجاوٹ کی تمیز ہو پینٹنگ میں نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ الفاظ میں قریب قریب یہ ناممکن ہے کہ جو مؤثر نہیں وہ خوبصورت ہوں۔ ماسوا ردیف و قافیہ کی اگر اس میں بھی کمی واقع ہوئی تو پھر یہ غلطی شاعر کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ ثابت ہوگی۔ لیکن دیکھنے والے کو متوجہ کرنے کے لئے اور اس کی تفریح کے واسطے صرف زبان کی خوبصورتی کافی نہیں۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے مصور کو گہری نظر ڈالنے اور ریاض کی ضرورت ہوگی۔ انہی اختلافات کے امتیاز نہ کرنے کی بناء پر وہ لوگ جو آرٹ میں ابھی شستہ زبان ہی بولنا سیکھ رہے ہیں اپنے آپ کو ایک فصیح اور بلیغ شاعر کا ہم پلہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ اور ناواقف نقاد روز بروز ایسے مصوروں کی تعریف کے پُل باندھنے میں بڑھتے جاتے ہیں۔ جو ایک رواں خوش نویس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

ڈچ سکول کی بہت سی تصاویر ماسوا Ruben Rembrandt اور Vandyke کے مصور کی قوت گویائی کی ایک خود نمائش ہیں۔ جن میں صاف زور دار اور فصیح مگر بے معنی اور بیکار الفاظ ہیں۔ جبکہ عہد عتیق کے چیمبو اور جوٹو کا کام ایک طرح سے گرما گرم الہام ہیں۔ جو ایک تتلاتے ہوئے بچے کے ہونٹوں سے نکلے ہوں۔ اگر ہم اتنا ہی کرتے ہیں کہ اول الذکر کو ایک مشین چلانے والے کے برابر رتبہ دیں اور آخر الذکر کو آرٹسٹ کہدیں۔ تو اس سے عوام کے مذاق کی تربیت نہیں ہوتی۔ کیونکہ عوام الناس کا مذاق ادنیٰ درجہ کی وہ خوشی محسوس کرتا ہے جو آرٹ سے حاصل ہوتی ہے لیکن آرٹ سے جو اعلیٰ درجہ کی خوشیاں حاصل ہوتی ہیں اُن کی طرف سے یہ لوگ بے بہرہ ہوتے ہیں۔

یہ امر فیصلہ کرنیوالے کا فرض ہے کہ وہ نہایت احتیاط سے فیصلہ کرے کہ تصویر میں تخیلات کیا ہیں؟ اور زبان کیا ہے؟ پھر زیادہ تر انہیں تصاویر کو رتبہ دے اور انہیں کی تعریف کرے جن میں تخیلات ہوں۔ اور جن میں صرف زبان ہو اُن کو کمال اور خوبی کے درجہ سے گرا دے۔ کیونکہ جو تصویر تخیلات میں برابری نہیں کر سکتی۔ وہ کسی درجہ کا رتبہ نہیں رکھتی۔ نہ اس کا کوئی وزن ہے۔ وہ تصویر جو بہت سے اعلیٰ خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ خواہ کتنی ہی بھدی بنائی گئی ہو اُس تصویر کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہے۔ جس میں کم اور ادنیٰ درجہ کے تخیل ہوں۔ اگرچہ وہ کتنے ہی عمدہ طریقہ سے بنائی گئی ہو۔ تصویر کی کسی قسم کی اہمیت و تشریح یا بناوٹ کی خوبی رتی بھر بلکہ ذرہ بھر وزن میں تخیل سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

ریفائیل کے چند قلم کار لوڈو یچی کی اُن مکمل تصاویر سے جو اُس نے کڑ مغزی سے چمکا دی ہیں بدرجہا بہتر ہیں۔ ایک مصور کا مکمل کام جس کو اس نے رنگ بھر کر خوشی کا سرچشمہ اور جذبات کا منبع بنا دیا ہے اس کے ابتدائی خاکے سے تاثرات اور جذبات میں کچھ ہی ممتاز ہوگا۔ بشرطیکہ وہ رنگ برمحل اور موزوں بھرے گئے ہوں اور جذبات کے اظہار میں معاون ہوں۔ اگر اس رنگ آمیزی سے تخیل کا ایک ذرہ بھی ضائع ہوا تو یہ ساری ظاہری سجاوٹ۔ رنگینی اور صفائی ایک گرانقدر جوہر کے بدلے میں لینا ہوگی۔ کیونکہ تخیلات کا معاوضہ

صرف تخیلات ہی ادا کر سکتے ہیں۔ جس وقت کسی تصویر کو مکمل کرنے یا خوبصورت بنانے میں ہلکے سے ہلکے اور دھندلے سے دھندلے تخیل کو بھی ضرر پہنچنا شروع ہو۔ تو اس اضافہ کو ایسا خیال کرنا چاہیئے۔ جیسے انسانی چہرہ کا شوخ کر بدشکل ہو جانا ؛

اگرچہ آرٹ کے اوپر ہمارے تمام قیاسات میں زبان کو اسی طریقہ سے علیحدہ کرنا چاہیئے اور اس کو اس کا ماتحت رکھنا چاہیئے۔ جس کا وہ اظہار کرتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم کو یہ بھی ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ بہت سے خیالات ایسے ہیں جو خلقی طور سے زبان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر خوشی جو آرٹ سے ملحق ہے اپنے اندر قوت متخیلہ کا اشارہ کرتی ہے۔ صرف قوت باصرہ کی خوشی جو شوخ رنگوں سے حاصل ہوتی ہے اس کی وقعت شیشے کی قلموں کے رنگوں کی بوقلمونیوں سے زیادہ نہیں۔ ماسوا اس وقت کے جبکہ یہ رنگ خاص ارادے اور ترتیب سے خاص معنوں میں ہمارے احساس کے مطابق لگائے جائیں اور یہ دماغ کا کام ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ لوک کی بیان کردہ تعریف کے مطابق لفظ idea اتنی وسعت رکھتا ہے کہ اس میں ایک حد تک حواس کے تاثرات بھی شامل ہو سکتے ہیں یعنی "وہ اثرات جن کے سوچنے میں دماغ مصروف ہے" یعنی اس حالت میں نہیں۔ جس حالت میں آنکھ کو نظر آتے ہیں بلکہ اس حالت میں جس میں ان کا اثر دماغ کے اوپر آنکھ کے ذریعہ پڑتا ہے ؛

پس اگر ہم کہیں کہ بڑی سے بڑی تصویر وہ ہے جو ناظر کے دماغ کو بڑے سے بڑے تخیلات کی کثیر تعداد پہنچائے تو ہمارے پاس یہ ایک ایسی تعریف ہے جس میں مقابلتاً اس قسم کی ہر خوشی جو آرٹ سے حاصل ہو سکتی ہے شامل ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہم یہ کہتے کہ سب سے اچھی تصویر وہ ہے جس میں صحیح صحیح قدرت کی نقل کی گئی ہے تو گویا ہم یہ تسلیم کر لیتے کہ آرٹ میں صرف قدرت کی نقل کرنے سے ہی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تب ہم آرٹ کے اس حصہ کو جو قدرت کی نقل نہیں ہے یعنی رنگ اور شکل کی حقیقی خوبیوں کو بحث سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ جس میں ریفائیل کا وہ پچیکاری کے پھول بوٹوں کا کام بھی آ جاتا ہے جو لوچیر میں بنا ہوا ہے اور بالکل نقل پر مبنی نہیں ہے۔ اس صورت میں ہم کو آرٹ کی ایک ایسی وسیع تعریف کی ضرورت ہے۔ جس میں اس کام کے مختلف مقاصد آ جائیں۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بڑا آرٹ وہ ہے جس سے بہت زیادہ خوشی حاصل ہو سکے۔ کیونکہ غالباً ایسا آرٹ بہت ہے۔ جس کا مدعا خوشی پہنچانا نہیں ہے بلکہ سکھانا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بڑا آرٹ وہ ہے جو بہترین نقل کرے۔ کیونکہ کچھ آرٹ ایسا بھی ہے جس کا مدعا سکھانا نہیں ہے بلکہ خوشی پہنچانا ہے۔ اور نہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ بڑا آرٹ وہ ہے جو ناظر کے دماغ کو کسی ذریعہ سے بڑے سے بڑے تصور زیادہ تعداد میں بہم پہنچائے۔ اور ہم نسبتاً اس کو بڑا تصور کہیں گے جو دماغ کی بہترین قوت سے حاصل ہو اور اسے حاصل کرنے میں دماغ پوری طرح مشغول رہا ہو اور دماغ کی اس مصروفیت کے ساتھ اسکی ترقی بھی ہو ؛

اگر یہ ہے تو بڑے آرٹ کی تعریف یہ ہوئی۔ جس کی قدرتاً مصور پیروی کرتا ہے کہ سب سے بڑا آرٹسٹ وہ ہے جس کے کام میں سب سے عمدہ تصورات کی زیادہ تعداد موجود ہو ؛ (باقی دارد)

مبارکباد عید

جملہ بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کی خدمت میں

تقاضائے دلِ شاداں مبارک سوئے افزو خوشی رجحاں مبارک
خوشی کے جانفزا ساماں مبارک خوشی کا روز ہے، خوشیاں مبارک

خوشا قسمت! ہلالِ عید دیکھا فروغِ نیرِ ایماں مبارک
خوشا قسمت! رُخِ امید دیکھا حصولِ دولتِ ایقاں مبارک

تمناؤں سے میٹھی عید آئی علاجِ تلخیِ دوراں مبارک
ادائے صوم کی توفیق پائی رضائے حضرتِ سبحاں مبارک

اِدھر گھر غرقِ لطفِ شیر و خرما حلاوت بارئ ایواں مبارک
اُدھر باہر فضا کا ذرہ ذرہ شکر ریز و لبن افشاں مبارک

دُوبارہ اذنِ آب و ناں ملا ہے دُوبارہ لطفِ آب و ناں مبارک
دُوبارہ غنچۂ خاطر کھلا ہے دُوبارہ شغلِ عطر و پاں مبارک

لباسِ فاخرہ زیبِ بدن ہے خوشی کے جوش کا اعلان مبارک
زمانہ فرطِ زینت سے دلہن ہے نئی آرائشِ گیہاں مبارک

(ہمایوں)

مسلماں عید گاہوں کو رواں ہیں فراغِ صوم پر شاداں مبارک
دمادم پیشِ حق سجدہ کناں ہیں عروجِ بختِ پرنازاں، مبارک

جدھر دیکھو، نمایاں شانِ اسلام شکوہِ مذہبِ ذیشاں مبارک
جسے پوچھو، بدل قربانِ اسلام نمودِ جذبۂ پنہاں مبارک

گلوئے دیں ہے اور بِدّھی، بشارت رخِ ملت ہے اور افشاں، مبارک
دُرِ مطلب ہے اور مٹھی، بشارت گُلِ مقصد ہے اور داماں، مبارک

نزولِ رحمتِ یزداں کا دن ہے نزولِ رحمتِ یزداں، مبارک
ہجومِ لطفِ بے پایاں کا دن ہے ہجومِ لطفِ بے پایاں مبارک

خوشی کے ساز سرگرمِ صدا ہیں "مبارک، عید کی خوشیاں مبارک"
مبارکباد کے طوفاں بپا ہیں مبارک، ہاں مبارک، ہاں مبارک

دعائیں ہیں اور آزاد دِل افگار
دعاہائے دِلِ افگاراں مبارک

حکیم آزاد انصاری

خزانہ کی تلاش

از محمد ناظم - بی ایس سی

کشتی اب کنارے کی طرف آ رہی تھی - سمندر کا پانی ساحل کی پہاڑیوں کے سلسلہ کو کاٹ کر اندر تک چلا گیا تھا - اس وجہ سے یہاں ایک خلیج بن گئی تھی - ایک چھوٹا سا دریا بہت دُور پہاڑوں کے ڈھال سے اُتر کر سرسبز اور گھنے جنگل میں بہتا ہُوا اس خلیج میں آکر گرتا اور سمندر میں شامل ہو جاتا تھا - ساحل سے دُور جنگل کے دُوسرے کنارے پر اونچے اونچے پہاڑ تھے - دھندلے اور بادل کے سے رنگ کے یہ پہاڑ ایسے معلوم ہوتے تھے - جیسے سمندر کی بلند موجیں جم کر رہ گئی ہیں - چھوٹی چھوٹی اور نامعلوم لہروں کے علاوہ اس وقت سمندر کا پانی بالکل ساکت تھا - صبح کا سہانا وقت تھا - اور پو پھٹ رہی تھی ؛

ایک شخص جو کشتی چلا رہا تھا رکا - اور اپنے چپوؤں کو کشتی میں رکھ کر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور کہنے لگا " وہ جگہ یہی معلوم ہوتی ہے " دوسرا آدمی کشتی کے اگلے حصہ میں بیٹھا ہوا بہت غور سے ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا - اس کے گھٹنوں پر بادامی کاغذ کا ایک تختہ کھلا ہوا رکھا تھا - اس نے کہا " ایونس ! یہاں آؤ - اور اسے دیکھو "

دونوں آدمی بہت ہی ہلکی آواز سے بولے تھے - کیونکہ ان کے ہونٹ بالکل خشک ہو رہے تھے اور ان پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں ؛

ایونس کشتی میں جھومتا ہوا آیا اور اپنے ساتھی کے کندھوں کے اوپر سے دیکھنے لگا - یہ کاغذ ایک نقشہ تھا - جو بہت سی تہوں کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا - اس کا رنگ بھی کچھ اُڑ گیا تھا - اور اکثر شکنوں پر سے پھٹ رہا تھا - وہ آدمی ان بوسیدہ ٹکڑوں کو ایک جگہ جوڑے ہوئے بیٹھا تھا - اس کاغذ پر پنسل سے اسی خلیج کا خاکہ کھینچا ہوا تھا - جو مٹ جانے کی وجہ سے بہت ہی دھندلا سا دکھائی دیتا تھا ؛

ایونس اپنا انگوٹھا اس پر پھیر کر بتانے لگا " دیکھو یہ پہاڑیوں کا سلسلہ ہے - یہ وہ کھائی ہے - اور یہ لہردار ٹیڑھی لکیر دریا ہے - دکاش مجھے پانی پینے کو مل جاتا ! ...... اور جہاں یہ ستارہ بنا ہُوا ہے - بس یہی وہ مقام ہے " ؛

نقشہ والا آدمی کہنے لگا " دیکھو یہ نقطے دار لکیر پہاڑی کے کھانچے سے سیدھی تاڑ کے درختوں کے جھنڈ تک جاتی ہے - آگے چل کر جہاں یہ دریا کو کاٹتی ہے اسی جگہ یہ ستارہ ہے - لہٰذا دلدل میں گھسنے سے پہلے ہمیں اس جگہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے " ؛

ایونس نے کچھ وقفہ کے بعد کہا - کہ یہ چھوٹے چھوٹے عجیب سے نشان کیسے ہیں - یہ تو بالکل ایک مکان کا سا نقشہ بناتے ہیں - لیکن ادھر اُدھر کو جو یہ اور چھوٹے چھوٹے خط کھینچے ہوئے ہیں ان کا کیا مطلب ہو سکتا ہے - میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں - اور یہ تحریر کس زبان کی ہے " ؛

" یہ چینی زبان کی ہے " ؛

ایونس - " درحقیقت وہ چینی ہی تھا " ؛

" وہ سب چینی تھے " ؛

تھوڑی دیر تک یہ دونوں ساحل کی طرف تکتے رہے - اور کشتی آہستہ آہستہ پانی پر بہتی رہی - اس کے بعد ایونس نے چپو کو دیکھا اور کہا - ہوکر ! اب چپو چلانے کا تمہارا نمبر ہے - ہوکر نے نقشہ کو تہ کر کے جیب میں رکھ لیا - اور ایونس کے پاس سے گزر کر خاموشی سے کشتی کھینے

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات

تو عین ذات می نگری در تبسمی

۱۳۴۹ھ

عبدالمجید پروین رقم

ہندوستان کے مایہ ناز خوشنویس منشی عبدالمجید صاحب "پروین رقم" کے کمال فن کا ایک لاجواب نمونہ

... چینی آدمی کی شکست ... حرکت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے اور اسکی حالت بہت ہی ابتر ہو رہی ہے ۔

ایولس نے نیم باز آنکھیں موندتے ہوئے اس جھاگ دار جزیرہ پر جاتے دیکھا تھا جو اب کشتی سے قریب ہوتا جاتا تھا ۔ سورج کے اس وقت مغرب میں غروب ہونے سے تمام آسمان ایک آتش دان بنا ہوا تھا ۔ حالانکہ یہ لوگ اس جزیرہ کے قریب پہنچ گئے تھے ۔ مگر ان کو کوئی خاص خوشی نہ تھی ۔ خزانہ حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ اور رات بھر کے سمندر کے لمبے سفر کی تکلیف اور پریشانیوں نے تمام خوشی خاک میں ملا دی تھی ۔ ایولس نے چینی آدمی کے بتائے ہوئے سونے کے ڈلوں کا خیال کرتے ہوئے وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی ۔ مگر اس کو پیاس بہت شدید تھی ۔ حلق بالکل خشک ہو گیا تھا ۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور اسکو دریا کے شیریں پانی کی موجوں کا خیال بندھ گیا ۔ سمندر کی موجوں کے پہاڑیوں سے آ آ کر ٹکرانے سے ایک شریلی آواز نکل رہی تھی ۔ جو اس کے کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ پانی کشتی کے دونوں طرف آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا ۔ چپو کی ہر جنبش پر ایک دھیمی آواز نکل کر لوریوں کا کام کر رہی تھی ۔ اب ایولس پر غنودگی طاری ہو گئی ۔ اس کے دماغ میں جزیرے کا ایک دھندلا سا خیال تھا ۔ لیکن اب ایک مرتبہ پھر خواب میں وہ اس رات کے تمام حالات دیکھنے لگا ۔ جب اس کو اور ہوکر کو چینی آدمی کا یہ راز معلوم ہوا تھا ۔

اس نے دیکھا کہ درختوں پر چاند کی روشنی پڑ رہی تھی ۔ قریب ہی ایک جگہ کچھ آگ روشن تھی ۔ جس کے سامنے تین چینی آدمی کھڑے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں باتیں کر رہے تھے ۔ ہوکر کو ان کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دی ۔ اس نے ایولس کو بلا کر اس طرف متوجہ کیا ۔ بعض جملے اس کو سنائی نہیں دئے ۔ اور بعض صاف سمجھ میں نہ آ سکے ۔ لیکن اس گفتگو کا مفہوم جو ان کی سمجھ میں آیا یہ تھا ۔ کہ چین کا ایک باشندہ یہاں اپنا خزانہ چھپا کر چلا گیا تھا ۔ لیکن اس کے بعد پھر سے لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا ۔ ... اب سے ایک سال قبل شانگھی یہاں آیا تھا ۔ اور اس نے ... محض حسن اتفاق سے اسے یہ خزانہ معلوم [illegible]

[illegible]

اور چونکہ شانگھی بہت ہی ... تھا اس لئے اس نے خود ہی اس خزانہ کو بہت حفاظت اور احتیاط کے ساتھ دفن کر دیا ۔ بالخصوص حفاظت کا اس نے بہت ہی خیال رکھا اور اس راز کو اپنی ہی ذات تک محدود رہنے دیا ۔ اب اسے یہ فکر ہوئی کہ یہاں سے جا کر مدد کے لئے کسی کو ساتھ لائے ۔ تاکہ خزانہ کو پھر کھود کر لے جا سکے ۔ اس کے بعد اس چھوٹے سے نقشے کے تہ کرنے کی آواز آئی ۔ اور ان لوگوں کی آوازیں بہت دھیمی پڑ گئیں ... ... پھر ایولس نے یکدم دیکھا کہ وہ شانگھی کی خنجر کی سی دم پکڑے ہوئے ہے ۔ پہلے تو شانگھی کا چھوٹا سا منہ بہت ہی سخت ہو گیا ۔ اور پھر غصہ میں آکر وہ ایک پھنکارتے ہوئے سانپ کی طرح دکھائی دینے لگا ۔ اس کے بعد اس نے اچھی طرح دیکھا کہ اس کا چہرہ بہت خوفزدہ اور حقیر معلوم ہونے لگا ۔ آخرکار شانگھی نے بہت سختی سے اس پر دانت پیسنے شروع کئے ... ... ۔

یہاں سے خواب کے اس سلسلہ نے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے ایک عجیب رخ بدلا ۔ ایولس کو اپنے سامنے سونے کا ایک بہت بڑا ڈھیر نظر آیا ۔ شانگھی وہاں کھڑا ہوا بڑبڑا رہا تھا ۔ اور ایولس کو دھمکی دے کر سونے کے پاس سے ہٹاتا تھا ۔ اس نے پھر شانگھی کی وہی خنجر کی سی دم پکڑ لی ۔ لیکن اس مرتبہ وہ بڑی وحشی شکل بدل کر اس سے لڑنے کو تیار ہو گیا ۔ اور اس پر دانت پیسنے لگا ۔ اس کا جسم بھی برابر پھولتا چلا جاتا تھا ۔

اب سونے کا چمکدار ڈھیر ایک پر شور دہکتی ہوئی بھٹی میں تبدیل ہو گیا ۔ اور ایک بہت قد آور شیطان ظاہر ہوا ۔ جو صورت میں بالکل شانگھی سے ملتا ہوا تھا ۔ لیکن اسکی دم بہت لمبی اور سیاہ تھی ۔ اس نے آکر ایولس کے منہ میں وہ دہکتے ہوئے انگارے بھرنے شروع کئے جس سے اس کا تمام جسم جل اٹھا ۔ پھر ایک دوسرے شیطان نے اس کا نام لے کر پکارنا شروع کیا ۔ ”ایولس ! ایولس !“ یکدم اس کی آنکھ کھل گئی ۔ اور اس نے دیکھا کہ ہوکر اسے آوازیں دے رہا ہے ۔

وہ اٹھ بیٹھا ۔ اب یہ لوگ دلدل کے کنارے پہنچ چکے تھے ۔ ایولس کے ساتھی نے کہا ۔ دیکھو وہ سامنے تین تاڑ کے درخت ہیں اور وہ جگہ ہے ان جھاڑیوں کے جھنڈ کی جیسے ... ۔ ... کر ...

[illegible]

نکل کر دوسری طرف دریا تک چلے جائیں تو یقیناً اسی جگہ پہنچ جائیں گے ؛

اب انہیں دریا کا دہانہ نظر آنے لگا۔ ایونس نے چلا کر کہا۔
"جلدی چلو۔ ورنہ بجائے میٹھے سمندر کا پانی پینا پڑے گا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ چلانے شروع کئے۔ اور دریا کے صاف پانی کو جو پہاڑیوں سے بہہ کر سبز گھاس کے درمیان چاندی کی طرح چمک رہا تھا حسرت سے تکنے لگا۔ پھر یکدم غصے میں ہوکر کی طرف پلٹا اور کہا "لاؤ۔ چپو مجھے دو" دریا کے دہانے کے قریب پہنچ کر اس نے اوک سے تھوڑا سا پانی منہ میں لیا اور کلی کر دی۔ تھوڑی دور اور چل کر اس نے پھر پانی کو چکھا۔ یہ پانی لذیذ اور میٹھا تھا۔ اسیوقت دونوں اس پر ٹوٹ پڑے ؛

"توبہ! ایسے ٹھیک نہیں پیا جاتا۔" یہ کہہ کر ایونس کشتی کے اگلے حصہ پر جھک گیا اور جانوروں کی طرح منہ سے پانی پینے لگا ؛

جب دونوں پانی پی چکے تو کشتی کو ایک چھوٹی سی خلیج میں لے گئے۔ اور اس میں سے اترنے والے تھے کہ ایونس نے کہا۔ ہم سیدھے راستہ پر پڑنے کے لئے اس گھنے جنگل میں سے ہاتھوں کے بل چل کر ساحل پر پہنچ سکیں گے۔ جہاں سے وہ جھاڑیاں نظر آتی ہیں ؛

ہوکر:۔ اس خیال سے تو پھر یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم کشتی ہی کو ادھر لے چلیں ؛

لہٰذا چپو چلاتے ہوئے وہ دریا سے گذر کر پھر سمندر میں آ گئے۔ اور تھوڑی دیر ساحل کے قریب قریب چل کر جھاڑیوں کے جھنڈ کے نزدیک پہنچے۔ یہاں وہ کشتی میں سے اترے۔ اور اس کو گھسیٹ کر ساحل کے اوپر تک لے گئے۔ اب انہوں نے جنگل کے کنارے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہانتک کہ پہاڑی کا کھانچہ اور وہ جھاڑیاں ایک سیدھ میں نظر آنے لگیں ؛

ایونس ایک اوزار اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ جو انگریزی حرف (ایل رما) کی شکل کا تھا۔ اس کے دونوں سروں پر تیز دھاردار پتھر کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ ہوکر بھی اپنے ہاتھ میں چپو لئے ہوئے تھا۔ کہنے لگا کہ دیکھو یہاں سے یہ بالکل سیدھا راستہ ہے۔ پس ہم سیدھے اسی رستہ پر دریا تک چلے جائیں گے اور اس کے بعد طرانہ......!
مگر کنشے کے گچھے ہوئے جھنڈوں اور تھور کے چوڑے چوڑے درختوں میں سے وہ اپنا راستہ بہت دشواری سے طے کرنے لگے۔ اسی طرح تھوڑی دور چلنے کے بعد اب بڑے بڑے درخت آ گئے۔ جن کے نیچے کی زمین بالکل صاف تھی۔ پتیوں میں سے دھوپ چھن چھن کر نیچے گر رہی تھی۔ اور آگے چل کر یہ درخت بہت ہی اونچے اونچے ہو گئے۔ ان کے تنے بڑے بڑے کھمبے سے معلوم ہوتے تھے۔ جن پر سرسبز پتے چھتری کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ گدھوں میں سے سفید سفید پھولوں کے موٹے موٹے گچھے لٹک رہے تھے۔ رسی کی طرح بل کھائی ہوئی بیلوں کی موٹی موٹی شاخیں ایک درخت سے دوسرے درخت پر پھیلتی چلی گئی تھیں۔ یہاں سایہ بہت ہی گھنا تھا۔ نیچے زمین پر سانپ کی چھتری کی قسم کے بہت سے پودے اور سرخی مائل بھورے رنگ کی گھاس اگی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر سردی کی وجہ سے ایونس کانپنے لگا ؛

ہوکر۔ غالباً ہم سیدھے ہی راستہ پر ہیں ؟

تھوڑی دیر میں اس اندھیرے میں سے انہوں نے اپنے آگے ایک جگہ سورج کی روشن شعاعیں نیچے کی سرسبز گھاس پر گرتی ہوئی دیکھیں۔ جس پر رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہیں پانی کی آواز سنائی دی۔ چنانچہ ہوکر کہنے لگا کہ اب ہم قریب آ پہنچے ہیں۔ یہ آواز دریا ہی کے پانی کی معلوم ہوتی ہے ؛

دریا کے کنارے پر گھاس بہت گھنی تھی۔ بڑے بڑے بلند درختوں کی جڑوں میں سے اور دوسرے درخت نکل رہے تھے۔ جن کے پنکھے کی طرح چوڑے چوڑے سبز پتے گلابی گلابی پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ گدھوں پر چمکدار پتیوں کی پھولدار بیلیں چڑھ رہی تھیں۔ قریب ہی ایک چوڑا سا کنڈ تھا۔ جس کا پانی بالکل ساکت تھا۔ اور اس پر بیضوی شکل کے بہت سے بڑے بڑے پتے تیر رہے تھے۔ ان کے درمیان بہت ہی ہلکے گلابی رنگ کا گل سوسن کا سا ایک پھول کھلا ہوا تھا ؛

ہوکر:۔ اب میرا خیال ہے کہ شاید ہم راستہ سے تھوڑا سا ہٹ گئے ہیں۔ دیکھو آگے دریا کے کنارے پر پہنچ کر کچھ معلوم ہوگا.....

ایونس:۔ کیا!

ہوکر:۔ اس آدمی نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہاں پتھروں کا ایک ڈھیر ہے ؛

تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کا مُنہ تکتے رہے۔ اور پھر یونس نے کہا۔ چلو پہلے تھوڑی دُور دریائے جہاؤ کی طرف چل کر دیکھیں؛

چنانچہ وہ بہت ہوشیاری سے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ ایونس یکدم رک گیا۔ اور سامنے انگلی کا اشارہ کرکے کہنے لگا "یہ کیا بلا ہے" ہوکر نے بہت غور سے دیکھ کر جواب دیا کہ نیلے نیلے رنگ کی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے؛

اسوقت وہ زمین کے ایک چھوٹے سے اُبھرے ہوئے ٹکڑے پر کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا چیز ہو سکتی ہے؛

ایونس فوراً تیزی سے آگے بڑھا اور دیکھا کہ وہ ایک نعش ہے..... اسی چینی آدمی کی نعش۔ جو اوندھے مُنہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اب دونوں آدمی اس کے قریب پہنچکر خاموشی سے اس منحوس نعش کو تکنے لگے یہ درختوں کے نیچے ایک صاف سی جگہ پر پڑی تھی۔ قریب ہی ایک چینی قسم کا بنا ہوا بیلچہ پڑا تھا۔ تھوڑی دُور آگے ایک تازہ کھُدے ہوئے گڑھے کے قریب پتھروں کا ایک ڈھیر بھی لگ رہا تھا؛

ہوکر نے کھنکار کر کہا کہ غالباً ہم سے پہلے بھی یہاں کوئی آیا تھا؟

ایونس یکدم دیوانوں کی طرح ناچنے اور کودنے لگا؛

ہوکر بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ اور نعش کے قریب جا کر دیکھا کہ اسکی گردن پھولی ہوئی ہے۔ رنگ نیلا پڑ گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی سوجے ہوئے ہیں۔ وہ تعجب سے یکدم چلایا اور اس گڑھے کی طرف جانے لگا؛

ایونس جو آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آ رہا تھا ہوکر سے کہنے لگا کہ بیوقوف مت بنو۔ دیکھو خزانہ ابھی کہیں گیا نہیں ہے۔ یہیں موجود ہے۔ یہ کہکر اس نے مڑ کر پہلے چینی آدمی کی نعش کو دیکھا اور پھر گڑھے کی طرف دیکھنے لگا؛

ایونس تیزی سے گڑھے کی طرف بڑھا۔ جس کو یہ بدقسمت آدمی پہلے ہی نصف سے زیادہ کھود چکا تھا۔ وہاں پہنچکر اس پر جھک گیا۔ اور مٹی ہٹا کر ایک بھاری ڈلا گھسیٹ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کانٹا چبھا۔ اس نے انگلیوں سے کانٹا نکالا۔ اور دھات کے اس بھاری ڈلے کو اٹھایا اور خوش ہو کر کہنے لگا کہ صرف سونا یا سیب ہی اتنا وزنی ہو سکتا ہے؛

ہوکر بہت زیادہ پریشان تھا اور ابھی تک اس چینی کی نعش کو تک رہا تھا۔ اب اپنے دوست کے قریب آ کر کہنے لگا کہ شاید یہ یہاں تنہا آیا تھا۔ اور کسی زہریلے سانپ نے اس کو ڈس لیا۔ مگر تعجب ہے کہ اس کو یہ جگہ کیسے ملی؟

یونس سونے کا ڈلا ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ اور ہوکر سے کہہ رہا تھا کہ ایک مُردہ چینی کی نعش کو کیوں اتنی اہمیت دیتے ہو۔ دیکھو۔ ہمیں یہ سب سونا لے جانا پڑے گا۔ وطن پہنچکر کچھ عرصہ کے لئے اسے زمین میں دفن کر دینگے۔ مگر اب کشتی تک کیسے لے چلیں...... اس نے فوراً اپنا کوٹ اتارا۔ اور زمین پر بچھا کر اس پر دو تین بھاری بھاری سونے کے ڈلے رکھے...... (اس کی کھال میں ایک اور کانٹا چبھا)..... اور کہنے لگا کہ ہم اس سے زیادہ وزن نہ اٹھا سکیں گے۔ پھر یکدم جھنجلا کر چلایا "تم کیا دیکھ رہے ہو"؟

ہوکر اسکی طرف پلٹا اور نعش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سر ہلا کر کہنے لگا...... "میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بہت زیادہ ملتی......"

ایونس:۔ بیوقوف ہوئے ہو۔ آؤ۔ چینی آدمی سب ایک سے ہی ہوتے ہیں؛

ہوکر اس کا مُنہ تکنے لگا۔ اور کہا میں سونا اٹھانے میں تمہاری مدد کرنے سے پہلے کسی نہ کسی طرح اسکو دفن ضرور کر دوں گا؛

ایونس:۔ دیکھو! ہوکر پاگلوں کی سی باتیں مت کرو۔ اس ملعون کو یوں ہی چھوڑ دو؛

ہوکر کچھ ہچکچایا۔ اور اپنے قریب کی بھُوری زمین کو دیکھ کر کہنے لگا۔ یہ مجھے دشوار معلوم ہوتا ہے؛

ایونس:۔ اب یہ بتاؤ کہ اتنے سونے کا کیا کریں۔ اسے پھر یہیں زمین میں دبائیں۔ یا سب کشتی پر لے چلیں؛

ہوکر اب بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ اسکی پریشان نگاہیں اونچے اونچے درختوں کے گدھوں پر پھر رہی تھیں۔ چینی آدمی کی نیلی نعش کو دیکھ کر وہ پھر یکدم کانپ گیا اور متلاشی نگاہوں سے پھر درختوں کی طرف دیکھنے لگا؛

ایوُنس:۔ ہوکر تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کیا تمہاری عقل ماری گئی؟

ہوکر:۔ یہاں سے کسی نہ کسی طرح ہمیں سب سونا نکال لے چلنا چاہئے۔

یہ کہکر اس نے کوٹ کے کالر کے دونوں سرے پکڑ لئے۔ دوسری طرف سے ایوُنس نے کوٹ پکڑا۔ اور اس طرح سونا اٹھا کر لے چلے۔

ایوُنس:۔ کیا ارادہ ہے۔ کیا کشتی پر چلیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ چپّو چلانے سے ابھی تک میرے بازوؤں میں درد محسوس ہو رہا ہے۔ ٹھہر جاؤ۔ اب تکلیف زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ میں ذرا آرام لے لوں۔

کوٹ پھر زمین پر رکھ دیا گیا۔ ایوُنس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور اسکی پیشانی پر پسینہ کے چھوٹے چھوٹے قطرے نمودار ہوگئے۔۔۔۔۔۔ "اس جنگل کی ہوا کچھ بھاری معلوم ہوتی ہے"۔۔۔۔۔۔۔ پھر بلا وجہ یکدم جھنجلا کر اٹھا اور کہنے لگا کہ تمام دن یہاں پڑے بیٹھے سے کیا فائدہ۔ آؤ مجھے مدد دو۔ جب سے اس نعش کو دیکھا ہے تم نے کچھ کام ہی نہیں کیا۔

ہوکر بہت اطمینان سے اپنے ساتھی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر کوٹ اٹھانے میں اس کی مدد کی۔ دونوں تقریباً ستّر گز تک خاموشی سے چلے۔ ایوُنس کا سانس پھولنے لگا۔ وہ ذرا ٹھہرا اور یکدم غصہ سے کوٹ کو دُور پھینک دیا۔ تھوڑی دیر تک کھڑا ہوا ہوکر کا منہ تکتا رہا۔ اور پھر ایک آہ بھر کے اپنا گلا زور سے گھونٹنے لگا۔

"میرے قریب مت آنا" یہ کہہ کر ایک درخت کو پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اور ذرا مستقل آواز میں بولا کہ میں ابھی ایک منٹ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی اور وہ درخت سے آہستہ آہستہ پھسل کر بالکل ایک بے جان چیز کی طرح گر پڑا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے اور تکلیف کیوجہ سے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔ ہوکر اس کے قریب آیا۔

ایوُنس:۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔۔۔۔۔۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔۔۔ سونا اٹھا کر کوٹ پر رکھ لو۔

ہوکر:۔ کیا میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا۔

"سونا اٹھا کر کوٹ پر رکھ دو"۔

جیسے ہی ہوکر نے سونے کا ڈلا اٹھایا۔ اس کے انگوٹھے کی گدی پر کوئی چیز چبھی۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ایک کانٹا تھا جو غالباً ایک انچ لمبا ہوگا۔ ایوُنس نے ایک خوفناک چیخ ماری۔ اور زمین پر لوٹنے لگا۔ ہوکر تھوڑی دیر متعجب نگاہوں سے کانٹے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایوُنس کی طرف دیکھا۔ جس پر تشنج کی حالت طاری تھی۔ اور زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اس کے بعد پھر اس نے درختوں کے تنوں اور بیلوں کی شاخوں سے بنے ہوئے جال میں اپنی نظریں دوڑائیں۔ اور پھر بھورے ودھندلے سایہ میں پڑی ہوئی چینی آدمی کی نیلی نعش کو دیکھنے لگا۔ اس وقت اسے نقشہ کے ایک کونے پر کچھ نشانات کا خیال آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کانٹے کو دیکھنے لگا۔ اور فوراً سمجھ گیا۔۔۔۔۔۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی "خدا کی پناہ"۔ کیونکہ یہ کانٹے ڈائیکس کے سم قاتل کے بنے ہوئے تھے۔ اور بالکل نقشہ کے اُن نشانات کی شکل کے تھے۔

چنانچہ اب اسے شانگھی کے دانت پیسنے کی وجہ معلوم ہوئی اور وہ خوب سمجھ گیا کہ اس نے اپنے خزانہ کی حفاظت میں یہ کانٹے بچھا دئے تھے۔

پھر اس نے ایوُنس کو آواز دی۔ لیکن ایوُنس بالکل خاموش پڑا تھا۔ تشنج بہت بڑھ گیا تھا۔ ہاتھ۔ پاؤں اور کمر سب اینٹھ رہے تھے۔ اور تمام جنگل پر ایک خوفناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ہوکر نے اس حصہ کو جہاں کانٹا چبھا تھا۔ اپنی پوری طاقت سے چوسنا شروع کیا۔ لیکن اس کے بازوؤں میں درد سا محسوس ہونے لگا۔ ہاتھ کی انگلیاں اینٹھنے لگیں۔ اور مٹھی بند ہوگئیں۔ تب اسے خیال ہوا کہ چوسنا بالکل بیکار ہے۔ چنانچہ عجیب ناامیدی کی حالت میں اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی ٹھوڑی کو ہاتھوں کا سہارا دیکر اپنے ساتھی کے اینٹھتے ہوئے جسم کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے پھر شانگھی کے دانت پیسنے کا خیال آیا۔

یہ میٹھا میٹھا درد اب گلے کی طرف بڑھنے لگا۔ اور بہت شدید ہوگیا۔۔۔۔۔۔ ناقابل برداشت۔۔۔۔۔۔۔

دونوں کا انجام وہی ہوا جو اس سے پہلے ایک چینی کا ہو چکا تھا۔

ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے نے درختوں کے اونچے اونچے سبز پتوں کو ایک جنبش دی اور بہت سے نامعلوم پھولوں کی سفید سفید پنکھڑیوں کی بارش ہونے لگی۔

(ترجمہ از ایچ۔ جی۔ ویلس)

Regd. No. L. 1091.



ميراخاند

تاریخ اشاعت عید نمبر عالمگیر!

(۱)

سال بھر کی آرزوئیں آج پوری ہو گئیں — عید ہے اور عید نمبر کی میسر دید ہے
لکھ دو حامد عید نمبر کیلئے تاریخ بھی — عید نمبر کی اشاعت گلبنِ امید ہے

۱۳۵۰ھ

(۲)

بڑھ گیا سب سے آج عالمگیر — سب کی بہبود اب تگ و دو ہے
ہند میں شمع طور ہے اُردو — یہ اسی شمع طور کی لو ہے
ہے ادب آفتاب عالمتاب — یہ اسی آفتاب کی ضو ہے
بحرِ موّاج ہے صحافتِ ہند — یہ اسی سیلِ علم کی رَو ہے

میں نے تاریخ یہ نئی لکھی
عید نمبر بشارتِ نو ہے

۱۳۵۰

(کاتبہ لسان الہند احمد حسن شوکت لکھنوی!)

فہرست تصاویر!

ٹائیٹل	(رنگین)	
میرا چاند	(رنگین)	از جناب سید اقبال حسین صاحب صنوی
پروانوں کی عید	(رنگین)	از جناب ماسٹر اللہ بخش صاحب آرٹسٹ
عید کا چاند	(رنگین)	از جناب مسٹر غلام مصطفےٰ صاحب
عید کا تحفہ	(رنگین)	از طوئ زماں عالی جناب حضرت حکیم فقیر محمد صاحب چشتی
ندی کنارے	(رنگین)	از جناب مسٹر غلام مصطفےٰ صاحب
دامن بہار	(رنگین)	ایک انگریز مصور کا شاہکار
ایک ایرانی دوشیزہ	(رنگین)	از جناب سید اقبال حسین صاحب صنوی

شاہی مسجد لاہور میں نماز عید کا نظارہ، مولانا قائد ایلوی
اجمیر کی ایک جھیل کا دلآویز منظر، آب شار، ایک مزدور عورت چائے
کی پتیاں توڑ رہی ہے، شملہ کا ایک میوہ فروش، جناب کوئی

فخر دنیائے ادب ہے نام عالمگیر کا

عالمگیر عید نمبر

یہ نقش ہر دل پہ ہے اک شوکت تحریر کا

فہرست مضامین عید نمبر

حافظ محمد عالم رئیس التحریر

(حافظ محمد عالم پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع ہوا)

ملاحظات

عید نمبر

کی زیر نظر اشاعت جن ناگفتہ بہ پریشانیوں اور ناقابل بیان مصروفیتوں میں عمل میں آئی ہے، ان کا اندازہ مجھ سے زیادہ شاید کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا، اور یہ کہانی جسقدر طولانی ہے، اسی قدر اس کا اعادہ ہیچ ہے بھی تو [illegible] نہیں چاہتا کہ مفصل طور پر اسکے متعلق کچھ عرض کروں۔ بہرحال آپ کے عالمگیر کا عید نمبر شائع ہو گیا، اور اپنی تہیدستی اور وقت کی بیحد قلت کے باوجود جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں نے آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا "**اگر خون جگر کا یہ قطرہ**" جسے میں بطور "**تحفۂ عید**" آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں آپ کی عید کی مسرتوں میں کچھ اضافہ کر سکے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی اور اپنی ناچیز مساعی کی داد سمجھوں گا،

حالت، اگر عید نمبر کسقدر تنگ وقت میں مرتب کیا گیا، اسکے مضامین کی فراہمی و انتخاب اور کتابت و طباعت کے لیے عالمگیر کے کارکنوں کو کتنا وقت ملا؟ [illegible] عالمگیر کا خاص نمبر [illegible] کے بعد کی روز تک [illegible] کا سلسلہ [illegible] ۹ جنوری [illegible] عالمگیر شائع ہوا اور [illegible] یکم فروری کو [illegible] بجے میں عالمگیر کے عید نمبر کے [illegible] خطوط لکھ رہا ہوں، کل ۳۱ جنوری کو اتوار کا دن تھا، [illegible] اور باوجود تعطیل کے [illegible] اور رسالہ عالمگیر کا [illegible] عید نمبر کی [illegible] مصروف رہا، بحمد اللہ کہ آج ۱۲ بجے تک عید نمبر مکمل ہو جائے گا، اور غالباً آج ہی اسکی [illegible] شروع ہو جائے گی۔

اگر آپ!

عالمگیر کا شاندار خاص نمبر قیمتی ایک روپیہ چار آنے اور عنقریب شائع ہونے والا سالانہ نمبر **مفت** حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک سال کے لئے عالمگیر کی خریداری قبول فرما لیجئے، عالمگیر کی سالانہ قیمت صرف چار روپے ہے، اور اسی قیمت میں وہ دو روپے آٹھ آنے کے مندرجہ بالا خاص نمبر ہر سال **مفت** پیش کرتا ہے، البتہ **عید نمبر** ایک زائد یعنی تیرھواں پرچہ ہوتا ہے اسکی قیمت بھی خریداروں سے ہر سال [illegible] وصول کی جاتی ہے

مینیجر رسالہ عالمگیر لاہور

غالباً

یہ عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ عید نمبر ملاحظہ فرمانے اور اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پیشتر اس حقیقت کو مد نظر رکھ لیا

جہانتک

میرا خیال ہے، میں یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ گذشتہ سال کے عید نمبر سے اس سال کا عید نمبر بہمہ وجوہ

کلامِ وحشت!

از جناب خان بہادر سید رضا علی صاحب وحشت

معافی کے نہیں قابل کچھ ایسی کی خطا میں نے
کیا خونِ وفا جس وقت کی عرضِ وفا میں نے

تری بیگانہ خوئی پر نہ ہوگی مجھکو مایوسی
نہیں دیکھی ہے کیا تیری نگاہِ آشنا میں نے

ہنسا ہوں حال پر اپنے جہاں رونے کا موقع تھا
کیا ہے شکر کے پردے میں قسمت کا گلہ میں نے

حریفِ غفلتِ ہستی نہیں تحریکِ بیداری
نہ اٹھنا تھا نہ اٹھا گو سنی بانگِ درا میں نے

یہ کیسی آہ نکلی یک بیک ڈوبی ہوئی غم میں
شکستِ دل کی شاید ہے سنی ہے جو صدا میں نے

نہیں احساس ہی مجھکو تری بے اعتنائی کا
ہوئی مدت کیا ہے شیوہ تسلیم و رضا میں نے

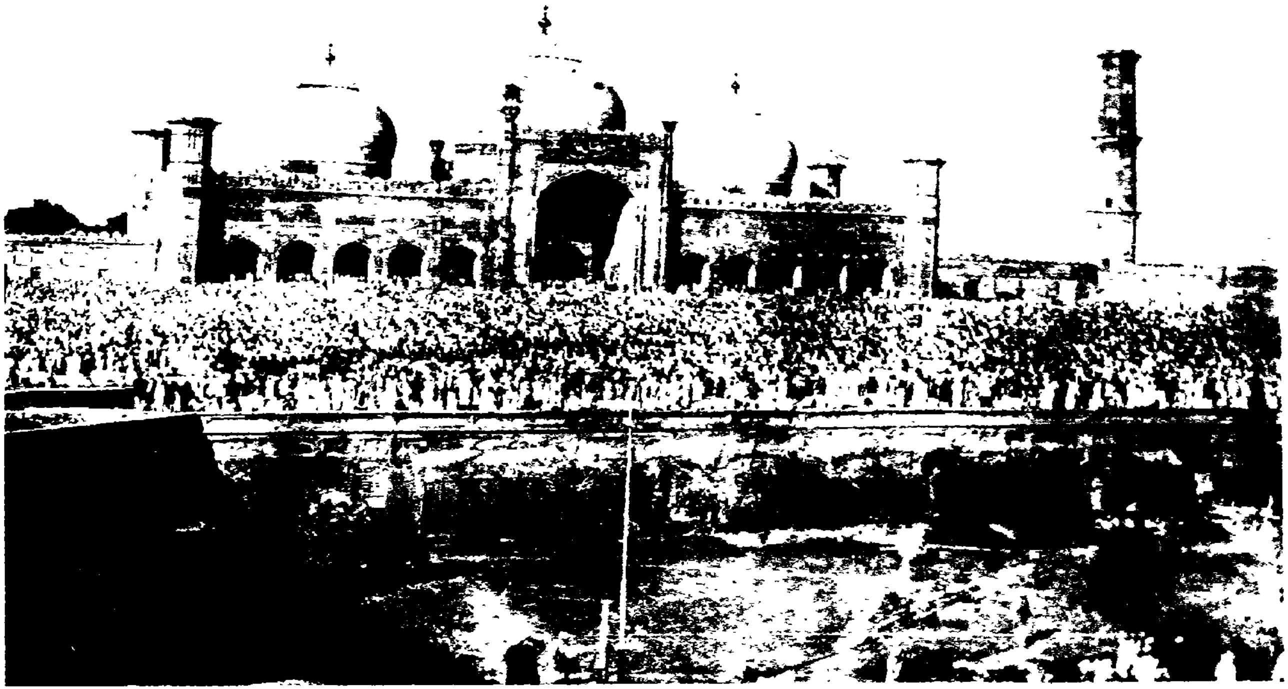
خطا ثابت ہوئی خود اپنے ہی شوقِ اسیری کی
تری زلفوں کو ناحق کہدیا دامِ بلا میں نے

نہ سرکی اک قدم بھی خاک میری کوئے جاناں سے
جمایا رنگ مٹ مٹ کر برنگِ نقشِ پا میں نے

یہ کیا انجان بنکر پوچھتے ہو مدعا میرا
بس اب جانے بھی دو، پایا تمہارا مدعا میں نے

کھلا آخر کہ ہے دردِ محبت ہی دوائے دل
عبث اس دردِ جاں پرور کی ڈھونڈی تھی دوا میں نے

زمانے کی روش کچھ ایسی ہے یاس آفریں وحشت
مٹایا رفتہ رفتہ دل سے نقشِ مدعا میں نے



شاہی مسجد لاہور میں نماز عید

مکہ معظمہ میں عید رمضان

آٹھویں صدی ہجری میں!

مسلمانوں کے مذہبی اور قابل احترام دونوں میں عید رمضان کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور اس مسعود دن کی خوشی میں لوگ مہینوں پہلے سے تیاریاں کرتے ہیں اور یہ وہی مبارک دن ہے جس کی بنیاد ہمارے پیغمبر نے ایسی نیک گھڑی میں رکھی تھی کہ جس کی روایات دنیا میں ہمیشہ جاری رہیں گی۔

ممالک اسلامیہ میں عید منانے کے مختلف طرح کے رسوم رائج تھے۔ چنانچہ خلفاء کے عہد میں عیدیں جن رسومات کے ماتحت ہوتی تھیں وہ طریقے اب دنیا سے ناپید ہو گئے ہیں۔

خلجی، تغلق اور مغل شہنشاہوں کے زمانے میں عیدین کی خاص تیاریاں ہوتی تھیں اور خود بادشاہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ ان میں حصہ لیا کرتے تھے۔ خاصکر ہندوستانی مسلمان ان کے شاندار بنانے میں اپنی آپ نظیر رکھتے ہیں۔

محمد تغلق کے عہد میں عید رمضان بڑے اہتمام بالشان طریقے پر منائی جاتی تھی اور خود شہنشاہ بھی بہ نفس نفیس نماز عید میں شریک ہوا کرتا تھا اور عید کے دن امراء و اعیان سلطنت کو بادشاہ کی جانب سے خلعتیں ملا کرتی تھیں عید کے پانچویں دن غلام اور لونڈیاں آزاد کی جاتی تھیں اور ساتویں دن خیرات ہوتی تھی۔ تقریباً شوال کا نصف مہینہ رمضان کی خوشی میں گزر جاتا تھا۔

مسلمانوں کے یہ رسوم ہندوستان میں صدیوں تک جاری رہے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد تک اس کی روایات برقرار تھیں۔ نواب آصفجاہ اول کے تخت نشین ہونے کے بعد اس کا کچھ اثر دکن میں اب تک باقی رہ گیا ہے۔

عرب میں عہد رسالت سے اب تک عیدین کی نماز کے ساتھ مختلف رسومات ہوتے تھے جن میں اب بہت کچھ تغیرات واقع ہو گئے ہیں۔ اس موقعہ پر ہم عرب میں آٹھویں صدی ہجری کی عید رمضان کا ایک مختصر سا خاکہ بیان کرتے ہیں[1] جو اس زمانہ اور ہمارے ملک کے لئے بالکل عجیب ہے۔ اگر ان کا زمانہ حال سے مقابلہ کیا جائے تو اسمیں اور اُسمیں بہت بڑا فرق محسوس ہوگا۔

جب مکہ شریف میں رمضان کا چاند دیکھا جاتا ہے تو امیر مکہ کے یہاں دھونسے اور نقارے بجائے جاتے ہیں مسجد الحرام میں فرش اور شمعیں روشن کی جاتی ہیں جس سے تمام حرم بقعہ نور بن جاتا ہے۔ سب امام اپنے اپنے مقتدیوں کو ہمراہ لیکر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ شافعی، حنفی، حنبلی اور مالکی چار قاری آکر قرات میں نیابت کی خدمت انجام دیتے ہیں جس سے مسجد الحرام کا کوئی زاویہ اور جانب خالی نہیں رہتا ہے اسمیں تمام قاری مع جماعت نماز میں مشغول رہتے ہیں اور تمام مسجد خاصگان خدا سے معمور رہتی ہے۔ حضور قلب حاصل ہو جاتا ہے اور دل رقت سے بھر آتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو منفرد طریقہ پر طواف اور مسجد میں نماز پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سب اماموں میں شافعی امام کی

[1] یہ معلومات مشہور سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامے عجائب الاسفار مترجمہ مولانا عطاء الرحمٰن سے اخذ کئے گئے ہیں صفحہ ۲۲۴ تا ۲۲۶ طبع دہلی

اس امر میں خاص کوشش ہوتی ہے۔ ان کی عادت یہ ہے کہ جب تراویح کو (ختم یعنی بیس رکعتیں) پڑھ لیتے ہیں تو ان کا امام معہ اپنے مقتدیوں کے سب طواف کرنے لگتے ہیں۔ جب الاسبوع سے فارغ ہوجاتے ہیں تو المفرقعہ جس کا ہم نے ذکر کیا ہے جمعہ کے دن خطیب کے سامنے پٹخارا جاتا ہے۔ یہ نماز کی جانب پھر رجوع ہونے کی نشانی ہے۔ پھر دو رکعتیں پڑھ کر سلام کرتے ہیں اس طرح سے اور بیس رکعتیں ختم کرتے ہیں۔ پھر شافعی وتر پڑھتے ہیں اور واپس ہوجاتے ہیں۔

سحریوں کے وقت مؤذن زمزمی سحر کا صومعہ میں اہتمام کرتا ہے اور حرم شریف کے شرقی رکن کے کٹہرے پر کھڑے ہو کر آواز دیتا ہے اور سحر کرنے کو یاد دلاتا ہے اسی طرح تمام صوامع میں مؤذن یہی کرتے ہیں جب ان میں سے کوئی بولتا ہے تو اسکے جواب میں اسکا دوسرا ساتھی بھی بولتا ہے ہر صومعہ کے اوپر ایک لکڑی نصب کی جاتی ہے اور اسکے اوپر ایک اور بینڈی لکڑی لگاتے ہیں۔ اسمیں دو بڑی بڑی شیشہ کی قندیلیں روشن ہوتی ہیں۔ جب صبح کا وقت قریب آتا ہے اور قطع سحر کا اعلان کیا جاتا ہے تو دونوں قندیلیں اُسی وقت موقوف کردی جاتی ہیں اور مؤذن اذان دینا شروع کرتے ہیں۔ مکہ شریف کے مکانات چھت دار ہیں۔ جنکے مکانات دُور ہوتے ہیں اور وہاں تک اذان کی آواز نہیں پہونچ سکتی ہے۔ وُہ ان قندیلوں کو دیکھ کر سحری کرتے ہیں۔ جب وہ گل کردی جاتی ہیں تو کھانا بند کردیتے ہیں۔

رمضان کی دس آخر راتوں میں سے ہر طاق رات میں قرآن ختم ہوتا ہے اس ختم میں قاضی فقہا اور بڑے بڑے علماء و فضلا شریک رہتے ہیں۔ قرآن ختم کرنے والا اہل مکہ میں سے کسی امیر کا لڑکا ہوتا ہے۔ جب وہ ختم کرچکتا ہے تو اس کے لئے منبر ریشم سے سجایا جاتا ہے اسپر خطبہ پڑھتا ہے جب اس سے فارغ ہوتا ہے تو اس کا باپ اُن تمام لوگوں کو اپنے گھر لیجاتا ہے اور انہیں کھانا اور شیرینی کھلاتا ہے۔ اس طرح تمام طاق راتوں میں یہی طریقہ رہتا ہے۔ ستائیسویں شب کو سب راتوں سے زیادہ اہتمام ہوتا ہے۔ بمقام الکریم کے عقب میں قرآن شریف کا ختم کرتے ہیں۔ اور حطیم الشافعیہ کے سامنے بڑی بڑی بلیاں کھڑے کرتے ہیں جن کا سلسلہ حطیم تک چلا جاتا ہے۔ ان کے بیچ میں لانبی لانبی لوحیں آویزاں کرتے ہیں۔ جو تین درجوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ان پر شیشہ کی قندیلیں اور زبردست شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ امام آگے بڑھ کر عشا کی نماز پڑھاتا ہے اور پھر سورۂ قدر کی تلاوت شروع کرتا ہے۔ اس وقت کل امام المقام میں ختم کی وجہ سے تعظیماً تراویح نہیں پڑھتے۔ بلکہ یہاں حاضر رہتے ہیں۔ امام دو سلاموں میں سورۃ ختم کرتا ہے پھر المقام کی طرف منہ کرکے خطیب کھڑا ہوتا ہے جب یہ اس سے فارغ ہوجاتا ہے تو تمام امام اپنے نمازیوں کی طرف واپس ہوجاتے ہیں اور یہ مجمع منتشر ہوجاتا ہے پھر اُنتیسویں شب کو مقام مالکی میں بظاہر ایک مختصر سا مجمع مفتخرا نہایت منزہ اور مؤقر ہوتا ہے اسمیں بھی ختم ہوتا ہے اور پھر خطبہ پڑھا جاتا ہے۔

ماہ شوال میں ان کی عادات جس کو ماہائے حج کا آغاز سمجھنا چاہئے اس کی چاند رات کو مشعلیں جلاتے ہیں شمعوں اور قندیلوں کو اسی انداز میں روشن کرتے ہیں جس طرح رمضان کی ستائیس تاریخ کو کیا کرتے ہیں۔ کل اطراف کے صوامع میں چراغاں کرتے ہیں اور تمام سطح حرم اور اُسکی مسجد کی سطح میں روشنی کیجاتی ہے جو ابی قبیس کے اوپر ہے۔ اس شب کو تمام مؤذن تحلیل و تکبیر اور تسبیح میں مشغول رہتے ہیں جب صبح کی نماز پڑھ چکتے ہیں تو عید کے شایان شان لباس پہن کر حرم شریف جاتے ہیں اور مناسب جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہیں

نمازِ عید ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے افضل کوئی مقام نہیں ہے۔

سب سے پہلے صبح کے وقت مسجد میں شیبیوں پہنچ کر کعبہ کا دروازہ کھول دیتے ہیں ان میں جو سب سے بڑا ہوتا ہے وہ اسکے آستانہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور باقی اس کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ امیر مکہ آتا ہے اور یہ تمام اس سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ بیت کا اسبوع طواف کرتا ہے اور مؤذن زمزمی قبہ زمزم کی چھت پر حسب معمول بلند آواز سے اُس کی اور اُس کے بھائی کی ثنا و دعا کرتا ہے۔ جب یہ یہاں کے اور ضمنی رسومات سے فارغ ہوتے ہیں تو باب معلّٰی کے قبرستان کی زیارت کو تبرکاً و تعظیماً جاتے ہیں۔ جسمیں صحابہ کرام اور صدور سلف کے مزارات ہیں پھر واپس ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ رمضان کی عید کا ہے۔

(سید احمد اللہ قادری)

قطعہ!

از جناب آب خلف و تلمیذ حضرت آہ امیٹھوی مدظلہ

آسماں پر چاند چمکا عید کا!
خوش ہے ہر مشتاق اس کی دید کا
عید اسکی کیا۔ اُسے کیا ہو خوشی
منتظر جو ہو تمہاری دید کا

تیس ۳۰ روپے!

عالمگیر عید نمبر کے لئے

از جناب ایم اسلم صاحب

یادش بخیر! نہ توبہ! بسم اللہ الرحمن الرحیم - امابعد - مرزا جی کو شاید ہی کوئی بالغ یا نابالغ ہو جو نہ جانتا ہو - یا یوں سمجھ لیجئے کہ شاید ہی کوئی کم بخت ہو جسے مرزا جی نہ جانتے ہوں - لیکن جاننا بھی کئی قسم کا ہوتا ہے - بعض تو مرزا جی کو صرف اس وجہ سے جانتے تھے کہ وہ مرزا جی ہیں یعنی "لڑاکے" آدمی - بعض لوگ انہیں اس طرح جانتے تھے جیسے کوئی ہرجائی حسینہ کو جانتا ہو - اور پھر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آپ کو صرف اس وجہ سے جانتے تھے کہ آپ ہر ایسے گھر میں موجود پائے جاتے جہاں کسی قسم کی دعوت ہو۔

اور سچ جانئے بیاہ شادی کی تقریبوں میں آپ اس طرح موجود ہوتے جیسے آج کل کانگریس و با ہر جگہ نمودار ہو رہی ہے - عام لوگوں کا تو خیال ہی تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ مرزا جی ایک وقت کا کھانا تو عموماً لوگوں کے ہاں کھاتے ہیں اور صرف ایک وقت کا اپنے ہاں - لیکن ماتم والے گھر تو بھولے بھی نہ پھٹکتے ۔ ہاں چہلم کے روز جا موجود ہوتے چونکہ میرے محلے میں رہتے تھے اسلئے مجھے اکثر آپ سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا - ایک دن میں نے پوچھا

"مرزا جی! یہ کیا بات ہے کہ شادی بیاہ کی جگہ تو آپ دنیا بھر کے کام چھوڑ کر پہنچیں گے - لیکن جہاں ماتم ہو وہاں پاس سے بھی نہیں گذرتے - حالانکہ کسی کے رنج میں شریک ہونا تو کار ثواب ہے۔"

آپ ایک دو بار سر ہلا کر بولے -

"میاں! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے - پڑھ لیں انگریزی کی دس پانچ کتابیں اور لگے لقمان کو حکمت سکھانے - ہم نے تو گلستاں اور بہار دانش سبقاً سبقاً کوئی بیس سال میں پڑھی ہیں اور ان میں عقل و دانش کی وہ وہ باتیں ہیں کہ اگر گدھا بھی پڑھ لے تو انسان بن جائے بھئی! تم ہم لوگوں کی باتیں نہیں سمجھ سکتے - ہمیں تو پرانی تہذیب کی بس یادگار سمجھو - ہم سے سنو! جس طرح خیرات اگر بن مانگے دی جائے تو اس کا ثواب بہت زیادہ ہوتا ہے اسی طرح اگر بن بلائے کسی کے ہاں محض خدمت کے لئے چلے جائیں تو اہل خانہ زیادہ ممنون ہوتے ہیں - اور عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں - یہ تو بیہودہ لوگوں کی باتیں ہیں کہ ہم پلاؤ قورمہ کی خوشبو پاکر جا پہنچتے ہیں - میاں! کھانے کو تو وہی ملتا ہے جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے - سچ جانو کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ہم دن بھر لوگوں کی آؤ بھگت میں لگے رہے اور کسی کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ ہمیں بھی کھانے کو کہے ......"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"تو مرزا جی! پھر آپ کیا بیرنگ ہی لوٹ آیا کرتے ہیں"

"اجی نہیں"۔ مرزا جی سر ہلا کر بولے - شرع میں شرم کیسی - پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہے - اور پھر قرآن میں بھی تو صاف حکم آیا ہے کہ مسلمانو! کھاؤ اور پیو ......"

میں نے ہنس کر پھر ٹوکا اور کہا۔

"حضرت! معاف کیجئے۔ کھانے پینے کا حکم قرآن میں مذکور تو ہے لیکن آپ کو اس کا محل بھی معلوم ہے؟"

"میاں!" آپ بولے "کیا بچوں کی سی باتیں لے بیٹھے تم ہم ٹھہرے دنیا دار لوگ۔ ہزاروں دھندے اور جتن دن بھر کرنے پڑتے ہیں ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ قرآن پاک سب کا سب پڑھ ڈالیں اور پھر ہم مُلّا نے تھوڑے ہی ہیں۔ مطلب سے کام ہے اور پھر یہ بھی تو بے ادبی ہے کہ "آسمانی باتوں" کی بیخ نکالتے پھریں"

"خیر چھوڑیئے اس قصہ کو۔ تو ہاں پھر آپ کیا کیا کرتے ہیں؟"

آپ بولے۔

"دل تو نہیں چاہتا کہ تم جیسے کرسٹان مزاج لوگوں سے بات کریں۔ لیکن خیر سن لو۔ کان پڑی آواز اچھی ہوتی ہے۔ سنا تو ہیں کہ عاقل بیار بد دیوار سے بھی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو بھئی! ایسے موقع پر ہم خود مانگ لیا کرتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ ماتم والے گھر کیوں نہیں جاتے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا دل پہلے ہی دُکھا ہوتا ہے۔ اب جو بھی جائے گا کچھ اسی قسم کی باتیں کرے گا جس سے ان کے دل کو اور بھی ٹھیس لگے۔ تو اب تم خود ہی بتلاؤ نہ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ روتے کو اور رلائیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ مرتے کو مارے شاہ مدار۔ ہاں جہلم پر چلے جاتے ہیں۔ ایک تو فاتحہ خوانی کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے دوسرے تھوڑی بہت خدمت بھی کر آتے ہیں۔"

آج رمضان شریف کا چاند نکلنے کی توقع تھی۔ مرزا جی میرے ہاں بیٹھے تھے۔ لوگ کوٹھوں پر کھڑے چاند دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "اے بندہ پرور! آؤ نا ہم بھی تو دیکھیں۔"

فرمانے لگے۔

"میاں! کپڑے صاف نہیں۔ دل تو بہت چاہتا ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ لیکن کیا کریں مجبوری ہے۔ آج نہ نکلا تو کل دیکھ لیں گے"

میں نے حیران ہوکر کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ چاند اور کپڑوں کا کیا تعلق۔ نماز تھوڑے پڑھنی ہے جو کپڑے صاف اور پاک ہونے چاہئیں"

"بس پھر وہی کرسٹانوں والی باتیں" آپ مسکرا کر بولے۔ "بھئی! چاند تو اللہ کا نور ہے۔ اس کی عزت و حرمت سب پر فرض ہے۔"

اتنے میں پاس کے کوٹھوں پر سے کسی شخص نے آواز دی۔

"وہ رہا"

سب اسی طرف دیکھنے لگے۔ مرزا جی جوتے اُتار کر کھڑے ہو گئے۔ اور لگے ہاتھ اُٹھا اُٹھا اور گردن بڑھا بڑھا کر دعا مانگنے۔ اتنے میں آذان کی آواز سنائی دی۔ میں نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ جب نماز پڑھ چکا تو دیکھا کہ مرزا جی اسی طرح آنکھیں بند کئے دعا میں مشغول ہیں میں نے ایک دو بار جو آواز دی تو ہولے سے "ہوں" کر دیا۔ آخر خدا خدا کر کے دعا ختم ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیوں حضرت! یہ دعا مانگی جا رہی تھی یا دل ہی دل میں کوئی دوا گھوٹ رہی تھی؟"

"ہاں یہ تو فرمایئے آپ کے روزہ رکھنے کا بھی ارادہ ہے یا چھٹی ہی رہیگی چھٹی کیوں رہے گی" آپ گرج کر بولے "رکھیں گے اور بیچ میدان کے رکھیں گے۔ اور غوث پاک کی دعا سے **پورے رکھیں**"

"خدا مبارک کرے" میں نے کہا۔

"دیکھو میاں!" آپ بولے "خوش قسمتی سے سردی کا موسم ہے۔ آنکھ جھپکتے دن ختم ہوتا ہے آج کل نہ پیاس ستاتی ہے نہ بھوک۔ تم بھی روزے ضرور رکھو۔ ایک تو یہ فرض ہے دوسرے اس سے صحت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو عید کی خوشی اور لطف انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جنہوں نے پورے روزے رکھے ہوں۔"

"انشاء اللہ آپ کی نصیحت پر ضرور عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن مرزا جی! یہ نہ ہو کہ دیگراں را نصیحت اور خود میاں فضیحت۔"

"بہت شریر ہو گئے تم" مرزاجی ہنسکر بولے "میسو آپس کی بات تو اور ہے لیکن دوسروں کے سامنے ہماری ہنسی مت کیا کرو۔ جانتے ہی ہو۔ مرزا ہوں میں قوم کا۔ اچھا اب چلتے ہیں۔ کچھ سحری کا انتظام کرنا ہوگا۔"

جب چلنے لگے تو میں نے کہا

"حضرت! کل روزہ یہاں ہی افطار فرمائیے گا۔"

"بہت اچھا" فرمانے لگے "اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو آجائینگے"

"دیکھئے بھول نہ جانا کہیں؟"

"میاں! توبہ کرو۔ تم کہو اور میں بھول جاؤں"

اگلے روز کوئی پانچ بجے ہی آموجود ہوئے۔ میرے پاس ایک دو اور آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے جو آپ کو دیکھا تو تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے "بیٹھئے بیٹھئے" فرماتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھکر اخبار دیکھنے لگے۔

ایک نے پوچھا

"مرزاجی! مزاج تو اچھے ہیں آپکے؟"

"ہاں بھیا!"

"حضرت!" دوسرا بولا۔ "کل شام درگاہ پر ختم ہے۔ کچھ طعام علیہ السلام کا بھی انتظام ہے۔ آئیے گا نا؟"

اور پہلا بولا

"اجی! مرزاجی کو تو کوسوں سے پلاؤ کی خوشبو آجاتی ہے۔ آئیں گے اور سو بار آئینگے۔ درگاہ والے نہ بھی بلائیں تو بھی تگمڈٹ بھاگے آئیں۔ کیوں مرزاجی! ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں بھیا!"

جب ملنے والے چلے گئے تو آپ بولے۔

"بدتہذیب۔ کمینے کہیں گے۔ شریفوں کے منہ آتے ہیں" اور پھر میری طرف دیکھ کر۔

"کیوں میاں! کیا وقت ہوگا؟"

"ابھی تو روزہ افطار کرنے میں نصف گھنٹہ پڑا ہے۔ آپ ابھی سے وقت پوچھنے لگے؟"

"سردیوں کے روزے ہی کیسے؟" آپ اخبار کی اوراق گردانی کرتے ہوئے بولے۔

"کیا پڑھتے ہیں آپ؟"

"ذرا کانگریسیوں کی قلابازیوں کا حال دیکھ رہا ہوں۔ دیکھو نا حکومت کو کس کس طرح سے دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ اجی سرکار دولتمند ار تو رہی ایک طرف سرکار کے "اقبال" کا مقابلہ کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ واللہ یہ لوگ ہیں بڑے استاد۔ پکٹنگ کے لئے عورتوں کو اکسا رہے ہیں جنوں۔ بس کھدر پہنو کی رٹ لگ رہی ہے۔ گویا شریفوں کے لئے اور کوئی کپڑا رہا ہی نہیں"

"اے حضرت!" میں نے کہا۔ "وہ وقت بھول گئے جب آپ بھی کھدر پوش بنے پھرتے تھے۔"

"میاں!" مرزاجی مسکراکر بولے "جدھر ناؤ بہتی ہو ادھر ہی بہ جانا اچھا ہوتا ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز۔ جب جھکڑ چلے تو جو شاخیں جھک جاتی ہیں وہی نقصان سے محفوظ رہتی ہیں۔ اور جو جھکتی نہیں وہ ٹوٹ جاتی ہیں۔ تو جب ملک میں کھدر کی رو چلی تو تم جیسے سینکڑوں کرسٹان وضع کے نوجوان بھی کھدر میں ملبوس نظر آنے لگے۔ لیکن کیوں؟ کیا قوم کی خاطر؟ ہرگز نہیں۔ تو پھر کیا ملک کی خاطر؟ الغلط۔ اجی! صرف نام اور نمود کی خاطر۔ تاکہ لوگوں میں چرچے ہوں۔ جدھر سے گذریں انگلیاں اٹھیں۔ لیکن میاں! نیتوں کا مالک تو اللہ ہی ہے۔"

"مرزاجی!" میں نے ہنسکر کہا "کالے کو کالا ہی نظر آتا ہے۔"

مرزاجی سے اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ مینارِ مسجد سے صدائے توحید اس عظمت اور شان سے فضا میں بلند ہوئی کہ شاید فلک پر کرّوبیاں بھی کانپ گئے ہوں۔ افطاری کے لئے دو چار چیزیں میز پر رکھی تھیں۔ مؤذن کی آواز سنتے ہی مرزاجی نے بسم اللہ پڑھکر طشتریوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں روزہ افطار کرکے نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوا تو مرزاجی کی طرف دیکھا۔ آپ ٹانگ پر ٹانگ رکھے کرسی پر کچھ اس طرح بیٹھے تھے۔ جیسے کوئی بڑا ہی تھکا ماندہ ہو۔ میری طرف

دیکھ کر فرمایا۔

"بہت جلد نماز پڑھ لی تم نے۔"

اور میں نے کہا۔

"مرزا جی! رمضان شریف کے مہینے میں تو نماز پڑھ لیا کرو، اتنی کاہلی بھی تو اچھی نہیں"

فرمانے لگے۔

"کاہلی واہلی تو کچھ نہیں۔ مجھے روزہ نہیں تھا"

"روزہ نہیں تھا۔ تو پھر بار بار وقت کیوں پوچھ رہے تھے آپ؟"

"میاں!" آپ بڑی سنجیدہ صورت بنا کر بولے۔ "وقت تو محض تمہارے خیال سے پوچھ لیا تھا۔"

"شکریہ! لیکن کل تو آپ مجھے لتاڑ رہے تھے۔ کیوں وہی بات ہوئی نا آخر؟"

"یعنے؟ کیا مطلب؟ کونسی بات؟ سینکڑوں باتیں دن بھر میں ہو جاتی ہیں۔ جانے تم کونسی بات کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟"

"بتلاؤں؟"

"ہاں ہاں۔ بات ہی تو ہے نا آخر۔ بندوق کی گولی تھوڑی ہے جو منہ سے نکلی اور سینے میں لگی"

"وہی! دیگراں را نصیحت . . . ."

"نہیں ہرگز نہیں!" آپ بات کاٹ کر اور ذرا اینٹھ کر بولے۔ "غوث پاک کی قسم لے لو۔ یہاں سے جا کر سحری کا سب انتظام کر لیا تھا۔"

"تو پھر روزہ کیوں نہ رکھا؟"

"بات یہ ہوئی کہ اس نیک بخت نے سحری کے وقت پراٹھا کھلا دیا پراٹھا تھا مزیدار ہم ایک کی بجائے دو کھا گئے۔ یا شاید اڑھائی ہی کھائے ہوں۔ خیال ہے شاید تین تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ کچھ ٹھیک نہیں کہہ سکتے کیونکہ باورچی خانے میں روشنی کا انتظام اچھا نہ تھا۔ کچھ سوجھا نہیں۔ خیر ہم نے رات ہی کہہ رکھا تھا کہ املی کی چٹنی ضرور تیار رہے۔ صبح ہم روزہ رکھیں گے اور کھانے کے بعد املی کی چٹنی ضرور کھائیں گے۔ لیکن جب چٹنی مانگی تو جواب ملا کہ املی تو منگوانی یاد نہیں رہی۔ یہ سن کر ہمیں بہت غصہ آیا۔ دل میں سوچا کہ گربہ کشتن روز اول پر عمل کرنا چاہئے۔ اور تو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ہنڈیا پاس پڑی تھی۔ وہی اٹھا کر باہر پھینک دی۔ بھئی خالی ہی۔ اب سوچنے لگے کہ اگر چٹنی کھائے بغیر روزہ رکھ لیا تو شاید پیٹ میں خلل پیدا ہو جائے اس لئے یہی مناسب سمجھا کہ پہلا روزہ قضا کر کے رکھ لیں گے۔ اگر کہیں طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو شاید حکیم جی سرے سے روزے رکھنے سے منع ہی کر دیں۔ لیکن بھیا! ایک بات ضرور ہے۔ گھر والی کو ایسے کان ہو گئے ہیں کہ مجال نہیں جو اب کبھی غفلت کرے۔"

چار پانچ روز گذر گئے لیکن مرزا جی نظر نہ آئے۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید روزہ رکھ کر گھر پڑے رہتے ہوں گے اسلئے پرسش احوال کے لئے بھی آدمی نہ بھیجا۔ ایک روز شام کے قریب خود ہی کہیں سے آ گئے۔ میں نے پوچھا۔

"مرزا جی! اتنے روز کہاں غائب رہے آپ اور یہ آپ کی صورت کیا بنی ہے۔ سردیوں کے روزے اور آپ کا یہ حال۔ حضرت! ابھی تو خیر سے سات ہی گذرے ہیں اور آپ کے چہرہ پر ابھی سے ہوائیاں اڑنے لگی ہیں"

"کیا کہیں تم سے" آپ سر کھجلاتے ہوئے بولے "گھر کا انتظام کچھ ٹھیک نظر نہیں آتا۔ ہمارے جیتے جی یہ حال ہے تو اللہ جانے بعد میں کیا ہوگا۔ سارا دن سامان لاتے لاتے بیخ نکل جاتی ہے۔ لیکن جب کوئی چیز مانگو تو جواب ملتا ہے۔"

"ہے نہیں"۔

"آپ لائے ہی کب تھے"

"پہلے ہی فکر کر لیا ہوتا"

"تو پھر جائیے نا لے آئیے خود ہی"

"تو کیا میں برقعہ اوڑھ کر لے آؤں"

"الہی توبہ! ایک بات کہہ کر بس سن لو۔ میاں ہم تو ایسی بیوی سے تنگ آ گئے ہیں۔ گھر میں ہماری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔ وہ پردہ نشیں ہو کر تو جدائی کرنے پر تلی بیٹھی رہتی ہیں"

"گویا گھر والی سے تنگ آئے ہیں آپ"

"گھر اور گھر والی کی ایسی تیسی" آپ جھنجھلا کر بولے۔ "غضب خدا کا سات روزے گذر گئے اور ہمیں ایک بھی نصیب نہیں ہوا۔ تو کل ہی کی

بات سن لو نا۔ شام کے وقت ہم نے کہا کہ دیکھو جس چیز کی ضرورت ہو ابھی بتلا دو۔ بازار سے لے آئیں گے۔ روزہ افطاری کے لئے بھی کچھ سوچ لو ارشاد ہوا۔ سب کچھ موجود ہے۔ ہم چپکے ہو رہے۔ سحری کھا کر جو ہم بیٹھے تو اچانک خیال آیا کہ کھجور یا چھوہارے سے روزہ افطار کرنا سنت نبوی ہے ان سے پوچھا۔ کیوں جی! گھر میں کوئی چھوہارا تو ہوگا ہم چھوہارے سے روزہ افطار کریں گے۔ گرج کر بولیں۔

"گھر ہے یا پنساری کی دوکان؟"

"بازار جو گئے تھے۔ لے آئے ہوتے"

"مجھے لاکر دیئے ہی کب تھے جو رکھ چھوڑتی؟"

"پوچھتے شرم بھی نہیں آتی"

"اب کیا عرض کریں آپ سے سمجھ لیجئے کہ گراموفون کی چابی لگ گئی تھی۔ آج کا روزہ قضا ہونے پر صبر کرکے بیٹھ رہے"

"مرزا جی!" میں نے کہا "معاف فرمایئے حضرت! افطاری کے لئے آپ کو چھوہارا چاہئے تھا۔ تو جا کر لے آتے۔ یا نوکر کو بھیج کر منگوا لیتے"

"میاں! کیا عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہو تم بھی۔ خود خریدنے جاتا تو دیکھنے والے یہی سمجھتے نا کہ مرزا جی روزہ نہیں رکھتے۔ سردی ہے چھوہارے کھانے کے لئے لے گئے ہیں اور اگر کسی اخبار والے کو .... خبر ہو جاتی تو سارے ملک میں ہماری فضیحت ہو جاتی

رہی نوکر سے منگوانے کی بات تو یہ تو تم ایسے فضول خرچ نوجوانوں کا دستور ہے کہ جہاں پیسے سے کام چل جائے وہاں روپیہ ہی خرچ کروگے۔ نوکر کو پیسہ یا دھیلا دیکر بازار بھیجتے تو چھوہارے تو وہ لے آتا۔ لیکن بیگم صاحبہ جب اسے چلتا کرتیں تو سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیتا کہ مرزا جی بنتے تو ہیں خاندانی امیر۔ لیکن دھیلے دھیلے کی چیز منگواتے ہیں۔ کیا کریں بھیا! خاندان کی عزت کا بھی تو خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک آدھ روزہ قضا ہو گیا تو انشاءاللہ نہیں عید کے بعد رکھ لیں گے۔ بلکہ ہمارا تو ارادہ ہے کہ جتنے قضا ہونگے اس سے دو گنے رکھیں گے۔ خیر کل سے روزہ ہی سمجھو"

الغرض جب تشریف لاتے بے روزہ ہوتے۔ اور کوئی نہ کوئی داستان سنا دیتے۔ ہاں عید کی تیاریاں بڑے زور سے ہو رہی تھیں کہیں زردوزی کا جوتا تیار کروایا جا رہا تھا۔ کہیں سلمہ ستارہ کی ٹوپی بن رہی تھی۔ کہیں اودی مخمل کے اچکن پر ڈوری لگ رہی تھی۔ پہروں دوکان پر بیٹھے ریشمی رومال ملاحظہ فرماتے رہتے لیکن پسند ایک بھی نہ آتا۔

ایک روز بازار میں ملاقات ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔

"کہاں سے آئے حضرت!"

فرمانے لگے

"میاں! جانتے بھی ہو سر پر عید آ رہی ہے۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ تو باقی ہے۔ ہر مسلمان پر عید کی تیاری فرض کی گئی ہے۔ بس عید ہی کے دھندوں میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ کیا کریں بال بچوں والا گھر ہوا۔"

"یہ رومال میں کیا باندھ رکھا ہے آپ نے؟"

"سویاں ہیں۔ نمونے کے طور پر تھوڑی سی مانگ لایا ہوں۔ غوث پاک کی قسم ان سویوں نے تو سخت پریشان کر رکھا ہے۔ کئی روز سے انہی کی نذر ہو چکے ہیں۔ ہمارے اختیار میں ہو تو شہر بھر میں جس قدر ملّانے ہیں سب کو نکال باہر کریں۔ یہ سویوں کی بدعت بھی تو انہی لوگوں کی ایجاد ہے۔ ہم نے بھی سینکڑوں بار قرآن شریف پڑھ چھوڑا ہے۔ لیکن یہ لکھا تو کہیں دیکھا نہیں کہ عید کے روز سویاں کھاؤ۔ ادھر وہ ہیں کہ گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھیں مارشل لا کے سے احکام جاری کر رہی ہیں کہ سویاں بال سے باریک ہوں۔ ریشم سے ملائم ہوں۔ شہد سے لذیذ ہوں۔ میدہ آب زمزم سے گندھا ہو کسی حافظ قرآن کے ہاتھوں کی بنی ہوں۔ اور بسم اللہ پڑھ کر بنائی گئی ہوں میاں! ہماری تو جان پر بن گئی ہے۔ کئی ایک جگہ سے نمونے لا چکا ہوں۔ اور ابھی تک پسند ایک بھی نہیں ہوا۔ لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہے وہ بھی سچی۔ آخر سیر بھر سویاں لینی ہیں۔ کیوں نہ دیکھ بھال کر لی جائیں۔ روپے آسمان سے تھوڑے ہی برستے ہیں یہ تو کچھ ہم ہی جانتے ہیں کہ کرایہ داروں سے کس طرح روپیہ وصول ہوتا ہے۔ بلا سے اباجان تو بس بنا گئے دو چار مکان۔ اور مصیبت پڑ گئی ہم لوگوں کو۔ نہ جانے کس پاجی نے کہا تھا کہ "چاکری" سب سے ذلیل چیز ہے۔ ہمیں تو ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو ہر مہینے بندھی بندھائی تنخواہ

گھر لے آتے ہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ کوئی ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ بھائی! رمضان کا مہینہ ہے۔ روزے کیوں نہیں رکھتے۔ غریب سرکاری کام کریں یا روزے رکھتے پھریں۔ خیر! اپنی اپنی قسمت ہے۔"

جب آپ اپنی بپتا کہہ چکے تو میں نے کہا۔

"مرزا جی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا؟"

"سوتوں کی نذر روزے کیسے ہوگئے؟۔ آپنے تو روزوں کو سویاں سمجھ رکھا ہے محلے والے دل میں کیا کہتے ہونگے کہ اچھا مسلمان ہے جو روزہ بھی نہیں رکھتا۔"

"ہوں" لگے پھر وہی احمقوں کی سی باتیں کرنے تم۔ گھر والی نے تو غصے میں آکر قسم کھالی ہے کہ گھر اور گھر والے جائیں بھاڑ میں لیکن میں ایک روزہ نہ چھوڑوں گی۔ اب جو ہم بازار سے سوتوں کے نمونے مانگ لاتے ہیں تو پکاتے بھی خود ہی ہیں اور پھر کھانی بھی مجبوراً ہم ہی کو پڑتی ہیں۔ اگر شام پر پکانا اٹھا رکھیں تو اسوقت بچے بھی موجود ہوتے ہیں۔ ایک آدھ مہمان بھی آیا ہوتا ہے۔ اب چھٹانک بھر سویاں کس کس کو دیں۔ اور پھر بچے بھلا کیسے بتلا سکتے ہیں کہ کیسی ہیں۔ صبح گھر والے تو سبھی فاقے سے نہ تو بہ روزے سے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم خود ہی پکا لیتے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی نمونہ پسند آیا تو گھر والی سے بھی مشورہ کرلیں گے۔

رہی محلے والوں کی بات۔ تو کسی کی مجال ہے جو ہمیں بے روزہ سمجھے۔ غوث پاک کی قسم! جھٹ اسکے خلاف سرکار میں خبر کردیں کہ کانگرسی ہے بم بناتا ہے۔"

قصہ مختصر اسی طرح ہمارے مرزا جی نے انتیس روزے گذار دیے۔ اور کہنے کو بھی ایک رکھا۔ جس روز چاند نکلنے کی امید تھی۔ آپ میرے ہاں بیٹھے تھے۔ شفق کی لالی پورے طور پر نمایاں تھی لیکن آپ کرسی پر کھڑے ہو ہو کر مغرب کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر بولے۔

"یہ اللہ میاں بھی حد ہی کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے احکام تو قرآن میں لکھ دیئے۔ لیکن روزوں کی تعداد مقرر نہ کی۔ کیا تماشہ ہے کہ عید کے لئے بھی چاند کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

مطلع آسمان بالکل صاف تھا ابر کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ چاند ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔ روزہ دار کوٹھوں پر کھڑے بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے اور مرزا جی کا یہ حال تھا کہ اب کرسی میز پر رکھ کر اس پر کھڑے تھے۔ کبھی کبھی خود ہی کہہ دیتے۔

"ہاں کچھ جھلک تو پڑتی ہے۔"

"کیا بیہودگی ہے کسی طرف سے آواز ہی نہیں آتی۔"

"سلامی کے گولے تو چھوڑ دیئے ہوتے۔"

میں نے کہا۔

"حضرت! چاند نکلے تو کوئی سلامی کے گولے بھی چھوڑے۔"

"نکلا کیوں نہیں۔ ضرور نکلا ہوگا"۔ آپ جھنجھلا کر بولے۔ "یہ تو لوگوں کی نظر کی خرابی ہے۔ اگر کسی کو نظر نہ آئے تو اس میں چاند کا کیا قصور۔"

اتنے میں اذان ہوئی۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ نہیں کی عید ہوگی۔ سب کوٹھوں سے اتر گئے۔ لیکن مرزا جی ہیں کہ برابر دیکھے چلے جاتے ہیں۔ میں نماز کے لئے کھڑا ہوا تو فرمایا۔

"یہ نماز تو پھر بھی پڑھی جائے گی۔ کہیں آدمی بھیجکر معلوم کیجئے۔ کسی نے شاید چاند دیکھ ہی لیا ہو۔ بھیا! جو کچھ کرنا ہو اب کرو۔ خدا کا انتیس روزے تو صبر و شکر سے گذارے۔ اب یہ ایک اور کون رکھے۔ غیر مذاہب کے لوگ اسلام پر اعتراض کیوں نہ کریں۔ کسقدر مضحکہ انگیز بات ہے کہ چاند دیکھو تو عید کرو۔ آنکھوں والوں نے تو دیکھ لیا لیکن اندھے کیا کرینگے۔ اور کیوں میاں! اگر تیس کو بھی چاند نہ نکلے تو کیا اکتیس کو بھی روزہ ہی ہوگا؟"

میں مسکرا کر قبلہ رو کھڑا ہوگیا۔ اور آپ بڑی مایوسی سے "چلو پورے تیس ہی سہی"، کہہ کر گھر کو سدھارے۔

ایم۔ اسلم







خلقت خدا کی ملتی ہے اے گل عذار عید
لگ جا گلے سے آہ کہ آئی ہے یار عید

اے شاہِ حسن بھول کے آجا کبھی اِدھر
میری بھی غمکدے میں تو ہو ایکبار عید

کیا کیا بناؤ ہوتے ہیں رکھ رکھ کے آئنہ!
سرکارِ حسن کی ہوئی آئینہ دار عید

ساقی بہادے آج تو دریا شراب کا
دل کھول کر منائیں تری بادہ خوار عید

مجھ سے تجھے گلے نہ ملایا ہزار حیف
دنیا میں اک مجھی سے رہی شرمسار عید

آتا نہیں نظر مجھے مکھڑا وہ چاند سا
آئی ہے کیسی یہ مرے پروردگار عید

آنکھوں کے سامنے جو رہی تو تو عیش ہے
گیسو شب برات ترا رخ ہے یار عید

غنچے ہیں آج گلبدنوں کے چمن چمن
دکھلا رہی ہے تازہ ہجوم بہارِ عید

وہ دن ہے زاہدوں کی بھی ہونٹوں پہ ہے ہنسی
توبہ کا آج توڑ رہی ہے خمار عید

میں اور غیر سے ملوں اچھا یہ حکم ہے
ایسی نہیں پسند مجھے زینہار عید

ائے آہ فکر و زور لگا بیٹھے کہاں تلک
مضمون کی تلاش کا جب ہو مدار عید!

عالمگیر عید نمبر کیلئے!

رمضان یا عید رمضان

از جناب مولانا عشرت رحمانی

یاد ش بخیر! کسقدر پرکیف و دلکش تھی وہ شام جس کی یاد اب بھی کہ جبکہ تھوڑی مدت گذر چکی ہے۔ دلربا ہے۔ پرلطف اور حسرت خیز بھی۔

حسرت خیز؟ ہاں اس لئے کہ وہ ساعت بہت پرکیف تھی۔ وہ ابتدا تھی مسرت خیز کیفیتوں۔ فرحت بخش انوار و برکات کی بارشوں کی اسلئے اور ہاں اسلئے

"اس شام کی یاد بھی: —— دلربا ہے!۔ پرلطف اور حسرت خیز بھی!"

گلیوں میں شور مچا ہوا تھا اور اس شور میں اک جوش تھا: وحشیانہ نہیں، الہانہ! شور! نوعمر لڑکے۔ بچے اور نوجوان سب اس شور میں شریک تھے اور سب کی آوازیں مل کر ایک پرجوش شور مچائے ہوئے تھیں۔ ×

اس شور میں ایک مستی تھی۔ ایک کیف تھا اور ایک مسرت ناقابل محو! بچے رقص معصومانہ میں مصروف دنیا و مافیہا کو بھلا رہے تھے۔ یہ سب مسلمان تھے! مسلمان اور بچے مسلمان؟ کہ یہ سب بچے تھے۔ ان کے شور میں ان کے جوش میں اور ان کی اسوقت کی حرکات میں خلوص، اور اسلامی خلوص جھلک رہا تھا۔ اور اسلئے ان سب بچوں "مسلمانوں" کی اسلامی صداؤں —— پرجوش شور سے گلیاں آباد تھیں۔ آباد اور مکر و ریا سے بالکل آزاد! کیسا دلکش سماں تھا

"گلیوں میں شور مچا ہوا تھا!"

چھتوں چھتوں لوگ پھر رہے تھے۔ ادھر دیکھا۔ اونچے ہو کر دیکھا۔ ذرا سر اٹھایا۔ دیکھا اور سر بلند ہو کر دیکھا —— دیکھتے رہے سب دیکھ رہے تھے۔ غور سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھنے کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے نہ دیکھنے والا بھی دکھائی دینے لگے گا۔ اس طرح دیکھ رہے کہ دنیا کی کسی شئے کو ایسے شکل سے بھی کبھی دیکھیں!! گویا دیکھ رہے تھے۔ دیکھنے کے اصل معنوں میں! کہ —— صاف نظر آجائے! یہ سب مسلمان تھے۔ "مسلمان" اسلئے کہ سب سر بلند ہو کر دیکھ رہے تھے —— غور سے دیکھ رہے تھے اور۔

"دیکھنے کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے!"

خوشی کی صدائیں بلند ہوئیں۔ "وہ ہے" "وہ ہے!" "دیکھ لیا جس کی تلاش تھی۔ اسے پا لیا۔ وہ دیکھ لیا۔ ہر طرف اسلامی جوش کے ساتھ نعرے بلند ہیں۔ بچے اچھلتے کودتے پھر رہے ہیں۔ جیسے کوئی بڑی نعمت مل گئی ہے۔ نعمت ایسی نعمت کاش ان دیکھا ہے جو کہیں بھی نہ ملے۔ پورے ایک سال کے بعد "یہ سنہری نشان" نظر آیا ہے۔ بچے خوش کیوں نہ ہوں۔ ان کا دل معصوم ہے۔ معصومیت انہیں مسرت کے جھولے میں جھولا رہی ہے۔ وہ مسلمان ہیں۔ انہیں اسوقت مذہبوں کے جھگڑے کی خبر نہیں۔ وہ اختلافات سے بالکل ناواقف ہیں۔ خوش ہیں۔ کہ

"دیکھ لیا! (جس کی تلاش تھی) وہ دیکھ لیا!"

آہ! وہ شام! وہ شام تھی جب "ہلال رمضان" —— اپنی پوری

عظمت وشان سے ۔ ہلال رمضان ۔ جلوہ گر ہوا ۔ جلوہ گر ہوا ——— اور اسلامی دنیا کو رحمت ۔ برکت ۔ بہجت ۔ و فرحت کا پیغام دیا ۔ پیام سلام دیا ۔ یعنی خدائے رحیم ورؤف نے بندگانِ حق کو مژدہ انعام دیا ۔ شہر بھر مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے نعرہ ہائے مسرت و تہنیت سے گونج سا رہا تھا ۔ معمر مسرور تھے مگر بہ تقاضائے سن و سال خاموش ۔ خاموش یعنی مدہوش ۔ خوش آئند کیف و سرور سے بیہوش !
مبارک ! مبارک !! کی صدائیں بھی بلند ہوئیں ۔ ماہ رمضان مبارک ! جس نے

"اسلامی دنیا کو رحمت ، برکت ، بہجت فرحت کا پیغام دیا ! "

بچے خوشی سے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے ۔ عجب چہل پہل تھی ۔ شور مچائے ہوئے تھے ۔ شور اسلامی جوش کا شور ! اس عالمِ کیف و سرور میں ۔ اس جہانِ برکت و نور میں ——— میں ——— دن بھر کی مصروفیات سے تھکا بیٹھا تھا ۔ تھکا بیٹھا تھا ایک پرسکون کمرہ میں خاموش ۔ بالکل جیسے مدہوش ۔ مگر دل کو باہر کی سب خبر تھی ۔ میں چاہتا تھا خاموش بیٹھوں مگر دل اس شور ——— اس جوش میں شرکت چاہتا تھا ۔ نہ صرف چاہتا تھا ۔ پوری توجہ سے شریک تھا ۔ اور تمام کیفیات کا اندازہ کر رہا تھا ۔ سب کچھ سن رہا تھا ۔ اور مجھے ان سے باخبر رہنے کے لئے تاکیدیں بھی ——— !

"اس عالمِ کیف و سرور میں ! اس جہانِ برکت و نور میں !"

دل کی مصروفیت ! ۔ دل کی توجہ !! ۔ اور دل کا انہماک ! جسطرف بھی ہو ۔ وہی انسان کا "مرکزِ خیال" ہے ۔ اور آہ ! وہ شام ۔ وہ وقت تو ۔ وہ تھا ۔ کہ "ہلالِ رمضان" ۔ نے اسلامی دنیا کو رحمت برکت ۔ بہجت و فرحت کا پیغام دیا !"

اس پُر کیف دور میں مرے دل میں ایک "کیفیت" تھی ——— کیفیت تھی ناقابلِ محو ۔ کیفیت بھی ناقابلِ بیان ! خیالات کا ہجوم ——— ہجوم مگر کیسوئی کی برکتوں کے ساتھ ۔ اطمینان وسکون کی نعمتوں کے سہارے ۔ خیالات کا ہجوم ۔ تھا اور

"اس پُر کیف دور میں میرے دل میں ایک کیفیت تھی ! "

بچے ! کمسن لڑکے !! بڑوں سے زیادہ جوش کا اظہار کر رہے تھے ۔ میں نے سوچا ——— یا میرے دل نے پوچھا ۔ "بڑے آدمیوں کو چھوٹوں سے کم خوشی ہے ؟ رمضان کی رحمتوں کا ——— "رمضان کی برکتوں کا" بچوں کو زیادہ احساس ہے" ۔ "بچے اپنے بزرگوں سے زیادہ خوشی منا رہے ہیں" ۔ "خوشی رمضان کی خوشی" ——— "روزہ اور تراویح" ! عبادات ۔ و برکات کی خوشی" ——— کیا بچوں کو بڑوں سے زیادہ خوشی ہے" ؟ خیالات کا ہجوم رہا ۔ پرسکون ——— مگر یقین و اطمینان" میں کشمکش تھی ! کیا

" بڑے آدمیوں کو چھوٹوں سے کم خوشی ہے ! "

غور کیا ۔ سوچا ۔ اور ——— دل میں جواب آیا ۔
"بچوں کو بڑوں سے زیادہ خوشی ہے !" ——— بڑوں کو بچوں سے کم خوشی نہیں !"
پھر سوچا اور سمجھا ———
"بچوں کا شور ! بچوں کا جوش ——— اور بچوں کی خوشی ——— "
"رمضان کی آمد پر ! ——— "عید کے لئے ہے" !! رمضان کے بعد !!"
"ہلالِ رمضان" کا خیر مقدم ۔ اس مسرت کے آغاز پر ہے جس کا انجام "عید" ہے !
ایک ایک دن گن گن کر گذارتے ہیں ۔ ہر دن کے بعد نئی مسرت ہوتی ہے ۔ اور مہینہ ختم ہو جانے پر ۔ جب یہ تمام مسرتیں جمع ہو جائیں گی تو "عید" ہوگی اسلئے ۔

"بچوں کو بڑوں سے زیادہ خوشی ہے ! "

بڑوں کو بچوں سے کم خوشی نہیں ۔
"بڑوں کا جوش ——— اور بڑوں کی خوشی ۔ "ہلالِ رمضان" کے خیر مقدم میں ہے ۔ اور رمضان کی آمد پر ہے ——— (رمضان کے لئے") ۔ رمضان میں !" ایک ایک ساعت گن گن کر گذارتے ہیں ۔ اور ہر ساعت "عید" سے کم نہیں ۔ دن گذرتے ہیں ۔ برکتیں بڑھتی ہیں ۔ اور ہر دن ایک نئی

مسرت ہوتی ہے! دن کی برکتوں میں — رات کی رحمتیں شامل ہیں —
اوران دن رات کی کیفیتوں کے سرور میں —
"بڑوں کو بچوں سے کم خوشی نہیں!"

"بڑوں کی خوشی بچوں سے زیادہ ہے"۔
بچے "عید" کی آمد کے منتظر ہیں۔ بڑی ساعت کی برکت کو عید سمجھ رہے ہیں بچے "عید" کا پیش خیمہ "رمضان" کو سمجھتے ہیں۔ بڑے پابندئ رمضان کو "عید" جانتے ہیں۔
بچوں کی "عید" ہے جب رمضان کا مہینہ گذرجائے۔
بچوں کی "خوشی" ہے کہ رمضان کا مہینہ گذرجائے
وہ سادہ دلی کے طفیل "آغاز وانجام" کی تمیز سے بے نیاز ہیں۔
بڑوں کی "عید" ہے جب رمضان (ادائگی فرض کیساتھ) گذرجائے!

بڑوں کی "خوشی" ہے کہ رمضان (ادائگی فرض کیساتھ) گذرجائے!
وہ احساس ویقین کے سہارے "آغاز وانجام" سے باخبر "فرض" کے نیازمند ہیں!
اسلئے ذی ہوش بڑے (بڑی عمر کے) مسلمانوں کو "رمضان" "عید" ہے!
اوراس لئے!

"بڑوں کی خوشی بچوں سے زیادہ ہے!"
"کہ یہ رمضان کی خوشی ہے!"

دل پر کیفیتیں طاری تھیں۔ ناقابل محو دنا قابل بیان!
یاد ش بخیر! کسقدر پرکیف و دلکش تھی وہ شام جس کی یاد بھی اسقدر دلربا ہے۔ پرلطف اور حشر خیز —— اور ہاں اسی شام کی مسرت "عید" ہے!

سرودِ میکش

از جناب میکش امرتسری

خیالِ یار بود نے دل وجگر باشد　　شئے کہ گشتہ کہ اولیں نظر باشد
چو شکوہ سنج بود عشق بے اثر باشد　　کہ مردِ غلغلہ از کیف بے خبر باشد
فروغِ چہرۂ ساقی نہ بے سبب افزوں　　مئے کہ کہنہ بود تیز تُند تر باشد
حدیثِ رنجِ فراقے زمن چہ میپرسی　　بیک نگاہ تو ایں قصہ مختصر باشد
وقارِ شیخ بکعبہ نہ باعثِ حیرت　　بہ دَیر برہمنے نہ مقتدر باشد
وصالِ یار چہ خواہم کہ چوں ملاقاتش　　گہے بہ بزمِ عدو گہ بہ رہگذر باشد

یکے ندیم خوش اطوار و ہمنوا میکش
مرا بس است ہمیں درجہاں اگر باشد

ہلالِ عید مبارک!

اثر کلکِ گہر سلک جناب حکیم خورشید حسن صاحب خورشید سہارنپوری

بس نازک است در بر گردوں ہلالِ عید
بنگر بچرخِ پیر چنیں خورد سالِ عید

در سرخیِ ردائے شفق مستتر گشت
صد مرحبا بشوخیِ رنگِ جمالِ عید

پیرِ مغاں بگفت کہ ای محتسب بگیست
در ملتم حرامِ صیام و حلالِ عید

در بزمِ عیش مطربِ خوش گو نوا بزن
ساقی بجام ریز ہم آبِ زلالِ عید

یارب طفیلِ حرمتِ روز و شبِ صیام
بادا نصیبِ ذوق پرستاں وصالِ عید

ساقی و جام بادہ و مطرب بہم رسید
از حد گذشتہ ام ز رہِ امتثالِ عید

مارا کشاں کشاں بہ درِ میکدہ کہ برد؟
از مہوشان و ساعتِ فرخندہ فالِ عید

من لائقِ نظارۂ روئے تو نیستم
لیکن نگاہ کن ز تلطف بحالِ عید

پُر کار گشت سادگیِ حسنِ شاہداں
نا آشنا کہ بود ز رازِ سوالِ عید

یارب برآں کہ شاد دل دوستاں کند
ہر ماہ ماہِ عید بود سال سالِ عید

چوں معتکف بکوش کہ در خلوتش رسی
دریاب در نہاں کدہ روزے مثالِ عید

ایں ساعتِ سعید مبارک بدوستاں
خورشید نیک بادبہ یاراں مآلِ عید

صبحِ عید!

عنایت حسین
از جناب سلمیٰ ام ترکی

عید کا چاند دیکھتے ہی لوگوں کے دلوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ شروع اسلام کا زمانہ تھا۔ لوگ خدا اور خدا کے سچے رسولؐ پر نئے نئے ایمان لائے تھے اور کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ جاذب کے مصداق ہر شخص کے دل میں احکام اسلام کی پابندی اور بجا آوری کا شوق حد سے زیادہ تھا کچھ اس سبب سے کہ ان کے ایمان تازہ تھے اُنکے دلوں میں ذوقِ یقین اور شوقِ عمل ازبس جاگزیں تھا۔ اور کچھ اس لئے کہ عید کے تہوار کو قومی اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے اور مناتے تھے۔ مدینہ منورہ میں معمول سے زیادہ جوش و خروش اور چہل پہل نظر آتی تھی۔

ماہ رمضان میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کے احساس سے متاثر ہو کر اور عید کو روزوں کا انعام سمجھکر خدائے عزّ و جل کی شکر گذاری کے طور پر صبح غریبوں یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے اور صدقۂ فطر ادا کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ لوگ فرطِ خوشی میں ادھر اُدھر پھرتے اور عزیز و اقارب سے ملتے تھے۔ خویش و احباب کو مبارکباد اور ارمغان و تحائف پیش کرتے تھے۔ اسلامی مضافات اور مساوات کا سچا جوش بحرِ ذخار کی طرح سینوں میں موجیں مار رہا تھا۔ دل اخلاص و انبساط اور محبت و عقیدت کے جذبات سے معمور تھے۔ سب ایک دوسرے سے گلے مل مل کر خوش ہوتے تھے۔ دوست تو دوست دشمن بھی آپس میں اس صفائی قلب سے مصافحہ و معانقہ کرتے تھے جیسے اُن کے سینے بغض و حسد سے کبھی مکدّر ہوئے ہی نہیں تھے۔

لیکن سب سے بڑھ کر خوشی بچوں کو تھی۔ وہ کمسن اور معصوم عید کی حقیقت کو تو کیا سمجھتے ہوں گے مگر ان کی مسرت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اُن کے مشفق اور مہربان والدین نے اُن کے لئے طرح طرح کے خوبصورت اور قیمتی ملبوسات عید کے دن پہننے کے لئے بنوا کر رکھے ہوئے تھے اس لئے وہ جاموں میں پھولے نہیں سماتے تھے اور اپنے دوستوں کو بلا بلا کر اپنے اپنے لباس دکھاتے اور خوش ہوتے تھے۔ صبح اپنے بزرگوں سے عیدی لینے کی غرض سے اُنہیں شام ہی سے سلام کرنے اور ملنے میں حد سے زیادہ شغف اور انہماک سے کام لیتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو خوش دیکھ کر دل ہی دل میں خدائے تعالیٰ کا شکریہ بجا لاتی تھیں۔

یہ تو عام مسلمانوں کی حالت تھی لیکن خاندانِ رسالت پر جو کیفیت طاری تھی وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل علیحدہ تھی۔ خاتونِ جنت حضرت فاطمہؓ اپنے دونوں جگر گوشوں یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو لئے ہوئے مصلّے پر بیٹھی ہوئی تسبیح و   میں مصروف تھیں انگلیاں تسبیح کے دانے گن رہی تھیں زبان اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پکار رہی تھی۔ اور آنکھیں اشکوں کے موتی پرو رہی تھیں۔

شہزادے اپنی والدہ محترمہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور بار بار یہ کہتے تھے۔

"اماں! ہمارے لئے کپڑے کب بناؤ گی؟ صبح عید ہے" گھر میں انتہائی عسرت اور تنگی تھی۔ کپڑے تو کجا کھانے کو بھی کچھ میسر نہ تھا اس لئے حضرت فاطمہؓ بچوں کو تسلی اور دلاسا دیکر فرماتی تھیں۔

"بیٹا سو جاؤ صبح دیکھا جائیگا"

لیکن بچے بضد تھے اور وہ کہتے تھے کہ فلاں لڑکے کے پاس ریشم کا کرتہ ہے اور فلاں کے والدین نے اسے اطلس کی قبا بنا کر دی ہے مگر ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ حضرت فاطمہؑ نے جواب دیا۔

"بیٹا تم جانتے ہو ہم غریب ہیں۔ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ تمہارے بابا حضرت علیؑ نے یہودیوں کی مزدوری کرکے اور میں نے چکی پیس پیس کر تمہیں پالا ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ راہ خدا میں دیدیتے ہیں۔ ہمارے دروازے سے کبھی کوئی سائل خالی نہیں پھرتا۔ ۔ ۔ ۔ صبح تم اپنے نانا کے پاس جانا وہ تمہیں کپڑے بنوا دیں گے۔"

مگر شہزادے ایک نہ سنتے تھے اور برابر کہے جاتے تھے۔

"اماں ہم صبح عید کی نماز کیسے پڑھنے جائیں گے۔ ہمیں تو شرم آتی ہے کہ ہمارے نانا جان تو تمام مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے اور ہم وہاں نہ ہوں گے۔

جناب فاطمہؑ۔ بیٹا کپڑے تو تمہارے نانا کے بھی وہی ہوں گے جو وہ ہمیشہ پہنا کرتے ہیں۔ غریبی ہم لوگوں کے ورثہ میں آئی ہے اس لئے تمہارے لئے یہی مناسب ہے کہ تم اسی لباس میں عید کی نماز پڑھو۔ اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوگا۔

امام حسنؑ۔ اماں ہم عمر رسیدہ لوگوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کا لباس نیا اور اُجلا ہوگا مگر بچوں میں تو کوئی ایسا نہیں ہوگا جو ہماری طرح عید کے دن بھی پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہوگا اس لئے ہم تو نہیں جائیں گے۔ امام حسینؑ اور اگر جائیں گے تو نئے کپڑے پہنکر جائیں گے اگر ہمیں نانا جان بھی لینے کے لئے آئیں گے تو نہیں جائیں گے پر نہیں جائیں گے۔

حضرت فاطمہؑ نے بہتیرا سمجھایا مگر بے سود آخر جب اس طرح ضد کرتے کرتے رات کا کافی حصہ گذر گیا اور حسنینؑ نئے کپڑوں کے لئے بہت مصر ہوئے تو جناب فاطمہؑ نے کہا۔

"بیٹا تم سو جاؤ۔ تمہارے کپڑے صبح درزی لے کر آئیگا مجھے یقین ہے کہ تمہارے نانا نے ضرور سلنے کے لئے دیئے ہوئے ہوں گے۔"

شہزادے کچھ تو رونے دھونے اور ضد کرنے کی تکان سے۔ کچھ رات زیادہ گزر جانے کی وجہ سے اور کچھ وعدہ وعید کی تسلی کے سبب سو گئے۔ جناب فاطمہؑ بھی لیٹ گئیں اور آپ کی لونڈی فضہ بھی گھر کے کاروبار اور نماز عشاء سے فارغ ہو کر سو گئی۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ تمام شہر پر خاموشی اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کے سب لوگ سوئے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جناب فاطمہ بیدار ہوئیں اور لونڈی سے فرمایا۔

"فضہ! معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے"

فضہ نے عرض کی۔

"بی بی سُنا تو میں نے بھی ہے لیکن اسوقت کون ہو سکتا ہے؟"

جناب فاطمہؑ نے فرمایا۔

"جاؤ دروازہ کھول کر دیکھو کون ہے اور کیا کہتا ہے"

فضہ دروازے پر گئی اور سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"مَنْ اَنتَ۔ یعنی تو کون ہے"

آواز۔ "اَنَا خَیَّاطٌ۔ میں درزی ہوں"

فضہ کے کان اس آواز سے مانوس تھے اسلئے اُسنے فوراً دروازہ کھول دیا لیکن دیکھا تو ایک اجنبی شخص دونوں ہاتھوں پر سفید رنگ کے کپڑے لئے ہوئے ہے۔ فضہ نے دریافت کیا

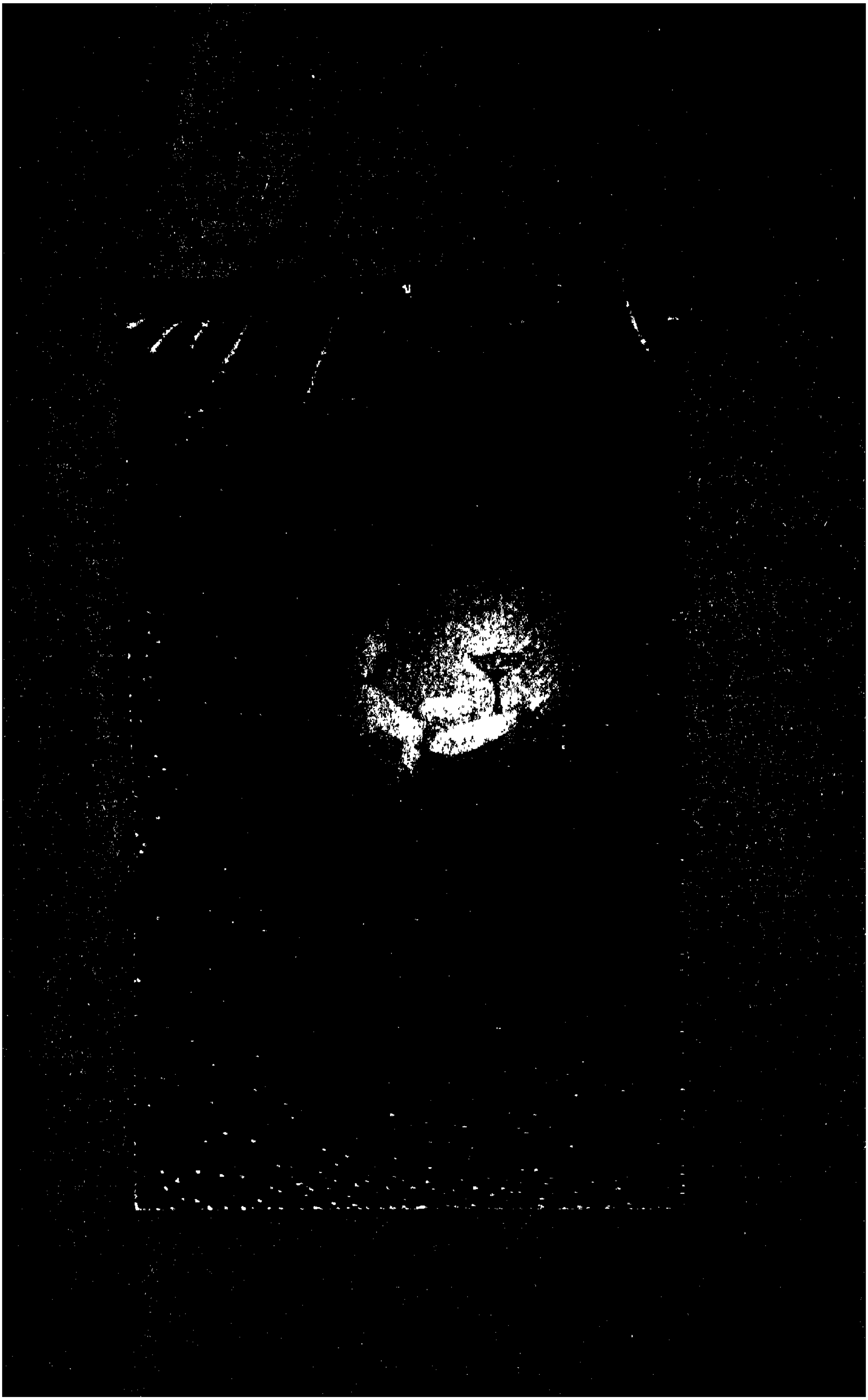
"یہ کپڑے کیسے ہیں"

اجنبی نے جواب دیا

"یہ دو حُلّے ہیں جو حسنینؑ کے لئے لایا ہوں" اور فضہ کے حوالے کرکے واپس ہو گیا۔

جب فضہ نے یہ ماجرا حضرت فاطمہؑ کی خدمت میں آکر بیان کیا تو وہ بہت حیران ہوئیں اور بہت سوچ بچار کرنے لگیں۔ پھر اس خیال سے کہ شائد رسولِ خدا نے اپنے نواسوں کے لئے بھیجے ہوں لیکر رکھ لئے۔

رسولِ مقبولؐ نماز فجر کے بعد مدینہ شریف کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں جہاں جہاں بیوہ عورتیں اور یتیم بچے ملے ان کی تسلی و تشفی کرنے میں مشغول تھے تاکہ امیروں کی شان و شوکت دیکھ کر اُن کے رنج و آلام میں اضافہ نہ ہو اور ان کے ٹوٹے ہوئے دل بالکل چکنا چور نہ ہو جائیں



حضور لوگوں سے فرماتے کہ صدقہ فطر مستحق لوگوں کو دیں اور اپنے غریب [illegible] نیک سلوک کریں اور حتی المقدور انہیں امداد بھی دیں۔

جب حضور سرورِ کائنات اس طرح تلقین و نصیحت فرماتے ہوئے حضرت علیؑ کے [illegible] دیکھتے ہیں کہ جناب فاطمہؑ اپنے بیٹوں کو نہلا دُھلا کر کپڑے پہنانا چاہتی ہیں مگر وہ انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سفید کپڑے نہیں پہنیں گے۔

رسُول اللہ نے فرمایا

"یہ کپڑے کہاں سے لئے ہیں؟"

جناب فاطمہؑ نے عرض کی۔

"بابا کچھ رات باقی رہے کوئی شخص آکر دے گیا تھا۔ میں تو سمجھی تھی کہ آپ نے بھیجے ہوں گے مگر آپ کو بھی معلوم نہیں۔"

حضورؐ نے دریافت کیا

"کیا حسنین نے نئے کپڑوں کی خواہش ظاہر کی تھی؟"

حضرت فاطمہؑ نے عرض کی

"بابا! رات حسنین بہت مچل رہے تھے اس لئے میں نے انہیں سلانے کی غرض سے یونہی کہدیا تھا کہ تمہارے کپڑے درزی صبح لے کر آئے گا۔"

رسُول خدا نے فرمایا

"تو امین اور صادق کی بیٹی ہے اللہ تعالیٰ کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ تو بچوں کے سامنے شرمسار ہو اس لئے اُس نے جبریل امین کو حُلے دیکر بھیجدیا۔"

رسُول اللہ نے فرمایا۔

حسنؑ! تم کپڑے کیوں نہیں پہنتے؟۔

امام حسنؑ نے جواب دیا۔

میں سفید کپڑے نہیں پہنوں گا۔ مجھے سبز رنگ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح حضورؐ نے جب امام حسینؑ سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا

"میں سُرخ رنگ کو پسند کرتا ہوں"

رسُول اللہ نے آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ فوراً جبریل امین نازل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک آفتابہ تھا جسمیں پانی تھا۔ جبریل امین آفتابہ سے پانی ڈالتے جاتے تھے اور رسُول اللہ کپڑے کو بھگوتے جاتے تھے۔ امام حسنؑ کا حلہ سبز رنگ کا ہو گیا اور امام حسینؑ کا سُرخ۔ عجوبہ یہ تھا کہ پانی ایک ہی برتن سے ڈالا گیا مگر دونوں کپڑوں کے رنگ علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔

الغرض حسنین نے وہ کپڑے پہنے اور عید کی نماز پڑھنے کے لئے اپنے نانا کے ہمراہ چلے۔ گھر سے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں تمام قریش کے لڑکے اونٹوں پر سوار ہیں اور عید گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ امام حسنؑ نے کہا

"ناناجان! لوگ تو اونٹوں پر سوار ہیں اس لئے ہم پیدل نہیں جائیں گے"

حضورؐ نے دونوں شہزادوں کو اپنے شانوں پر اُٹھا لیا اور عید گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

امام حسینؑ نے کہا

ناناجان! لوگوں کے اونٹوں کی مہاریں ہیں اور ہمارے اونٹ کی کوئی مہار نہیں

رسُول اللہ نے جن زلفوں کی خدا قسم کھاتا ہے اُن کے ہاتھوں میں دیکر کہا۔

"بیٹا تمہارے اونٹ کی یہ مہار ہے"

پھر امام حسنؑ نے کہا

ناناجان! لوگوں کے اونٹ بولتے ہیں اور ہمارا اونٹ نہیں بولتا۔

اسوقت رسُول اللہ نے ..... "عف عف" کی آوازیں نکالیں اور اپنے شہزادوں کو عید گاہ کی طرف لے چلے۔

تاجی امرتسری

مسلم اور ہلالِ عید!

عالمگیر عید نمبر کیلئے

از ادیب الملک حضرت اکبر حیدری

(۱) مسلم :-

اے ہلالِ عید! اے سرمایۂ عیش و نشاط
اے ہلالِ عید! اے پیغامِ لطف و انبساط
میرے غمخانے میں دردانگیز اِک آواز ہے
احتیاط! اے شادمانی کے پیمبر! احتیاط

یاد آتا ہے مجھے عہدِ گذشتہ کا عروج
خوں رُلاتا ہے مجھے اسلامِ خستہ کا عروج
پرچمِ توحید پر وہ تیری تصویرِ حسیں
جس سے وابستہ کبھی تھا بختِ رفتہ کا عروج

ہاں تجھے بھی یاد ہے وہ سرگزشتِ اوّلیں
ہمصفیر و ہمنوا تیرا کبھی تھا میں حزیں
بدنصیبی سے میری وہ ہوگئے خواب و خیال
جو فسانے سن چکے ہیں مجھسے افلاک و زمیں

کون تھا ہاں کون تھا وہ جس کے ہنگاموں میں تو
کارفرما تھا کبھی آسودہ و صرفِ نمو
کون تھا جس نے تجھے بخشی حیاتِ جاوداں
کس نے تیرا نام پھیلایا تھا آخر چارسو

یاد آتے ہیں کبھی اب بھی وہ افسانے تجھے
جب لئے پھرتے تھے اپنے ساتھ دیوانے تجھے
یاد کر وہ دن کہ جب تیرے جلال و رعب میں
دیکھتے تھے قیصر و کسریٰ کے کاشانے تجھے

آہ لیکن آج ہمدم میں نہیں وہ تو نہیں
گل وہی باقی ہیں لیکن اُن میں رنگ و بو نہیں
ایک رشتہ تھا کہ جسمیں منسلک تھا میں بھی تو
اب ترا پرچم نہیں اب وہ مرے بازو نہیں

آج جب بدلا ہوا ہے بزمِ دُنیا کا نظام
آج کیوں آیا ہے تو لیکر مسرت کا پیام
آج کس کے دل سے دیکھوں تجھ کو کس کی آنکھ سے
کیا کروں آخر پذیرائی کا تیری اہتمام

ہاں مگر آ! ہمدمِ دیرینہ و دمساز آ!
چند آہیں ہیں ابھی تک مائلِ پرواز آ!

(۲) ہلال

ہوش میں آ ہوش میں او مسلمِ بے خانماں! کیوں مسلماں آپ کو کہتا ہے ننگِ دوجہاں
صاحبِ توحید ہوتا تو زمانے میں اگر۔ یوں نہ دنیا سے کبھی مٹتا ترا نام و نشاں

اپنی غفلت کا مجھے الزام کیوں دیتا ہے تو اپنی بربادی کے حیلے ڈھونڈھتا ہے حیلہ جو
میں تو آمادہ ہوں تیری ہمصفیری کیلئے تجھ میں باقی ہے اگر اب بھی کوئی شانِ نمو

دیکھ آنکھیں کھول کر اسلاف کا طرزِ عمل ہے اگر ہمت تو آ! اس جادۂ مشکل پہ چل
چھوڑ دے باطل پرستی توڑ دے ایوانِ کفر بتکدہ میں پھر بنا کعبہ ذرا کروٹ بدل

میری ہستی میں ابھی مضمر ہے وہ رازِ حیات جس کو سُنکر چونک اُٹھیگی بساطِ کائنات
آ! کہ میں تجھکو سکھاؤں زندگی کا فلسفہ آ! کہ میں تجھکو دکھاؤں منزلِ راہِ نجات

بدرِ کامل تھا کبھی میں نور سے معمور تھا تھی ضیا مجھ سے عبارت میں سراپا نور تھا
آشیانہ تھا کبھی میرا بہ آغوشِ فلک سربلندی پر میں اپنی کسقدر مغرور تھا

یہ مرا اقبال تھا ادبار کی حالت نہ پوچھ دامنِ تاریک میں کیا تھی مری غایت نہ پوچھ
رفتہ رفتہ آہ میری روشنی رخصت ہوئی مجھ سے اب میرے تنِ کاہیدہ کی صورت نہ پوچھ

کر گیا بیدار لیکن اب مجھے میرا زوال از سرِ نو پھر نکل آیا میں بنکر اک ہلال
منزلیں پھر طے کروں گا میں عروجِ نور کی ہے اگر ہمت تو آ تو بھی ہو میرا ہمخیال

از سرِ نو ملتِ برباد کی تنظیم کر! مائلِ تبلیغ ہو قرآن کی تعظیم کر!
اہلِ دنیا کو سُنا! حکمِ خدا حکمِ رسولؐ نعرۂ "تکبیر" کی عظمت کو پھر تسلیم کر

پھر وہی نغمہ ہو تیرا پھر وہی سازِ حیات
پھر وہی میں ہوں۔ وہی تو ہے وہی رازِ حیات

عالمگیر کے عید نمبر کیلئے

عید کی مانگ

از حضرت "کوئی"

کہنے لگیں "کیسے بیٹھے ہو؟"

کہا "اچھے بیٹھا ہوں!"

"صورت پہ ڈھائی کیوں بج رہے ہیں"

"رمضان کی جدائی کا افسوس ہو رہا ہے!"

"سچ ہے روزے تو ہم بھی بہت رکھتے تھے"

"روزوں کا طعنہ کیوں دیتی ہو بیگم! سحری تو کبھی قضا نہیں ہوئی"

"تو پھر یوں کہو کہ سحریوں کے چھوٹنے کا افسوس ہو رہا ہے"

"یوں ہی سہی۔ بہرحال تم مجھے کم از کم کافر ثابت نہیں کر سکتیں۔ تم نے وہ مثل نہیں سنی بیگم کہ روزہ نہ رکھیں، نماز نہ پڑھیں تو کیا سحری بھی نہ کھائیں بالکل ہی کافر بن جائیں"

"جی ہاں سنی ہے۔ بس سنی ہے۔ تم نے تو بے حیائی پہ کمر باندھ لی ہے۔ نہ نماز کے نہ روزے کے اور رمضان کے چھوٹنے کا اتنا افسوس کہ کیا ملاں لسین کو ہوگا!"

"سچ فرمایا!"

"معلوم ہے رمضان کے مہینہ کی کتنی فضیلت ہے؟"

"نہیں!"

"ہر طرف اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ اور ایک نیکی کی ستر ہزار نیکیاں درج کی جاتی ہیں۔ اگر کوئی اس موقعہ سے بھی فائدہ نہ اٹھائے تو افسوس کی بات ہے یا نہیں؟"

"بجا ارشاد ہوا!"

"نیکی کے فرشتے زمین پر بھیجے جاتے ہیں۔ جنت کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے"

"درست ہے!"

"تو پھر افیمیوں کی طرح ٹوٹل رہے ہو کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟"
گدگدی کر کے نگاہوں میں نگاہیں ڈالتے ہوئے ——— کیا خفا ہو گئے؟"

"نہیں بیگم، بھلا تم سے خفا!؟ ——— میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر بقول تمہارے رمضان میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ شیطانی افعال تو دنیا میں ایک مہینہ تک سرزد ہو نہیں سکتے۔ اب جو یہ رمضان کے مہینہ میں عیدوا کے ساتھ جمیا بھاگ جاتی ہے یا لپنے گنگو کمہار کا گدھا چوری چلا جاتا ہے۔ یا آبکاری کی دوکان پر میر مقدس حسین چھپ چھپ کر ٹھرا پیتے ہیں یا بی الہیٰ جان کے کوٹھے سے چوں چوں کی آوازیں آتی ہیں یا مسٹر سانڈرس کو مقتول بھگت سنگھ قتل کر دیتا ہے ——— یہ سب افعال اگر ستر ہزار نیکیاں بناکر عیدوا، جمیا، گنگو، میر مقدس حسین، بی الہیٰ جان اور بھگت سنگھ کے نامۂ اعمال میں آنکھ بند کر کے درج کر دئے جاتے ہیں تو پھر ہم تم رہے نہ ٹوٹے میں؟"

"توبہ! پھر وہی الٹی باتیں شروع ہو گئیں۔ میاں تم خدا کیلئے بہشتی زیور پڑھو ان انگریزی کتابوں نے تمہارے خیالات بالکل خراب کر دئے ہیں!"

"اچھا یہ بات ہے؟ تو پھر لاؤ بہشتی زیور۔ دوگانے سے پہلے اسی کی سنت لیں!"

"نہیں اب نہیں، پھر اطمینان سے پڑھنا" یہ کہہ کر بیگم چل دیں۔ ہم نے مڑ کر پکارا۔

"ذرا سنو تو سہی"

"نہیں ہم نہیں سنتے۔ پھر کوئی دہریہ پن کی بات سوجھی ہوگی"



حضرت کری

"تمہیں تمہاری قسم مولانا، یہ رباعی سنتے جاؤ!" بیگم مسکرا کر پلٹیں

"کیسی رباعی؟"

"ذرا اطمینان سے بیٹھو تو سناؤں۔ آج ہی صبح لکھی ہے"

"کیا؟" (بیساختہ ہنستے ہوئے) مجھے معلوم ہے جو کچھ تم نے لکھا ہوگا قسمیہ مجھے معلوم ہے"

"بھلا کیا؟"

"تم سناؤ!"

ہم نے پڑھا۔ ذرا ٹھہر ٹھہر کر ——— "یوں کہنے کو چاہے کچھ زمانہ کہہ دے"

بیگم مسکرائیں ہم رُک گئے۔

"تم مسکرا کیوں رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ تم پڑھو۔ سب پڑھ جاؤ"

ہم نے پھر کہا ——— یوں کہنے کو چاہے کچھ زمانہ کہہ دے
حیلہ کہہ دے اسے بہانہ کہہ دے
شکر اللہ عید تو ہوا ہے ساقی!
مخمور پہ فرض ہو دوگانہ؟ کہہ دے!

"وہی مہریت! لاحول ولا قوۃ" بیگم نے پیٹھ موڑتے ہوئے کہا۔ "ہم جا رہے ہیں"

"ایک اور سن جاؤ۔ تمہیں ہماری قسم!"

بیگم پھر رُک گئیں۔ ہم نے پھر شروع کیا ———

سے رنج و تعب سے تو بیشک ہے خوشی
ورنہ وہ مشقتوں کی ہے مزدوری
روزے رکھنے نہ شب کو ورزش کرنی
عید رمضاں سے عید شہریاں اچھی!

بیگم توبہ توبہ کرتی ہوئی ایک دم اوجھل ہوگئیں اور ہمارے سر پر عید سوار ہوئی۔ یکایک احکامات جاری ہونے شروع ہوئے ——— کسی سے کہہ رہے تھے کپڑے لاؤ، کسی سے کہہ رہے تھے عطر لاؤ، کسی سے کہہ رہے تھے پانی رکھو، کسی سے کہہ رہے تھے جوتا چمکاؤ۔ غرض تمام ہوم گورنمنٹ کام کر رہی تھی اور ہم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی طرح بیٹھے ہوئے فقط شیو کر رہے تھے۔

جس روز سے ہم نے نپولین کی سوانحعمری کا مطالعہ کیا ہے اس روز سے ہم بھی اسی اصول پر کاربند ہو گئے ہیں کہ پہلے داہنے رخسار کا شیو کیا جائے پھر بائیں کا اور سب کے بعد ٹھوڑی کا۔ نپولین کو اس طرح حجامت بنانے میں ممکن ہے کوئی سہولت محسوس ہوتی ہو لیکن ہمیں تو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اب ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ نپولین کے زمانہ میں سیفٹی اُسترے ایجاد نہیں ہوئے تھے اور ہمارے پاس سیفٹی اُسترا ہے جسے اس کے بنانے والے نے یہ خصوصیت بھی رکھی ہے کہ وہ تقریبات کے موقعہ پر ضرور کُند ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں آپ کو سیفٹی ریزر اور شیو کی تھوڑی بہت سائنس بھی سمجھا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ورنہ آپ شیو کے اُس انقلاب کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکیں گے جو نپولین کے زمانے سے اب تک دنیا میں رونما ہو چکا ہے۔

بات یہ ہے کہ داڑھی کی نشوونما میں قدرت نے عجیب و غریب حکمت سے کام لیا ہے اور غور کرنے کے بعد اس حکمت کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی آزاد چھوڑنے کے لئے بنائی گئی ہے نہ کہ مونڈنے کے لئے۔ کم از کم سیفٹی ریزر سے مونڈنے کے لئے تو بنائی ہی نہیں گئی۔

دلیل یہ ہے کہ رخساروں کے بال ہمیشہ ٹھوڑی کے بالوں سے ذرا نرم ہوتے ہیں۔ اور ٹھوڑی ہر لحاظ داڑھی کا دار السلطنت ہوتی ہے۔ نپولینی طریقہ سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی داڑھی کی صفائی کی ابتدا رخسار ہی سے ہوتی ہے۔ رخسار صاف کرنے کے بعد ہمارے جومی اُستروں میں اتنی سکت نہیں رہتی کہ بلا چپڑے کے دو چار چپت کھائے اُسی آسانی کے ساتھ ٹھوڑی صاف کر دیں جس آسانی کے ساتھ رخسار کی صفائی کر چکے ہیں۔ چنانچہ اُن اُستروں سے شیو کرتے ہوئے یہی ہوتا ہے کہ دورانِ اصلاح میں سٹاپٹ کی آوازوں کے کان عادی ہو جاتے ہیں۔ اگر اُسترے کے ساتھ یہ زبردستی نہ کی جائے تو یقیناً ٹھوڑی کے بال داڑھی کی شرعی داغ بیل کو کسی طرح معدوم نہ ہونے دیں اور اسکے دار السلطنت کو نیست و نابود کرنے میں حضرتِ انسان کی کوشش ناکام ایک مضحکہ بنکر چہرے پر نمایاں ہوتی رہے۔ لیکن جس وقت حضرتِ "جلیٹ" علیہ الرحمہ نے سیفٹی ریزر کی ایجاد فرمائی ہے غالباً اُس وقت اُنکے ذہن میں داڑھی کی یہ پیچ موجود نہیں تھی۔ ورنہ ضرور اس کا انتظام کیا جاتا۔ اُنہوں نے صرف اُس کی قطع برید کے ایک آسان اور بے خطر طریقہ پر غور کیا

ہے۔ یہ مطلق نہیں سوچا کہ رخسار صاف کرنے کے بعد جب ٹھوڑی اُسترے کے موجد کا نام پوچھنے لگے تو اُسے کیا جواب دیا جائے۔ حجامی اُسترے کی طرح سٹاپٹ کی تو وہاں گنجائش ہوتی نہیں، نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یا تو نیا ہتیار نکالا جاتا ہے یا پھر شرعی داغ بیل کے نمایاں نقوش کو دو چار مرتبہ ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر برداشت کر لیا جاتا ہے۔

میرے اس بیان کی تصدیق سَو فیصدی جنٹلمین کریں گے اور تلخ تجربہ اُٹھانے کے بعد غالباً ۹۹ فیصدی اس نتیجہ پر پہونچ چکے ہوں گے کہ کم از کم سیفٹی ریزر سے ٹھوڑی کے بال مونڈنا ایک ایسی زبردستی ہے جسے ہر لحاظ سے خلاف وضع فطری کہا جا سکتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب مدعا اس جملہ معترضہ سے یہ تھا کہ عید کے دن شیو کرتے ہوئے ہم یہ سب کچھ سوچ رہے تھے اور سیفٹی ریزر کے موجد کو دل ہی دل میں وہ سب کچھ کہہ رہے تھے جو زیادہ سے زیادہ ایک فصیح و بلیغ کوتوال کسی عادی چور کو کہہ سکتا ہے۔

پورا ایک گھنٹہ گذرنے کے بعد اس مصیبت سے نجات پائی تو نہا دھو کر کپڑے بدلے اور باہر آئے۔ ہمارے اکثر دوست نئی نئی پوشاکیں پہنے ہوئے پہلے سے منتظر بیٹھے تھے۔ ہماری صورت دیکھنا تھی کہ چاروں طرف سے سوالات کی بوچھار پڑی۔

ایک صاحب نے کہا ——— "اماں اب نکلے ہو؟" دوسرے بولے "لاحول ولا میاں ایسی بھی کیا زن مریدی!" تیسرے فرمانے لگے "آپ کو معلوم ہے کیا بجا ہے؟" چوتھے نے استفسار کیا "تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ غسل تھا یا دفعہ ۱۰۷ کا مقدمہ؟" پانچویں نے اظہار خیال کیا ——— "یاران کے سنگار نے تو مولویوں کو مات کیا۔ صبح سے اطلاع کراتے کراتے یہ وقت آ گیا!"

چھٹے بولے "رزنے بہت رکھے ہیں اُن کا خمار اُتار رہے تھے"

غرض جتنے منہ اُتنی ہی باتیں، ہم کچھ سنتے ہوئے کچھ ہوں ہاں کرتے ہوتے ایک طرف قالین پر آ کر بیٹھ گئے۔ اب سنجیدہ باتوں کا نمبر آیا۔ ایک صاحب نے نہایت متانت سے کہا:۔

"ہاں صاحب تو اب یہ طے ہو جانا چاہئے کہ قاضی جی کے پیچھے نماز پڑھی جائے گی یا ملّاں جی کے۔"

"دوگانہ تو قاضی جی کے پیچھے ہی ہوا کرتا ہے یہ ملّاں جی کی ٹانگ کدھر سے اڑی؟" ہم نے اظہار رائے کرتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کو معلوم ہی نہیں ہے" ایک صاحب نے طنزاً ہم سے کہا "میاں وہی سال گذشتہ والا معصومیت کا جھگڑا"

"تو کیا اس سال بھی قاضی جی پر معصومیت کا الزام ہے؟"

"جی ہاں سُنا ہے دو نمازیں ہونگی"

"تمہارے خیال میں تو وہ پکے دنیا دار ہیں، کسی کو یقین ہو یا نہ ہو، ہم تو اُنہی کے پیچھے نماز پڑھینگے!"

ہم نے اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

تائیداً ایک صاحب نے فرمایا "بیشک اُس غریب کو زبردستی معصوم بنا رکھا ہے۔ دو چار دشمنوں نے مل کر ملّاں جی کو اُبھار دیا ہے۔ انہیں حصہ ملنے کی اُمید ہے وہ اسلئے مخالف ہو گئے ہیں ورنہ وہی قاضی جی ہیں جو پہلے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ پُر لطف بات یہ ہے کہ جو لوگ اُنہیں معصوم سمجھتے ہیں وہی اُن کے پیچھے نماز پڑھنے سے گریز کرتے ہیں اور جو انہیں دنیا دار کہتے ہیں وہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کو تیار ہیں"

ہمارے سب دوست ہمزبان ہو کر بولے ——— "بیشک اُن کے پیچھے نماز جائز ہے۔ خواہ مخواہ چند خود غرضوں نے انہیں سیدھا سمجھ کر ان کی کمزوری سے ناجائز نفع اُٹھانے کے جال پھیلا رکھے ہیں"

اس ردوکد کے بعد متفقہ طور پر طے ہوا کہ عیدگاہ چل کر قاضی جی کے پیچھے نماز پڑھی جائے لیکن ایک شخص نے اطلاع دی کہ عیدگاہ میں تین پارٹیاں بنی ہوئی ہیں، ایک قاضی جی کے پیچھے نماز پڑھے گی دوسری ملّاں جی کی امامت میں اور تیسری ایک اور مقدس بزرگ کی قیادت میں۔ ہم نے کہا ارے لعنت ہے ان پارٹی بندیوں پر آؤ بھائیو اگر عیدگاہ میں تین جماعتیں ہونا جائز ہیں تو پھر چوتھی جماعت یہیں کیوں نہ منعقد کر لی جائے سب نے بیک آواز اس تجویز کو پاس کیا اور فوراً دوگانہ مع چھ تکبیروں کے منعقد ہو گیا۔ دوگانہ سے فارغ ہونے کے بعد دوست رخصت ہوئے تو ہم اندر گئے، بچوں نے گھیر لیا "ابا ہمیں عیدی لکھ دو! — عیدی لکھ دو — عیدی لکھ دو"۔

ہم نے گھبرا کر کہا ——— "جاؤ جی اپنے استاد سے لکھواؤ، ہم کوئی طالب

ہیں جو عیدی لکھیں گے۔
کسی نے نازک سے لہجہ میں کہا ——— "لکھ کیوں نہیں دیتے؟ تمہارے لئے کون مشکل کام ہے۔ بچوں کا دل رہ جائے گا!"
اب اس حکم کے بعد ہم بھی مجبور تھے چنانچہ پنسل کاغذ اٹھا کر دس منٹ کے لئے خاموشی کا آرڈیننس جاری کیا گیا۔ اس کے بعد ایڑی طلب کی گئی، اب ایڑی کے اوپر جو چوٹی کاری کی گئی وہ اتفاق سے مطلع و مقطع سمیت اچھی خاصی ہماری غزل تھی ——— وھو ہذا :-

عید کی دُم

اس طرح بھوک کے لیسنس کی تجدید ہوئی
صبحدم شیخ پکارا کہ اُٹھو عید ہوئی

کہیں اُنتیس رہی اور کہیں تیس رہی
اسی ہڑبونگ میں غائب مری اک عید ہوئی

تو بھی آ چاند کسی شوخ کا ناخن نکلا
کل تری دید ہوئی آج مری عید ہوئی

آگے روزوں میں یکایک جو اڑی چاند کی ٹانگ
رند کی عید ہوئی شیخ کی تبرید ہوئی

پھر نئے سر سے ہر اک پیر و جواں طفل بنا
شیر خواری کی بزرگوں میں بھی تقلید ہوئی

کوئی کہتا ہے گنہگار کوئی دُنیا دار
پھر وہی قاضیٔ معصوم پہ تنقید ہوئی

کوئی

وغیرہ وغیرہ۔

اسکے بعد ہم ذرا سو گئے۔

کوئی

عالمگیر عید نمبر کیلئے

ساقی اور عید

از جناب عشرت رحمانی مُدیر نیرنگ

عید آئی ہے عید آئی ہے — یعنی جام نوید لائی ہے
دورِ عشرت ہے ہاں پلا ساقی — ابرو ۓ کی دُہائی ہے

نظر فروز ہے منظر بہار ہے ساقی — کہ تیرا جلوہ رُخ لالہ زار ہے ساقی
سرور وکیف بھی ایسا ہی کچھ عطا کر دے — کہ جیسے تشنہ لبی کی پکار ہے ساقی

ترس رہی ہے نظر صدقہ شباب تو دے — عتاب ہی سہی لیکن کوئی جواب تو دے
نگاہ مست کی گردش سے کام لے ساقی! — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے"

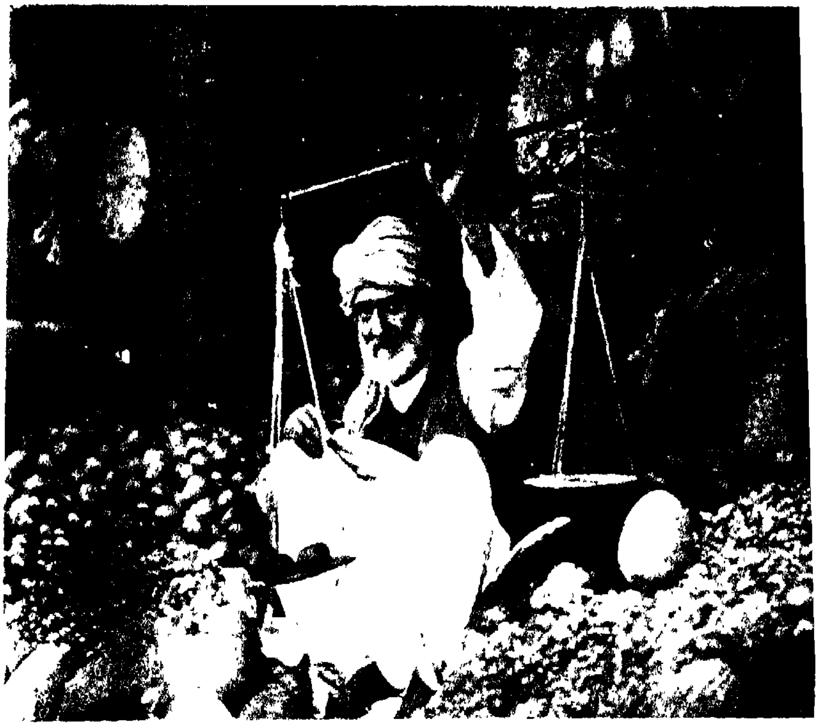
وہ رنگ دے جو تجھ سا حسین ہو ساقی — وہ کیف دے جسمیں کہ یقیں ہے ساقی!
ہاں جلوہ پُرنور کی بس ایک جھلک — مستی کی ہوس ہمکو نہیں ہے ساقی!

حسین ساقی متین ساقی شراب میں کچھ شعور بھر دے
کہ جوش و مستی سے ہوش آئے جو ایسا دل میں سرور بھر دے
ہلالِ عید آج جلوہ گر ہے، ترے ہی جلوؤں کی عید ہوگی!
مری خیالوں کو مست کر دے! مری نگاہوں میں نور بھر دے



مزدور عورت

رسالہ عالمگیر لاہور



میوہ فروش

چنبیلی کی کلی!

زیر طبع تصنیف "خانم" کا ایک باب

اسکے تو ہم بھی قائل ہیں کہ چنبیلی کی کلی کچھ شکرقندی کی ہمشکل ہوسکتی ہے مگر اسکے یہ معنی تو نہیں کہ سر سالے کا منڈھے اور الٹے بہنوئی کے سر پڑے!!

۱

ایک روز کا ذکر ہے کہ اتوار کا دن تھا اور میں چارپائی پر بیٹھا قلم میں روشنائی بھر رہا تھا کہ اتنے میں بلائے بے درماں کی طرح ایسی بے تحاشا خانم آن کر گری کہ سب سیاہی پھیل گئی۔

"ارے" کہہ کر میں پھاند پڑا۔ "اندھی ہو"

"تار!" اسکے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی کس خوشی سے اُسے خبر سنائی ہے تار کھولتے ہوئے + ایک عجیب نامعقول خبر۔ کیا عرض کروں۔ بس خبر کیا حماقت کہئے + وہ یہ کہ ننھا منا سا خانم کے ایک بھائی پیدا ہوا ہے۔!

پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس عجیب و غریب خبر کو سنکر کیا کروں۔ ہنسوں یا روؤں + ذرا غور کیجئے کہ آپکے ایک سالا پیدا ہوا ہے! . . . . ایک اور! . . . . ایک نہ شد دو شد! وہ مضمون ہے۔ کچھ عجیب سی معلوم دی کہ کوئی سُنے گا تو نہ معلوم کیا کہے گا کہ انہیں دیکھو حضرت کو اسالے کی پیدائش پر خوش ہو رہے ہیں۔ خواہ میں بالکل خوش نہ ہوں مگر لوگ تو یہی کہیں گے! اپبلک تو یہی کہے گی!! لاحول ولا قوۃ مجھ بھلا اس توموں لوی کیا مچی چنانچہ یہ وہ خیالات تھے جو تار کی عبارت پڑھتے ہی میرے دل میں آئے۔ میں نے تار پڑھا اور پھر خانم کی طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ! ادھر میرے تو یہ خیالات اور اُدھر خانم کی حالت! مارے خوشی کے چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھیں خوشی کے نور سے لبریز اور چہرہ پر مسرت کے تارے جھمک رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میری پیاری بیوی۔ میری پیاری رفیقہ حیات۔ میری ہمسفیر و ہمجلیس کس طرح پھول کی طرح مارے خوشی کے پھلکھڑی سی کھلی ہوئی جا رہی ہے۔ اک جوش فرحت و شادمانی ہے کہ چھایا ہوا ہے! معاً سوال پیدا ہوا۔ کیا ایک شوہر کا یہ فرض اولین نہیں کہ اپنی چہیتی بیوی کی خوشی میں شریک ہو؟ کیا بیوی کے رنج و غم اور ہنسی اور خوشی میں شوہر کا شریک ہونا لوازمات میں سے نہیں ہے؟ ضرور ہے اور بالضرور۔ سچے دل سے بیوی کی ہر خوشی میں شریک ہونا چاہئے۔ لہذا مجھکو بھی سچے دل سے مجبوراً خوش ہونا پڑا! چنانچہ فوراً ہی میں نے سب سے پہلے خانم کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ خوشی کا موقعہ ہے۔ سخت خوشی کا مقام ہے۔ جتنا بھی خوش ہوا جائے کم ہے۔ خدا نے خود ہمیں خوشی کا دن دکھایا ہے۔ خدا نے خود ہمیں ایک ننھا منا سا چاند سا سالا عنایت کیا ہے۔ ہم کیوں نہ خوش ہوں ہماری خانم خوش۔ اور ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ کیوں نہ ہمارے دل میں لڈو پھوٹیں بیشک پھوٹیں۔ پھوٹیں اور اوّل پھوٹیں۔ کیوں نہ ہم باغ باغ ہوں۔ بیشک ہوں۔ کچھ مذاق تھوڑا ہی ہے۔ مقام ہی کچھ ایسا خوشی کا ہے۔ قصہ مختصر ہم دونوں بیحد خوش ہوئے۔ والد صاحب نے مبارکبادی کا تار بھیجدیا اور اب ہم ایک اور صلاح کر رہے تھے۔ خانم نے یہ تجویز کی کہ بس اسی ہفتہ میں لڑکے کا عقیقہ ہوگا لہذا بہتر ہے کہ ایک جوابی تار دے کر تاریخ عقیقہ معلوم کرکے اُسمیں باضابطہ ایک ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے۔ اس طرح کہ جیسے ہم بھی ایک خود مختار مہمان ہیں اور آئے ہوئے ہیں ایک رسم میں (خوشی کے موقعہ پر) باضابطہ شرکت کرنے کو۔ چنانچہ یہی کیا۔

۲

جب ہم دونوں چلنے کی تیاری کر رہے تھے تو خانم نے کہا "دیکھو وہاں ذرا ہاتھ روک کے کھانا کھانا"

میں نے خانم کی طرف دیکھا۔ اور پھر کہا "تو کیا ہم کوئی کھاؤ بیر ہیں؟ یا خدانخواستہ ہم مربھکے ہیں جو تم ایسی کہہ رہی ہو"

خانم نے کہا "میں نے ایک بات کہی ڈھنگ کی۔ جب تم وہاں کم کھانے والے مشہور پہلے ہی سے ہو تو میں کہتی ہوں کہ اچھا ہے ذرا بات بنی رہے اور کرکری نہ ہو"

میں نے کہا "سچ کہتی ہو تم۔ بات بیشک ڈھنگ کی ہے"

مسکرا کر وہ بولی "دیکھنا تم وہاں۔ ابکی سب ہی تو ہوں گے۔ دیکھنا تم کیسے کیسے کھاؤ لوگ ندیدوں کی طرح کھانے پر گرتے ہیں۔ تم ویسے بھی زیادہ نہیں کھاتے جو کہیں ذرا ہاتھ روک لوگے تو بس مزہ ہی آجائیگا"

میں نے خانم کے پر نور اور بشاش چہرہ کو دیکھا۔ کسقدر خوشی حاصل ہوگی اس کو میرے کم خوراک مشہور ہونے پر۔ یہ میں نے اپنے دل ہی میں کہا اور سوچا کہ بیشک میں سسرال سے ابکی نام پیدا کرکے لوٹوں گا۔ خانم نے پھر ہنستے ہوئے کہا "دیکھنا تم مزے ابکی۔ ایک تو ویسے ہی تمہاری کم خوراک اور پھر ذرا ہاتھ روک گئے اور ادھر وہ ڈھو کے ڈھو! دونوں کس کس کے ہڑپیے ماریں گے ...."

بات دراصل یہ تھی کہ خانم کے ذہن میں ابتک بڑے بڑے اور موٹے موٹے دولہا بھائیوں کے خطرناک نقشے معہ انکے اوزان کے پیش نظر تھے۔ اگر ایک دولہا بھائی "ایک من بیالیس سیر" کا تھا تو دوسرا ڈھائی من پکے کا۔ کھانے پر جو پل پڑیں تو سسرال میں قحط ڈال دیں چولہوں میں زلزلہ آجائے۔ آخر میں بھی تو داماد ہوں۔ جو میری وقعت ہے وہ کسیکی نہیں۔ کیوں؟ اسی وجہ سے کہ ہر معاملہ میں میانہ روی سے چلتا ہوں۔ کھاتا کم ہوں۔ نازک بدن واقع ہوا ہوں۔ ضرورت پڑ جائے تو بڑے بڑے بچوں میں شمار ہو سکتا ہے۔ کانٹے پر تول لیجئے۔ کبھی ایک من پانچ سیر تو کبھی چھ سیر۔ دبلا پتلا۔ نازک اندام۔ ہلکا پھلکا۔ پھر اگر ایک قسم کی ددّو یا ساس نے میرا نام "چنبیلی کی کلی" رکھدیا تو کیا بیجا کیا۔

جب ہمارا نام "چنبیلی کی کلی" رکھا گیا تھا تو ہمیں اور خانم دونوں کو بیحد خوشی ہوئی تھی مگر طے یہ کیا گیا تھا کہ مصنوعی طور پر اس خطاب سے بیزاری کا اظہار کیا جائے اور چڑھنا چاہیئے۔ یہ محض اس لئے کہ دادی اور بھی چھیڑیں۔

مندرجہ بالا خیالات میرے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ جب میں سسرال پہونچا۔ دیکھوں تو دروازہ پر بڑے ساڑھو کھڑے ہیں۔ آنوزمیاں کس زور سے پکڑ کر انہوں نے میرے ہاتھ کو جھٹکا ہے مصافحہ کرنے میں کہ بیان سے باہر۔ منجھلے بھائی یعنی خانم کے منجھلے بہنوئی سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں باتیں کرتا باہر ہی رہ گیا اور خانم اندر اتر گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی اندر گیا۔

مہمانوں کی وجہ سے جگہ نہ تھی پھر بھی ہماری آمد کا حال سنکر خانم والا پرانا کمرہ ہمارے لئے موجود تھا۔ خانم اپنے ننھے منے بھیا کو گود میں لائی اور مجھے دکھایا۔ آپ خود خیال کیجئے کہ میں بھلا اسے کیا دیکھتا اور کدھر سے دیکھتا۔ ایک پلپلی سی چیز تھی کپڑے میں لپٹی ہوئی۔ ناک منہ۔ گال وال سب ایک اور۔ پلپلے سے معلوم ہو رہے تھے

خانم نے مجھ سے کہا "اسکا نام رکھا جائیگا"

میں نے دل میں سوچا کہ آخر میں کیا کروں۔ میں بھلا کیسے روک سکتا ہوں۔ اسمیں کونسی نئی بات ہے نام تو لوگ بغیر رکھے مانیں گے ہی نہیں۔ جب میں کچھ نہ بولا تو خانم پھر بولی :-

"تم بتاؤ کیا نام ٹھیک رہے گا"

نام مجھے کئی یاد آگئے۔ پیر محمد۔ تیغ علی۔ قلندر بخش۔ وغیرہ وغیرہ

غل تھا علیؑ کی تیغ کا سب رنگ ڈھنگ ہے
جبریل کانپتے تھے کہ خیبر کی جنگ ہے

غل غپاڑہ کو تو جانے دیجئے اس پر غور کیجئے کہ یہ نام سنکر حضرت جبریل کیا سوچیں گے۔ قصہ مختصر تیغ علی بہت اچھا نام ہے اور یہ سوچ کر کہ یہ تو ہم خود اپنے لڑکے کے لئے رکھ چھوڑیں۔ خانم کو اور کوئی نام بتا دیں چنانچہ ہم نے سادگی سے کہا "پیر محمد"

مگر جناب وہ تو یہ سنکر۔ بچہ کو منہ کے پاس سے ہٹا کر تیور بدل کر بولی "معاف کیجئے ...." میں کچھ گھبرا سا گیا۔ آخر نباض ہوں نا۔ جلدی سے میں نے بوکھلا کر کہا "خدا کے واسطے خفا مت ہو۔ مجھے نام نہیں معلوم"

(تیغ علی بتانا نہیں چاہتا تھا)

خانم خوش ہوگئی اور اب اس بچہ کو میرے منہ کے قریب کیا۔ میں نے غور سے دیکھا اور انگلی اس کے گال پر رکھی تھی کہ وہ بولا ... "میں"

جلدی سے خانم نے اُسے کلیجہ سے لگا لیا اور دوڑی چلی گئی۔

اسکے بعد میں گھر میں گیا۔ بڑی سالیوں سے دعائیں اور روپیہ لئے۔ مگر دادیا ساس وہ جو کہ ضد ایک قسم کی دادی تھیں اور جنہوں نے میرا نام چنبیلی کی کلی رکھا تھا انہوں نے دیا دلایا تو کچھ نہیں بلکہ اُلٹی بلائیں لیں "میری چنبیلی کی کلی" انہوں نے کہا اور جھٹ جھٹ بلائیں لیں۔ میں نے نظر نیچی کرکے جو دیکھا ہے انکھیوں سے خانم کی طرف، تو خدا جانتا ہے کہ جان بوجھ کر وہ ایسی بن رہی تھی کہ جیسے نہ تو اُسے انہیں کچھ کہتے سُنا ہے اور نہ وہ اس کہنے سے خوش ہوئی اور نہ اُسے اُن تہقہوں سے سروکار ہے جو منجھلی آپا اور ان کے میاں اور بڑی آپا نے بلند کئے۔

(۳)

اسکے بعد کھانے کا وقت آیا جس کا میں بےچینی سے انتظار کر رہا تھا کچھ تو اس وجہ سے کہ بھوکا تھا اور کچھ اسوجہ سے کہ باوجودیکہ بھوک میں کھانا کھاؤں گا۔ بہ نسبت اور دنکے بہت کم کھاؤں گا۔ لوگ دیکھیں گے اور تعریفیں ہونگی۔ دسترخوان لگایا گیا۔ کیا ہی پرلطف مجمع تھا۔ دونوں سالیاں تھیں دونوں خانم کے جنگی بہنوئی تھے۔ ایک کنارہ نمکدانی کی طرح میں بھی رکھا ہوا تھا۔ خانم سب بہنوں میں چھوٹی اور خادمہ تھی۔ بڑے بھائی نے بہت کہا کہ "اری تو بھی آجا" مگر خانم نہ آئی۔ نوکرنیوں کی طرح میاں اور دولہا بھائیو اور بہنوں کی خدمت کر رہی تھی۔ کھانا چنا جاچکا تھا اور خانم نے کس ہوشیاری سے کھانا چنا تھا۔ میرے سامنے چڑیوں کا سا چوگا رکھا تھا۔ کھانا شروع ہوگیا۔

میں کچھ نا امید سا ہوگیا کیونکہ نہ تو کوئی میری ضرورت سے زیادہ چھوٹے نوالہ کو دیکھتا تھا اور نہ کوئی یہ غور کر رہا تھا کہ میں تیزی سے کھا رہا ہوں یا آہستہ آہستہ۔ خدا بھلا کرے منجھلی آپا کا کہ انہوں نے میری طرف توجہ کی اور کہا "یہ لو"۔ یہ کہہ کر چاولوں کی پلیٹ آگے بڑھائی۔ واہ ری بیوی میں تو قائل ہوگیا۔ کس انداز سے کہا ہے۔ کچھ چپکے اور کچھ زور سے۔ "لیا نہ ہو"۔

میں نے شکریہ کے ساتھ پلیٹ ہاتھ سے لی مگر جناب آپ غور فرمائیں کہ میں اُسمیں سے کچھ لیتا۔ کیسے! کیونکہ خانم کا عجیب وغریب اشارہ پا چکا تھا اور پھر اب آنکھ جو چار ہوئی تو اُس نے پلک کا اشارہ کردیا کہ "خبردار"۔ میں نے پلیٹ لیکر پاس رکھ لی اور پھر اسی طرح چِنگنے لگا۔ اب میں نے خانم کے دولہا بھائیوں کی طرف ذرا غور سے دیکھا۔ بخدا کیسا زوروں میں یہ دونوں حضرات سسرال کا مال واقعی سسرال ہی کا مال سمجھ کر کھا رہے تھے! ان بھلے مانسوں کو بھلا کہاں فرصت کہ میری کم خوری کے کمالات پر غور کریں۔ میں اس ناکامی کے وہم میں پھنسا ہوا تھا کہ خانم نے اب نیا پانسہ پھینکا۔ کیوں نہ ہو عقلمند بیوی پر قربان جایئے۔ نہ معلوم کس طرح اور کیسے وہ دادی صاحبہ کو لگا لائی۔ وہ بھی نہ معلوم کیا سکھا کر، کہ آئیں وہ اپنے دلچسپ اور پرشکن چہرہ کو پر مذاق بنا کر اور بولیں:

"میری چنبیلی کی کلی کو بھی کچھ دیا کھانے کو؟ بچیوں؟"

بڑی آپا شگفتہ ہو کر بولیں "تمہاری چنبیلی کی کلی تو سونگھ رہی ہے۔ ایک دو چپاتیاں سامنے تھیں وہی ختم کئے نہیں ہوتیں"۔

بڑے بھائی نے مذاق میں یوں حصہ لیا کہ روٹیوں کا ڈھیر اُٹھا کر میری طرف رکھ دیا۔ "یہ لو" دو تین رکابیاں اور سرکا دیں اور کہا۔ کھاؤ بھئی ڈٹ کے کھاؤ۔ نہیں دادی یہی کہیں گی کہ ہم لوگ سب کھا گئے"۔

"میں خوب کھا رہا ہوں" میں نے کہا۔ "دادی میں نے ڈٹ کے کھایا ہے آج"۔

"دیکھوں تو میں کیا ڈٹ کے کھایا ہے تو نے"۔ یہ کہہ کر دادی صاحبہ نے میرے پاس ہی بیٹھ کر میرے کھانے کی وہ تشریح کی ہے کہ دل میرا باغ باغ ہوگیا کیونکہ آپ یقین مانیں کہ خانم پر جو میری نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری طرف دیکھ نہیں رہی ہے بلکہ ثنا کئے دے رہی ہے۔ اس کا چہرہ اُن جذبات کا آئینہ تھا جن کی حقیقت ایک شوہر ہی معلوم کرسکتا ہے۔ دادی صاحبہ نے تشریح کرکے بتادیا کہ میں نے صرف ڈیڑھ روٹی کھائی ہے۔ سالن جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ اور چاولوں کی باری ہی نہیں آئی ہے۔ کباب اس طرف لوگوں نے آنے ہی نہیں دئیے کھاتا میں کیا خاک۔

منجھلی آپا نے کچھ تشویش کا اظہار کیا اور بولیں۔ "سچ مچ انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔" اِدھر میں نے یہ سنا اور خانم کو دیکھا۔ حالانکہ ابھی اور کھاتا مگر اب میں نے طے کر لیا کہ اب تو ذرا بھی کچھ نہ کھاؤں گا۔ آپ ہی بتائیے کہ کیسے بھلا کھاتا۔

بڑی آپا نے کہا "کھانے بھی دو۔ یہ کیا معاملہ ہے کوئی تکلف تھوڑا ہی ہے۔ جتنا سب کا جی چاہے کھائیگا۔" پھر میری طرف مخاطب ہو کے کہا "کھاؤ جی تم۔ جو تمہارا جی چاہے۔ پھر جی چاہے تو کھانا اور جی نہ چاہے تو مت کھانا۔ تکلف اسمیں کا ہے کا ہے بس سمجھ لو کہ گھر ہی کا کھانا۔"

"ایسا میں بیوقوف تھوڑی ہوں جو بھوکا رہ جاؤں گا" میں نے کہا۔ "میں کھا رہا ہوں۔ آپ کوئی صاحب میری طرف سے فکر نہ کریں۔"

یہ کہہ کر میں نے پھر چنگنا شروع کیا۔

مگر بہت جلد کھانا اختتام پر پہنچا اور مٹھاس کا دور آگیا۔ ڈبل روٹی کے میٹھے ٹکڑے تھے۔ ایک تو میں نے آدھا پیٹ کھانا کھایا تھا اور دوسرے کیوڑہ اور زعفران کی بھوک پر ذرا سی مہک! پھر نوالہ جو ایک چھوٹا سا لیا ہے تو حلق سے معدہ تک ایک ذائقہ کی لکیر بنتی چلی گئی! خلاف مرضی ہاتھ کو معدہ کے احکام کی تعمیل کرنا پڑی۔ میں نے بہت تھوڑا سا لیا تھا اور چار نوالوں میں رکابی صاف کر کے معدہ میں بھوک کی گھرچن محسوس کرنے لگا اور لامحالہ اس پلیٹ پر نظر پڑی۔ بڑی آپا نے میری طرف پلیٹ بڑھائی اور میں ہاتھ بڑھانے والا ہی تھا کہ خانم سے نظر چار ہو گئی۔ کس قدر خوفزدہ ہو کر اس نے میری طرف دیکھا ہے کہ میں کہیں سے نہ لوں۔ چنانچہ میں فوراً رک گیا۔ مگر انہوں نے باوجود میرے منع کرنے کے میری پلیٹ میں دو چار ٹکڑے رکھ ہی دیئے اور کہا "کھاؤ جی تم"۔ پھر خانم کی طرف میں نے دیکھا۔ کس قدر اُس کو ناگوار اور بار خاطر گذر رہا ہے۔ اب سوائے اس کے کیا چارہ تھا کہ نہ کھاؤں۔ لیکن یہ نہیں کا۔ حال کہ جی اندر سے ہے کہ تڑپ رہا ہے۔ بس وہی مضمون کہ "پیو نہ سکے لے نہ سکے"۔ خانم نے گویا میرے اوپر پہرہ لگا دیا۔ میں نے یہ طے کر کے 'کہ خیر نہ کھاؤں گا' مگر ظاہرداری لازمی ہے۔ ایک آدہ ریزہ۔ ایک آدہ پستہ کی ہوائی۔ ایک آدہ بادام کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔ بڑی آپا نے جو دیکھا تو پھر بولیں "کھاتے نہیں تم"۔

خانم پھر بولی "کھایا نہ ہو۔ دیکھ نہیں رہی ہیں آپ کہ کھیل رہے ہیں بس پستہ کی ہوائیاں چن چن کر کھا رہے ہیں۔ کھانا ہوتا تو خود نہ لے لیتے۔"

اب بتائیے کہ میں کیسے کھاتا۔ قصہ مختصر کھانا ختم ہوا۔ سب لوگ اُٹھے۔ میرا یہ حال کہ آپ مانیئے کہ دل رکابی میں چھوڑ کر اٹھا۔ ہاتھ دھونے کے لئے کھینے کے پاس کھڑا تھا اور نظر پلیٹ کی طرف تھی کہ خانم نے چپکے سے میری کلائی میں چٹکی لی۔ میں نے جو دیکھا ہے تو واللہ خانم کے شرارت آمیز چہرہ پر نور کے حرفوں سے لفظ "محبت" کس طرح تحریر تھا!

کھانا کھانے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک خوش فعلیاں ہوتی رہیں۔ میرے کم کھانے کا ذکر بہت ہی تھوڑی دیر رہا۔ کم از کم جرم کر آدہ گھنٹہ تک تو ہونا چاہیئے تھا۔ مگر نہ ہوا۔

بات چیت ختم ہونے کے بعد جب اُٹھا ہوں تو کچھ یونہی سی بھوک معلوم ہو رہی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ میں کم کھاتا ہوں مگر حضرت اب بھی نہیں کہ جیسی ڈیڑھ روٹی میں نے کھائی تھی ایسی پانچ چپاتیوں سے بھی گیا گذرا!

(۴)

تجربہ شرط ہے، مگر ہاں شب فرقت کے بارہ میں اتنا تو سننے میں آیا ہے کہ کاٹے نہیں کٹتی۔ مگر حضرت "شب بھوک" اور ہی بلا ہے۔ نہ سونا اچھا لگتا ہے نہ جاگنا۔ دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے لحاف کے اندر ہی اندر تکلف تو دیکھیئے کہ خانم سے بھی میں نے کچھ نہ کہا کیونکہ اس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ آج کا میرا کارنامہ باورچی خانہ میں کوئلہ سے بڑے بڑے حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ کس طرح دادی صاحبہ نے خانم کی بہنوں کے سامنے میرا اور اُنکے موٹے اور کھاؤ شوہروں کا موازنہ کر کے ثابت کر دیا کہ میں واقعی "چنبیلی کی کلی" ہوں۔ میرے لئے اب صرف یہی امر باعث تقویت رہ گیا تھا۔

سونے کو نیند ظالم تو آخر آ ہی گئی مگر رات کو عجیب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ عجیب ہی منور سماں ہے۔ ایک کمرہ میں میں بیٹھا ہوں چاروں طرف اسقدر نورانی روشنی ہے کہ سوائے روشنی کی تڑپ کے آنکھوں میں کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ ایک ہیولہ سا سامنے آتا ہے اور معًا ایک بڑی پلیٹ، وہی رات کے ٹکڑے والی پلیٹ سامنے آجاتی ہے!

رہی! بالکل وہی! قوام میں ڈوبے ہوئے زعفران اور کیوڑہ سے معطر ٹکڑے سامنے رکھے ہیں۔ خواب کی حالت میں میں نے بھوک کی خلش! رجی ہاں خلش محسوس کی۔ پلیٹ کی طرف از خود ہاتھ بڑھ گیا۔ لینے والا ہی تھا کہ ایک دم سے آنکھیں اوپر اٹھ گئیں! ایک سایہ سا آیا اور آنکھیں ایک دم سے سامنے تھیں اور ایک غبار سا آنکھوں میں یا پھر فضا میں مسلط تھا۔ ایک عجیب ہی ناقابلِ بیان تعلق اس غبار سے اور دل سے قائم ہو گیا نہیں بلکہ پہلے سے تھا۔ یہ غبار کیا تھا بلکہ ایک نورانی پردہ تھا جس کے پسِ پشت جذب و محبت کی بجلیاں چمک رہی تھیں! جنکی عجیب و غریب تخیلی حرکت میں گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا! یہ عجیب و غریب دھندلا ہلکا یا نورانی پردہ!! میری بھوک نہ معلوم کدھر اور کہاں گئی اور اب میں تو اس نورانی حجاب کو دیکھ رہا تھا۔ یہ عجیب و غریب حجاب بر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ورنہ محسوس تو ضرور ہو رہا تھا اور پھر وہ بھی آنکھوں کے ذریعہ سے ایک لرزش سی اس عجیب غریب پردہ پر عیاں تھی۔ اور زیادہ ہوئی۔ پھر اور زیادہ ہوئی! کچھ تار کی طرح باریک راگ سا اس پردہ کی لرزش سے پیدا ہوا۔ بیشک ایک راگ تھا۔ اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ان عشق و محبت کی بجلیوں کا ایک ہوشربا ترنم ہے جو پسِ پردہ چمک رہی تھیں۔ بال سے بھی زیادہ باریک کچھ آواز سی اس پردۂ لرزاں سے پیدا ہوئی۔ اسقدر باریک کہ تارِ نظر کی باریکی بھی اس کے آگے ہیچ ہے۔ اسقدر باریک اور مہین ترنم اس پردہ سے ایک لرزش کے ساتھ پیدا ہوا کہ کان اس کے سننے کے نہ تو اہل تھے اور نہ صلاحیت رکھتے تھے۔ اس ترنم کو ایسا معلوم ہوا کہ دل کے نازک پردہ نے سنا اور دماغ میں پہونچا یا!! قصہ مختصر ایک بال سی باریک آواز میرے دل نے سُنی۔ جگر کو چھیدتی چلی گئی۔ کیا سریلی اور باریک آواز تھی اور کس طرح یہ آواز اپنی نزاکت کے ساتھ لرزتے ہوئے دل کے پردہ کو چھو رہی تھی:- ع

اپنے اپنے دامنوں میں بجلیاں لئے ہوئے

رُک رُک کر:-

ع۔ اپنے ... اپنے ... دامنوں میں بجلیاں ... لئے ہوئے۔

بس غضب ہو گیا۔ میں بیتاب ہو گیا۔ میرے دل نے اس عجیب غریب گیت کو آگے بڑھایا۔ ع جبیں پہ اپنے کس ادا سے چمکیاں لئے ہوئے...

پیامِ عشق؟ التجا میں سسکیاں لئے ہوئے ...... نگاہِ نیم باز.....
... ی ... تپچیاں لئے ہوئے ...... وغیرہ وغیرہ

یہ وہ گیت تھا جس کے مصنف نے مجھے بت پرستی سکھائی! اشترک بنانے کے بعد پھر غضب پہ غضب کہ موحّد[1] بنا دیا۔ کہیں کا نہ رکھا۔ یہ باریک راگ جو دل سُن رہا تھا میرے لئے نیا نہ تھا۔ پھر بھلا مجھے یہ معلوم کرنے میں کیا دیر لگتی کہ اس پردۂ خیالی کے اس طرف کون ہے! لیکن اگر اس طرف پردہ کے ستمگری تھا تو اس طرف "اَن دیوتا"! یعنی ڈبل روٹی کے ٹکڑے ...... کبھی سحر سامری کا زور غالب آیا اور کبھی "اَن دیوتا" کی پرستش اور پیٹ پوجا کی دُھن۔ عجیب کشمکش و رنج میں تھا کہ کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔ جہاں عقل جا کر رکتی ہے دراصل وہیں سے دوزخ اور بہشت کی شروعات ہے۔ ہدایت قسمت اور خدا کے ہاتھ ہے پھر کسی نے سچ کہا ہے "

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے ہوئے
تو اگر پردہ اُٹھا دے تو نہ ہی تو ہو جائے!

یہاں بھی پردہ تھا۔ اور نتیجہ ظاہر ہے۔ یعنی پیٹ و دماغ پر غالب آیا اور گویا مجبوراً میں نے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کی طرف پھر ہاتھ بڑھایا اور ہاتھ میرا قریب پہونچ ہی گیا تھا کہ دفعتاً کمرے کا نور ماند پڑ گیا! ایک جھپکی سی آئی اور اُس نور کے پردہ پر ایک غبارِ ظلمت! یا ایک چادرِ زنگار چھا گئی.....

ایسے کہ میں ایک دم سے سن سے ہو کر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ میں نے متوحش ہو کر اس منحوس چادرِ زنگار یا پردۂ ظلمت کو دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اُس طرف پردہ کے کوئی قہرمانِ جلال ہے جس کے غیظ و غضب کے شعلے اس پردۂ ظلمت کو توڑ کر میرے اوپر پھٹ پڑنا چاہتے ہیں...
..... کس طرح یہ زنگاری چادر لرز لرز کر غصّہ کی چنگاریاں اُڑا رہی تھی۔

میں مجبوراً جوں کا توں رہ گیا۔ خاموش! بالکل خاموش! ہاتھ اپنی جگہ واپس آ گیا۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑوں سے باز آیا۔ کس طرح یہ ظلمت رفتہ رفتہ نہیں بلکہ دیکھتے دیکھتے مدھم پڑ گئی! ماند پڑ گئی! وہی نور! وہی روشنی بڑھنا شروع ہوئی اور ادھر میرے دل سے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کا خیال باہر ہوا ہے کہ پھر وہی نور کا پردہ سامنے تھا! پھر وہی نور کا دھواں سا پیشِ نظر تھا اور پھر وہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس نور کے بادل میں عشق و محبت

[1] اس نکتہ کو اہلِ ذوق آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔ قصہ مختصر پھر وہی "طلسم نورافشاں" میرے سامنے تھا...... بہ منم شہنشاہ طلسم نورافشاں !!!...... پردہ کی ہر جنبش۔ نورانی دھوئیں کا ہر پیچ گویا یہی کہہ رہا تھا۔

مگر حضرت۔ وہ کسی نے کہا ہے اور سچ کہا ہے کہ "بھوک عجیب چیز ہے۔ اور پھر بھوک اور گیہوں! اجی اللہ میاں وچھوڑا دیں جنت کس گنتی میں ہے! بھوک میں بھلا ایسے طلسم دیکھنے سے کبتک گذارہ ہوتا۔ چنانچہ بقول چچا سعدی بھوک میں لوگ عشق سے عموماً مستعفی ہو جاتے ہیں۔ دمشق میں ایسا ہو ہی چکا ہے پھر میں نے ہندوستان میں اگر پیٹ پرستی کو عشق و محبت پر ترجیح دی تو کون ستم کیا۔ اس نورانی دھوئیں یا حجاب سے قطع نظر کرکے میں نے آخر کار ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر ہاتھ ڈال ہی دیا......

لیکن۔ ادھر میرا ہاتھ بڑھا ہے اور اُدھر ایک ناقابل بیان سرعت کے ساتھ ایک سیاہ آندھی تھی یا طوفان۔ یا پھر قہر مجسم کہ سیاہی کے ساتھ ساتھ اس نورانی چادر سے لرزکر اور اس دھوئیں کو جوکہ اب بالکل سیاہ تھا اک چشم زدن میں اس زور سے پیچ در پیچ کرکے اور بجلی کی چمک کیساتھ اس پردہ کو ایک ہیبتناک زلزلہ کے ساتھ چیر کر نہیں بلکہ توڑکر کس ستان سے خانم کا پر نور و پر عتاب چہرہ نکلا ہے کہ بیان سے باہر! مع میرا ہاتھ پکڑکر زور سے جھٹک کر کہا "تم شہنشاہ طلسم نورافشاں ...... یہ کیا کر رہے ہو؟"

میری ایک دم سے آنکھ کھل گئی۔ میرا ہاتھ خانم کے ہاتھ میں تھا اور اُس نے پھر جھٹک کر کہا "یہ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے بوکھلاکر احمقانہ اور بھوکی نظروں سے چاروں طرف دیکھا میں آپ سے کیا عرض کروں۔ یہ خواب! یہ عالم تخیل .... (خواب آمیز) .... میرا سازندہ دل! پھر میری رفیقۂ حیات! یہ دماغی کیفیت! اور پھر یہ بھوک!! واللہ خانم کا حسین و خوبصورت چہرہ کیا تھا کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ جیسے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کا تمام حسن اُس صناع حقیقی نے کوٹ کوٹ کر میری پیاری بیوی کے چہرہ میں بھر دیا ہے! تمام شیرینی وحلاوت وخوبصورتی معہ عطریات کے خانم کے چہرہ پر موجود تھی!!

"یہ کیا کر رہے تھے" پھر خانم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کیا سو رہے ہو؟..... آنکھیں کھولے ہوئے!"

آپ خود خیال فرمائیں کہ میں بھلا کیا جواب دیتا۔ کیا کہدیتا کہ ظالم تونے مجھے بھوکا مارا؟ پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا کھاکر دماغ میں پولو کھیلنے پہونچے ہیں!۔

یہ سوچ کر کہ گھر میں کہ اس خواب کو بتائیں گے اسوقت یونہی ٹالدیا۔ پھر سو گئے۔ مگر اسکے بعد پھر دو تین مرتبہ وہی ٹکڑوں کی پلیٹ نظر پڑی اور کچھ نہ کچھ ایسی بات پیش آئی کہ کھانا نصیب نہ ہوا۔ صبح اٹھا ہوں اور آئینہ جو دیکھا ہے تو منہ پر مارے بھوک کے بارہ بجے ہوئے تھے۔

۵

صبح ناشتہ کا وقت آیا۔ ایک ایک چائے کی پیالی دسترخوان پر خالی رکھی ہوئی تھی "مرگیا" میں نے دل میں کہا۔ کیا اکیلی چائے ملے گی! مگر نہیں۔ خانم کچھ بہت سی چیزیں لئے پہونچی۔ ایک کاغذ میں سے نکال نکال کر اُس نے سب کے سامنے نہایت ہی خستہ اور بھربھری پستی کھجوریں رکھنا شروع کیں۔ پانچ پانچ سب کی پیالی کے پاس رکھتی چلی آئی۔ میرا نمبر جو آیا تو صرف ایک! غضب ہوگیا! میں نے جو نظر سے نظر ملائی ہے تو میں کیا عرض کروں کہ کس طرح اُس نے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا ہے کہ بیان سے باہر۔

خدا بھلا کرے کہ بڑی آپا نے فوراً میرے حصہ پر توجہ کی اور خانم سے کہا:۔

"انہیں ایک ہی کھجور دی!"

"کھانا ہے خانم بولی۔ کھانا ہے ..... ناشتہ کرنا ہے کوئی دعوت تو نہیں کرنا نہیں"

"اور ہم لوگ تو دو کان لگائیں گے شاید" منجھلے بھائی چٹکی لیتے ہوئے بولے۔

بخدا یہ جملہ بھی کیا تھا! اور اس نے کیا اثر دکھایا ہے میں نے خانم کے چہرہ کو ایک عجیب عالم میں دیکھا! مسرت کی بجلیاں چمک رہی تھیں خوشی سے چہرہ جگمگا اٹھا سارا چہرہ نور مجسم ہوکر رہ گیا۔

لطف یہ کہ سبکو تقسیم کرکے کھجوریں کاغذ سے نکال کر دسترخوان کے بیچوں بیچ میں خانم نے رکھ دیں اور منجھلے بھائی سے کہا "آپ کیوں

ڑکان لگائیں گے ۔ آپ کھائیں گے ..... پھر یہ رکھی تو ہیں ۔ جس کا
ی چاہے لیلے گا ۔ میں تو روز کی ناشتہ کرانے والی .... کوئی آج نرالا
اشتہ تو یہ کر ملنے سے رہے۔"

ڑے بھائی نے کہا "بھلا کوئی بات بھی ہے ۔ یہ لو جی" یہ کہہ کر میری طرف
ٹھی بھر کھجوریں بڑھائیں ۔

یں نے کہا "بھائی میں لیلوں گا ۔ آخر اسمیں تکلف ہی کیا ہے لیلوں گا"

اتنے میں ایک ایک اُبلا ہوا انڈا آیا ۔ بڑے بھائی نے دو منگوائے۔
ب ناشتہ شروع ہو گیا ۔

میں نے اپنی کھجور کھائی ۔ انڈا چھیل رہا تھا ۔ میری قسمت تو دیکھئے کہ
گندہ نکل گیا ۔ خانم کی مہربانی کہئے کہ دوسرا انڈا لائی اور جھٹ سے چھیل کر
سفیدی چھیک کے زردی کی گولی رکابی میں رکھدی ۔ بڑی آپا نے
انم پر اعتراض کی نظروں سے دیکھا تو خانم نے عجیب فخریہ انداز سے کہا:-
"توبہ کرو آپا ۔ انڈے کی سفیدی اچھوتے تک نہیں ہیں" (واقعہ یہ ہے
چھلکا تک کھرچ لیتا ہوں)

مگر جناب یہاں یہ حال کہ اس وقت تو چھلکا تک کھا جاتا ۔ ایک
ردی اور ایک کھجور کھانے میں دیر ہی کیا لگتی ۔ میں نے ختم کر کے خانم
کی طرف نظر ڈالی اور آنکھ سے اشارہ کیا کہ "اور" ۔ اسکے جواب میں
س نے آنکھیں ایک دم سے پھاڑ کر چہرہ پر برہمی کے آثار پیدا کرنے
کی کوشش کی ۔

ادھر میرا تو یہ حال اور اُدھر خانم کے دونوں بہنوئیوں کا یہ حال کہ کُل
کی کُل کھجوریں "پار" کر گئے ۔ میں منہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا ۔

اب خانم جو کمرہ پر آئی تو میں نے کہا کہ مجھے سخت بھوک لگ رہی
ہے ۔ اُس نے اس کے جواب میں خیال کیا کہ یہ آثار دیوانگی ہیں ۔ میں
نے جب زور دیکر کہا کہ سچ کہتا ہوں تو اُس نے گلے میں باہیں ڈال کر کہا
"ہماری خاطر" میں نے کہا کہ کچھ ہمیں چرا کر لا دو اور قاعدے اور اصول
دری کے بتانے تو اس نے کہا کہ موقعہ نہیں ہے ۔ مگر میں نے بہلا پھسلا کر
بھیجا اور لگا انتظار کرنے ۔

کوئی پندرہ منٹ بعد وہ آئی ۔ منہ پھلائے منجھلی آپا سے لڑ کر آرہی

تھی پھر وہ بھی میری وجہ سے ۔ ایک عجیب وغریب اور انتہا سے زیادہ
دلچسپ بحث چھڑی ہوئی تھی ۔ وہ یہ کہ میری کم خوراکی کا مسئلہ نہایت ہی
سنجیدگی سے زیر بحث تھا ۔ چھوٹی آپا یعنی منجھلی آپا نے خانم سے کہا کہ
معلوم ہوتا ہے تم چھپا کر اپنے میاں کو کھانے کو دے آتی ہو ۔ ورنہ اتنا
کم کوئی نہیں کھا سکتا" (لڑنے کی بات ہے کہ نہیں ۔ غور کیجئے گا)

اسکے جواب میں خانم نے کچھ ان کے میاں کے کھانے پر چوٹ
کردی ۔ خانم نے جو بحث وہاں کی وہ بیحد معقول تھی ۔ کوئی وجہ نہیں جو وہ
چھپا کر مجھے کھلائے ۔ بالخصوص جبکہ "لوگ" مجھ سے کھُلم کھلا دس گنا زیادہ
کھا رہے ہیں ۔ کون امر مانع ہے میرے لئے جو میں حسب خواہش
نہ کھاؤں ۔ کوئی وجہ نہیں ۔ محض میری توہین مقصود ہے کہ میں چلا جاؤں ۔
وغیرہ وغیرہ ۔ دادی نے خانم کی طرفداری کی اور شہادت دی کہ کوئی چیز
ایسی نہیں جو خانم اپنے نام سے بھی اپنے کمرہ کی طرف لے گئی ہو ۔ پھر تصدیق
کی کہ واقعی میں کھاتا ہی اتنا ہوں ۔ یہ قصہ خانم نے مجھے سنایا اور پھر مجھ
سے سنجیدگی سے کہا کہ "میں کمرہ میں کوئی چیز اپنے کھانے کے بہانہ سے
لا سکتی تھی مگر اب اگر لائی ۔ تو لاؤں گی تو ایک دفعہ اور لوگ کہیں گے کہ
برابر یہی ہوتا رہا ہے ۔ وہ تو کہو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں سچ مچ
کوئی کھانے کی چیز اس طرف قسم کھانے کو بھی نہیں لائی ورنہ سب کیا
دھرا مٹی ہو جاتا ۔"

اسکے جواب میں اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ خیر دوپہر کو میں ضرور
کھانا پیٹ بھر کے کھاؤں گا ۔ آخر روزہ بھی لوگ رکھتے ہی ہیں ۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آیا ۔ یہاں اب یہ بیان کرنا کہ کھانے پر
کیا کیا واقعات پیش آئے غیر ضروری اور ایک ہی بات کا بار بار دہرانا
ہے ۔ حالانکہ میں نے خانم سے کہدیا تھا کہ میں سخت بھوکا ہوں لیکن بخدا
میرے لئے کم از کم موت بدرجہا بہتر ہے بجائے اس کے کہ اپنی جیتی
ہوی کا چہرہ اُداس یا غمگین دیکھوں ۔ بس آپ یہ سمجھ لیجئے کہ دوپہر کا کھانا
جو کھا کر اُٹھا ہوں تو اتنا ہی بھوکا تھا جتنا پہلے! مگر اس کا صلہ! صلہ یہ ملا
کہ میں نے خانم کے چہرہ کو دیکھا ۔ بس چاندنی چوک ہو رہا تھا اور آنکھوں
میں مارے خوشی کے پریاں ناچ رہی تھیں ۔ ایک بھوکے شوہر کے لئے

بشرطیکہ وہ "فنافی القوم" ہو رہا ہو یہ بہت کافی ہے۔ ہم نے بھی سوچ لیا کہ مر جائیں گے بیوی کے عشق میں جو کے تب بھی پروا نہیں!

دستر خوان سے میں واپس کمرہ پر آرہا تھا تو میری نظر نے ایک بڑی حسین و جمیل ...... دیکھی۔ ایسی کہ نظروں میں کھُب کر رہ گئی اور مجبوراً مجھے دل ہی دل میں پڑھنا پڑا۔ ع۔ عالم ہمہ یغمائے تو......

خلق خدا شیدائے تو ...... حورے ندانم یا ملک......

فرزند آدم یا پری...... دیکھے ہے گر ہوکا تجھے......

کہتا یہی ہے یک بیک...... ای نرگس شہلائی تو آہو رمیدہ کافری

...... بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔ اور واقعی چیز بھی یہ ایسی ہی تھی نہایت ہی خوبصورت کہ اُس کے آگے پری کی حقیقت نہیں۔ بیساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ ع

اُف تری کافر جوانی جوش پہ آئی ہوئی۔

ایک نہایت ہی گداز خوبصورت ...... سے بید موٹی گاؤ دم ہوتی ہوئی دونوں طرف ایک حسین جمیل نوک پر ختم ہوئی تھی...... ایک طاق میں موٹی سی شکر قندی رکھی ہوئی تھی!! واللہ کس طرح اس مہ جبیں نے میرے معدہ کا دل چھین لیا ہے! ع

بجیرم تم کہ عجب تیر بے کماں زدئی
کسی کے دل میں رہی اور کسی کے پار گئی

میں نے خانم سے کہا تھا کہ اگر رات کے کھانے پر میں بھوکا رہ گیا تو اسٹیشن جا کر کھاؤں گا مگر کھاؤں گا ضرور۔ خانم نے کہا کہ پاگل پنے کی باتیں تو کرو مت میں تمہیں کھانے کو شام ہی کچھ لا دوں گی ورنہ کھانے کے بعد تو ضرور ہی لا دوں گی۔ جب میں نے کہا کہ تم بڑے مزے سے کچھ نہیں تو ایک آدھ تو روٹیاں ہی دو کھی چرا کر لا سکتی ہو تو اس کے جواب میں وہ ہنسی کا گول گپا ہو گئی۔ پھر سنجیدہ ہو کر جو اُس نے اس امر کا خطرہ ظاہر کیا ہے کہ تمام ریاض بیکار جائے گا۔ تمام نیک نامی اور شہرت میں وہ بٹہ لگے گا کہ عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ پھر اگر وہ شہرت جو میں نے حاصل کی ہے کہیں جاتی رہی تو لطف زندگانی ہیچ ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

جس طرح روزوں میں مغرب کا انتظار ہوا کرتا ہے اسی طرح میں نے شام کا انتظار کیا۔ آخر نہ کیسے آتی۔ شام بھی آگئی۔ کھانے کا وقت بھی آگیا۔ میں نے چلتے وقت خانم سے چپکے سے کہا کہ روٹیاں ضرور چُرانا۔ اُس نے وعدہ بھی کیا۔ دستر خوان پر جو پہونچا تو ایک قہقہہ کے ساتھ میرا استقبال ہوا۔ رشتہ کی ایک چچی ابھی ابھی آئی تھیں اور اسوقت بڑے زوروں میں میرے کم کھانے کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ الفاظ "چنبیلی کی کلی" کی میرے کم کھانے کے واقعات پر تفصیلی روشنی ڈال کر تفسیر کی جا رہی تھی۔ بڑے بڑے مفسر جمع تھے تو چچی کو سلام کر کے میں بھی خوش ہو کر بیٹھ گیا۔ واللہ کیا مزے کی باتیں شروع ہوئی ہیں۔ ہر وقت کے میرے کھانے کی پوری کی پوری تفصیل مع نکات کے چچی کو بتائی گئی۔ پھر اس پر وہ وہ مزے کے جملے۔ فقرے۔ بیساختہ موٹے موٹے تمیز لفظوں کی چھبتی ہوئی چوٹیں! کچھ میری نزاکت پر کچھ میرے "چنبیلی کی کلی" ہونے پر پھر لگے ہاتھوں خانم کے اوپر دلچسپ چھینٹے۔ پھر دادی صاحبہ کا محبت آمیز مذاقیہ ایکٹنگ جس کا اختتام اسقدر ڈرامٹک! اسقدر کومک اور اسقدر لطیف تھا کہ بیان سے باہر۔ طرح طرح کے ایکٹنگ کر کے انہوں نے میری بلائیں لیں۔ اسی پر کیا قہقہے کم تھے کہ انہوں نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر۔ میری "چنبیلی کی کلی" کہہ کر میرا منہ چوم لیا۔!!

بس کچھ نہ پوچھئے! کیا لطف رہا ہے! کیا قہقہے لگے ہیں! میں تختۂ مشق بنا ہوں تو وہ بھی کس عجیب لطف و انداز کے ساتھ! میرا ہی کیا حال تھا جو خانم کا حال ہوا! میں نے جو خانم کو دیکھا ہے تو اس کی حالت ضبط تحریر میں نہیں آسکتی۔ ایک دریائے موج و تبسم تھا کہ خانم کے چہرہ پر لہریں لے رہا تھا! محبت اور خوشی کی افشاں تھی کہ چہرہ پر چھڑک کر رہ گئی تھی اور خوشی و خرمی کا نور تھا چہرہ پر؟ کہ تبسم کے تارے چہرہ پر پڑے جھلک رہے تھے! قصہ مختصر خانم کا چہرہ میرے لئے اسوقت سچ مچ "طلسم نور افشاں" ہو گیا۔

اب آپ خیال فرمائیں کہ اس دلخوش کن تمہید سے جو کھانا شروع ہوگا تو کیا کیا مزیدار باتیں نہ ہوئی ہونگی قدم قدم پر لطیفے اور ان تمام لطائف کا مرکز میں بنا ہوا اور خانم ہے کہ مارے خوشی کے پھولی جا رہی

ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں اپنی پیاری اور دلاری رفیقہ حیات کو دیکھتا اس کی خوشی کو دیکھ کر مالامال ہوتا۔ یا ان تمام فقروں اور جملوں اور دلچسپ دلخوش کن مذاق کا مرکز بنتا! یا کھانا کھاتا!

نتیجہ ظاہر ہے۔ بھوکا کا بھوکا اٹھا۔ بلکہ سچ عرض کرتا ہوں اس وقت کی گوناگوں قرحتوں میں کھانا نہ کھانے کی تکلیف تک کا احساس نہ ہوا۔ یہ دستر خوان کا جلسہ بھی کس قدر مزہ دار گذرا ہے کہ اس پر سو ناشتے قربان۔ ساری محنت وصول ہو گئی۔ بڑی دیر تک [illegible] بڑے [illegible] کے ساتھ مجلس برہم ہوئی۔ واپس میں [illegible] آ رہا تھا [illegible] اور حور مجسم شکر قندی پر پڑی [illegible] کہتا [illegible] کے ساتھ [illegible] خانم کو [illegible] شکر قندی [illegible] واپس [illegible]

سونے کا وقت آ چکا تھا [illegible] (بیوی گرم) لیکن دیر آمد درست آمد۔ واپس آئی [illegible] کھانے کو لائی۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "اونٹ کے منہ میں زیرہ" گنتی کے کچھ کھجوریں اور ایک انڈا۔ فوراً زہر مار کر گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ [illegible] تو اور بھی آگ تیز ہو گئی۔ خانم نے کہا کہ تم اب دیوانے ہو گئے ہو شاید۔ بہت [illegible] پانی پی لو۔ چنانچہ بہت تو نہیں تھوڑا سا میں نے پانی پی لیا۔ پھر خانم نے باتیں شروع کیں۔ وہ باتیں جن سے ویسے بھی بھوک جاتی رہتی ہے [illegible] لگے یعنی وہی میری کم خوری کے سلسلہ میں جو باتیں [illegible] موجودگی میں ہوتی ہیں۔ بخوف طوالت نظر انداز [illegible] اور آپ سمجھتے ہوں گے کہ کیا سبب ہے کہ میں فاقہ پر فاقہ کھینچ رہا تھا [illegible] زندہ تھا بلکہ جب کھانے کا وقت اور موقع آتا تو اس سے دیدہ و دانستہ کوئی فائدہ نہ اٹھاتا تھا اور بھوکا کا بھوکا رہتا تھا۔ انہی باتوں کے سلسلہ میں ایک تجویز میں نے خانم کے روبرو پیش کی۔

"شکر قندی!" میں نے خانم [illegible]

وہ چپ رہی۔

"وہ شکر قندی کس کی رکھی ہے؟ ..... موٹی سی ..... اس طاق میں" میں نے کہا۔

"کیوں؟ خانم نے اپنے لحاف میں سے کہا "بدھو کی ہے" (یہ بدھو

صاحبزادے تھے چھوٹے سے ایک [illegible]

"اس کو چولھے میں نہ چپکے سے دبا دو" میں نے خانم [illegible]

خانم نے جواب میں میری طرف دیکھا .... پھر اس کے بعد ہم دونوں میاں بیوی میں کیا باتیں ہوئیں؟ کیا طے ہوا؟ اور کیا ہوا؟ یہ باتیں میری ورنہ اس سے پر اب میرے راز ہی میں رہنے دیجئے۔ جھوٹ سے فائدہ کیا اور سچ میں بتا [illegible] نہیں۔

[illegible] ..... پھر ایک خواب!

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں خود ..... [illegible] قندی [illegible]

[illegible] بے جذب و قوت تخیل [illegible]

پھر جو نو [illegible] میں دیکھا تو .....

ایک دم سے نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا ..... [illegible] کہ جیسے [illegible] کی کلی ہوں ..... سامنے فوراً ہی ایک بہت بھری [illegible] کی جھاڑی تھی جس میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کچھ جیسے چنبیلی کی کلیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک عجیب دھند لکے میں غور سے ان کلیوں کی [illegible] دیکھا۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ غور سے جو دیکھتا ہوں تو [illegible] بلکہ شکر قندیاں لگی ہوئی ہیں ..... (ایک ہچکی سی آئی ..... ایک لرزش سی ہوئی ..... [illegible] دیکھتا ہوں کہ [illegible] موٹی شکر قندی [illegible] دیکھی تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھایا .....

(۴)

صبح کچھ دیر سے اٹھا۔ لیکن آنکھ کھلتے ہی ..... [illegible] دھوپ ہے ..... اپنے خواب کی تعبیر میں مشغول تھا۔ خانم سامنے تھی۔ مگر آنکھیں۔ حواس و اندیشہ سے پریشان اور چہرہ پہ ہوائیاں ....!

بدحوطوالعمرہ یعنی چھوٹی آپا کی ملازمہ کے لڑکے کی کسی نے موئی سی شکرقندی غائب کردی۔ سوائے احمد کے (دوسرا ملازم لڑکا) اور کون ہوسکتا ہے۔ لہٰذا مارا گیا اور خوب اس چوری پر مارا گیا اور یہ اس کے رونے کی آواز تھی جو خانم کی قوت سماعت کو بڑھائے دیتی تھی۔ چھوٹی آپا بھی بڑی برہم ہیں۔

میں لحاف ہی میں ابتک بیٹھا ہوا تھا۔ چھوٹی آپا کمرہ میں آتے آتے رکیں اور پھر آگئیں۔ "کنجیاں" انہوں نے کہا۔ میں سرہانے رضائی اوڑھے بیٹھا تھا لحاف ہٹا کر کنجیاں انہوں نے ڈھونڈیں۔ کنجیاں تو مل گئیں مگر ساتھ ہی شکرقندی کے چھلکوں کی فرش پر بارش ہوگئی۔

"ہیں!" اُن کے منہ سے نکلا اور میری طرف جو دیکھا .... میرے منہ کی طرف .... تو۔ "دو اور دو چار!" .... پھر خانم کی طرف دیکھا .... اور پھر میری طرف تو پھر وہی! یعنی۔ "دو اور دو چار"

اس کے بعد کیا ہوا؟ صیغہ راز میں ہے اور رہیگا۔ ہاں اتنا بتاسکتا ہوں کہ اگر ایک طرف ان دادی صاحبہ کی شامت آگئی جنہوں نے مجھے "چنبیلی کی کلی" کا خطاب دیا تھا تو دوسری طرف بدتمیزوں نے اور نالائقوں نے نہ صرف میرا بلکہ دادی صاحبہ کا لقب بھی شکرقندی رکھ دیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

مرزا عظیم بیگ چغتائی

کیفِ عید!

از حضرت کیفی صاحب دہلوی

غزل مسلسل

نیا ارمان ہوتا تھا نئی اُمید ہوتی تھی! | عجب دن تھے کہ اپنی عید اپنی عید ہوتی تھی
پیالے کورے کورے گوری گورے ہاتھ ساقی کے | ہماری بزم رشکِ محفلِ جمشید ہوتی تھی
وہی دن آج بھی ہیں جسکی ہم خوشیاں مناتے ہیں | ہماری عید کیا وہ تو تمہاری دید ہوتی تھی
کبھی تو شوق بڑھ بڑھ کر گلے ملنا سکھاتا تھا | کبھی کچھ شرم دامنگیر کی تاکید ہوتی تھی
یہ حسن و عشق تھے جس وقت تک دنیا میں عزت سے | مری رسمِ وفا بھی قابلِ تقلید ہوتی تھی
ہمیں وہ خط لکھا کرتے تھے پہلے کس تکلف سے | بڑا القاب ہوتا تھا بڑی تمہید ہوتی تھی
وہی کہنا پڑا اغیار کو آخر ہم جو کہتے تھے | ہمارے قول کی اوّل بڑی تردید ہوتی تھی
برا ہو بدگمانی کا الٰہی! کیا زمانہ تھا | کہ اِک اِک بات کی سو سو طرح تنقید ہوتی تھی
پڑے رہتے تھے پی کر مست ہم ساقی کے قدموں پر | کہاں کی عید؟ کیسی عید؟ کیسی عید ہوتی تھی
زبردستی خفا ہونا ترا بے چین کرتا تھا | کبھی تو یاس ہوتی تھی کبھی اُمید ہوتی تھی

ادب سے شوق پابوسی جھجکتا تھا مگر کیفی
کسی کے مسکرانے سے بڑی تائید ہوتی تھی



افلاطون کا قول ہے کہ "انسان کی وہ زندگی جو امتحان و آزمائش سے بیگانہ ہے وہ کسی طرح سے بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں ہے" [illegible] زندگی کا [illegible] [illegible] زندگی کا [illegible] [illegible] صداقت کی [illegible] [illegible] —— سقراط کا [illegible] اور صداقت [illegible] کی پاداش میں [illegible] کی مصائب اور [illegible] کے ہاتھوں زہر کا پیالہ پی کر جان دینا [illegible] گذار [illegible] باوجود [illegible] آج تک فراموش نہ کیا اور بایں ہمہ گردش لیل و نہار [illegible] ہے۔

[illegible] بیانات [illegible] سے پہلے اس کے [illegible] کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے جس میں اس کی زندگی، مقدمہ، نیز [illegible] اور موت تک کے بہت سے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور [illegible] طور پر یہ بات بھی دل پر نقش ہوئی جاتی ہے کہ ایک جاں نثار [illegible] اور پیکر اخلاقیت کس بے باکی سے اعلائے کلمۃ الحق کر کے [illegible] مصائب و آلام کو کس طرح ذلیل اور ناقابل اعتنا سمجھتا ہے۔

بہرحال سقراط اپنی خصوصیات اخلاق کے لحاظ سے یونان قدیم کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ تاریخ عالم میں ایک ممتاز شخصیت کا مالک ہے —— مقام تاسف ہے کہ ہم سقراط کی ابتدائی زندگی کے حالات سے مکمل طور پر ناواقف ہیں۔ اگرچہ متعدد بیانات ایسے موجود ہیں جو مفسرین نے اس کی ابتدائی زندگی کے متعلق فراہم کئے ہیں، لیکن ان میں سے بہت کم محقق کی نظر میں قابل وثوق ہو سکتے ہیں۔ افلاطون اور زنوفن صرف یہی دو ایسی ہستیاں ہیں جو [illegible] سقراط کی حالات زندگی کے متعلق قابل اعتبار و توجہ ہیں۔ مگر بایں ہمہ سقراط کی ابتدائی زندگی پھر بھی ہمارے لئے ایک معمہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا۔

سقراط کا سال پیدائش تقریباً چار سو ستر سال قبل مسیح خیال کیا جاتا ہے۔ سافرونسکس اس کے باپ کا نام تھا۔ سنگ تراشی اس کا پیشہ تھا۔ اس کی ماں فیناریت دایہ گری کا پیشہ کرتی تھی —— یہ ہیں وہ ابتدائی حالات زندگی اگر ان کو حالات کہا جا سکتا ہے جن سے ہم واقفیت رکھتے ہیں۔ اس سے زائد یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ سقراط کی عقلی و اخلاقی تربیت کس طرح سے ہوئی اور وہ کون سے موثرات تھے جنہوں نے اس کی ذہنی زندگی کو ایک غیر معمولی پختگی و استواری بخشی۔ اس سے آگے بڑھ کر ہم کو ایک واقعہ ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سقراط نے چالیس سال کی عمر تک پوٹیڈیا کے متعدد محاصروں میں حصہ لیا تھا۔ ان محاصروں کا زمانہ چار سو تیس یا چار سو انتیس قبل مسیح ہے —— بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ سقراط نے اپنی طفولیت اور عہد شباب اس دور میں جبکہ ایتھنز یونانی تاریخ کے لئے ایک زریں باب کا مواد فراہم کر رہا تھا یہ وہ عہد تھا کہ ایتھنز علم و فضل، سیاست و تمدن، ادب و شعر کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فلسفہ، منطق، ریاضی، شعر و موسیقی غرض ہر علم و فن کے

چشمے ہر طرف بہ رہے تھے۔ ایتھنز کی تمام ترقیاں اگرچہ معاجاتی طور پر منصۂ شہود پر نمایاں ہوئی تھیں لیکن حیرت انگیز بھی بہت تھی

غرض مدینۃ العلم ایتھنز اسوقت سیاسی اور عقلی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا سنہ ۴۸۰ اور سنہ ۴۰۰ ق۔م کا زمانہ وہ زمانہ ہے کہ جس میں یونانیوں نے شعر، تصویر، سنگ تراشی اور تعمیر میں حیرت انگیز قابلیت اختراع دکھا دکھا کر فنون لطیفہ میں تمام دنیا کا کامل الفن استاد ہونے کی حیثیت حاصل کرلی ہے ——— اسکلس ملک الشعرائے یونان (متوفی سنہ ۴۵۶ ق۔م) کی وفات کے وقت سقراط کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اسی طرح سوفوکلس، تقریباً سات سال قبل سقراط کی ولادت سے مرچکے تھے۔ فیدیس سنگتراش اعظم جس کی صناعی کے بہت سے نمونے برٹش میوزیم میں موجود ہیں اور جس کا سنہ وفات چار سو تینتیس قبل مسیح ہے پیریکلس[1] زبردست خطیب اور قارونی دولت کا مالک جس کا نام تاریخ تہذیب میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے ——— تھیوسیڈیڈیس مورخ جس کی تاریخ شہرہ آفاق ہے۔ اس کا سنہ پیدائش سنہ ۴۷۱ ق۔م ہے، ان سب کا زمانہ قریب قریب وہی زمانہ ہے جس میں سقراط نے کتم عدم سے عالم وجود میں قدم رکھا تھا۔ یہ وہ زعمائے علم و فن ہیں جن پر یونان کو ناز ہے فلسفہ شاعری اور فنون لطیفہ کی پیداوار ان ہی مذکورۃ الصدر نامور اہل فن کی ریاضتوں کا نتیجہ ہے لاریب کہ ایتھنز کی تاریخ ایسی ہستیوں کی نظیر پیش کرنے سے ہمیشہ سے تہی دامن تھی اور رہی ہے ——— سنہ ۴۲۰ ق۔م جبکہ سقراط کی عمر پچاس سال کی تھی وہ مذکورہ بالا جیسے استادان فن و علم کا معاصر تھا بہت ممکن ہے کہ ان میں سے اکثر کے ساتھ اس کے معاصرانہ تعلقات بھی ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایتھنز ایسی کوئی بڑی بستی نہ تھی اور اس کے علاوہ باشندگان ایتھنز اپنا بہت سا وقت پبلک کاروبار میں گذارتے تھے۔ ایسی صورت میں سقراط جیسی ہونہار ہستی کا طبقہ علماء و سیاسیین سے بیگانہ رہنا قرین انصاف نہیں

ایک ایسے شہر میں سقراط جیسی بلند ذہنیت کا رہنا ہی اس کی عقلی و علمی تربیت کے لئے زبردست موثر اور موزوں ماحول تھا۔ اور اس علم و حکمت آفرین ماحول کے پوشیدہ اثرات چپکے چپکے سقراط کو سقراط بنا رہے تھے۔

پریکلس کی سب سے بڑی پالیسی یہ تھی کہ وہ ایتھنز کو یونانی عقل و معارف کا مرکز اعظم بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ سقراط بڑے فخر کے ساتھ اپنے معافی نامہ میں ایتھنز کے عقل و علمیت کی فوقیت کا ذکر کرتا ہے

ایتھنز نے اپنے باشندوں کو ایک اور قسم کی تربیت حاصل کرنے کا موقع دیا تھا۔ اوّلاً ایتھنز کی سیاسی آئین بندی تھی ڈی لاس DELOS کے اتحاد کی سرپرستی حاصل کرنے کے بعد اسنے شہنشاہانہ اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ اور بقول ایتھنز کے دشمنوں کے ایتھنز کا وہ استبداد جمہوری قبا میں پاسے کوب نظر آتا تھا غرض یونان کا پیتھوس، ایلاد اس وقت عظیم الشان مقبوضات کے تمام دلتی کا مالک تھا۔ اور اس کا انتظام خود قانون کے زبردست ہاتھوں سرانجام پاتا تھا

اس سلسلہ میں ایتھنز کے آئین حکومت کا مختصر ذکر ضروری ہے کیونکہ اس آئین کے ساتھ سقراط کی زندگی کا گہرا تعلق ہے ——— ایتھنز کا ہوشمند تعلیم یافتہ طبقہ ایک پارلیمنٹ (پنچایت) کے ذریعہ براہ راست تمام ملک پر حکومت کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ ہر ایک شہری بشرطیکہ وہ پارلیمنٹ کا رکن بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کا ممبر بن سکتا تھا۔ تمام اراکین جمہوریت کو ہر جلسہ میں قانونی طور پر شریک ہونا ضروری تھا۔ ان کے یہاں نمائندگی کے ذریعے حکومت کا رواج نہ تھا۔ اور وزراء کی ذمہ دارانہ وساطت سے تقسیم عمل کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ چنانچہ ہر شہری انفرادی طور پر حکومت کے ہر معاملہ میں غور و فکر کرنے پر مجبور تھا اور اسی لئے ہر شہری کی سیاسی فکر اور ذمہ داریاں بہت اہم خیال کی جاتی تھیں۔ اس کو ملک کے داخلی، خارجی معاملات، قانون سازی، صلح و جنگ کے پیچیدہ مسائل، خلفائے سلطنت سے شرائط اتحاد انتظامات نوآبادیات جیسے گوناگوں موضوعات کے متعلق سوالات سننا پڑتے تھے، اور ہر پہلو پر مدلل بحث کرنی پڑتی تھی۔ نیز ہر ایک رکن جمہوریت کو ہر مسئلہ متنازعہ فیہ کے موافق اور مخالف مقرروں کے استدلالات اور جرح اور قدح کو سنکر، انتہائی ذمہ داری کے ساتھ دلائل کو جانچ تول کر ذاتی طور پر فوری اور مستحکم فیصلہ دینا ہوتا تھا ——— ایتھنز کے عدالتی معاملات بھی ایتھنز والوں کے لئے ایک خاص تربیت مخصوص انداز سے مہیا کیا کرتے تھے۔ یعنی جوڈیشل کاروائیوں کے لئے

[1] اس کا سن وفات ۴۲۹ ق م ہے

جیوریاں قائم کی جاتی تھیں اور ان جیوریوں کے لئے شہری لوگ قرعہ اندازی کے بعد منتخب کیے جاتے تھے ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ اہل ایتھنز کے اندر ہمہ گیر اور اعلےٰ ذہنیت پیدا ہو گئی تھی۔ جس کی مثال عہد حاضر کی ترقی یافتہ نظامہائے حکومت میں بھی مفقود ہے

اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ سقراط نے عملی اور علمالقول میں شروع ہی سے حصہ لے کر موافق اور مخالف پر زور دلائل کے اندر امتیاز کرنے کی ضرورت محسوس کر چکا ہوگا۔ اور اس کی گوناگوں سیاسی مصروفیات نے اس کے قوائے دماغی کو تہذیب و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنے کے سامان مہیا کئے ہوں گے

بہر حال یہ ہیں وہ حالات جنہیں رہ کر سقراط نے اپنی زندگی کے پچاس سال گزارے تھے۔ تعلیم کے لفظ کو وسیع معنی میں استعمال کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس نے تجربہ اور عمل سے مذکورہ بالا مہذب ماحول میں رہ کر بہترین تعلیم حاصل کی تھی ——— اس کے بعد ہمیں اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ ہم اس کی رسمی تعلیم و تربیت اور علمی لیاقت کے لئے تحقیق و تفتیش کا مشکل فرض اپنے ذمہ رکھیں

ورنہ ایسی صورت میں اس کے عقلی ارتقا کی تاریخ محض قیاسی ہوگی اتنا اور یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس نے عہد طفولیت میں موسیقی، جسمانی ورزش اور نوشت و خواند کی وہ تعلیم جو اس زمانہ میں اہل ایتھنز کے یہاں عام طور پر رائج تھی۔ اور جس کو جسمانی اور دماغی تربیت کے نام موسوم کیا جاتا تھا۔ ضرور حاصل کی ہوگی۔ نیز یہ کہ سقراط یونانی ادبیات کو اپنے کلام میں بطور مثال و سند استعمال کرنے میں مشاق تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی مروجہ علوم و فنون کی واقفیت کافی تھی۔ اور وہ خاص طور پر ہومر کا بہت دلدادہ تھا۔

سقراط کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے واسطے ہم کو اس کے مکالمات اور مقدمہ کی کارروائی سے مدد حاصل کرنی پڑے گی جس کو ہم کسی دوسری صحبت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

فی الحال تو اس کی ابتدائی زندگی کے حالات کی دھندلی تصویر کو اجاگر کرنا کافی سمجھتے ہیں ٭

تصوّراتِ حسین

بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کا ایک دلنشین گیت

(ترجمہ ظفر قریشی دہلوی بی اے)

رنگین و جمیل تصوّرات کے پرندوں اُڑ جاؤ! ——— اب میں
تمہیں اپنی روح کے سینہ سے نہیں لگاؤں گی! ——— جاؤ! اب
تم آزاد ہو!

ہاں! اے مرغانِ تصوّر! اب تمہیں کنول کی پنکھڑیوں
کی طرح لبوں سے مس نہیں کروں گی، دل میں جگہ نہیں
دونگی ——— تم آزاد ہو، اُڑ جاؤ! اے رنگین تصوّرات:—
سفید بادلوں کے جنگل میں!

نہیں! اے تصوّراتِ حسین اب تم اپنے مسرور چہروں سے
مجھے محفوظ نہیں کر سکتے ——— تم میرے قفسِ ذہنی میں
پھڑپھڑاؤ نہیں ——— لو! اُڑ جاؤ!!

میرے لب نغمات تصوّرات کو گنگنا نے گنگناتے
بالکل تھک گئے ہیں۔

اب میں زندگی کے افقی مقامات پہ اپنے تصوّر کو
بھیجتے بھیجتے تنگ آگئی ہوں ——— ہاں اے رنگین محفلوں
کے رفیقو، اے مونسو! اُڑ جاؤ!! ———
بیابانوں کے محیط نور و رنگ میں!!

کیسی عید!



وہ اٹھی کالی گھٹا آئی گنہگاروں کی عید
میکدہ میں دیکھئے اب چل کے میخواروں کی عید

بخشدینا بے طلب عاشق کو بوسے بے حساب
مغربی معشوق کے فیاض رخساروں کی عید

ٹال دے دیکر موکل کی بڑھانا پیشیاں
ہے عدالت میں وکیلوں اور مختاروں کی عید

امن کا مژدہ اڈیٹر کیلئے پیغام موت
جنگ کا ہلچل بھرا اعلان اخباروں کی عید

خوش نصیبی سے چڑھے ہتّے کوئی بھولائیں
مفت دولت ہاتھ گر آئی تو ہے یاروں کی عید

کوئی قسمت سے ملے گھوڑے کی ٹپ پھر دیکھئے
ریس کے دام محبت میں گرفتاروں کی عید

اس شکر لب نے دیے بوسے سلونے ہونٹھ کے
ہے چھواروں کی جگہ اب تو نمک پاروں کی عید

خون دل پینا ذرا سی "واہ" پر آٹھوں پہر
شاعری کا شوق ہے دنیا میں بیکاروں کی عید

جیب خالی ہاتھ خالی دوستوں میں واہ واہ
ہے محرم پیٹ میں لب پہ ہے اشعاروں کی عید

ملازمت

عید نمبر عالمگیر کے لئے

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی

اوجھنی کے تعلقدار کنور رام پال سنگھ جب تک زندہ رہے اپنے پیادے بدھو خاں کو اپنی ناک کا بال سمجھتے رہے۔ چار روپے کے پیادے کی بات ہی کیا۔ لیکن کنور صاحب بدھو خاں کی اتنی قدر کرتے تھے کہ ان کے مختار عام لالہ چمن لال کو بھی رشک ہوتا تھا۔ کنور صاحب بدھو خاں کا نام نہ لیتے تھے۔ وہ ہمیشہ ان کو خاں صاحب کہہ کر پکارتے تھے اور یہ اسی قدردانی کا نتیجہ تھا۔ کہ خاں صاحب بھی کنور صاحب پر جان دیتے تھے ان کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو تیار رہتے۔ کنور صاحب جہاں بھی جاتے خاں صاحب کو اپنے ساتھ رکھتے۔ کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ کنور صاحب کے دشمنوں نے ان کو گھیر لیا۔ لیکن خاں صاحب کی بہادری سے ان پر کوئی آنچ نہ آنے پائی۔ لاٹھی چلانے میں خاں صاحب اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے پہلوان ان کا لوہا مانتے تھے کنور صاحب اکثر اپنے دوستوں سے فخریہ کہا کرتے تھے کہ میں خاں صاحب کو اپنے بھائی کے برابر سمجھتا ہوں۔ جب کنور صاحب کا آخیر وقت آیا۔ تو انہوں نے اپنے اکلوتے لڑکے پرتاپ سنگھ کا ہاتھ خاں صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "خاں صاحب اب چلنے کی تیاری ہے پرتاپ کو میں تمہیں سونپے جاتا ہوں۔ اس کو اپنا لڑکا سمجھنا۔ ابھی یہ ناتجربہ کار ہے دنیا کے نشیب فراز سے ناواقف ہے"۔ فرط محبت سے خاں صاحب کا گلا بھر آیا۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا چھوٹے کنور کو اللہ پاک اپنے امن و امان میں رکھے میں تو ان کا ادنےٰ خادم ہوں۔ اگر میری جان بھی ان کے کسی کام آئے تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔

کنور صاحب چل بسے ان کی کریا کرم سے فراغت پا کر کنور پرتاپ سنگھ نے اپنے علاقہ کا کام سنبھالا۔ بیس بیگہ زمین کنور رام پال سنگھ خاں صاحب کے نام لکھ گئے تھے اس کے کاغذات کنور پرتاپ سنگھ نے بڑی خوشی سے خاں صاحب کو دیدیئے لالہ چمن لال کو جب پتہ چلا کہ کنور صاحب ان کے نام کچھ زمین لکھ گئے ہیں تو ان کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ دنیا کا عجب دستور ہے۔ یہاں کوئی کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتا خاں صاحب کو بیس بیگہ زمین کیوں ملی اور میں اس سے محروم کیوں رہا یہ سوال چمن لال اپنے کینہ جو حاسد دل سے بار بار کرتے لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ ملتا۔ اپنے عیب سے کوئی خود واقف نہیں ہوا کرتا۔ لالہ چمن لال بھی اس نقص سے خالی نہ تھے انہوں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا۔ کہ جس طرح سے بھی ہو خاں صاحب کو نیچا دکھانا چاہیئے۔ جب تک خاں صاحب نوکری سے برطرف نہ کئے جائیں گے مجھے عروج حاصل نہ ہوگا۔ رشک و حسد سے انسان کی عقل ماری جاتی ہے چمن لال نے یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی کسی کی روزی نہیں بند کر سکتا خدا رزاق ہے اس نے پیدا کیا ہے۔ تو خاں صاحب کی پرورش بھی کرے گا۔ وہ محتاج نہیں رہ سکتے۔ خاں صاحب سے لالہ چمن لال کنور رام پال سنگھ کے زمانہ ہی سے جلتے تھے۔ لیکن ان کا بس نہ چلتا تھا۔ انہوں نے کئی مرتبہ خاں صاحب کو نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کی لیکن "چاہ کن را چاہ در پیش"۔ والا معاملہ ہوا کنور صاحب کے مرتے ہی لالہ چمن لال پھر خاں صاحب کو زک پہنچانے کی فکر کرنے لگے۔ خاں صاحب سوائے دربانی کے اور کوئی کام نہ کرتے تھے۔ دن بھر ڈیوڑھی پر حاضر رہتے۔ اگر کنور صاحب کہیں باہر جاتے تو





دامن بہار

خان صاحب اپنے کندھے پر لاٹھی رکھے ان کے پیچھے پیچھے چلا کرتے لالہ جی کو خان صاحب کی برائی کرنے کا کوئی موقع ہی نہ ملتا۔

ایک دن اتفاق سے خان صاحب کو بخار آ گیا۔ وہ دو دن تک ڈیوڑھی پر نہ آ سکے۔ لالہ جی کو شکایت کرنے کا موقع مل گیا انہوں نے کنور صاحب سے کہا۔ آجکل تحصیل وصول کرنے کے دن ہیں کام بہت ہے۔ اگر سرکار اجازت دیں تو میں خان صاحب کو ڈیوڑھی سے ہٹا کر اسامیوں سے دین وصول لینے کے لئے علاقہ پر بھیج دوں۔ ڈیوڑھی پر کام ہی کیا ہے۔ دن بھر خان صاحب مکھیاں ہی تو مارا کرتے ہیں

کنور صاحب۔ دین وصول کر لینے کے لئے تمہارے پاس چار پیادے ہیں۔ کیا ان سے یہ کام نہیں ہو سکتا جو تم کو خان صاحب سے کام لینے کی ضرورت پیش آئی۔

لالہ جی۔ حضور آج کل کام کی بہت زیادتی ہے۔ تحصیل وصول کے دن ہیں۔ اگر خاں صاحب بھی اس کام پر مامور کر دیئے جائیں تو بہت اچھا ہو گا۔

کنور صاحب۔ پتا جی کے زمانہ میں کس طرح کام چلتا تھا

لالہ جی اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہیں۔ کنور صاحب کو خان صاحب کا اتنا خیال ہے۔ لالہ جی کو اس کا گمان بھی نہ تھا۔ بدطینت انسان اپنی ہار کبھی تسلیم نہیں کرتا کنور رام پال سنگھ کے زمانہ میں لالہ جی اپنی حرکتوں سے کئی مرتبہ ذلیل ہو چکے تھے۔ اگر کوئی شریف ہوتا۔ تو پھر کبھی کسی کی بدگوئی نہ کرتا۔ لالہ جی چکنا گھڑا تھے۔ ان پر لعنت ملامت کی بارش ہوتی۔ لیکن اس کا انہیں کچھ احساس ہی نہ ہوتا۔ خان صاحب نے لالہ جی کا کبھی برا نہ چاہا تھا۔ بلکہ ان کے ہمیشہ خیر خواہ رہے۔ اس کے برخلاف لالہ جی نے خان صاحب کو کبھی اچھی نگاہ سے نہ دیکھا جب وہ ہر طرح سے ہار گئے تو انہوں نے خان صاحب کو زک پہنچانے کے لئے مذہبی رنگ اختیار کیا۔

شدھی کی تحریک خدا جانے کس بری ساعت سے شروع کی گئی۔ کہ اس نے ہندوستان کے خرمن امن میں آگ لگا دی۔ برسوں سے ایک ساتھ شیر و شکر رہنے والے بھارت ماتا کے سپوت ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق پیدا ہو گیا۔ ایک طرف شدھی اور دوسری طرف تبلیغ۔ کہیں سنگٹھن تو کہیں پر تنظیم کے جلسے ہونے لگے۔ اوجھنی کے قریب ایک گاؤں مبارک پور میں آریہ سماج کے ایک پر جوش رکن لالہ شام لال زمیندار رہتے۔ انہوں نے ایک چمار کی جو عیسائی ہو گیا تھا شدھی کی۔ اور اس کی تقریب میں ایک عالیشان جلسہ کیا جس میں دور دور سے آریہ پرچارک بلائے گئے۔ کنور رام پال سنگھ اور لالہ شام لال میں پٹی داری تھی۔ انہوں نے جیتے جی کبھی لالہ شام لال کو منہ نہ لگایا۔ لیکن ان کے مرنے کے بعد جب شدھی کی تحریک شروع ہوئی۔ تو لالہ شام لال نے کنور پرتاب سنگھ سے ایسا میل جول بڑھانا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جب شام لال نے آریہ سماج کا جلسہ کیا تو انہوں نے کنور پرتاب سنگھ سے اس کی صدارت کے لئے استدعا کی کنور صاحب سناتن دھرمی تھے۔ وہ آریہ سماج عقائد سے سخت اختلاف رکھتے تھے۔ پھر بھی ان پر اتنا زور ڈالا گیا۔ کہ مروت با عاطہ سے صدارت سے انکار نہ کر سکے اس تجویز کے اصلی محرک کنور صاحب کے مختار عام منشی چمن لال تھے اور انہیں کی غائبانہ کوششوں کا یہ اثر ہوا۔ کہ کنور صاحب آریہ سماج جلسہ کے صدر بنائے گئے۔ کنور صاحب کی شرکت سے ہندوؤں کا دل بڑھ گیا اور جلسہ کی رونق دوبالا ہو گئی

پر جوش مقرروں نے بھی خوب دھواں دھار تقریریں کی۔ تماشہ کا جلسہ۔ لیکن اس میں خواہ مخواہ مسلمان بادشاہوں کے من گھڑت ظلم و ستم کے افسانے دھرائے گئے جلسہ میں زیادہ تر تاریخ سے ناواقف اَن پڑھ اجیڈ دیہاتی ہی شامل تھے جب ان کو بتایا گیا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے مندر گرائے اور دیویوں کی عصمت دری کی تو غیرت مند دیہاتیوں کا خون جوش غضب سے ان کی رگوں میں دوڑنے لگا۔ عرصہ سے وہ مسلمانوں کے ساتھ میل ملاپ رکھتے چلے آ رہے تھے آپس میں برادرانہ تعلق تھا۔ اس سے پہلے انہیں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ مسلمان ان کے دشمن ہیں انکو یہ معلوم ہی نہ تھا۔ کہ مسلمان ملکش ہیں پرچارکوں نے دیہاتیوں

کے جو تیور بگڑے دیکھے تو انہوں نے اور بھی نمک مرچ لگایا۔ یہاں تک کہ ایک نے علانیہ مسلمانوں کو بائیکاٹ کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ لالہ چمن لال نے فوراً اٹھ کر تائید کر دی اور سب نے بغیر سوچے سمجھے اس تجویز کو پاس کر دیا۔ کنور پرتاب سنگھ تعلیم یافتہ تھے وہ اچھی طرح سے واقف تھے کہ ایسی نفاق انگیز تجویزوں کا نتیجہ بہت خراب ہوگا۔ کیونکہ ان کے علاقہ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد تھی۔ مسلمانوں نے ان کے خاندان کی ہمیشہ خدمت کی تھی۔ یہ سب کچھ سوچکر بھی کنور صاحب لوگوں کے بڑھتے ہوئے جوش کو دیکھکر اس نقصان دہ تجویز کی مخالفت نہ کر سکے۔ دوسری ضروری تجویز لالہ شام لال نے مسلمانوں کی شدھی کے لئے پیش کی جو بغیر کسی مخالفت کے پاس کر دی گئی۔ اور اس جلسہ میں پرچار کرنے کے لئے چندہ کے لئے اپیل کی گئی۔ جفاکش غریب دیہاتیوں نے دو دو چار چار آنہ کرکے چندہ دیا۔ لالہ شام لال اور لالہ چمن لال کی طرف سے سو سو روپے کی رقمیں پیش کی گئیں۔ کنور پرتاب سنگھ کو بھی مجبوراً دو سو روپے اس کار خیر میں دینے پڑے اور جلسہ "ہندو دھرم کی جے" کے نعروں میں اختتام پذیر ہوا

اس جلسہ نے اوجھنی اور مبارک پور کا کیا ذکر آس پاس کے تمام گاؤں میں آتش نفاق بھڑکا دی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کا بائیکاٹ کرنا شروع کر دیا۔ مسلمان غیر منتظم تھے ان کے خلاف کیا کارروائیاں کی جا رہی ہیں۔ ان کو پتہ ہی نہ چلا۔ اور اگر کسی مسلمان کو معلوم بھی ہوا تو وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ جب مسلمانوں کو ہندوؤں نے بہت پریشان لیا تو وہ ایک دن ڈرتے ڈرتے کنور پرتاب سنگھ کے پاس جاکر فریادی ہوئے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اب کنور صاحب وہ کنور صاحب نہ رہے تھے۔ مذہبی تعصب نے انکی کایا پلٹ دی انہیں نیک و بد کی تمیز ہی نہیں رہی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کو تسلی و دلاسا دیتے انہوں نے الٹی مسلمانوں کو جھڑکا بتائی۔ اور صاف صاف کہ دیا کہ وہ اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔ مسلمان وہاں سے مایوس ہوکر بدھو خان صاحب کے مکان پر پہنچے خان صاحب نے کہا "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم لوگ اطمینان رکھو۔ میں موقع پاکر کنور صاحب کو سمجھا دونگا۔ یہ سب لالہ چمن لال کی کارستانی ہے ورنہ کنور صاحب تو مذہبی جھگڑوں سے ہمیشہ دور بھاگتے تھے کنور صاحب کو میں آہستہ آہستہ راہ پہلے آؤنگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم اپنی طرف سے کوئی شرارت نہ کر بیٹھنا"۔ میراں بخش ایک نوجوان اکھڑ جولاہا تھا وہ بول اٹھا۔ "خان صاحب تم ہمیں تو کہتے ہو کہ کوئی شرارت نہ کر بیٹھنا لیکن ہندوؤں کو کچھ نہیں کہتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم غریب ہیں۔ اور وہ امیر ہیں ہم میں اتفاق نہیں ہے اور ان میں اتفاق ہے۔ ہندو ہمارے ساتھ آجکل بھنگیوں کا سا سلوک کر رہے ہیں لیکن کوئی ہماری فریاد نہیں سنتا"

خان صاحب بولے "میں کہ تو رہا ہوں کہ کنور صاحب کو سمجھا دونگا" اس کے بعد مسلمانوں کو اطمینان ہو گیا۔ اور وہ منتشر ہو گئے۔ آگ لگانے والوں نے اس کی خبر کنور صاحب تک پہنچا دی۔ اور مشہور کیا کہ خان صاحب نے مسلمانوں کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا ہے جلسہ کے بعد سے کنور صاحب کے مشیر کار لالہ چمن لال ہو چکے تھے۔ اب کنور صاحب کو خان صاحب سے کوئی رائے لینے میں ہچکچاہٹ ہوتی تھی جب ان کو ہندوؤں نے یقین دلایا کہ خان صاحب مسلمانوں کو ورغلا رہے ہیں تو انہیں بہت غصہ آیا۔ کسی کی طرف سے ذرا سی بدگمانی پیدا ہو جائے پھر اس پر اعتبار نہیں رہتا چنانچہ اب خان صاحب کی طرف سے کنور صاحب کو ڈر معلوم ہونے لگا۔ انہوں نے خان صاحب سے بغیر کچھ دریافت کئے ہی چمن لال کو حکم دیا کہ "خان صاحب کو ڈیوڑھی پر سے ہٹا کر علاقہ پر بھیجدو میں ایسے خطرناک آدمی کو اب اپنی ڈیوڑھی پر رکھنا پسند نہیں کرتا اگر اس کی قدیم خدمات کا خیال نہ ہوتا تو میں برخاست کر دیتا۔ پھر بھی اب اگر ان کی کوئی شکایت سنی۔ تو میں خان صاحب کو ملازمت سے برطرف کر دونگا"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں لالہ جی کی مراد بھر آئی۔ انہوں نے خان صاحب کو بلا کر کنور صاحب کا حکم سنا دیا۔ خان صاحب سناٹے میں آ گئے۔ وہ پندرہ بیس سال سے ڈیوڑھی پر کام کرتے چلے آ رہے تھے یکبارگی بلا کسی خطا اور قصور کے جو وہ ہٹا دیے گئے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ ضرور دال میں کالا ہے۔ انہوں نے کنور صاحب سے ملنا چاہا۔ لیکن کنور صاحب نے کہلا دیا کہ ملنے کی فرصت نہیں ہے

کنور صاحب کا ایک گاؤں بیراگی پور ادجھنی سے دکن جانب دس بارہ میل پر تھا خاں صاحب وہیں بھیج دیئے گئے۔ ان کے جاتے ہی میدان صاف ہو گیا۔ لالہ چمن لال کی بن آئی۔ ڈلوڑھی پر نفاق پسند لوگوں کا مجمع رہنے لگا۔ انہوں نے کنور صاحب سے مسلمانوں کی اتنی جھوٹی شکایتیں کی کہ وہ مسلمانوں کے سخت خلاف ہو گئے، یہ رنگ دیکھ کر لالہ چمن لال نے ہندو کارندوں کو اشارہ کر دیا۔ اور مسلمان آسامیوں پر ظلم ہونے لگا۔ بیگار۔ بیدخلی کی نالش غرضیکہ ہر ممکن طریقہ سے غریب مسلمانوں کو دبایا جب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تو وہ بھی "تنگ آمد بجنگ آمد" پر تیار ہو گئے۔ مبارک پور کے ایک رئیس مولوی ظہیر الدین مسلمانوں کے لیڈر بنے انہوں نے مسلمانوں کو خوب بھڑکایا ان کے مشورے سے مسلمانوں نے ہندوؤں کا بھی بائیکاٹ شروع کر دیا۔ تبلیغ کے بھی جلسے ہونے لگے۔ کنور صاحب کے علاقہ میں ایک گاؤں دہرم پور تھا۔ وہاں کے برہمن بڑے جابر تھے انہوں نے اچھوتوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اپنے کنوئیں سے انکو پانی تک نہ بھرنے دیتے تھے۔ اچھوتوں کو مسلمانوں کے تبلیغی جلسوں کا علم ہوا وہ بھی موقع ملنے پر شامل ہونے لگے ان کو جیسا پتہ چلا کہ مسلمانوں میں ذات پات کی کوئی تفریق نہیں۔ ان کے یہاں شاہ و گدا برابر کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں تو ان کے دل پر خاص اثر پڑا۔ کٹر برہمنوں کی چھوت چھات سے وہ تنگ آ گئے تھے۔ کہ آخر کار قریباً دوسو اچھوت بڑی خوشی سے مسلمان ہو گئے۔ اس خبر نے ہندوؤں کے ہوش اُڑا دیئے۔ کنور صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی انہوں نے جوش انتقام میں اپنی نومسلم آسامیوں کے گھروں کو آگ لگوا دی مسلمان حاکم ضلع سے فریادی ہوئے لیکن کنور صاحب نے اپنا روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ اور مسلمانوں کی ایک بھی چلنے نہ دی۔ بلکہ نومسلموں کو اسقدر تنگ کیا گیا۔ کہ وہ دہرم پور چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ کنور صاحب نے جب سنا کہ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کا بائیکاٹ کرنا شروع کر دیا تو انہوں نے اپنے ہندو کارندوں کو حکم دیدیا کہ مسلمان آسامیوں سے مار مار کر کام لو اس کے جواب میں مولوی جمال الدین نے بھی اپنی ہندو آسامیوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ تمام علاقہ کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ مسلمانوں نے کنور صاحب کے کھیتوں کو جوتنا بونا چھوڑ دیا۔ آمدنی کم ہونے لگی لالہ چمن لال نے موقع پا کر رشوت کا بازار گرم کیا۔ ایک دن لالہ چمن لال نے کنور صاحب سے شکایت کی۔ کہ یہ سب شرارت بدھو خاں کی ہے۔ کنور صاحب نے کہا۔ "اچھا یہ بات ہے مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ گھر کا پروردہ نمک حرام ہو جائے گا۔ پتا جی کا خیال نہ ہوتا۔ تو میں اس کو جیل بھجوا دیتا۔ پھر بھی اب میں اس کو اپنے یہاں نہ رکھوں گا۔ برخاست کر دو۔"

لالہ چمن لال کی باچھیں کھل گئیں کہنے لگے "حضور یہ نمک حرام اسی لائق تھا۔ اب دیکھ لیجئے گا سب خان صاحبی نکل جائے گی۔"

ناکردہ گناہ خان صاحب برخاست ہوئے تو انہیں بڑا صدمہ ہوا۔ اس وجہ سے نہیں کہ ملازمت گئی بلکہ اس وجہ سے کہ کنور صاحب خفا ہو گئے ہیں۔ ادجھنی پہنچکر انہوں نے کنور صاحب سے ملنے کی بہت کوشش کی تاکہ وہ کنور صاحب کو اصلیت سے آگاہ کریں۔ اور بتائیں کہ علاقہ میں کیسا اندھیر ہو رہا ہے۔ لیکن "کون سنتا ہے فغاں درویش"۔ کنور صاحب نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں ایسے نمک حرام سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ خان صاحب کو خلاف توقع کنور صاحب سے "نمک حرام" کا خطاب ملا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گھر واپس ہوئے۔ تو ان کے نوجوان لڑکے پیرو نے کہا "دیکھا بابا کنور صاحب کا سلوک خدا جانے آپ ان سے کیوں دبتے ہیں۔ میں تو ہرگز گالی نہیں کھا سکتا۔ غریب ہیں تو کیا ہر شخص ہم پر ظلم نہیں کر سکتا ہے۔ یہ انگریزی راج ہے۔ کنور صاحب نے آپ کو گالی دی ہے یہ انہوں نے اچھا کام نہیں کیا۔ میں کنور صاحب سے اس کا بدلہ لے لوں گا۔"

خان صاحب نے پیرو کو ڈانٹ کر کہا "خبردار کبھی ایسی گستاخی نہ کرنا ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔ تو کنور صاحب ہی کی روٹی کھا کھا کر اتنا بڑا ہوا ہے۔ کنور صاحب کی کوئی خطا نہیں۔ یہ سب چمن لال کی شرارت ہے۔ اسی نے ان کو بھڑکا رکھا ہے۔ ہمارے وہ مالک ہیں ہم کو تو ان کے پسینے پر اپنا خون بہانا چاہیئے پیرو چپ ہو گیا اس نے دل میں سوچا کہ بابا سٹھیا گئے ہیں انکی مت ماری

گئی ہے ان سے کچھ کہنا فضول ہے

اوجھنی میں ہمیشہ گائے کی قربانی کی آزادی رہی کنور رام پال سنگھ کے زمانہ میں اس کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ وہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے رنج وغم اور ہنسی خوشی میں شریک ہوتے تھے مسلمانوں کو بھی ہندوؤں کا اتنا خیال تھا کہ اول تو وہ گائے کی قربانی نہ کرتے تھے اور اگر کسی گاؤں میں گائے کی قربانی ہوتی بھی تھی۔ تو رہ گذر کے بجائے مکان کے اندر ہی ہوتی تھی۔ اور اس کا گوشت بہت پوشیدہ طریقہ سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ تاکہ ہندوؤں کی دلشکنی نہ ہو۔ ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کا بڑا خیال تھا۔ جب وہ کسی مسجد کے سامنے سے نکلتے تو باجہ ہرگز نہ بجاتے۔ لیکن کنور پرتاپ سنگھ پر شدھی اور سنگٹھن نے اتنا اثر کیا کہ انہوں نے اپنے علاقہ میں گائے کی قربانی کرنے کی ممانعت کردی۔ مسلمانوں کو سخت ناگوار ہوا۔ انہوں نے کہا دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اپنے مذہبی فرائض سے نہیں روک سکتی راضی خوشی کی اور بات ہے۔ لیکن کسی دباؤ سے ہم گائے کی قربانی بند نہیں کرسکتے مولوی جمال الدین کے فتوے سے سمند ناز کو اک اور تازیانہ ہوا سب مسلمان کٹنے مرنے پر تیار ہوگئے اوجھنی سے تھوڑی دور پر میر الطاف حسین تعلقدار (جن سے کنور صاحب کی دشمنی تھی) کا علاقہ تھا۔ کنور رام پال سنگھ سے میر صاحب کی فوجداری بھی ہوچکی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے کنور صاحب کا ساتھ دیا تھا۔ جس سے میر صاحب کو شکست ہوئی تھی میر الطاف حسین نے جب دیکھا کہ کنور صاحب کے علاقہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جنگ چھڑی ہے تو انہوں نے کنور صاحب سے اپنا انتقام لینے کے لئے مسلمانوں کو مدد دینے کا وعدہ کرلیا بقرعید کے دن مولوی جمال الدین کے مکان پر سینکڑوں مسلمان جمع ہوگئے۔ کیونکہ انہیں کے مکان پر گائے کی قربانی کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کے مکان کے سامنے کچھ دور پر ہندوؤں نے بھی اپنا ڈیرا جمایا کنور پرتاب سنگھ ان کے ساتھ تھے انہوں نے ہندوؤں کو کہہ دیا تھا کہ چاہے کچھ ہو لیکن مسلمانوں کو گائے کی قربانی نہ کرنے دو۔ جس وقت وہ گائے کی قربانی کرنے چلیں تم دھاوا بول دو۔ مسلمانوں کی طرف میر الطاف حسین تعلقدار کہہ رہے تھے کہ بھائیو! اگر آج تم ہندوؤں سے دب گئے تو پھر تمہارا یہاں رہنا دشوار ہوجائے گا۔ گائے کی قربانی کرنے میں اگر ہم مارے گئے تو شہید اور زندہ رہے تو غازی کہلائیں گے۔ غرضیکہ مرنے اور مارنے کے لئے ہندو اور مسلمان تیار ہورہے تھے لیکن اسوقت تک کسی نے پیشقدمی نہ کی تھی کہ یکایک بدھو خاں لپکتے ہوئے آئے اور دونوں جماعتوں کے درمیان کھڑے ہوگئے اس وقت خان صاحب مسلمانوں کے کسی مشورہ میں شریک نہ تھے بلکہ اس کے برخلاف وہ مسلمانوں کو سمجھاتے تھے۔ کہ صبر کرو۔ خلاف امید خان صاحب کو دیکھ کر مولوی جمال الدین نے کہا خدا کا شکر ہے کہ آپ کو مسلمانوں پر رحم تو آیا وہاں کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے یہاں آجائیے"!

ادھر لالہ چمن لال نے بھی خان کو دیکھا اور کنور صاحب سے کہنے لگے۔ "دیکھی حضور نے بدھو خاں کی نمک حرامی! کب تک چھپ کر کام کرتا آخر حضور کے سامنے آہی گیا"۔

کنور صاحب ۔لیکن وہ مولوی جمال الدین کے دروازہ پر کیوں نہیں گیا دور ہی کیوں کھڑا ہے

لالہ جی - اس میں بھی اس کی کوئی چالاکی ہوگی چھٹا بدمعاش ہے

کنور صاحب۔ اچھا ذرا چپ تو رہو سنو تو سہی وہ مولوی صاحب سے کیا کہتا ہے

خان صاحب نے مولوی صاحب سے مخاطب ہوکر کہا "مولوی صاحب مجھے معاف کیجئے میں آپ کے گہار میں شامل ہونے کے لئے نہیں آیا میں تو صرف یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ ہمارے گاؤں پر رحم کیجئے کسی کا دل دکھانے سے کیا فائدہ جو کچھ آپ کے کرنے کا ارادہ ہے اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا"!

مولوی صاحب نے قہقہہ مار کر کہا۔ "آہا ہا آپ ہمیں سمجھانے آئے ہیں خوب جب کنور صاحب نے ہم پر ظلم کیا۔ مسلمان بھائیوں کو گھر سے بے گھر کیا ان کے کارندوں نے غریب مسلمانوں کو مارا پیٹا ہندوؤں نے ہمارا بائیکاٹ کیا اس وقت آپ کہاں تھے آپ کو اچھی طرح سے معلوم ہوگا۔ کہ ہم کوئی نئی بات نہیں کررہے ہیں۔ قربانی کرنا ہمارے مذہبی فرائض میں داخل ہے کوئی ہم کو اس فرض سے نہیں روک سکتا"!

خان صاحب ۔ آپ کا خیال درست ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ گائے کی قربانی کی جائے اس کے بجائے آپ بکرے یا دنبہ کی قربانی کر سکتے ہیں۔ ہندو ہمارے وطنی بھائی ہیں ان کے جذبات کا احترام کرنا بھی ہمارا فرض ہے؟

مولوی صاحب ۔ لیکن ہم ہندوؤں سے ڈر کر یا ان کے دباؤ سے کوئی شعار اسلامی ترک نہیں کر سکتے کنور رام پال سنگھ کے زمانہ میں گائے کی قربانی کی کوئی مخالفت نہ تھی وہ مسلمانوں کے ہمیشہ دوست تھے اس وجہ سے ہم نے بھی گائے کی قربانی نہیں کی کیونکہ مسلمانوں کا تو ہمیشہ سے اصول یہ رہا ہے کہ جو بندہ نوازی کرے دل اس پہ فدا ہے۔ رواداری اس کو کہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی اپنے زور یا طاقت سے ہمیں گائے کی قربانی سے روکنا چاہتا ہے تو اس کی سخت غلطی ہے۔ کیونکہ "باطل سے دبنے والے اے دوستو نہیں ہم"۔ ہم گائے کی قربانی ڈنکے کی چوٹ کریں گے ہندو ایک جانور کے پیچھے ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں ان کو انسانی خون بہانے میں کوئی عار نہیں۔ لیکن ہمیں تو سب سے زیادہ اس کا تعجب ہے کہ فوج میں گوروں کے لئے روزانہ سینکڑوں گائیں ذبح ہوتی ہیں لیکن کوئی مائی کا لال انکو نہیں روکتا۔ ہم کو ہی کمزور سمجھ کر ہندو کیوں دباتے ہیں۔ لیکن آپ کو ان باتوں سے کیا مطلب آپ سے کچھ کہنا ہی فضول ہے کیونکہ آپ تو کنور صاحب کا نمک کھائے ہوئے ہیں۔ ان کی سی کہیں گے ہی"

خان صاحب اس عرصہ میں آہستہ آہستہ اس مقام پہ پہنچ گئے جہاں گائے بندھی ہوئی تھی ادھر کنور پرتاپ سنگھ بھر خیال میں غوطے کھا رہے تھے ان کو کبھی غریب مسلمانوں پر غصہ آتا اور کبھی رحم۔ مولوی صاحب کی تقریر نے ان کو شش و پنج میں ڈال دیا وہ سوچنے لگے ۔ مولوی صاحب سچ تو کہتے ہیں یہ وہی مسلمان ہیں جو پتاجی کے زمانہ میں ہم پر اپنی جان تک ہر وقت قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ لیکن اب تو یہ عالم ہوگیا ہے۔ کہ آسامی ہو کر بھی ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں آخر ایسا کیوں ہوا بس بس معلوم ہوگیا یہ سب آگ چمن لال کی لگائی ہوئی ہے افسوس میں نے اس کے کہنے میں آکر مفت میں مسلمانوں کو اپنا دشمن بنا لیا افسوس میں نے خان صاحب ایسے وفادار اور شریف پیادہ کو صرف اسی جرم پر کہ وہ مسلمان ہے کیوں برخاست کیا"

ایک دفعہ انسان کا دل صفائی پہ مائل ہو پھر اس کا ضمیر اس کو راہ راست پر لے ہی آتا ہے۔ کنور صاحب کے دل کی بھی یہی حالت ہوئی جب تک ان کے دل میں مسلمانوں کی جانب سے غبار کدورت بھرا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے ہنر بھی ان کی نگاہ میں عیب معلوم ہوتے تھے ان کی ہر حرکت سے شرارت ٹپکتی تھی۔ لیکن جس وقت کنور صاحب کے شیشہ دل سے غبار کدورت دور ہوا ان کو مسلمان بے ضرر اور خیر خواہ نظر آنے لگے۔ اب ان کو دوست اور دشمن میں فرق معلوم ہونے لگا۔ کنور صاحب نے فوجداری کے نتائج پر غور کیا تو عالم خیال میں ان کی آنکھوں کے سامنے سینکڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی خون میں لت پت لاشیں اور سینکڑوں بیوائیں اور یتیم بچے باحال پریشان ماتم کرتے دکھائی دیئے۔ کنور صاحب کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت لالہ چمن لال نے یہ کہہ کر کہ "حضور تیار ہو جائیے مسلمان قربانی کرنے جا رہے ہیں" ان کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ کنور صاحب چونک اٹھے گویا وہ کسی گہری نیند میں تھے انہوں نے دیکھا کہ خان صاحب گائے کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑے ہیں اور چلا چلا کر کہہ رہے ہیں۔ "بھائیو! ہاتھ جوڑتا ہوں گائے کی قربانی نہ کرو۔ میں اس کے بجائے ایک چھوڑ دس بکرے دینے کو تیار ہوں۔ بھائیو خدا کے لئے رسول کے لئے اپنی ضد سے باز آجاؤ۔ سرراہ گائے کی قربانی کر کے کسی کا دل کیوں دکھانا چاہتے ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو پہلے مجھے مار ڈالو"

کنور صاحب کے کانوں میں بھی خان صاحب کی آواز پہنچی انہوں نے چمن لال سے کہا "جاؤ جاؤ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ مجھے اب تمہاری بالکل ضرورت نہیں رہی میں اب مسلمانوں سے ہرگز لڑائی مول نہ لونگا" یہ کہتے ہوئے کنور صاحب اپنے گُہار سے نکل کر مولوی جمال الدین کی طرف بڑھے پیادوں نے انکا ساتھ دینا چاہا لیکن کنور صاحب نے منع کر دیا۔ مولوی جمال الدین میر الطاف حسین اور تمام مسلمانوں نے کنور صاحب کو اپنی طرف تنہا آتے دیکھا تو حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کہ اب کیا

ہونے والا ہے۔ کنور صاحب نے آگے بڑھ کر بلند آواز سے کہا "بھائیو معاف کرنا میں غلطی پر تھا سچ مچ مجھے آپ کے مذہبی فرائض میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ آپ شوق سے قربانی کیجیے" اتنا کہ کر کنور صاحب نے خان صاحب سے کہا "خان صاحب! ادھر آئیے میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ پرماتما نے آج میری آنکھیں کھولدیں۔ مجھے کھرے کھوٹے نیک اور بد کی پہچان ہو گئی۔ آج سے آپ میرے پیارے نہیں۔ بلکہ اب میں آپ کو اپنے پتاجی کی جگہ پر سمجھتا ہوں آپ نے مجھے کیا چھوڑا میرے تمام علاقہ نے مجھے چھوڑ دیا۔ پتاجی نے آپ کو جو وصیت کی تھی اسے نباہیے اور میری سرپرستی کیجیے" خان صاحب نے دوڑ کر کنور صاحب کو گلے سے لگالیا۔ اور روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا "ہاتھ جوڑتا ہوں کنور صاحب آپ اپنا دل چھوٹا نہ کیجیے ہمارے آپ مالک اور ہم ان کے غلام ہیں"

اس مؤثر سین کو دیکھ کر تمام مسلمان بیتاب ہو گئے مولوی صاحب کا دل بھر آیا۔ انہوں نے کنور صاحب سے کہا۔ جب آپ ہمارے قربانی کرنے میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی بڑی خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم گائے کی قربانی نہ کریںگے۔ آپ اس گائے کو بخوشی لے جا سکتے ہیں مسلمان ناشکرے نہیں ہیں۔ انکا تو ہمیشہ سے یہ قول رہا ہے ع

"با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا"

مسلمانوں کے اس ایثار۔ رواداری اور ہمدردی کو دیکھ کر ہندوؤں کی آنکھیں کھل گئیں۔ سب کے دل صاف ہو گئے میاں الطاف حسین صاحب نے کنور صاحب کے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

پریشانہ چاہیئے!

دل بستگی کو میری پریشانہ چاہیے
ہر چار سمت جلوۂ جانانہ چاہیئے

کبتک یہ پردہ داریئے وارفتگانِ عشق
اے حاصل الم تجھے ایسا نہ چاہیئے

تیرا خیال دل میں اگر جاگزیں ہوا
میرے خیال کو پر پروانہ چاہیئے

ہر نالہ آشیاں کیلئے ایک برق ہو
ویرانیوں سے زینت کاشانہ چاہیئے

برق جمال! خانہ دل میں بھی اک جھلک
معمور تجلیوں سے یہ ویرانہ چاہیئے

خونِ جگر روانہ ہو آنکھوں کی راہ سے
دامن پہ میرے خرمنِ دُردانہ چاہیئے

دل دے کے کیوں ہے وقف پریشانیٔ خیال
ہشیار اے ظفر تجھے ایسا نہ چاہیئے

ابر!

میخانے میں عید

از جناب منشی نذیر علی صاحب ... کاکوروی

عالمگیر عید نمبر

کہہ رہی ہے آج یہ ہر مست میخانے میں عید
رنگ لائی ہے کسی میکش کے پیمانے میں عید

رقص کرتی پھر رہی ہے آج میخانے میں عید
کیا نشیلی انکھڑیوں سے ہے پریخانے میں عید

کیوں نہ خم کے خم چڑھائیں جھوم کر بادہ قطار
ہم سے مستوں کیلئے آئی ہے میخانے میں عید

عکس ابروئے کسی کا یا ہلال عید ہے
یا یہ مستوں کو نظر آتی ہے پیمانے میں عید

اللہ اللہ ساقیٔ توبہ شکن کی چشم مست
آ جنوں اب ہم منائیں دشت ویرانے میں عید

کیوں نہ جھوم اٹھیں نگاہِ مست ساقی دیکھ کر
جام احمر ہے کہ ہے شیشے کے پیمانے میں عید

درد ہوش اڑتے ہیں دوڑی اک مسرت کی لہر[1]
کیا پری بنکر اتر آئی ہے پیمانے میں عید

---

[1] لہر جس طرح میں نظم کیا ہے قابل اعتراض نہیں ہے۔ نواب مرزا شوق مشہور استاد کا شعر ہے ؎ پھر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی ٭ بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی ٭

عالمگیر عید نمبر! کیلئے!

عیدی

از مسٹر "ناکارہ" حیدرآبادی

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ شادی کی شیروانی پہنکر کبھی عید کی نماز پڑھنے نہ جاؤں گا مجھے وہ کمخواب کی شیروانی پہنکر باہر نکلتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے اس کے علاوہ میں حد درجہ سادگی پسند ہوں۔ اور ہمیشہ سے زرق برق پوشاک کا سخت ترین مخالف رہا ہوں۔

میں نے قسم کھالی تھی کہ وہ بھڑکیلا لباس زیب تن کئے ہرگز مسجد نہ جاؤنگا۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری بیگم صاحبہ[1] کا۔ کہ انہوں نے علی الاعلان کر دیا تھا کہ جانا ہے تو کمخواب کی شیروانی پہنکر جاؤ۔ ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ میں بھی آپ کی دعا سے بید ضدی واقع ہوا ہوں۔ مگر میں نے گھر میں چیخ چیخ کر اسکا اعلان کر دیا کہ جان جائے یا جان ہی مگر میں وہ شیروانی پہننے کا روادار نہیں۔ اس ضمن میں میں نے بہت سی باتیں فر فر کہ ڈالیں۔ گریبان پھاڑ کر مسجد کے بجائے جنگل کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کی دھمکی دی۔ اس منحوس شیروانی کو نذر آتش کرنے اور پھر اس کے شعلوں میں خود کو گرانے اور ستی ہو جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر سب بے سود! بیگم صاحبہ کے آگے ایک بھی پیش نہ گئی۔ انہوں نے وہ شور و غل مچایا۔ کہ مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں بہرا ہوتا! گھر کی ماما اور چھوکریاں بھی ان کی ہم زبان ہو گئیں اور سب کے سب ملکر میرا ناک میں دم کرنے لگیں۔ ایک آدھے بیلے کا مقابلہ چار حوا کی بیٹیوں سے تھا۔ میرا ہی دل گردہ تھا جو میں آدھ گھنٹہ تک برابر میدان میں ڈٹا رہا۔ سب کچھ سہی مگر کمخواب کی شیروانی ہرگز نہیں! ——— مگر ع۔ وہی ہوتا ہے جو عورت کا کہا ہوتا ہے

قریب تھا کہ سب کی سب ملکر مجھ پر ٹوٹ پڑتیں اور مجھ کو بے قابو کر کے وہ گدھے کی جھول میرے جسم پر پہنا دیتیں۔ کہ میں نے سوچا کہ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ ننھا شریف ادھر الگ جلدی کر رہا ہے۔ کہ ابا چلو مسجد کو چلو۔ ان کم عقل عورتوں سے کون جھک جھک کرتا رہے۔ اور اپنا عزیز وقت ضائع کرے؟ ——— میں نے آخر ہتھیار ڈال دیئے اور کمخواب کی شیروانی اٹھالی۔ گھر کی چار دیواری کے اندر گھاگھرا حکومت" قائم ہو چکی تھی! آہ! ایں ہم اندر "شوہری" بالائے غم ہائے دگر

شریف کو ہمراہ لئے اور شادی کی شیروانی پہنے مسجد کی طرف چلا۔ کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ نظر اوپر نہیں اٹھتی تھی کبھی کبھی کنکھیوں سے راہ چلتوں کو دیکھ لیتا تھا۔ کہ وہ مجھے اور میری شیروانی کو کن نظروں سے دیکھتے ہیں کبھی شریف پر ایک آدھ تنقیدی نظر ڈال لیتا تھا۔ واللہ! آج شریف اطلس کی شیروانی اور نئی ترکی ٹوپی میں کتنا پیارا معلوم ہو رہا تھا! چشم بد دور وہ آج بہت دلکش اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ کیوں نہ ہو؟ آخر میرا ہی بیٹا ہے۔ لوگ اسے پیار کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور یہ شعر میرے ورد زبان تھا ؎

نظر لگے نہ کہیں اسکے دست و بازو کو۔ یہ لوگ کیوں مرے لخت جگر کو دیکھتے ہیں

خدا اس کی عمر دراز کرے!

آپ کو معلوم ہے شریف حد سے زیادہ شریر ہے۔ راستہ تمام میں اس کو نصیحتیں کرتا رہا۔

میں نے کہا۔ شریف بیٹے۔ دیکھو مسجد میں شرارت مت کرنا۔ ادب سے بیٹھے رہنا اور دوسرے بچوں کو ستانا مت! اچھا؟ اور ہاں۔ بیٹا سنتے ہو! نماز کے وقت ادھر ادھر دوڑتے پھروگے

[1] افسوس ہے کہ میں ان کا نام ظاہر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انہوں نے مجھ سے اسکا وعدہ لیا ہے کہ اگر میں نے کسی طرح نام کا اظہار کر دیا تو ان سے کوئی برا نہ ہوگا۔

تو اللہ تمہیں مارے گا۔ سمجھے؟ اور دیکھو بیٹیا ....

"ابا یہ دیکھو۔" اس نے اٹھنی اور ایک روپیہ جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ اماں نے یہ روپیہ دیا ہے۔ اول تو بولیں میں تجھے عیدی نہیں دیتی۔ پر میں کب مانا؟ ضد کرنے لگا ــــــ اور یہ اٹھنی ماموں جان دے گئے۔ صبح میں ان کے پاس اور پیسے نہیں تھے۔ ورنہ میں اور جھگڑتا ان سے ــــــ اب آپ بھی لائیے عیدی۔ میں ضرور لوں گا۔ ہاں! آج بہت پیسے جمع کرنا ہیں۔ خالہ جان اور نانی اماں سے بھی لوں گا۔ اب آپ لائیے۔ ایک روپیہ سے کم نہ لونگا۔ ہاں!"

میں نے سوچا۔ یہ ماننے والی اسامی نہیں۔ روپیہ نہ دوں تو ایکدم سے زمین پر لوٹنے لگیگا۔ گدھے کی طرح اور نئے کپڑے سب ستیاناس کر ڈالیگا۔ میں اس کی فطرت سے خوب واقف ہوں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

شریف خوش ہو کر کہنے لگا۔ "آہا! لاؤ لاؤ! اچھے ابا ہیں ہمارے! اب اڑھائی روپے ہو گئے۔ کم از کم پانچ روپے آج ....؟"

"شریف! ان روپوں کا کیا کرو گے تم؟" میں نے پوچھا۔ "اُدھر لاؤ روپے میں رکھتا ہوں۔ ورنہ تم کھو بیٹھو گے ان کو۔ یا کوئی چھین لے گا۔ اوہر لاؤ۔" بولا۔ "واہ! کون چھینتا ہے! میں رکھونگا یہ روپے حفاظت سے۔ ایک فٹ بال خریدونگا میں اور ایک ......"

مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مجبوراً صحن میں بیٹھنا پڑا۔ نماز شروع ہونے میں ابھی پاؤ گھنٹہ باقی تھا۔ ایک مولوی صاحب جنکا جبہ ایسا ہی لمبا تھا جیسی ان کی داڑھی، ممبر پر کھڑے وعظ فرما رہے تھے۔ اور لوگوں کو نماز عید کی ترکیب بتلا رہے تھے۔ مگر قربان جائیے ہمارے مسلمان بھائیوں کی عقل کے کہ اتنا سمجھانے پر بھی نماز میں ایسی ایسی فاحش اور فاحش غلطیاں کرتے ہیں کہ مارے شرم کے مسجد کے حوض میں ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے کچھ لوگ تو ان مولوی صاحب قبلہ و کعبہ کا "وعظ بیان" سن رہے تھے۔ کچھ صحن میں پیچھے کی طرف بیٹھے مزے سے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ شاید گھر کے معاملات پر بحث ہو رہی تھی۔ کچھ حوض پر وضو کر رہے تھے ان میں سے کوئی غرارہ پر غرارہ کئے جا رہا تھا۔ کوئی کھنکار کھنکار کر خواہ مخواہ بلغم نکالنے کی سعی پیہم میں ہمہ تن مصروف تھا۔ کوئی پانی پہنچا کر ناک سے ایسے نغمے نکال رہا تھا کہ بے اختیار ہو کر داد کے طور پر اس شخص کو حوض میں دھکیل دینے کو جی چاہتا تھا۔ اور پھر گرجدار آواز میں قرات سے یہ پڑھنے کو۔ کہ فاعتبروا یا اولی الابصار!

خیر خدا خدا کر کے نماز شروع ہوئی۔ دوسرے اللہ کے بندوں نے تکبیروں میں غلطی کی ہو تو کی ہو۔ مگر میں قران کی قسم کھانے کو طیار ہوں کہ میں نے ہرگز ایک بار بھی غلطی نہیں کی۔ اور نہ مجھے اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت ہوئی۔ مسجد کے سناٹے کو صرف پیش امام صاحب کی قرآت توڑ رہی تھی۔ کہ یکایک ایسا معلوم ہوا گویا مسجد میں گائے بیل گھس آئے ہیں اور حوض پر پانی پینے کے لئے لڑ رہے ہیں۔ میری طرح اور دوسروں کی توجہ بھی اُدھر مبذول ہو گئی ہوگی۔ کیونکہ اس بلا کا شور برپا ہوا کہ خدا کی پناہ! غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک ذات بزرگ "وضو بنا رہے" ہیں۔ لاحول ولا قوۃ! یہ لوگ گھر سے وضو کر کے کیوں نہیں آتے؟ اور اگر بالفرض مسجد آتے آتے پھر وضو کرنے کی حاجت لاحق ہوئی تو خاموشی سے کیوں یہ فرض ادا کرتے نہیں۔؟ دوسروں کی نماز میں اس طرح خلل انداز ہونا کبھی ایک مستحسن فعل نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں تو میں کہ رہا تھا کہ حوض پر اس غضب کا شور ہوا کہ میں تو سمجھا کہ دو مگروں کی پانی میں زور دار جنگ ہو رہی ہے اور پھر دفعتاً "دھڑام" سے ایک ایسی آواز آئی۔ کہ میں اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ کیا وضو کرنے والے حضرت حوض میں گر تو نہیں پڑے؟ یا اللہ! بار بار جی میں خیال آیا کہ رکعت توڑ کر حوض کی طرف بھاگوں اور ان صاحب کو ڈوبنے سے بچالوں۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی معلوم ہوا کہ وہ حضرت صحیح سلامت ہیں۔ اور پانی کی وہ آواز حوض میں پاؤں ڈالکر دھونے کی تھی۔ خیر۔ رسیدہ بود بلائے وغیرہ وغیرہ۔

دوسری رکعت میں مجھے کھانسی معلوم ہوئی۔ میں نے ہر چند روکنے کی کوشش کی۔ مگر کمبخت کو نہ رکنا تھا نہ رکی۔ آخر میں کھانسا۔ آپ کو معلوم ہے ہندوستانیوں میں تقلید کا مادہ ضرور ہوتا ہے۔ ادھر میں کھانسا۔ اُدھر مسجد کے ایک گوشہ سے ایک صاحب نے

اس کا جواب دیا۔ پھر ایک اور ستم ظریف نے اس کا جواب الجواب اب تو کھانسی وبا کی طرح ساری مسجد میں پھیل گئی۔ ہر طرف سے "اخو! اخو! اوہنہ! اوہنہ!" وغیرہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ہر شخص کھانسنے میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کم بخت کھانسی اس طرح متعدی صورت اختیار کر جائیگی تو میں کبھی نہ کھانستا۔ اب مشکل یہ تھی کہ "ہشت" کر کے یا "خاموش! خاموش!" کا نعرہ مار کر ان نامعقولوں کو چپ کرانے والا کوئی نہ تھا۔ ایک ذات بزرگ نے تو حد ہی کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ کوئی کھانسنے کی ابتدا کرے۔ اور ادھر میں ساز نوازی شروع کروں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ وہ صاحب اتنا کھانسے اتنا کھانسے کہ دمہ کا کوئی کہنہ مریض بھی سنتا تو مارے حیرت کے عش عش کر اٹھتا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اس روز کھانسی کا میدان انہی کے ہاتھ رہا ـــــ غرض اس روز امام صاحب کی طرف غور سے کان لگا کر سننے کے بجائے اکثر لوگوں نے کھانسنے میں اپنے کمالات خوب خوب دکھلائے۔ کہ استغفر اللہ! مجھے بڑا ہی غصہ آیا۔ کچھ اس لئے کہ چند حضرات کی کھانسی مصنوعی تھی۔ اور کچھ اس لئے کہ اس عالمگیر کھانسی کا سلسلہ لامتناہی معلوم ہوتا تھا۔

خیر بڑی دیر کے بعد کھانسی تھمی۔ کھانسنے والے جوانمرد کھانستے کھانستے تھک گئے۔ کچھ دیر تک تو سکوت طاری رہا۔ مگر بہت جلد ٹوٹنے کے لئے۔ بچوں کو مسجد کے ایک گوشہ میں سب سے علیحدہ ایک صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ہمارے فرزند ارجمند بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ خدا جانے اس نئی پود کے گروہ میں کونسی بلا نازل ہوئی۔ کہ یکایک بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ایک بچہ رونے لگا۔ خدا خیر کرے! ایک آفت سے ابھی ابھی نجات ملی تھی۔ کہ ایک دوسری زیادہ خطرناک آپڑی سچ ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ اول اول تو اس لونڈے نے ہلکے ہلکے سروں میں رونا شروع کیا۔ مگر جب دیکھا کہ اس کے والد بزرگوار اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تو اس نے آہستہ آہستہ آواز بلند کی اور خطرناک حد تک بلند کی۔ خدایا میں تیرا کلام سنوں یا اس لونڈے کا رونا؟ ایک وقت میں دو کام مجھ سے نہیں ہوتے ـــــ غرض پیش امام صاحب خوش الحانی سے سورۃ پڑھتے رہے وہ نامراد روتا رہا اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

لونڈا صرف روتا ہی نہ رہا۔ بلکہ زبان سے کچھ کہتا بھی رہا۔ بلکہ گاتا بھی رہا۔ اس سے ہمیں بحث نہیں کہ قافیہ کیا تھا۔ البتہ ردیف یہ تھی۔ "ابّا۔ اماں کے پاس لے چلو۔ اوں اوں اوں! ابّا اماں کے پاس لے چلو۔ اوں اوں اوں" مگر سب سے اہم مقطع تھا۔ وہ کیا! "ابّا یہ پٹّا (لونڈا) مجھے مار رہا ہے۔ یہ دیکھو مجھے دھکیل رہا ہے"!

میں سمجھ گیا کہ مارنے والا لونڈا کون ہے۔ ہمارے فرزند دلبند کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ اس کی شرارت مسلم ہے۔ کونسا بچہ شریر نہیں ہوتا۔ مگر اکثر شریف کی شرارتیں خطرناک ہوتی ہیں اور اسی سے میں ڈرتا ہوں۔ اب مجھے یہ معلوم کر کے سخت کوفت ہونے لگی کہ اس نالائق کی شرارت یہاں بھی گل کھلا رہی ہے۔ دل میں بہت ہی خوفناک خیالات آئے۔ مگر میں مجبور تھا۔ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کم بخت ہوتے ہی نہ مرا۔ ٹھیر تو سہی۔ نماز کے بعد گھر چلکر اس کی چمڑی نہ ادھیڑ دوں تو میں اس کا باپ نہیں۔

نماز ختم ہونے تک وہ چھوکرا برابر روتا رہا۔ سلام پھیرتے ہی دو باپ اپنے اپنے بیٹوں کی طرف لپکے۔ ایک تو رونے والے بچے کو چمکار چمکار کر چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور میں شریف کی ران میں چپکے سے چٹکی لے کر اس کی طرف غصہ سے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میری شعلہ بار آنکھیں صاف طور پر یہ کہہ رہی تھیں کہ ٹھیر دبیٹا! باہر نکلو تو سہی۔ آج تیری ماں کی گود خالی نہ کر دوں تو میرا نام پلیٹ کر رکھ دینا خطبہ ختم ہوا دعا مانگی گئی۔ اس کے بعد لوگ "دین دین!" کا نعرہ مار کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور معانقہ اور مصافحہ کا بازار گرم ہوا۔ اس سے فارغ ہو کر میں شریف کو ساتھ لے کر دروازہ کی طرف چلا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ شریف کا پیٹنٹ لیدر والا نیا پمپ شو زندارد۔ ادہر دیکھا ادھر دیکھا۔ یہاں ڈھونڈا وہاں ڈھونڈا۔ شریف سے پوچھا۔ کہ "ابے! جوتا کہاں چھوڑا تھا؟" مگر سب بے سود کوئی بدمعاش جوتہ چرا لے گیا تھا۔ خدا اس چور سے سمجھے اور مسجد کے زیر سایہ حوالات چاہیئے

میں ابھی جوتا ڈھونڈ ہی رہا تھا۔ کہ دفعتاً ایک جگر خراش چیخ سنائی دی۔ اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں نے فوراً مڑ کر دیکھا۔ میری نظروں نے ایک ایسا دردناک منظر دیکھا کہ جس کا خیال کر کے اب بھی میرے رونگٹے بیٹھے بیٹھے کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہو ہو کر بیٹھتے ہیں

شریف حوض میں گر پڑا تھا!

میں سب تماشا اس طرف دوڑا۔ بہت سے لوگ بھی "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" کہتے ہوئے حوض کی طرف دوڑ پڑے۔ یا اللہ! اب کیا ہوگا؟ کیا میرا بچہ ڈوب جائیگا؟ مجھے بھی تیرنا نہیں آتا اور سب لوگ سوالات کی بوچھاڑ اور چیخ پیخ کر میرے ہاتھ پاؤں پھلائے دیتے تھے۔

"یہ کس کا بچہ ہے؟ ——— ارے ارے! کوئی اس کو نکالو بھئی دیکھو نا کیسی ڈبکیاں کھا رہا ہے؟ ——— یہ کیسے گر پڑا؟ ——— پاؤں پھسل گیا؟ ——— بھائی اسے حوض کی طرف جانے ہی کیوں دیا! ——— ٹھیرو ٹھیرو! گڑبڑ مت کرو! ——— ذرا آپ کا شملہ تو دینا —— بھئی اس واسطے تو کہتے ہیں کہ بچوں کو مسجد میں مت لے آؤ ——— خدا کے لئے اتنا شور مت کرو ——— لڑکا پریشان ہو رہا ہے۔ اللّٰہم صلّ علیٰ سیدنا.... ارے رے! اسکی اطلس کی شیروانی خراب ہوگئی ——— آہستہ آہستہ کھینچو حضرت ——— لاحول ولا قوۃ عجیب آدمی ہیں آپ" ——— غریب کی ناک میں پانی گھس گیا ہے ——— ڈرنا مت بیٹا ——— شاباش!

یہ حضرات تو اس طرح غل مچا رہے تھے اور میں رونی صورت بنائے کھڑا دعائیں مانگ رہا تھا۔ او ڈوبتوں کو بچانے والے خدا! (اس معصوم کی جان مت لے۔ اس کے عوض مجھ بدنصیب کی جان حاضر ہے۔

شریف کو پانی سے نکال لائے۔ سردی اور خوف کے مارے اس کے دانت بج رہے تھے۔ پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور "آچھین! آآآچھین!" کر کے بار بار چھینک رہا تھا۔ میں اٹھا کر اسے مسجد کے حجرہ میں لے گیا۔ نئی ترکی ٹوپی جواب نئی نہ رہی تھی۔ اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ شیروانی اور قمیض اور پاجامہ اتار کر ایک شال میں لپیٹ کر بٹھا دیا ایک رومال سے سر کے بال خشک کئے اب سوال یہ تھا کہ شریف کو گھر کس طرح لیجاؤں۔ اس ہیئت کذائی سے ساتھ لے جانا اپنے آپ کو ایک تماشہ بنانے کے مترادف تھا۔

صحن میں ایک شناسا نظر آئے، میں نے ایک چٹھی لکھ کر انہیں دی کہ گھر پہنچا آئیں۔ میں نے لکھا

شریر شریف کی اماں! خدا تمہیں نیک توفیق دے! تمہارا لال حوض میں گر پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈوب نہ مرا۔ تمہارے بیجا لاڈ و پیار نے مجھے آج یہ روز بد دکھایا۔ محبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں ہزار بار کہتا رہا ہوں کہ تمہاری وجہ سے بچہ بگڑ رہا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ لاتوں کا بھوت باتوں سے نہیں مانتا اور چمار کے دیو کو جوتی کی پوجا وغیرہ۔ مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ آج تم نے اور مسجد والوں نے اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ میں خواہ مخواہ رسوا ہوگیا۔ خدا مجھے اس کا اجر دیگا۔ اب بھی تم لاڈو پیار کے نقصان کو محسوس نہیں کرتیں تو چند سال اور ٹھیر جاؤ۔ شریف کی بیوی آنے تک۔ تمہارے بیٹے نے تمہیں اگر گھر سے نکال باہر نہ کیا تو میری مونچھیں مونڈ دینا!

تمہارے نور نظر نے اطلس کی شیروانی، ریشمی قمیض، نیا پاجامہ، نئی ترکی ٹوپی، غرض سب کچھ ستیاناس کر ڈالا ہے۔ نیا جوتا کوئی بدمعاش اٹھا لے گیا۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔ تم دونوں نے مل کر مجھے خوب راحت پہنچائی ہے! تمہارے اور تمہارے کلیجہ کے ٹکڑے کے واسطے میں فضول اپنی اوقات ضائع کر رہا ہوں ——— اور قسم ہے اس خدائے قدوس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ میں آئندہ تمہارے چاند کے لئے موٹے کھدر کی قمیض اور ٹاٹ کی شیروانی بناؤنگا۔ جب شریف کے ننھیال کے

توگویا قیمتی اور فوق البھڑک لباس پہننے کا سلیقہ آجتک نہ آیا۔
توپھر اس نامعقول لونڈے سے اطلس کی شیروانی اور ریشم کی قمیض احتیاط اور تمیز سے پہننے کی توقع رکھنی فضول اور بالکل فضول ہے۔

مطلب کہنے کا یہ کہ شریف کا پرانا جوتا، ٹوپی اور شیروانی قمیض اور پائجامہ جلد از جلد روانہ کرو۔ شریف ٹھنڈ کے مارے ٹھٹھر رہا ہے اور وہاں! عید مبارک! فقط والسلام

تمہارا سرتاج: شرف"

قاصد کو روانہ کرنے کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آج میرا کتنا نقصان ہوا۔ ذیل میں میں نے حساب کیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

	روپے	آنے	پائی
شیروانی اطلس کی (بحساب آٹھ روپیہ چار آنہ فی گز) معہ سلائی وغیرہ	۱۸	۱۲	×
قمیض ریشم کی (بحساب دس روپیہ چار آنہ فی گز) معہ سلائی و بٹن وغیرہ	۶	۵	۴
پائجامہ ہرک کا (بحساب ساڑھے بارہ آنہ فی گز) معہ سلائی و ریشمی ازاربند وغیرہ	۲	۱۴	۱۰
ترکی ٹوپی معہ پھندنا وغیرہ	۶	۹	۷
پمپ جوتہ معہ پائتابہ و گارٹر وغیرہ	۸	۷	۱۱
میزان:-	۴۴	۱۰	۶

دیکھا آپ نے! ایک وقت مجھ غریب کے چوالیس[1] روپے ساڑھے دس آنے کا نقصان ہوگیا۔ گویا میں نے یہ روپے پانی میں بہادیئے۔ مگر نہیں مجھے رنج نہ کرنا چاہیئے۔ میں ہمیشہ ایک صابر اور شاکر انسان رہا ہوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ شریف کی جان کا صدقہ تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ صاحب کپڑے لے آئے۔ معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ یہ دہشت اثر خبر سنتے ہی بہت پریشان ہوئیں۔ اور ٹانگہ کے ذریعہ مسجد آکر اپنے لخت جگر کو ساتھ لیجانے کا ارادہ ظاہر بھی کیا۔ اور ملازم کو ایک بکرا لے آنے کیلئے کہہ بھی دیا ہے۔

شریف کو پرانے کپڑے پہنا دیئے گئے۔ وہ اب تک گھبرایا ہوا تھا۔ شرارت وہ اب رفو چکر ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں اب شریف کبھی تیرنا نہ سیکھ سکیگا۔ اس کے دل پر ہمیشہ کے لئے پانی کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

باہر نکل کر شریف بھیگی ہوئی اطلس کی شیروانی کی جیبوں میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ آخر تنگ آکر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "ابا۔ وہ اڑھائی روپے کیا ہوگئے؟ میری عیدی؟" میں نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم؟ جیب میں دیکھو۔ اچھی طرح۔"

کہنے لگا۔ "نہیں ہیں ابا۔ بولو ابا۔ میری عیدی کون لے گیا؟ میرے اڑھائی روپے کیا ہوئے۔ ابا؟"

مگر میں سمجھ گیا تھا۔ "بیٹا حوض میں گر پڑے ہوں گے روپے۔ خیر جانے دو۔ فکر مت کرو۔ گھر چلکر میں تمہیں روپے دوں گا بیٹا۔ اچھے بچے ہو نا! اب چلو"

باپ بیٹا گھر کو چلے۔ بیٹا اپنے ڈوبے[2] ہوئے روپوں کا ماتم کرتے ہوئے۔ اور باپ بیٹے کو صبر کی تلقین اور عیدی کی یاد کر کے رونی آواز بنا کر باتیں کرنے سے باز رکھتے ہوئے

میں نے سوچا جہاں چالیس ساڑھے دس آنے کا نقصان ہوا وہاں ان اڑھائی روپوں کی کیا حقیقت ہے؟ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ ہر کاروباری آدمی عالمگیر کساد بازاری کا رونا رو رہا ہے۔ مجھے اپنے اس مالی خسارہ کا کوئی خیال نہ کرنا چاہیئے لیکن میں نے قسم کھالی تھی کہ آئندہ کبھی شریف کو سہرا مسجد کو نہ لاؤنگا۔ مگر میں نے مسجد سے روانہ ہونے سے قبل موذن صاحب سے رازدارانہ لہجہ میں کہہ دیا ہے کہ جب حوض صاف کرانے کی غرض سے خالی کیا جائے تو اسے سب سے پہلے

[illegible]

---

[1] میں اپنے کالج میں ریاضی کا بہترین طالب علم رہا ہوں۔ اس لئے اس حساب میں کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔ یقین نہیں آتا تو آپ جوڑ کر دیکھ لیجئے!

[2] مجھے یقین کامل ہے کہ بعض منچلے ناظرین مضمون پڑھنے کے بعد سب سے پہلے مسجد کے حوض میں ڈوبے ہوئے روپیوں کو کسی طرح حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر میں ان سے زیادہ چالاک ہوں۔ میں نے اس مسجد کا نام کہیں نہیں بتلایا ہے۔

از قلم صفیہ عزیز بیگم

عید الفطر کی خوشی

از جناب محمد حسن مہدی صاحب مجلسی لکھنوی

(۱) جہاں میں آج ہر طرف مسرّت و نشاط ہے
ہجومِ لطف و عیش ہے وفورِ انبساط ہے
کرے دلوں سے آج دور لذّتِ سرور کو
یہ غم کی کیا بساط ہے

(۲) جو دل تھے وقفِ رنج و یاس وہ بھی اب تو شاد ہیں!
جو غم نصیب تھے جہاں میں وہ بھی بامراد ہیں!
کسے مجال جو مٹائے عیش کے وفور کو
کہ شاد غم نژاد ہیں

(۳) اگرچہ عید فطر کی خوشی جہاں میں عام ہے
ہر ایک قلب مومن آج کتنا شادکام ہے
مگر حقیقۃً ہے عید، عید روزہ دار کی
یہ برکتِ صیام ہے

(۴) اٹھو یہ کیسی کاہلی ہے غم کو دل میں جا نہ دو
نوید عیش و مژدۂ طرب انہیں سنا نہ دو
جنہیں لگی تھی سال بھر سے آس، اس بہار کی
انہیں خوشی دکھا نہ دو

(۵) یہ عید عیدِ فطر ہے یہ عیدِ مومنین ہے
ہر ایک دل میں انبساط اب تو جاگزین ہے
نکال دیجے آج تو ہجومِ رنج و یاس کو
دلوں میں گر مکین ہے

(۶) چہل پہل تو دیکھئے عجب ہی عیدگاہ میں
نہیں رہا ہے کوئی فرق عامی اور شاہ میں
خدا نے دی ہیں عشرتیں جو قلبِ حق شناس کو
کھٹکے نہ کیوں نگاہ میں

(۷) وہی ہیں مسلم آج جن کو عید کی خوشی ہوئی!
وہی ہیں مومن آج جن کو نعمتِ طرب ملی!
رکھے مہِ صیام میں جنہوں نے روزے تیس دن
صلہ ہے ان کا یہ خوشی

(۸) ہر اک امیر اور غریب آج باغ باغ ہے
سکوں ہے دل کو اور جگر کو حاصل اب فراغ ہے
قلوب مومنین کے ہیں کتنے شاد و مطمئن
نہ درد ہے نہ داغ ہے

(۹) خوشا وہ دل کہ جو غریب ہو کے بھی امیر ہو
ہے اپنے گھر کا بادشاہ گو کہ وہ فقیر ہو
اسی کو کہتے ہیں خوشی، یہ ہے امیر و شہی
کہ مطمئن ضمیر ہو

(۱۰) خوشا وہ جس کی زندگی ہے وقفِ طاعتِ خدا
وہ جس کا مقصدِ حیات ہے رسول کی رضا
وہ جس نے پورے روزے رکھ کے اس مہِ صیام میں
کیا ہے فرضِ دیں ادا

(۱۱) وہی ہے بندۂ خدا جو وقفِ بندگی رہے
خدا کی راہ میں بہے جو اس کا خون وہ ہے
خلوصِ قلب سے مگر رہے خدا کے کام میں
ہزار مشکلیں سہے

دو گز زمین!

بڑی بہن چھوٹی کے یہاں مہمان تھی۔ وہ آج ہی شہر سے آئی تھی اس کا شوہر تاجر تھا اور چھوٹی کا ایک کسان۔ بڑی بہن شہر کی گوناگوں دلچسپیوں مثلاً مہذب سوسائٹی کھیل تماشے عمدہ لباس تھیٹر وغیرہ کے بیان میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہی تھی۔

چھوٹی کا دل ان نعمتوں سے محروم ہونے کے باعث رنجیدہ تو ضرور تھا لیکن اس نے یہ کہ کر دھارس بندھائی کہ بہن۔ یہ سب کچھ تو ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں اطمینان قلب میسر نہیں۔ کیونکہ تجارت مثل جہاز کے ہے جو ایک طوفان خیز سمندر کی ناہموار سطح پر تھپیڑوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہو نہ معلوم کب ایک آسمان سے باتیں کرتی ہوئی موج اٹھے اور اس جہاز کو تھپک کر سمندر کی تہ میں ہمیشہ کے لئے سلا دے۔ لیکن اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا کہ اگر جہاز سمندر کا سینہ چاک کرتا ہوا ساحل مقصود پہ آ لگے تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ مگر اس کے لئے ایک تجربہ کار اور گرگ باراں دیدہ ناخدا کی ضرورت ہے"

"رہنے دو ان باتوں کو" بڑی نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "ہر چیز میں خطرہ ہے" سمندر کی تہ میں غوطہ لگاتے ہیں تو موتی گلے کا ہار ہوتا ہے دنیا میں سود و زیاں پہلو بہ پہلو ہیں"

چھوٹی کہنے لگی۔ میرا مقصد یہ تھا کہ تاجر خواہ کتنا ہی دولتمند کیوں نہ ہو اس کے دیوالیہ ہونے کا ہر آن امکان ہے۔ آج جو لاکھوں کے مالک ہیں وہ کل کساد بازاری یا کسی اور وجہ سے ممکن ہے کہ پھوٹی کوڑی کو محتاج ہو جائیں"

"خوب!" بڑی بہن نے طنزاً کہا۔ کیا زراعت میں اس قسم کا اندیشہ نہیں ہے؟ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اس میں نقصان کا سب سے بڑھ کر امکان ہے۔ بارش نہ ہو تو قحط پڑتا ہے اور اگر زیادہ ہو جائے تو فصل خراب۔ مزدور کام نہ کریں جانور کھیت چر جائیں، ٹڈیاں چگ جائیں یا کوئی اور بلائے آسمانی نازل ہو تو کسان فاقوں مرنے لگیں —— کہو ہے کہ نہیں؟"

چھوٹی بہن کا شوہر کریم جو اب تک خاموش بیٹھا سن رہا تھا، کہنے لگا۔ "دیکھو میں نے بچپن سے کھیتی باڑی کی۔ اس لئے مجھے ان تمام اندیشوں سے خوب سابقہ پڑ چکا ہے —— لیکن میرا دعوےٰ ہے کہ اگر میرے قبضہ میں پچاس ایکڑ زمین ہو جائے تو میں اندیشوں کو خاطر لانا کجا شیطان کی بھی پرواہ نہ کروں"

شیطان بھی اتفاقاً اسی محفل میں کچھ فاصلہ پہ بیٹھا یہ گفتگو سن رہا تھا کریم کا یہ چیلنج جو سنا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ دل میں کہا۔ "آدم نے لاکھوں ایکڑ زمین پر خوشحال زندگی بسر نہ کی بھلا یہ ناخلف اولاد آدم کیا کچھ کر سکیگا۔ چھوٹا منہ بڑی بات —— اچھا! ہم اسے بہت سی زمین دیں گے۔ مگر فوراً ہی واپس لے لیں گے، اس طرح کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو"

(۲)

اسی گاؤں میں ایک عورت سو ایکڑ زمین کی مالک تھی۔ بعض مشکلات نے اسے زمین بیچ دینے پر مجبور کیا۔ پٹیل اس زمین کو سستے داموں خریدنے پر آمادہ تھا۔ یہ آس پاس کے کسانوں کے لئے بہت مضر تھا۔ کیونکہ پٹیل سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے مزدور

کم اجرت پر فراہم کر کے اچھا غلہ اگا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں کو جبر و تشدد کا بہت اندیشہ تھا۔ اس لئے تمام گاؤں والے ایک روز جمع ہوئے اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح پٹیل کو زمین خریدنے سے باز رکھا جائے۔ ایک نے رائے دی کہ کیوں نہ ہم سب چندہ جمع کر کے اس زمین کو خرید لیں۔ سبھوں نے یہ تجویز پسند کی اور مالکہ کو سمجھایا کہ ہم پٹیل سے زیادہ رقم دینے پر آمادہ ہیں۔ مالکہ کا اس میں کیا حرج تھا؟ وہ راضی ہو گئی۔

چندہ جمع ہونا شروع ہوا۔ لیکن کسی وجہ سے مقررہ روپے فراہم نہ ہو سکے۔ اس لئے اعلان کر دیا گیا کہ ہر شخص اپنی اپنی بساط کے موافق تھوڑی تھوڑی زمین مالکہ سے خرید کرے۔ اس طرح شاید پٹیل کے پنجے سے بچ سکیں

دوسرے روز ہر شخص اپنی اپنی تھیلی سنبھالے مالکہ کے مکان پر گیا۔ کسی نے دو ایکڑ کسی نے چار، کسی نے چھ، غرض ہر شخص اپنی مقدور کے مطابق زمین خریدنے لگا۔ یہ دیکھ کر کریم کو بھی شوق ہوا۔ اپنی بیوی کے پاس آیا اور کہنے لگا "دیکھو، سب لوگ تھوڑی بہت زمین خرید رہے ہیں۔ ہم بھی کیوں نہ خرید لیں؟

بیوی نے اپنا پورا زیور لا کر سامنے رکھدیا۔ کریم خوشی خوشی گاؤں کی طرف چلا ساہوکاروں کے ہاں زیور گروی رکھا رقم لے اس عورت کے گھر پہونچا اپنی زمین سے ملی ہوئی دس ایکڑ زمین اس نے بھی خرید لی اب وہ بہت خوش تھا۔ دن بھر ہل چلانے، دانے بکھیرتے اور پانی دینے میں مصروف رہتا۔ رات تمام اپنی زراعت کو ترقی دینے اور نئی نئی ترکیبیں سوچنے میں کاٹ دیتا۔ اس کی محنت رائیگاں نہ گئی ہر سال دس ایکڑ زمین خریدتا۔ یہاں تک کہ چند ہی برسوں میں وہ پچاس ایکڑ کا واحد مالک ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو ایک چھوٹا رئیس سمجھنے لگا

(۳)

کریم کی قسمت کا آفتاب اب نصف النہار پر تھا۔ اس کے بعد زوال لازمی تھا۔ نہ معلوم مزدوروں میں کیوں نفاق پیدا ہوا؟ ایک روز کھیت پر خوب کشت خون ہوا۔ ایک کا ہاتھ ٹوٹا۔ دوسرے کی ٹانگ، تیسرے کی پیٹھ میں چوٹ آئی، اور چوتھے کا سر پھٹ گیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مزدور دوسری صبح کام پر نہ آئے اور جو مزدور کام پر آئے ان میں دو گروہ ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے۔ بات بات پر آپس میں لڑ پڑتے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کام خراب ہو گیا۔ کئی دن گذر گئے مگر کھیت کی جتائی ختم نہ ہوئی۔

یہ حال دیکھ کر ایک دن کریم ان کو ڈانٹنے لگا۔ "یہ آخر تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ صبح سے شام تک بس لڑنے جھگڑنے کے سوا اور کچھ کام نہیں۔ چاہے ہمارا کام رک کیوں نہ جائے دیکھتے نہیں ہو کہ دوسرے کھیتوں میں بالشت بالشت بھر پودے اُگ آئے ہیں۔ اور ہمارے یہاں ابھی جتائی ہی ختم نہیں ہوئی۔ دیکھو میں تم کو آخری بار تاکید کرتا ہوں کہ اگر تمہاری یہی سستی اور لاپروائی رہی تو میں بری طرح پیش آؤں گا۔"

تنبیہ کا اثر نہ ہوا تو کریم نے مزدوری دینی بند کر دی۔ مزدور اب آپس میں جھگڑنے کے بجائے کریم کے خلاف متحد ہو گئے۔ انہوں نے اس کے یہاں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ گاؤں کے دوسرے مزدوروں میں بھی پروپیگنڈا کیا کہ کوئی اس کے پاس کام نہ کرے۔ غرض اب کے فصل پوری ہڑتال میں گذر گئی جس کی وجہ سے کریم کی ساری زمین خشک پڑی رہی اور بہت سے مویشی ہلاک ہو گئے۔

ایک روز کریم باہر چبوترے پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اور اپنا خشک کھیت دیکھ کر آہ آتشین کھینچ رہا تھا کہ ایک مسافر اس کے یہاں شب باشی کے لئے آیا۔ کریم نے خوش آمدید کہا۔ کھانے پینے سے فراغت پا کر ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ دوران گفتگو میں اس نے نوکروں کی بے ایمانی اور اپنی تباہی کا ذکر کیا

مسافر نے کہا۔ "میری بات سنو اور سب زمین بیچ کے نگر عجیب آباد کا رخ کرو۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں اور سچ کہتا ہوں کہ وہاں کی زمین زیادہ سرسبز و شاداب ہونے کے علاوہ سستی بھی ہے آب و ہوا خوشگوار ہے اور مزدور اطاعت گذار ہیں۔"

"خیر۔ یہاں نہ سہی عجیب آباد ہی سہی۔ ہماری قسمت شاید وہاں چمک جائے۔" کریم نے دل میں کہا۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مسافر سے پوچھا "نگر کدھر ہے؟ — یہاں سے کتنا فاصلہ ہوگا؟"

شمال کی طرف ــــ فاصلہ تقریباً پچھتر میل ہوگا۔ مسافر نے جواب دیا۔

بیوی سے مشورے کے بعد کریم اپنی زمین بیچدینے کی فکر کرنے لگا۔ زیادہ دن نہ گذرے کہ ایک خریدار خاطر خواہ معاوضہ پر خریدنے کے لئے تیار تھا۔

(۴)

کریم زمین بیچکر بیوی بچوں کے ساتھ مسافر کے بتائے ہوئے راستہ پر عجیب آباد کے خیال میں چلا۔ تین روز بعد وہ منزل مقصود پر تھا۔ گاؤں کے پٹیل کے یہاں پہونچکر اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ پٹیل نہایت اخلاق سے پیش آیا اور اپنا رجسٹر دیکھ کر کہا کہ پچاس ایکڑ زمین فروخت شدنی ہے جو باریک چاول پیدا کرنے میں اپنی آپ نظیر ہے۔

"پچاس ایکڑ خریدنے کے لئے میرے یہاں روپیہ کافی نہ ہوگا"

اس نے خیال کیا لیکن حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ نہ صرف زمین بلکہ وہ اسی رقم میں مویشی اور ضروری سامان بھی خرید سکتا ہے

"مسافر سچ کہتا تھا کہ زمین بے حد ارزاں ہے" اس نے دل میں کہا اور زمین کو دیکھنے کے بعد خوشی خوشی خرید لیا۔ مزدور اور جانور بھی فوراً مل گئے۔ زمین کی جتائی شروع ہوئی۔ اور چرخ کے ذریعہ سے گہری باولیوں سے پانی نکالنے کا انتظام ہوگیا

مزدوروں کی جانفشانی اور کریم کی نگرانی سے چند ہی دنوں میں کھیتی ہری بھری ہوگئی۔ اس کے دیکھنے سے آنکھوں سے نور اور قلب کو سرور پہونچتا تھا۔ اپنی امیدوں کی کھیتی یوں لہلہاتے دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہوگیا

پودے زردی مائل ہوئے اور دانے پک گئے تو فصل کاٹی گئی۔ امیدوں سے بڑھ کر اور حوصلہ سے چڑھ کر فائدہ ہوا۔ اپنی عمر میں اس نے ایسے نفیس اور باریک چاول نہ دیکھے تھے۔ دور دور سے لوگ آتے اور منہ مانگی قیمت دیکر لے جاتے

دوسرے سال بھی حسب سابق انتظام اور اہتمام عمل میں آیا۔ فصل پکی اور کاٹی بھی گئی۔ چاول پچھلے سال جیسے عمدہ نہ تھے۔ خریدار آئے اور چاول دیکھے۔ ایک نے پوچھا۔ "بابو۔ یہ چاول گذشتہ سال جیسے نہیں معلوم ہوتے" دوسرے نے کہا۔ "یہ نہیں دوسرے عمدہ چاول بتاؤ" تیسرا منہ بنا کر بولا۔ "یہ تو بہت کم داموں کے ہیں" پانچویں نے "ایسے چاول تو ہمارے گاؤں میں مل سکتے ہیں۔ ہم نے اتنی دور ناحق تکلیف کی"۔ کریم کو اس دفعہ ایک پائی کا فائدہ نہ ہوا۔

تیسرے سال اس نے غیر معمولی محنت کی فصل تیار ہوئی۔ کٹائی کے لئے ایک ہفتہ باقی تھا۔ انہیں دنوں گاؤں کے میلہ میں ہزاروں جانور فروخت کے آئے تھے ایک رات نہ معلوم کس طرح سینکڑوں مویشی باڑ توڑ کر کھیت میں گھس پڑے۔ رکھوالیوں کی ممکنہ کوشش کے باوجود جانوروں نے رات کی رات میں سارا کھیت تباہ کر ڈالا۔

دوسرے روز کریم اپنی قسمت پر رو رہا تھا کہ ایک تاجر جو میلہ میں آیا ہوا تھا اس سے کہنے لگا۔ "دوست جو کچھ ہونا تھا سو ہوگیا۔ اب افسوس کرنے سے کیا فائدہ؟ میری رائے تو یہ ہے کہ فوراً زمین اور جانور جو کچھ بھی تمہارے پاس ہوں ان سب کو بیچ ڈالو اور سیدھا حسرت پور کا رخ کرو۔ وہاں کے پٹیل کو تھوڑی سی رشوت دیدو۔ اور کچھ تحائف لوگوں میں یونہی تقسیم کرو۔ بس میں تم کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ تمہیں اس سے اچھی زمین اور پھر کم داموں میں مل جائے گی"

"کتنی دور ہے؟" کریم نے پوچھا۔

"تقریباً پچیس میل" تاجر نے جواب دیا

(۵)

تاجر کے مشورے سے کریم نے زمین اور مویشی بیچ دیئے۔ بیوی بچوں کو عجیب آباد ہی چھوڑ دیا اور خود ایک ملازم کے ساتھ کچھ تحفے اور روپیہ لے کر حسرت پور کا رخ کیا۔ خیال یہ تھا کہ پہلے زمین اور مکان کا بندوبست کرلے تو پھر بال بچوں کو بلا کر مستقل سکونت اختیار کرے۔

دوسری صبح وہ حسرت پور میں تھا۔ نووارد کو دیکھ کر لوگ جوق در جوق گرد جمع ہونے لگے کریم نے تحائف نہایت فراخدلی سے تقسیم کئے۔ ان عنایتوں پر وہ بیحد خوش ہوئے اور ہر شخص اس کو اپنے گھر مہمان ہونے کی دعوت دینے لگا۔ بہت اصرار کے بعد کریم اور اس کا ملازم ایک شخص کے یہاں مہمان ٹھہرے۔ انڈا۔ دودھ۔ مرغی۔ دہی غرضیکہ ہر



[illegible]

چیز سے اس کی تواضع کی گئی۔

"میرا ارادہ یہاں مستقل قیام کا ہے" کریم نے دوران گفتگو میں کہا "اس لئے مجھے تھوڑی سی زمین درکار ہے جو کچھ معاوضہ ہو میں دینے کو تیار ہوں۔"

"جتنی چاہیں آپ خرید سکتے ہیں۔" یک نے کہا۔

"لیکن پٹیل سے مشورہ ضروری ہے" دوسرے نے اضافہ کیا۔

عین اس وقت ایک موٹا سا شخص گھوڑے پر سوار ادہر آنکلا۔ گھوڑے کے ساتھ بہت سے لوگ پیدل چل رہے تھے ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر وہ رکا۔ تو لوگوں نے کریم سے کہا

"یہی ہیں پٹیل صاحب"

وہ گھوڑے سے اترا تو کریم نے ایک تھیلی روپوں سے بھری ہوئی اس کی نذر کی جس کو جیب میں رکھتے ہوئے اس نے کہا "اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی؟" لوگوں نے سمجھایا کہ کریم صاحب ایک خلیق اور مہربان آدمی ہیں اور یہاں کچھ زمین لے کر مستقل سکونت چاہتے ہیں "ضرور خریدیئے۔ ضرور خریدیئے" پٹیل نے کہا۔ "زمین پسند فرمالیجئے"

"مگر قیمت؟" کریم نے کہا۔

پٹیل مسکرایا۔ "پانچسو روپے فی یوم" اس نے کہا۔

"فی یوم؟ یہ کوئی نیا پیمانہ معلوم ہوتا ہے مجھے تو گز، بیگہ، ایکڑ وغیرہ یاد ہیں" کریم نے دل میں کہا۔

کیوں؟ پٹیل نے کریم کو خاموش دیکھ کر پوچھا "کیا آپ کو تامل ہے؟"

"معاف فرمایئے" کریم بولا "میں اس پیمانہ سے واقف نہیں ہوں براہ کرم ایکڑوں کا حساب لگایئے"

پٹیل سمجھانے لگا۔ "سنیئے ہمارے یہاں ایکڑ کا حساب نہیں ہے یوم سے مطلب یہ ہے کہ صبح سے شام تک آپ جتنی زمین پر چل سکیں اس کی قیمت پانچ سو روپیہ ہوگی" —— "دن بھر میں تو آدمی کئی میل چل سکتا ہے" کریم نے تعجب سے پوچھا۔

"بس جتنے میل بھی آپ چل سکیں وہ آپ کے ہیں" پٹیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن ٹھیک طور سے تصفیہ کیسے ہوگا؟" کریم نے دریافت کیا۔

پٹیل نے کہنا شروع کیا "دیکھیئے آپ زمین پسند کر لیجئے اور سورج نکلتے ہی ایک مقام سے چل کھڑے ہوں۔ وہاں ہم نشان لگا دیں گے کچھ آدمی گھوڑے پر آپ کے ساتھ ساتھ چل نکلیں گے۔ جہاں جہاں آپ فرمائیں وہاں وہ جھنڈیاں لگاتے جائیں گے۔ شرط یہ کہ آپ سورج ڈوبنے سے پہلے اسی مقام پر پہنچ جائیں۔ جہاں سے آپ نے چلنا شروع کیا تھا ورنہ قیمت جو آپ کو پیشگی ادا کرنی ہوگی واپس نہ مل سکے گی"

کریم راضی ہوگیا۔ مقام پسند کرلیا اور دوسری صبح اس عجیب و غریب طریقہ پر زمین حاصل کرنے کا تہیہ کرلیا۔

(۶)

کریم بستر پر لیٹا تو یہ خیالات رہ رہ کر اس کے دل میں سمانے لگے۔ کل قسمت کا فیصلہ ہے۔ اگر میرے پاؤں نے مدد کی تو پینتیس چالیس میل کا چکر ضرور کاٹوں گا۔ بس ایک دن کی محنت ہے۔ پھر چین ہی چین۔ عمدہ زمین تو میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ کتنی زرخیز۔ کتنی ہموار —
اس کا دماغ رات بھر ان ہی خیالات کا آماجگاہ بنا رہا۔

رات آنکھوں میں کٹی پچھلے کی خنکی سے غنودگی طاری ہوئی اور اس نے ایک خواب دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا ہے۔ یکایک ہنسی قہقہہ کا ایک غلغلہ بلند ہوا۔ وہ باہر نکلا۔ درخت کے سایہ میں شخص بیٹھا قہقہے لگا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ حسرت لو اندام پٹیل ہے۔ کریم قریب گیا اور دریافت کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس چیز نے یوں بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ پٹیل نہیں بلکہ وہ تاجر ہے جس نے عجیب آباد میں اس زمین کا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا تم وہی شخص نہیں نے مجھے یہاں بھیجا؟ کہ وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہ تاجر نہیں بلکہ وہ مسا جس نے کریم کو اپنے گاؤں سے عجیب آباد منتقل ہونے کی صلا وہ متحیر تھا کہ معلوم ہوا کہ نہ تو وہ تاجر ہے نہ مسافر اور نہ پٹیل شیطان ہے۔

"وہ مجھے کیوں دیکھ رہا ہے اور کیوں ہنس رہا ہے؟"!

دل میں سوال کیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور پوچھنا چاہتا تھا۔ کہ ایک شخص اس کی بجائے زمین پر چت پڑا نظر آیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ غور سے دیکھا تو وہ شخص خود کریم تھا۔

اس نے بے ساختہ ایک چیخ ماری جس سے آنکھیں کھل گئیں وہ اٹھا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ سحر کے ہاتھوں شب کا گریبان چاک ہو رہا تھا۔ "بس اب۔ مجھے تیاری میں مشغول ہو جانا چاہیئے" اس نے کہا؛

(۷)

کریم نے اپنے نوکر کو جگایا اور کہا کہ جا کر پٹیل سے کہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقررہ مقام پر جلد سے جلد آجائے۔ نوکر گیا تو خود تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ منہ ہاتھ دھو، ناشتہ کر، کپڑے پہننے لگا ایک گرم ٹوپی اوڑھ لی تاکہ کان ہوا کے سرد جھونکوں سے محفوظ رہ سکیں۔ موٹی سی اچکن پہن لی کہ جسم کو سردی نہ چھوئے اور بھاری کیلدار بوٹ پہن لی تاکہ کانٹے اور پتھر تکلیف نہ دیں۔

اس کے بعد وہ تیزی سے مقررہ مقام پر پہونچ گیا۔ جہاں پٹیل اور دوسرے گاؤں والے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"دیکھئے" پٹیل نے کہا۔ "یہاں سے آپ کو اپنا سفر شروع کرنا ہوگا اس حلقہ میں روپوں کی تھیلی رکھ دیجئے۔ آپ کا نوکر۔ دوسرے گاؤں والے اور میں یہاں بیٹھے آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ اور ہاں یہ یاد رہے ناکہ اگر آپ غروب آفتاب سے پہلے پھر اسی مقام پر نہ آئے تو ایک پائی بھی آپ کو نہ ملے گی۔"

کریم نے روپوں کی تھیلی رکھدی کمر ہمت چست باندھ۔ تھوڑی سی روٹی پاس رکھ لی گلے میں پانی کی چھاگل ڈالی اور مشرق کی طرف منہ کر کے سورج کی پہلی شعاع کا انتظار کرنے لگا —— یہ معرکہ دیکھنے کے لئے گاؤں کا گاؤں ٹوٹ پڑا تھا۔ ادہر آفتاب نے چہرہ سے لحاف ہٹائی ادہر کریم چل پڑا۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ وہ نہ تیز نہ آہستہ بس معمولی رفتار سے جا رہا تھا۔ ایک میل چلنے کے بعد اس نے ایک جھنڈی لگانے کو کہا اسی طرح تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلہ پر جھنڈیاں لگواتا چل رہا تھا۔ اب آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا۔ اس نے گرمی محسوس کی۔ اس نے گرم ٹوپی اتار دی۔ ایک پہر ڈھلا تو وہ دس میل چل چکا تھا۔ "رفتار خاصی ہے" اس نے خیال کیا۔ درخت کے نیچے دم لینے کے لئے کچھ دیر بیٹھ گیا۔ پانی پیا اور پھر چلنے لگا۔

آفتاب سر پر تھا۔ اور تمازت کی وجہ سے پسینہ آنے لگا تھا گھنیری چھاؤں میں بیٹھا جیب سے روٹی نکالی۔ اور کھا پی کر پھر چل پڑا لیکن موٹی اچکن کی گرمی اب ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے اتار دی اور چل کھڑا ہوا۔ "غالباً بیس میل چل چکا ہوں" اس نے خیال کیا "چکر پورا کرنے کے لئے مجھے اب رخ بدلنا چاہیئے" وہ بائیں جانب مڑا۔

"کتنی عمدہ زمین ہے۔ گیہوں خوب اگیں گے" اس نے دل میں خیال کیا۔ "آؤ چلتے چلتے اس کا بھی احاطہ کر لوں" —— آہا۔ اس پر جوار خوب اگے گی۔ کیوں نہ اس کو بھی قبضہ میں کر لوں؟"

(۸)

سہ پہر کا وقت آگیا۔ کریم کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ جوں جوں پانی پیتا گیا پیاس اور بھی بڑھتی گئی۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا پیٹھ اکڑ گئی۔ اور جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا۔

"آوہ! وقت بہت کم رہ گیا اور منزل ابھی بہت دور ہے سورج میرے لئے تھوڑا ہی ٹھیرے گا! مجھے اب پوری قوت سے کام لینا چاہئے بس تھوڑی دیر کی زحمت اور پھر عیش مدام" یہ خیالات یکے بعد دیگرے اس کے دماغ میں گھومنے لگے۔

اس نے بوٹ اتار دی اور نعرہ لگایا کہ "المدد اے ہمت مردانہ!" اور دوڑنا شروع کیا۔ "اُف! بڑی دور ہے پہونچنا مشکل ہے" اس نے خیال کیا اور نہایت تیزی سے بھاگا۔ منزل مقصود قریب تھی لیکن وقت بالکل تنگ تھا۔ گاؤں والے ہمت بڑھا رہے تھے۔ ایک کہتا بس دو میل اور باقی ہیں۔ "دوسرا کہتا" ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا!" سورج غروب ہونے میں بہت کم وقت باقی اور فاصلہ ایک میل تھا۔ پاؤں بے قابو تھے۔ سر میں چکر اور دل میں حسرت لوگ مجھے حریص۔ پاگل۔ کم ہمت اور خدا جانے کیا کیا کہیں گے اگر

میں ــ اُف!" ــ بس ایک فرلانگ ہے ایک فرلانگ ــ لگا تار دوڑنا دوڑنا! ــ بیڑا پار ہے" لوگ چیخ رہے تھے۔

کریم کو اب روپوں کی تھیلی، اس کا دُکھی پٹیل اور دوسرے تماشائی سب کے سب صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے بے تحاشا چھلانگ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

آفتاب کی آخری شعاع بھی غائب ہو گئی ــ کریم کا ہاتھ حلقہ کے اندر تھیلی تک پہونچ چکا تھا۔

"اَے جوان مرد" پٹیل نے کہا "تو نے اندازہ سے زیادہ زمین حاصل کی" لوگ نعرہ ہائے تحسین و مرحبا بلند کر رہے تھے

کریم کا نوکر قریب آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے منہ سے لہو جاری ہے۔ پاؤں زخمی ہیں۔ جسم سرد ہے اور تارِ نفس ٹوٹا ہوا ہے نوکر سر پیٹنے لگا۔ لیکن پٹیل اٹھا اور اس زمین سے جسکو کریم نے جان دیکر حاصل کی تھی دو گز زمین ناپی اور کہا۔ "تو یہاں دفن کردو انسان کو فقط دو گز زمین کی ضرورت ہے اور بس!"

آوازِ حیات!

از جناب ایم۔ اے وفا فرخ آبادی

ایک لفظِ عشق ہی رازِ حیات / ورنہ کیا ہے؟ کچھ نہیں سازِ حیات
کون ہے پردہ درِ رازِ حیات / موت!! وہ ہم رنگِ اعجازِ حیات
چپ ہی رہنے دیجیے سازِ حیات / ورنہ کھل جائینگے سب رازِ حیات
مرنے والے موت بھی اک چیز ہے / بس یہی آتی ہے آوازِ حیات
موت کی بھی لرزشیں پاؤ گے تم / اک ذرا چھیڑو تو یہ سازِ حیات
ایک دن ہوگی سپردِ خاک یہ / شورشِ ہستی باندازِ حیات
موت کی منزل وہ کیا ہی سامنے / دُور سے سُنتا ہوں آوازِ حیات
پھر وہیں جاتا ہوں مرنے کیلئے / اُن کو دکھلانا ہی اعجازِ حیات
اور پھر کیا چاہتی ہی مجھ سے موت / کہہ رہا ہوں تجھ کو ہمرازِ حیات
نغمہ ہائے موت تو سب سن لئے / کیا سنائے کوہر اب سازِ حیات

موت کی خاطر ہے ورنہ اے وفا
میں اُٹھاتا اور اعجازِ حیات

عید نمبر عالمگیر کے لیے

ہجراں نصیب کی عید!

از جناب جعفر صاحبزادہ جعفری

آئی ہے عید حشر کا ساماں لئے ہوئے،
دل ہے سرشکِ خوں تہ داماں لئے ہوئے،

وہ آئیں یا نہ آئیں مزہ آگیا ہمیں،
بیٹھے رہیں گے عید کی خوشیاں لئے ہوئے،

تو ہم سے دُور ہے تو نہیں کچھ مضائقہ،
رگ رگ میں تیرا درد ہیں پنہاں لئے ہوئے،

آثارِ عید دیکھ کے روئے میری بلا،
اہلِ جنوں ہیں کاوشِ ہجراں لئے ہوئے،

اے کاش حشر تک نہ ہو تکمیلِ آرزو،
اُٹھ جائیں دردِ دل کو پریشاں لئے ہوئے،

کیا زیرِ آسماں یہی مفہوم عید ہے؟
مر جائیں اُن کی دید کا ارماں لئے ہوئے،

بس عید ہے یہی کہ ہیں محرابِ سجدہ تک،
جائیں خیالِ ابروئے جاناں لئے ہوئے،

ماموں جان کی سحری!

ماموں جان کہتے تو بہت تھے کہ ہم نے بچپن میں یوں روزے رکھے اور جوانی میں ایسے روزے رکھے اور اس ترتیب سے قرآن شریف ختم کئے اور اس طرح تراویح پڑھی اور فلاں فلاں مسجد میں معتکف رہے مگر جب سے ہم نے ہوش سنبھالا خدا جھوٹ نہ بلوائے ماموں جان کو ایک روزہ بھی رکھتے ہوئے ہم نے نہیں دیکھا۔ مگر اکثر دفعہ سحری ضرور نوش جان فرماتے اور رمضان بھر افطار ضرور کرتے۔

کبھی مرزا صاحب کو سحری کی دعوت دی جارہی ہے تو کبھی میر صاحب کو مدعو کیا جارہا ہے کبھی خان صاحب سحری کرنے والے ہیں تو کبھی چھنا میاں کی دعوت ہے بہرحال پورے رمضان شریف میں دس بارہ دفعہ سحری کی دعوت ہوتی اور ہر دعوت میں دس بارہ آدمی مدعو ہوتے سب کے ساتھ ماموں جان سحری نوش فرماتے اور صبح کو "ہلکا سا" ناشتہ بھی اڑا دیتے۔

افطار پر تو روزانہ بیس بائیس آدمیوں کا مجمع رہتا۔ بعض خاص دوست اور عزیز بعض دوستوں کے دوست اور ملاقاتی بعض محلے والے۔ چار بجے دیوان خانے کے صحن کو صاف کرا دیا جاتا جھاڑو دلوائی جاتی اور پانی کا چھڑکاؤ کر کے تخت بچھائے جاتے تختوں کے اطراف مونڈھے اور کرسیاں رکھی جاتیں ایک طرف چوکی پر آفتابے سجے رہتے نیچے سیلاپچی رکھی رہتی ایک جانب چوکیوں پر صراحیاں جمائی جاتیں اور کٹورے گلاس بھی رکھے رہتے۔ دالان میں جانماز بچھائی جاتی اور افطاری کا انتظار رہتا۔ بعض مخلصین تو بس عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے سیدھے یہیں آکر دم لیتے بعض ذرا دیر سے آتے بہرحال افطار سے پہلے مجمع خلاف قانون جمع ہوجاتا۔ اور افطار کی توپ کا انتظار رہتا توپ دغنے سے پہلے دو خوان اندر سے آجاتے اُدھر توپ دغی اُدھر حافظ جی نے منہ ہی منہ میں دعائے افطار بڑبڑاتے ہوئے کشتیوں پر کے نوبست پوش نکال دیئے اور بسم اللہ کر کے شروع فرما دیا پھر تو غازیاں "دینِ دار" دو جہاں بادل پُرنور شعار" دہ دہ دا دِ افطار دینے کہ بس دونوں کشتیاں ختم ہو جاتیں۔ اس منزل افطار کو طے کر کے حافظ جی کی امامت میں نماز مغرب ایک طرف شروع ہو جاتی اور دوسری طرف ماموں جان اور ان کے چند احباب بیٹھ کر "شغل حقہ" فرمانے لگتے بعض حضرات جو نماز کے وقت حقہ پینا معیوب تصور کرتے تھے۔ آہستہ سے اٹھ کر کھنکارتے ہوئے بیت الخلا کا رخ کرتے اور استنجے سے فارغ ہو کر ڈھیلا ہاتھ میں لئے ہوئے بیت الخلا کے دروازے پر باضابطہ ٹہلنے لگتے اور نماز ختم ہونے تک تنبیجی داب داب کر ڈھیلا سکھاتے۔ نماز ختم ہونے کے بعد پھر ایک بار مجمع اپنی پرانی نشستوں پر قائم ہوجاتا اور گپیں اڑتیں ان میں سے اکثر حضرات تو گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر تشریف لیجاتے مگر تین چار خاص احباب جو ماموں جان کے ساتھی اور قدیم دوست تھے بیٹھے رہتے آٹھ بجے دالان میں دسترخوان بچھایا جاتا۔۔۔۔۔

اور ماموں جان سب کے ساتھ کھانا کھاتے اور پھر دس گیارہ بجے رات تک گپیں اڑاتیں۔

مرزا صاحب رکاب کے منصبدار اور بڑے قدیم بزرگ تھے بات بات پر مختار الملک بہادر کا حوالہ دیتے اور ہمیشہ چندو لال۔ اور میر عالم کے زمانے کے قصے سنایا کرتے۔ میر صاحب بھی سن و سال میں

مرزا صاحب سے کم نہ تھے مگر ان کو نہ دبیر عالم کے قصے یاد تھے اور نہ چندولال کے البتہ اپنے تئیں کمسن تصور کرنے کی وجہ سے ان کا یہ حال ہوگیا تھا۔ کہ جس واقعہ کو پوچھو کہتے ہیں "یاد نہیں میں ان دنوں کمسن تھا"۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے طغیانی کا قصہ کہا تو آپ بڑی متانت سے فرمانے لگے "سنا ہے کہ پانی ہماری ڈیوڑھی تک بھی آگیا تھا۔ مگر مجھے یاد نہیں۔ اس لئے کہ میں چھوٹا تھا۔

خان صاحب کا یہ حال تھا کہ دنیا میں کسی کو اپنے سامنے نہ تو سپاہی سمجھتے اور نہ سوار اور نہ مرد نہ ہی خوبصورت۔ دنیا کی جتنی سپاہیانہ خوبیاں ہوسکتی تھیں وہ اپنے آپ میں جمع خیال کرتے اور حضرت یوسف کے بعد وہ کسی کو خوبصورت سمجھتے تو فقط اپنے آپ کو۔

حافظ جی کو دو پارے بھی منہ زبانی یاد نہ تھے۔ مگر وہ اپنے آپ کو حافظ، قاری، محدث، مفسر، مبلغ تصور فرماتے جب کبھی تذکرہ ہوتا آپ بکمال انکساری عرض کرتے کہ کچی ولگی نہ باشد ہم نے تیس پارے منہ زبانی یاد کئے ہیں منہ زبانی۔"

چندا میاں کی پوچھئے نہیں وہ تو بس "منہ زبانی اخبار تھے" دن بھر کے واقعات ان سے سن لیجئے لوگوں کے گھروں کی حالت ان سے دریافت کر لیجئے امرا کے شجرے از بر تھے۔ رئیسوں اور امیروں کی خاندانی ہسٹری منہ زبانی یاد تھی، شہر میں جو حادثہ اور واقعہ ہو وہ سن لیجئے۔ ہر دفتر ہر محکمہ ہر دوکان کی روزانہ حالات پوچھ لیجئے کبھی حافظ یٰسین صاحب کی کارگزاری کی تعریف کرکے قصہ سنا رہے ہیں۔ کہ انہوں نے ایک مثلوں کے بستہ پر یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ "ہم نے اس بستے کی ڈوری کھولنی چاہی مگر گرہ سخت تھی اور نہیں کھلی لہذا بلا تجویز واپس۔"

کبھی اپنے ہم نام "چندا میاں آنریری مجسٹریٹ" کا قصہ سنا رہے ہیں کہ وہ اجلاس پر بیٹھے ہوئے گواہوں کے بیانات قلمبند کرتے کرتے اپنی ریوالونگ چیر (گھومنے والی کرسی) کو گھما کر میز کی طرف پشت اور دیوار کی طرف منہ کرکے بیٹھ گئے اور ان کے اجلاس کا چپراسی لگا پکارنے "عدالت چیمبر میں ہے" اور وہ اڑانے لگے سگرٹ کبھی ہارون سیٹھ کا تذکرہ کرتے ہیں کہ انہیں نیروزہ نے کس طرح "نادر خاں" کا لقب دے دیا۔

بہرحال موٹر کی ٹکر، سائیکل کی چوری سے لے کر مسافروں کی آمد اور لوگوں کے گھروں کی گوشت ترکاری تک کی تفصیل ہمارے چندا میاں سنا دیتے۔

ان حضرات کی خود سرائیاں، بذلہ سنجیاں، ماموں جان کو اس قدر پسند تھیں کہ دن بھر میں دو تین دفعہ جب تک ان حضرات سے مل نہ لیتے چین نہ آتا۔

ابھی یہ حضرات مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر بیٹھے ہی تھے کہ چاند کی توپیں دغیں ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے ماموں جان نے جھٹ آنکھیں بند کرلیں اور لگے ولادو سے فرمانے کہ جا تھوڑی سی ہری گھاس لے آ۔ ہری گھاس تھی نہیں گھوڑے کے لئے آئی ضرور تھی مگر گھوڑے نے بھی زبردست افطار کرکے اسے ختم کر دیا تھا آخر بام کا ایک کونڈا لایا گیا اور جب وہ سامنے رکھا جا چکا تو ماموں جان نے آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا۔ جب بیٹھے ہوئے نظر نہ آیا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور چاند دیکھ کر آپ نے جلدی سے بام کو بجائے "گیاہ سبز تر" کے دیکھ لیا اور پھر سب کو چاند کی مبارکباد دی۔

گیارہ بجے رات تک تو یاران غافل بیٹھے گپ کرتے رہے جب یہ لوگ جا چکے تو ماموں جان نے سب ملازمین کو جمع کرکے احکامات اجرا فرمانے شروع کئے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تعمیل بھی کرائی جانے لگی۔ پہلے تو دیوان خانے کے دونوں طرف کے دالان اور پیش دالان جھڑوائے گئے شطرنجیاں جھٹکوا کر بچھائی گئیں ان پر نئی چاندنیوں کا فرش ہوا۔ صدر میں سوزنیاں بچھائی گئیں اور ان پر قالین بچھوا کر تکئے جموائے گئے۔ ہر دالان میں تین تین اگالدانیں رکھوائی گئیں ایک ایک عطردان اور ایک ایک تھالی جس میں چکنی ڈلی اور الائچی کی ڈبیاں تھیں قالین کے کونے پر رکھے گئے۔ پیش دالان میں بھی فرش کرایا گیا۔ نئے پائدانز ڈالوائے گئے زنانی دروازے کا پردہ بدلوایا گیا۔ اور ایک بجے رات کو ان تمام انتظامات سے فارغ ہوکر زنانے میں تشریف لے گئے پہلے تو ممانی جان سے

مشورے ہوئے اور پھر اپنے لئے کپڑے نکلوائے گئے سرخ دھاری دار نیم آستین نیا ململ کا کرتہ، نیا دوہرا پاجامہ نکلوا کر علیحدہ رکھا گیا۔ سفید ریشمی آزار بند پاجامے میں ڈالوایا گیا۔ کرتے کے گلے کو سونے کی کنڈیاں لگائی گئیں سرخ جامہ وار کی پھولدار شیروانی نکالی گئی نیا چوخانہ دار صوفیانہ چریالی رومال منگوایا گیا اور پسوان کا مدار قصوری جوتی علیحدہ کرکے رکھی گئی، سرخ شال کا شملہ (صافہ) جس پر بڑی بڑی کیریاں کڑھی ہوئی تھیں ان سب کپڑوں پر رکھا گیا اور اس کے بعد حضرت نے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو مہندی لگوائی اور پھر چار چھ انگوٹھیاں سونے کی جیبی گھڑی اور سونے کا توڑا جس میں دو تین پرانی اشرفیاں اور ایک یمنی (عقیق) کی مہر پڑی لٹک رہی تھی پسند فرمایا۔ اور سنہری پیش قبض اور ایک سنہری قبضے کی سرخ میان والی عباسی نکال کر رکھ چھوڑا تب کہیں چین آیا۔ اب جو گھڑیال ملاحظہ فرمائی تو نج گئے تھے تین بس جلدی سے پڑ کر سو رہے۔

صبح سویرے خلاف معمول ٹھیک آٹھ بجے بیدار ہو کر چیخنا شروع کیا کہ "اری بختاور ذرا حمام تو دیکھنا" اری میمنت ذرا پانی تو دیکھ گرم ہوا یا نہیں" اری پیلے اچل بیسن چھانواں (گھسنی) حمام میں رکھ آ اجی بیگم ذرا خضاب تو لا دو اور ارے کوئی ہے ذرا پان تو دے جانا۔ مگر بالکل صاف ہوں ورنہ خضاب خراب ہو جائیگا۔ ہاں ذرا گرم پانی تو لا دو میں سر اور ڈاڑھی دھو دوں گا۔

خدا خدا کرکے نو بجے خضاب ختم ہوا اور حمام پہنچے اور پھر وہی لیلے بیسن مل دے، میمنت پیٹ مل دینا۔ بختاور پانی بہاتی جا اور ابے بدمعاش دلاور کھڑا ہوا منہ کیا تکتا ہے دیکھتا نہیں خضاب لگا ہوا ہے ابے بھاگ مازو کا پانی لے آ، دس بجے غسل اعظم ختم ہوا اور حضرت نے عید کی پوشاک جو پہنی تو ساڑھے دس ہوگئے گیارہ بجے دیوان خانے میں برآمد ہوئے تو اس شان سے کہ سرخ سرخ شال کا نکے وار شملہ، جامہ وار کی لال شیروانی، نیا چمکدار سرک کا دوہرا پاجامہ، پسوان زرین قصوری جوتی، ہاتھوں میں بلا مبالغہ دس بارہ انگوٹھیاں، کندھے پر رومال، بغل میں عباسی، ہاتھ میں کٹار،

باہر آتے ہی بختاور کو حکم ہوا کہ دو پیچوان (حقے) لا کر باہر رکھے اور پان بنوا لائے اور پھر سائیس سے ارشاد ہوا کہ ابے معلوم نہیں ہم عید کی نماز کو جانے والے ہیں گاڑی تیار کی یا نہیں؟ سائیس بیچارہ پریشان دار بھاگا، اور لگا گاڑی (بگھی) تیار کرنے بدقت تمام ساڑھے گیارہ بجے گاڑی تیار ہوئی اور حضرت چلے مگر دلاور بھی ایک ہی شیطان ہے جب حضرت بگھی میں تشریف فرما ہو چکے تو کہنے لگا سرکار نمازیں تو ختم ہوگئیں عیدگاہ کی نماز بھی ختم ہوگئی، گھنٹہ بھر پہلے میں نے سلامی کی توپیں سنی ہیں۔ فرمانے لگے "ابے شہر میں ہزاروں مسجدیں ہیں کیا کہیں نماز نہ ملے گی،" دلاور نے کہا "سرکار مسجدوں میں تو نمازیں جلدی ہوتی ہیں، سب سے آخری نماز عیدگاہ میں ہوتی ہے وہ بھی ختم ہوگئی اب کہاں نماز ملے گی!" ابھی دلاور سے بحث ہو ہی رہی تھی کہ چندا میاں آپہنچے اور حضرت نے بگھی سے اتر کر ان سے معانقہ کیا جب چندا میاں نے سمجھایا کہ "حضرت نمازیں ختم ہوگئیں بارہ بجے ہیں اب بھلا کون عید کی نماز پڑھتا ہے۔ یوں ہی ارادہ ہو تو آہستہ آہستہ چلئے کہ مسجد چل کر ظہر پڑھ لیں گے" اس فقرے پر حضرت کچھ جھینپے اور چندا میاں کا ہاتھ پکڑے ہوئے دیوان خانہ میں آکر بیٹھ گئے۔

اب عید کی ملاقاتیں شروع ہوئیں پہلے تو نوکروں نے عید کی ملاقات کی ہر ایک کو انعام تقسیم ہوا اس کے بعد لوگ آنے شروع ہوئے دو بجے تک لوگوں کی آمد رہی اور ماموں جان ہنسی خوشی عید ملتے رہے۔ دو بجے اندر تشریف لے گئے تو سب سے پہلے ممانی جان نے کھڑے ہو کر سلام کیا بس ماموں جان پھول ہی تو گئے ہماری ممانی جیسی گورنر جنرل بلکہ قیصرۂ ہند نما عورت کا کھڑے ہو کر سلام کرنا معمولی بات نہ تھی، ماموں جان نے ہنس کر جواب دیا اور ممانی جان کے برابر بیٹھ کر لگے سب کو پکارنے یکے بعد دیگرے سب بیٹیاں آکر ملیں ان کے بعد چھوکریاں مامائیں، اور انائیں آداب عید بجا لائیں ہر ایک کو حسب مراتب عیدی سرفراز ہوئی۔ سب سے آخر میں ہم نے جا کر پہلے تو ماموں جان کو سلام کیا پھر ممانی جان کو دونوں نے دعائیں دیں اور سلامیاں مرحمت فرمائیں، ماموں جان نے پوچھا میاں عید کی نماز کہاں ہوئی ہم نے عرض کیا قبلہ عیدگاہ میں، کہنے لگے ایں تم تو گھر ہی تھے نا؟ ہم نے عرض کیا جی نہیں آپ غسل فرما رہے تھے کہ ہم نماز کیلئے

گئے اور آپ آپ ممانی جان سے عید مل رہے تھے کہ ہم آئے فرمانے لگے واہ میں ان سے عید کب ملا۔ ہم نے عرض کیا قبلہ جس وقت ممانی جان آپ کو بندگی کر رہی تھیں اسی وقت ہم گھر میں داخل ہوئے کہنے لگے خیر، مگر ہمیں نماز نہیں ملی۔ ہماری سالیاں عجیب آفت ہیں۔ چھوٹی نے تو بس کر دیا کہ ابا جان دولہا بھائی گئے ہی نہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ نبھ گئی اور ہم نے کہا بی بی ابھی تو آیا ہوں ذرا دم لے لوں تو ملنے جاؤں گا اب بھلا دوپہر میں کوئی عید ملنے جاتا ہے ممانی جان نے سمجھ لیا مگر ماموں جان کو خدا سلامت رکھے کہنے لگے ہاں میاں ٹھنڈے وقت میں جانا اس دھوپ میں ملاقات کیا ضرور ہے ہماری بیگم صاحبہ نے بھی ذرا آنکھیں نکال کر گھورا تب کہیں وہ آفت ٹلی ورنہ اس نے تو کہہ ہی دیا تھا کہ ہم نماز کو گئے ہی نہیں۔

آپ ہی کہئے اس دلچسپ منظر کو دیکھنا چھوڑ کر ہم نماز کے لئے کیوں جاتے۔

اب جو ہم سلامی لے کر اپنے کمرے میں آئے تو ننھی چھوٹی سالی نے۔ بھائی آپ عیدگاہ کو گئے تھے نا آپ نے عیدگاہ میں نماز ادا کی تھی نا، آپ عید کی نماز پڑھ کر آ رہے ہیں نا، کہ کر چھیڑنا شروع کیا۔ مگر جب ہم نے ع عیدگاہ ما غریباں کوئے تو گانا شروع کیا تو وہ بھاگ کھڑی ہوئی اور ہم نے دوپہر کا کھانا کھا کر جو سائیکل سنبھالی تو بس ادارہ علیہ پہونچکر دم لیا۔

(سید تمکین الکاظمی)

دُعا!

(بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کی ایک دلکش اسلامی نظم کا ترجمہ)

اے رحیم ہم تیری حمد کرتے ہیں محبت زمانہ اور تقدیر کے مالک
چلنے والی ہواؤں اور سمندروں کے آقا
یا حمید یا حفیظ
تو ہماری راتوں کی روشنی ہے تو ہمارے دلوں کی بخشش ہے
جس کا نام تمام کائنات میں مشہور ہے
یا غنی یا غفار
تو ہماری آرزوؤں کا منتہا ہے تو ہمارا سکوت و ترنم ہے
تو سورج کی شعاع اور پودوں کی حیات ہے
یا وہاب یا وحید
تو ساعت بساعت تبدیل کرتا ہے ہمارے ضعف کو قوت میں
ہماری غلامی کو آزادی میں!
یا قدیر یا قوی
ہم ترے نور کے پر تو ہیں ہم تیری قدرت کے اسرار ہیں
ہم ترے ازلی خواب کی تعبیر ہیں
یا رحمٰن یا رحیم

(شفیعی)



اجمیر کی ایک جھیل کا دلآویز منظر



مولانا نذیر ایودوی

کس کس کی عید

جناب مولانا حامد حسن صاحب قادری

جس پہ ہو چشمِ التفات اُسکی! | عید اسکی، شبِ برات اُسکی
دل کسی درد مند کا دل ہو | دل میں چُبھتی ہے بات اُسکی
اُحد و کربلا پہ کیا موقوف | ہے بڑی بے نیاز ذات اُسکی
خواب میں بھی جو محوِ دید رہا | عید کا دن ہو کیوں نہ رات اُسکی

اُسکے کوچہ میں مر گیا حامدؔ
اُسکی یہ موت ہے حیات اُسکی

یاد آیا میکہ!

شہر طیطلہ اندلس کی وسیع ریاستوں میں "دار ریاست" تھا۔ اگر ایک طرف اس کا سیاسی۔ تجارتی اور مرکزی وقار بڑھا ہوا تھا تو دوسری طرف اسکی وہ خصوصیت تمام دیگر مرکزوں سے ممتاز تھی جسے بجا طور پر "جنت رنگ و نور" سے تشبیہ دیسکتے ہیں۔

مسلمان فرمانرواؤں نے اس کی جس قدر قلعہ بندی کی تھی، امراء و روساء نے اندرون و بیرون شہر اپنے اپنے مذاق سلیم کی رہنمائی میں جو تفریح گاہیں، بارہ دریاں۔ باغ اور خوش قطعہ چمن کی بنا ڈالی تھی اگر ان سے قطع نظر بھی کر لیجئے تو "قصر الساعۃ" کو فراموش کر دینا انسانی فطرت و ذہن کی بدترین توہین ہے یہ "جاذب توجہ" عمارت شہر سے کسی قدر فاصلے پر دریائے ٹیگس کے کنارے بنی ہوئی تھی، اور اسکی تعمیر و تزئین میں اسلامی اندلس کے تمام اہتمامات ختم کر دیئے گئے تھے قصر کی دیواریں بہترین سنگ مرمر کی بنائی گئی تھیں ان کی طلاکاری اور پچی کاری دیکھکر خیال ہوتا تھا کہ فراخ حوصلگی کی انتہا ہے۔

بڑے بڑے فوارے جنکی خوبصورتی پر "فوارہائے نور" کا گمان ہوتا تھا مناسب فاصلوں پر بنائے گئے تھے۔ جب یہ چھوٹتے تو "آبی تصادم" کا ایک مسلسل و مربوط نغمہ چھڑ جاتا رہا۔ گرد و پیش کے سبزہ پر پانی کی مہین مہین بوندیں ایسا معلوم ہوتی تھیں کہ گہرے سبز رنگ کے سمندر کی سطح پر صدہا حباب ہیں اور جب خاموش ہو جاتے تو معلوم ہوتا کہ موسیقی کے دیوتا "ترنم خاموش" کے اکتساب میں مصروف ہیں۔

پانی کے مد و جزر کے لئے ایک حوض بنایا گیا تھا جس کے وسط میں نہایت عجیب و غریب قسم کا آلہ لگا ہوا تھا۔ اس "اختراع نادرہ" کا سہرا، مشہور الزرقل کے سر ہے جو اپنے وقت کا باکمال ہیئت دان تھا۔ ایسی ایجاد مشکل ہی نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ناممکن ہے کیونکہ صدیاں گذر چکیں مگر اس کا ثانی کہیں سننے میں نہ آیا۔ الزرقل نے اس حوض کو اس طرح بنوایا تھا کہ اسمیں چاند کی تمام "جاذبیت" بھر گئی تھی۔ وہ یوں کہ حوض کو دو حصوں میں منقسم کر کے آبی سلسلہ ایک ہی رکھا گیا تھا۔ جیسے جیسے چاند گھٹتا۔ بڑھتا۔ ویسے ہی حوض میں پانی کی مقدار گھٹتی بڑھتی۔ ادھر دلہن افق چاک کر کے چاند اپنا معصوم چہرہ نکالتا۔ ادھر آب رواں کی ہلکی ہلکی روانی حوض میں شروع ہو جاتی۔ جوں ہی چاند "ماہ نیم ماہ" کا لقب حاصل کرتا حوض لبالب بھر جاتا، بالکل اسی طرح جیسے شراب، ہلکے ہلکے جوش کے ساتھ جام سیمیں میں لبریز ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ اب اُبلی اور تب اُبلی: مگر ساقی کی نگاہیں حد سے متجاوز نہیں ہونے دیتیں۔

اسی طرح ادھر چاند "ماہ کامل" ہو کر کاہیدہ ہونے لگتا ادھر پندرہویں تاریخ سے انتیسویں تک بتدریج حوض خالی ہونے لگتا۔ بالکل اسی طرح جیسے "اضافہ مزید" یا "بحر مدید" سے ناامید ہو کر سب سب کر کے جام خالی کرتا ہے۔ باریک بیں نظروں کے لئے یہ دور انحطاط بھی خالی از کیف نہ ہوتا۔ کیونکہ چاند کی کاہیدگی اور حوض کی بتدریج "بے آبی" سے یہی گمان ہوتا تھا کہ چاند اپنی قوت قائم رکھنے کے لئے اس "جام عجیب" سے اپنی تشنہ لبی دور کر رہا ہے۔

اگر اس حوض میں کچھ پانی زیادہ کر دیا جاتا، یا نکال لیا جاتا تو یہ نہ ہوتا کہ وہ بہ نکلے یا خالی ہو جائے بلکہ مقدار اصلی قائم رہتی۔ کسی کسر و اضافہ کا اثر نہ پڑتا۔ پانی کی کمی بیشی سے صرف تاریخوں ہی کا پتہ نہ چلتا بلکہ غور کرنے والے لوگوں کو رات اور دن کے گھٹنے بڑھنے کا پورا پورا علم ہوتا رہتا تھا۔ یعنی اگر دن چھوٹا ہوتا تو پانی کم مقدار میں بڑھتا اور رات میں زیادہ و العکس بالعکس،

یہ ندرت یہیں تک ختم نہ تھی بلکہ اسی اتار چڑھاؤ سے ہفتوں کا بھی حساب معلوم ہوتا تھا کیونکہ حوض میں درجے بنے ہوئے تھے۔ چاند کی پہلی تاریخ کو اٹھائیسویں درجہ میں پانی آتا تھا اور غروب آفتاب کے وقت چودہواں حصہ لبریز ہو جاتا تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ یہ حوض ایک طرف آبی "جدول اوقات" تھا تو دوسری طرف ایک دائمی جدول تاریخ و روز، بالکل صحیح ہے۔ لیکن

ایسی ایجاد سے کام لینے کے لئے جس قدر وسعت و عمق کی ضرورت ہے کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو فطرت نے ذوق سلیم عطا کیا ہو۔ مگر افسوس ایسے لوگ اب کہاں! بایں ہمہ اندلس کے فرمانرواؤں کو وحشی کہا جاتا ہے۔ اور کون لوگ کہتے ہیں؟ وہی جنھیں اسکی بھی تمیز نہیں کہ وہ خود کیا تھے اور ان وحشیوں نے انھیں کیا بنا دیا۔ ملاحظہ ہو مسٹر ایس۔ پی۔ اسکاٹ (S. P. Scott) اپنی بے مثل تاریخ۔ دی ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ (The History of the Moorish Empire in Europe) میں لکھتے ہیں کہ:-

"اگر عیسائی بادشاہ، اہل عرب کی قابلیت اور تہذیب کو نہ دیکھتے تو ترقی اور تہذیب ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آتی۔ اس لئے یہ تمام رنگا رنگ لطافتیں اور برکتیں جو انعامات عالم پر نظر آ رہی ہیں عربوں ہی کے طفیل میں ہیں۔ اہل کلیسا قوائے دماغی و عقلی سلب کئے ہوئے تھے محض اس وجہ سے کہ انکی ذاتی حیثیت خطرے میں نہ پڑ جائے یورپ میں سب سے پہلے وادی الکبیر کے کنارے اس حق کا اعلان عربوں نے کیا اور موجودہ نسل جو اس سے استفادہ کر رہی ہے وہ محض بانیان اسلامی اندلس کی بے بہا وراثت ہے۔"

کیا اس شہادت کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ اندلس کے فرمانروا سب کے سب وحشی جاہل اور غیر مہذب تھے؟ اگر انصاف کوئی چیز ہے تو اس کا فیصلہ ہمیشہ نفی میں ہوگا۔ تعصب کی بات اور ہے۔ تاہم ہمارے لئے محض یہ بات تسلی دہ نہیں ہو سکتی کہ ہمارے اسلاف نے یورپ کو قعر جہالت سے نکالکر علم و عمل کی روشنی میں آزاد کر دیا اور اس امر کی شہادت اغیار کی تاریخ سے ملتی ہے اور کیوں؟ اس لئے کہ پدرم سلطان بود کا پندار بادہ دوشینہ کا خمار ہے اسکا مفہوم اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ہم اسی فریب ہی میں مبتلا رہکر اپنی ہستی فنا کر دیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ ہم بھی اسلاف کی طرح دنیا میں اپنی زبردست ہستی کا ثبوت دیں کہ تمام عالم اسی طرف جھک جائے اور یہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ مسلمان کی انتہا "سر بجنب طلب" میں پوشیدہ ہے نہ کہ بوریا ہی طلبی میں!

خیر! بات میں بات نکل آئی ...... تمام جزیرہ اندلس میں اس حیرت انگیز ایجاد کا شہرہ تھا۔ جہلا اس کا تذکرہ نہایت خوف و ہراس کے ساتھ کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ طلسمی چیز تھی جسے صرف جن اور دیگر پوشیدہ طاقتیں بنا سکتی ہیں حالانکہ اس کا موجد ایک انسان تھا اور انھیں کے زمانے میں موجود، لیکن ان کے فہم سے بالاتر بات تھی اسوجہ سے انکی حیرت بھی بیجا نہ تھی۔

الذرغل کی یہ ایجاد عام لوگوں کے لئے گھڑی کا کام دیتی تھی۔ لیکن فی الاصل نجوم کے مسایل حل کرنے کے واسطے تھی۔ راتوں کو یہیں بیٹھکر فطرت اور اس کے اسرار کی گہرائیوں کو پیمایۂ خیال سے ناپا جاتا تھا۔ اس عجیب اور محیر العقول طلسم کے علاوہ ایک اور عمارت تھی جسے "قصر مرآۃ" کہنا بالکل بیجا نہ ہوگا۔ یہ ایک چھوٹا سا محل تھا جس کے چاروں طرف سبزہ لہلہاتا رہتا تھا۔ اندر جانے کے لئے زمین کھود کر راستہ بنایا گیا تھا جس کی شکل بالکل تہ خانے کی سی تھی قصر کی دیواریں چھتیں اور فرش تمام آئینہ بند تھے لیکن آئینہ بندی ایک ہی طرح کے شیشوں سے نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ مختلف اللون شیشے ذوق صحیح کی رہنمائی میں جڑے گئے تھے جوڑوں کے بیچ میں سونے اور چاندی کی منبت کاری تھی۔ امیر طیطلہ گرمی سے پناہ لینے کے لئے اپنے غلام اور کنیزوں کے جھرمٹ میں اس قصر میں چلے آیا کرتے تھے عجیب بات یہ تھی کہ جیسے ہی امیر صاحب پہونچتے ویسے ہی پوشیدہ فواروں کی امداد سے تمام قصر پر پانی برسنے لگتا۔ اور اس سبکروی اور ہمواری کے ساتھ کہ گویا "آب رواں" کی ایک چادر ہے جو تمام قصر پر محیط ہے۔

پانی اس انداز سے نیچے گرتا تھا کہ پیچیدہ راہوں کے تصادم سے نہایت لطیف نغمہ پیدا ہو۔ امیر کے لئے یہ نغمہ لوری کا کام دیتا تھا اور ایک "فطرت آشنا" انسان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کہیں دور آبشار کی نغمہ چھڑا ہے۔ لیکن ایسا "مدھم اور کومل" کہ روح کھنچی جاتی ہے!

اس مصنوعی بارش سے نہ صرف ہوائے گرد و پیش "نسیم خنک" بن جاتی تھی بلکہ اس "آب رواں" کی چادر سے چھن کر جو روشنی قصر کے اندر آتی تھی وہ قوس قزح کا بہترین منظر پیدا کر دیتی تھی اور نظارہ کرنے والوں کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ رنگ و نور، تبسم و خنکی، تفطر و نزہت کی تمام لطافتیں بیک وقت محیط ہو گئی ہیں!!!

پیامِ یگانہ

یوسف کو اس انجمن میں کیا ڈھونڈھتا ہے
ہنگامۂ ما و من میں کیا ڈھونڈھتا ہے
نیرنگِ تماشائے حجابِ معنی
تصویر کے پیرہن میں کیا ڈھونڈھتا ہے

میرزا یگانہ لکھنوی

عالمگیر کے عید نمبر کیلئے!

کتابِ زندگی!

از جناب مظہر انصاری بی اے (آنرز)

پھاٹک کے کواڑ بند ہو گئے۔ اب اتنے بڑے ڈھنڈار گھر میں انوری اکیلی تھی۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انوری نے تنہائی محسوس کی — دن کے وقت ہمیشہ استانی جی کے ساتھ رہنا، رات کو ہمیشہ امّی جان کے پاس سونا یہی انوری کا روزمرہ کا پروگرام تھا۔

مگر آج اماں جان بھی رشتے داروں میں ملنے گئیں اور استانی جی بھی نہیں آئیں۔

اس نے سوچا اب دو گھنٹہ تک میں اکیلی رہوں گی۔ پورے دو گھنٹے تک — آج ہی کے دن سب کو جانا تھا۔ اماں جان کو بھی" اور استانی جی سے انوری کو اتنی محبت تھی کہ اس نے وعدہ کرلیا کہ آپ کی غیر حاضری کی اطلاع امّاں جان کو نہیں دونگی استانی جی نے کہا تھا مجھے ایک پرائیویٹ کام ہے انوری نے خیال کیا ہاں ہوگا، دنیا میں سب کو اپنے اپنے کام ہوتے ہیں۔

آرام کرسی پر بیٹھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

آج سب باہر گئے ہیں کیا سب کو آج ہی کے دن باہر جانا تھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی، اِدھر اُدھر پھرنا شروع کیا۔ سوچتی جاتی تھی۔ باری باری سے ہر کمرے کو دیکھوں گی ہاں — کتنا بڑا مکان ہے، دیکھو کیسے تعجب کی بات ہے آجتک میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ ہمارا مکان بھی اتنا بڑا ہے — محل کا محل!

"کیسی خاموشی ہے"!

ہارمونیم رکھا ہوا تھا۔ انوری نے دھونکنی کھولی۔ "سا" اور "رے" کے سروں پر بڑے زور سے انگلی ماری، ایک زور کی مرنی سی آواز خالی کمرے میں گونجی انوری ڈر کر پرے ہٹ گئی

"نوج میں تو ڈر بھی گئی"۔

دوڑ کر وہ کمرے کی کھڑکی کے قریب گئی اور گردن باہر ڈال کر دیکھنا شروع کیا۔ پائیں باغ بالکل سنسان پڑا تھا۔

مکان کیسا اکیلا اکیلا معلوم ہو رہا ہے، اگر ابّا جان کتوں ہی کو اپنے ساتھ نہ لے جاتے تو بھی زندگی کے کچھ آثار نظر آتے۔ مگر وہ مجھے تو یہ تنہائی کاٹے کھاتی ہے ......

آہا۔ ہاں خوب خیال آیا۔ چلو آج ابّا جان کی لائبیریری والے کمرے کو دیکھوں بہت منع کیا کرتے ہیں کہ وہاں نہ جانا وہاں نہ جانا" انوری بڑی باغیانہ سپرٹ کی لڑکی تھی۔ ایسے قوانین کو جو غیر ضروری معلوم ہوں وہ بے کھٹکے توڑ دیا کرتی تھی۔ مگر ایسی باتیں جنکا انجام خطرناک ہو ...... توبہ توبہ ایسی چیزوں کے وہ قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ لائبریری میں جانا اس کے لئے ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔ مگر وہ اسے غیر ضروری پابندی سمجھتی تھی۔

اس نے سوچا۔ اس میں کوئی خطرہ تھوڑے ہی ہے' میں اس سے بُری لڑکی تھوڑے ہی کہلاؤں گی۔ ابّا جان نے کہا تھا کہ بُری لڑکی وہ ہوتی ہے جو بُرے بُرے کام کرتی ہے۔ مگر یہ کوئی بُرا کام تو ہے نہیں اس میں شرارت کی بھی کوئی بات نہیں۔ کوئی چیز بھی نہیں ٹوٹیگی

نہ کچھ خراب ہوگا۔ میں پنجوں کے بل جاؤنگی۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہوگا کہ انوری لائبریری والے کمرے میں داخل بھی ہوئی تھی یا نہیں ....."

ہانپتی کانپتی انوری پنجوں کے بل چڑھنے لگی ......

اٹھائیسویں سیڑھی ......

خوشی کے مارے وہ باغ باغ ہو رہی تھی جیسے کوہ طور کی تسخیر کے لئے جا رہی ہے۔

لائبریری والے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا ....

انوری نے دھکا دیا تو گڑگڑاہٹ کیساتھ کواڑ اس طرح کھلے جیسے علاؤالدین چراغ کے قصے میں طلسمی پتھر غار کے سرے پر سے ہٹتا ہے

پنجوں کے بل وہ اندر داخل ہوئی

لائبریری کیا تھی اچھی خاصی خانقاہ تھی۔ لال سبز شیشے کھڑکیوں میں لگے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی محرابیں تھیں، بڑے بڑے طاق تھے، اور ہلال کے نشان جا بجا بنے ہوئے تھے جن کے اوپر قرآن کی آیات لکھی ہوئی تھیں

الماریاں طرح طرح کی کتابوں سے بھری پڑی تھیں اور انوری کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کو بہت پسند کرتی تھی۔

"ابا جان مجھے یہاں آنے سے کیوں منع کرتے ہیں۔ میں تو گھنٹوں تک بیٹھی یہاں کتابیں پڑھا کروں"........

اچھا لاؤ .... ذرا کوئی کتاب پڑھوں .....

(۲)

"مگر یہ تو ہزاروں کتابیں ہیں ان میں سے کون پڑھوں ...

... وہ لال جلد والی ...... سب سے اچھی وہی معلوم ہوتی ہے .... ہائیں دیکھوں ..... ہاں وہی وہی"

اور یہ سب سے اچھی کتاب سب سے بڑی کتاب بھی تھی

"ہاں یہی ...... یہ تو مچان پر رکھی ہے ——— تو کیا مچان پر چڑھوں اب؟ ——— اس الماری پر سے چڑھ جاؤں"

اسے یہ معلوم ہوا کہ کتاب ہنس رہی ہے اور کہہ رہی ہے "چل رہی چھوکری تو کہاں مجھے پڑھ سکتی ہے؟..... تو اتنے اوپر چڑھ ہی نہیں سکتی!" اچھا یہ بات" تو میں چڑھ کر دکھلا دونگی"

مچان پر چڑھ کر اس نے کتاب کھولی ——— پہلے صفحے پر لکھا ہوا تھا ...... قرآن مجید فرقان حمید ——— انوری نے ہجے کرنے شروع کئے قاف لمبے پیش قُر الف مد زبر آ قُرآ نون موقوف قرآن"......

کلمے کی انگلی اٹھا کر اس نے ہونٹوں پر رکھ لی گویا اپنے آپ کو خود ہی چپ رہنے کا اشارہ کر رہی ہے

"کوئی کھیل کی کتاب ہے تبھی تو ایسا پیارا نام ہے اس کا ——— اس روز ابا کہہ نہیں رہے تھے میرے پاس شطرنج وغیرہ کھیلوں کی کتابیں رکھی ہیں ——— دیکھوں تو سہی اس میں کیا کیا لکھا ہے۔ رکھی تو بڑی حفاظت سے ہے اور سب کتابیں تو یونہی پڑی ہوئی ہیں۔ یہ بڑی بڑی حفاظت سے جھاڑی پونچھی رحل پر رکھی ہے"

آلتی پالتی مار کر انوری مچان پر بیٹھ گئی اور رحل پر رکھی ہوئی بھاری کتاب کو کھولا۔

اے ہے یہ سب سے اوپر کیا اڑنگ بڑنگ سا بکھیڑہ بنا ہوا ہے۔ بے بھی اس میں ہے سین بھی ہے اے لو میم کا گول مول سا بنا ہوا سر بھی ہے .... اور یہ کیا ہے الف لام لام، الف،

....

اور یہ عبارت کیا ہے؟ ——— لاؤ پڑھوں تو ———

الف لام زبر اَل، ح م زبر حَم، الحم، د پیش دو، اَلحَمدُ ——— کون بھی پڑھے، بڑی مشکل ہے .... کسی اور زبان کی ہے"

بالکل اس طرح جیسے یہ فقرہ اُسے ناگوار گذرا، آن کی آن میں کتاب رحل سے پھسل کر مچان سے ٹھکراتی ہوئی الماری کے اوپر آ رہی..

..... انوری دو ایک پل تک سانس روکے بیٹھی رہی ......

اب میں اسے کس طرح اٹھاؤں گی اتنی بھاری ہے یہ کتاب،

میرے تو اچھے سے بھی نہیں اٹھیگی .... اب کیا کروں؟

..... اب کیا کروں؟"...... انوری سوچا کی۔

شام کا وقت ہو گیا، کمرے میں تاریکی پھیلنے لگی"

دفعتاً انوری کو کتاب کے پہلے صفحے میں سے روشنی کی ایک شعاع

نکلتی نظر آئی ——— ایک پاکیزہ صورت سفید ریش بزرگ کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں کوڑا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا خون میں لتھڑا ہوا دل ......

انوری نے گھبرا کر بھاگنے کا ارادہ کیا مگر تاریکی سارے کمرے پر مسلط ہو چکی تھی۔ جاتی کس طرح ....

سفید ریش بزرگ کا چہرہ چمک رہا تھا خوف زدہ لڑکی نے گردن موڑتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا ——— چہرہ بڑھنا شروع ہوا ——— بڑھتا گیا بڑھتا گیا یہاں تک کہ بہت بڑا ہو گیا .... اب اس روشن چہرے کی آنکھیں کھلیں .. .. انوری ہکا بکا کھڑی دیکھ رہی تھی ——— وہ گھبرا کر چیخ مارنے کو ہی تھی

سفید ریش بزرگ نے آہستہ سے کہا —— "انوری"

خوف کھائی ہوئی لڑکی ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی

—— جی —— ہی ہی —— جی ہاں —— میں نے ..... جان کر ..... کتاب نہیں گرائی ..... ہی ہی ..... ہی ہی ..... اچھی"

آواز آئی تم ڈرو نہیں"۔

"جی نہیں میں ڈرتی نہیں ..... ہی ہی ..... میں ڈرتی نہیں ..... ہی ہی ..... ہی ہی ..... ہی"

اور اس کی آنکھیں بزرگ کی سفید براق عبا پر گڑی ہوئی تھیں —— کبھی کبھی وہ ان کی صندلی کھڑاؤں پر بھی ایک نگاہ ڈال لیتی —— تسبیح پھراتے ہوئے ہاتھ بھی اسے نظر آ رہے تھے۔ مگر چہرے کی طرف ..... چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ گھبراتی تھی۔ ڈرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو میں آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں اور یہ شخص فوراً میرے پیٹ میں اتر جائے

"میرے قریب آؤ —— انوری ڈرو نہیں —— میرے قریب آؤ —— اور جو کچھ مجھ سے مانگنا چاہتی ہو مانگو ....."

انوری کی جرأت بڑھی۔

ہاں آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا آپ آسمان سے اترے ہیں"

اچھا دیکھو لڑکی میں تمہارے تین سوالوں کا جواب دونگا۔ مگر دیکھو صرف تین سوالوں کا کم نہ زیادہ، ہاں کرو۔ سوال کرو۔

انوری نے فوراً کہا۔

"ابا جان مجھے یہاں آنے سے کیوں روکتے ہیں؟"

"کیونکہ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے۔ تم ابھی اسے سمجھ نہیں سکتیں، بیٹا کتابیں علم کے درخت کے پھل ہیں۔ اور علم اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی"

"اچھائی برائی کا علم کیا ہوتا ہے"؟

"زندگی کا علم"

"اچھا تو میری زندگی اچھی ہوگی یا بری"؟

"ایسا معلوم ہوا جیسے سفید ریش بزرگ جھرجھری لے رہے ہیں گو دیکھنے والی کو اس کا احساس نہیں ہوا۔

"دیکھو عزیز نونہال یہ تیرا تیسرا اور آخری سوال ہے۔ خوب سوچ سمجھ لے۔ کیا تو اس کے بدلے کوئی اور سوال نہیں پوچھ سکتی؟ میں تجھے اور بہت سی باتیں بتا سکتا ہوں"

لیکن انوری نے اور جما کر کہا۔

"نہیں میں تو صرف اسی سوال کا جواب چاہتی ہوں"

"تمہاری بچی دیکھو تو پچھتاؤ گی"

انوری کچھ جھجکی مگر پھر جی کڑا کر کے کہا۔

آپ بتا دیجئے آپ کو اس سے کیا۔ وعدہ کر چکے ہیں آپ دیکھئے

(۳)

سفید ریش بزرگ نے اپنا وہ ہاتھ جس میں خون سے لتھڑا ہوا دل تھا آسمان کی طرف اٹھایا، خون کے قطرے گرنے لگے۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ پہلے تو قطرے گرتے رہے پھر دھار بندھ گئی۔

انہوں نے کہنا شروع کیا۔

ننھی بچی میں زندگی کی کتاب کھول کر تیرے سامنے رکھ سکتا ہوں، اور تجھے دکھا سکتا ہوں کہ کس طرح زندگی ...... اور کیونکر ...... اور کن حالات میں ....

"مگر تیری عمر ابھی بہت کم ہے، آہ! کس دل سے تجھے تکلیف میں مبتلا کروں .... آہ!

سن ایک اجڑے ہوئے چمن کے نونہال سن! —— ایک مسلمان کے جگر گوشے سن ....

"تیرا بچپن اچھی طرح سے گزر رہا ہے، ماں باپ تجھے سینوں پر لٹاتے ہیں، اور ایک دنیا کی نعمتیں تیرے لئے مہیا کرتے ہیں! خدا نہ کرے خدا نہ کرے اگر وقت آپڑے تو تیرے لئے جان تک بھی دینے سے گزیز نہ کریں ...... مگر ...... یہی ماں باپ ..... یہی ماں باپ جن کی تو لاڈلی ہے جن کی آنکھوں کا تارا ہے۔ یہی ماں باپ اپنے ہاتھوں سے تجھے جہنم میں جھونک دینگے —— تیری شادی کے وقت یہ آنکھیں بند کر لیں گے" دولت کی لوٹنا میں تجھے پاپی بر کے ہاتھوں میں سونپ دینگے ...... تیری شادی ہوگی ...

... خانہ آبادی کے لئے نہیں ...... خانہ بربادی کیلئے...

برباد ہونے کے لئے، زندگی میں موت کا مزا چکھنے کے لئے تیرا ہاتھ ایک نااہل مرد کے ہاتھ میں دیدیا جائیگا۔ ایک جواری ڈھنڈاری شرابی مرد کے ہاتھ میں۔

اول اول امید اور تمنا کے طلسمی پردے تیری آنکھوں کے آگے دھوکے کی ٹٹیاں رکھیں گے، میری بچی تو امید کے سہارے پر جیئے گی۔ مگر آہستہ آہستہ حقیقت سنگین حقیقت اپنا خوفناک چہرہ دکھانا شروع کردیگی۔ جن چیزوں کی تجھے پہلے سے خواہش تھی اور جن کو حاصل کر لینا تو نہایت آسان سمجھے بیٹھی تھی وہ اب کوسوں پرے نظر آئینگی امید پر سے جب طلسمیت کا رنگ اڑجائیگا تو وہ تیرے سامنے عریاں تریں صورت میں آجائینگی۔ اس وقت تو دیکھے گی، کہ یہ امید نہیں ہے —— رنگ چڑھائی ہوئی یاس ہے۔

"اپنے خوابوں کی بربادی تجھے پریشان رکھے گی —— تو مسرت کے پیچھے دیوانہ وار دوڑیگی —— خوشی حاصل کرنے کے لئے ان تھک قربانیاں کریگی اور کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوگا کہ بس اب لافانی خوشی حاصل ہوئی، بس اب خوشی کے دروازے ہی پر کھڑی ہوں ایک قدم اٹھایا اور اندر داخل۔ مگر مسرت ....

پھی مسرت کبھی حاصل نہ ہوسکیگی۔ حصول مسرت کی تلاش میں تیری کوششوں کے ہاتھ دیوانہ وار فضائے بعید میں بلند ہونگے کہ خوشی کے ہیولے کو زندگی کے سینے سے پیوست کرلیں، مگر تھک کر واپس لوٹ آئیں گے —— اسوقت تو ایسا محسوس کرے گی جیسے آسمان پر سے زمین پھینکی جارہی ہے۔ ہر نئے خواب آرزو کے لئے تجھے نئے امتحان مصیبت کا سامنا کرنا ہوگا ....

موت کا دن زندگی کے سب دنوں سے زیادہ خوشگوار دن ہوگا وہ دن جب تیری مٹی ٹھکانے لگیگی" ......

لتھڑے ہوئے دل سے جو سفید ریش بزرگ کے ہاتھ میں تھا خون کی ایک لمبی پھوار نکلی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے دل رو رہا ہے۔

" تیرے دل میں محبت کی موجیں اٹھیں گی مگر ان موجوں سے کھیلنے والا کوئی نہ ہوگا۔ ایک اجنبی سا جذبۂ رومانیت کا ایک احساس تیرے سینے میں پیدا ہوگا۔ یہ جذبہ یقین دلائیگا کہ خوشی کا دن نزدیک ہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوگا صرف اس مٹے ہوئے جذبہ کی یاد ایک مدت تک تیرے دل کے لئے تازیانہ بنی رہیگی —— ہر مرتبہ جب تو اپنے رنگین خوابوں کو یاد کریگی، ایک بے چینی، ایک چبھن، ایک کاوش محسوس ہوگی ...... محبت! محبت سے کسی انسان کا دل خالی نہیں، تیرا سینہ بھی اس امانت سے شرف اندوز ہوگا ...... مگر آہ ...... صرف آنسوؤں اور آہوں کی یادگار چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کو رخصت ہوجانے کے لئے .....

میں کہتا تھا میری بچی یہ سوال نہ کر ...... تو ابھی نہیں سمجھ سکتی وہ وقت کیا ہوگا! ....

خون میں لتھڑا ہوا دل پھولا جاتا تھا جیسے اب پھٹا! اب پھٹا ....

خاوند کی لاپرواہی تیرے لئے عذاب جان ہوگی —— اپنے منہ سے تو کہے گی نہیں، اور سننے والا بھی کون ہوگا جو تیری کہن سنے، مگر یہ احساس کہ اب میرا جینا بیکار ہے، مرض بنکر تیرے رگ و ریشے میں سرایت کرجائیگا ..... لوگ ابر کہتے رہیں گے —— اے ہے بوا تم تو سوکھ کر بالکل کانٹا ہوئی جاتی ہو ——

خون کا تو بالکل نام ہی نہیں رہا تمہارے جسم میں کا ہے کے فکر لگا رکھے ہیں اپنی جان کو" ——— مگر کوئی نام کا نہ سکو مرض کی اصلی وجہ تشخیص کر کے اس کا مداوا نہیں کریگا کسے فرصت ہوگی جو یہ سوچیگا کہ تو خاوند کی نظر التفات کی پیاسی ہے . . . .

اور وہ جس کے پیچھے تیری یہ حالت ہوگی، وہ . . . . . . وہ دوستوں سے شراب کباب اڑائیگا، شاہدان بازاری کا ناچ دیکھیگا، ان کے راگ رنگ میں شریک ہوگا، دنیا کے لطائف سے دل بہلائیگا، تو دنیا کے مزے لوٹیگا، عورتوں کے ذائقے چکھیگا . . . اور تیری طرف کبھی توجہ بھی نہ کرے گا۔

ڈانسنگ ہال کی سائیڈ پر بیٹھا اس کی نظروں میں شہوت بھری ہوگی، شاہدان بازاری اس کی آنکھوں میں سما چکی ہوں گی۔ تو خود اس کے گھر کو سنبھالے بیٹھی ہوگی، اس کی نگاہوں میں بھوک جھلکتی، تو اپنے ننگ و ناموس کی قربانی پر اس کی بقا کے نسل کی ذمہ داری لے چکی ہوگی، اس کے بھلا کر رہی مصروف کی ہوگی . . . " وہ ہاتھ میں سفید ریش بزرگ کوڑا سنبھالے ہوئے تھے غیر ارادی طور پر بار بار اٹھ رہا تھا، لہراہٹ سے کوڑا بار بار تنتا تھا ——— گویا ابھی جاکر اس مرد کی چمڑی ادھیڑنے والے ہیں۔

" تیری اس کلفت کا مداوا قدرت کی طرف سے ہوگا۔ تیرے ہاں اولاد ہوگی۔ ماں سنکر تو سمجھے گی کہ اب سکھ مل گیا، خاوند نہ سمجھا نہ سہی اولاد تو سمجھے گی . . . . بڑی چاہت سے بڑی محبت سے تو بیٹے کو پالے گی، آپ گیلے میں سوئیگی اسے سوکھے میں سلائیگی، اپنی جان پر ہزار آفتیں لے گی مگر بیٹے کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیگی۔ خدا کی درگاہ میں ہر وقت دست بدعا رہیگی کہ الٰہی میرا لال جیئے، بڑھے، پروان چڑھے جو میرے دن پھریں . . . .

"مگر وہ مایوس ہوگی . . . .

"کیا بچہ کم سنی میں انتقال کر جائے گا

"نہیں

وہ جیئے گا جوان ہوگا، مگر باپ کی لاپرواہی سے بگڑ جائیگا۔ آوارگی اختیار کریگا، بروں کی صحبت میں بیٹھے گا، بدمعاشی کو اپنا شعار بنائے گا۔ دنیا میں بھکیا ہوگی۔ سب تھو تھو کریں گے ذلت ہوگی رسوائی سے پالا پڑیگا، شراب خوار، بد اطوار، بدکار باپ بدمعاش، جواری نالائق بیٹے کو مار پیٹ سے درست کرنا چاہے گا۔ مگر شاخ تو مڑ سکتی ہے کہیں درخت کا تنا بھی موڑے سے مڑا ہے . . . .

اس وقت تو روئیگی، سر کو پکڑ کر روئے گی، تیرا دل اندر سے ڈوبیگا مگر تو بے بس ہوگی . . . . . درد، دل میں درد اٹھیگا ٹیسیں اٹھیں گی، بے بس ہوگی . . . . . آفات کے طوفان میں تیری کشتی ڈگمگا رہی ہوگی . . . .

لخت جگر ہوا دل ہوتے ہوتے عزیزوں سے الگ ہو جاتے . . . .

اس وقت وہ خون میں نہایا ہوا نظر آتا تھا

اس وقت کوئی تیرا ساتھ نہ دے گا۔ وہ لوگ جو تجھ سے محبت کرتے تھے، وہ لوگ جو تیری رفاقت کا دم بھرتے تھے، وہ لوگ جو تجھ سے رشتہ ظاہر کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے ——— اس وقت تجھ سے پہلو بچائیں گے . . . .

تو شکایت کریگی، وہ جواب دینگے "بوا تمہارے بیٹے کا چال چلن خراب ہے، تم سے ملنے میں ہماری بدنامی ہوتی ہے، ہمارے گھروں میں بہو بیٹیاں ہیں ——— ان کا کہاں ٹھکانہ لگے گا۔ تم ہی بتاؤ . . . . . کل کلاں کو کسی نے کہ تمہاری بیٹی تو . . . . . .

ماں باپ کی موت کا غم الگ ستائیگا ——— اولاد کے مستقبل کا خیال الگ کاٹے کھائے گا . . . . غرض تو ہوگی اور ایک دنیا کے رنج، ایک دنیا کے تفکرات، ایک دنیا کی بلائیں ایک دنیا کی مصیبتیں . . . .

ہائے . . . . . . آئے . . . . . آہ" خوف زدہ لڑکی دیوانوں کی طرح چیخنے لگی "ہی ہی . . . . ہی ہی" گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اس نے سفید ریش بزرگ کی عبا کا دامن پکڑ لیا۔ "نہیں . . . . نہیں . . . . اچھی کر دیجئے ایسا نہیں ہوگا"

التجا کے طور پر اس نے ہاتھ اوپر اٹھائے ——— صفحہ الٹ گیا، کتاب بند ہوگئی۔

سفید ریش بزرگ غائب ہو گئے . . . . .

(۴)

عین اس وقت دروازہ کھلا، بتی لئے ہوئے کوئی داخل ہوا۔
کسی نے سوئچ دبایا۔ کھٹ سے آواز آئی۔
روشنی ہوگئی۔

اور انوری نے معمول سے زیادہ سخت آواز میں اباجان کو کہتے سنا۔

"شریر تو یہاں گھسی ہوئی ہے سارے گھر میں ڈھونڈ مارا آپ یہاں بتی بھی گل کر رہی ہیں!"

انوری اباجان کے غصہ سے بہت ڈرتی تھی اور کسی وقت وہ اس طرح ڈانٹتے تو انوری غسل خانہ میں جاکر چھپ جاتی مگر اس وقت اباجان کے غصے سے بھی زیادہ خطرناک چیز اسے ڈرا رہی تھی۔

باپ کی آواز کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اباجان کی صورت کے تصور میں اسے اپنے خراب مستقبل کی تصویریں چلتی پھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی سخت کرخت آواز میں اسے آنے والے طوفان کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی ......

دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی انوری کو باپ نے پچکار کر سہارا دیا
"اباجان خدا کرے مجھے ابھی موت آجائے خدا کرے میں ابھی مر جاؤں۔

"کیا بات ہے بیٹا کیا بات ہے ——— روؤ نہیں .... کیا ہوا"
بہتیرا پوچھا مگر انوری کوئی جواب نہ دے سکی ....
کامل ایک گھنٹے تک وہ ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔
آخر باپ نے ساری کہانی سنی۔
انوری نے سنایا سارا قصہ سنایا مگر عجیب مایوسی کے لہجے میں ایک ... الگ عورت کے لہجے میں۔

باپ نے سنا۔ پہلے پہلے اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر جوں جوں قصہ آگے چلتا گیا اسکے چہرے پر سنجیدگی کے آثار طاری ہونے لگے۔ جب قصہ ختم ہوا تو اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور چہرہ زرد تھا۔

پریشان لڑکی کے ماتھے پر سے سیاہ نرم نرم بالوں کے گچھے ہٹاتے ہوئے اس نے کہا

"بیٹی تم ان باتوں کا کچھ خیال نہ کرو۔ بھول جاؤ ان باتوں کو تم"
"مگر اباجان کیا یہ باتیں صحیح ہیں ...."
"ہاں بیٹی بالکل صحیح"

"تو کیا میری زندگی ایسی ہی ہوگی"، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

تم روؤ نہیں۔ پہلے میری بات سن لو۔ یہ باتیں بالکل صحیح ہیں۔ دنیا کو آدمیت سے چھڑانے والے آقا کی ساری امت آج باطل پرستی میں گرفتار ہے ہر مسلمان بچی کی زندگی آج خطرے میں ہے۔ والدین کی لاپرواہی سے نہ معلوم کتنے انمول لال گدڑیوں میں خاک ہو رہے ہیں۔ مگر تم خوش نصیب ہو کہ تم کو بشارت ملی۔ تمہارے والدین کو رب العزت کی درگاہ میں سجدہ شکر لازم ہے کہ اس نے اپنے اکمل پیغام مجسم کرکے تمہاری آنکھوں کے سامنے دکھلا دیا اور ہمیں آنے والے خطرات سے پیش از وقت آگاہ کر دیا۔ اب ہم تمہاری شادی دیکھ بھال کرکے کرینگے ہم تمہیں اندھا دھند بھاڑ میں نہیں جھونک دینگے مالدار نہ ہو نہ سہی، مگر جس لڑکے کو ہم تمہارے لئے انتخاب کریں گے وہ ہڈی چمڑی سے درست، خوبرو سے شریف اور محبت کرنے والے دل کا مالک ہوگا۔

(مظہر انصاری)



شاعر سے خطاب

یہ شعلے جو تڑپتے ہیں ترے پہلوئے مضطر میں
یہی دوڑائینگے برقِ عمل ملت کے پیکر میں

زمیں سے آسماں تک ایک ہی قانونِ فطرت ہو
عیاں ہے مہر سے جو سوز وہ پنہاں ہے اخگر میں

مٹایا جس نے یہ قانون وہ خود مٹ گیا آخر
وہ شامل حلقۂ نشار میں ہو یا سمندر میں

تری منطق الگ تاویل انوکھی فلسفہ مبہم
بتا تو ہی کوئی تجھ سا ملے گا ہفت کشور میں؟

نشاطِ زندگی کے رمز تو سمجھے تو کیا سمجھے
تجھے تفسیرِ غم ملتی ہے اوراقِ گلِ تر میں

یہ قبل از وقت مایوسی ہی تو دشمن خرد کی ہے
تجھے معلوم ہے لکھا ہے کیا تیری مقدر میں؟

اگر تو منتہائے زیست یہ سمجھا تو کیا سمجھا
کہ تو بیٹھا رہے صبح و مسا پہلوئے دلبر میں

یہ میدانِ عمل ہے تو نے اس کو کھیل سمجھا ہے
اسی کا ایک رُخ ہے اور کیا رکھا ہے محشر میں

تجھے تعمیرِ ملت کے لئے تیار ہونا ہے
خدا جانے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے دم بھر میں

مگر تو اپنے اشکوں کی ضیا پاشی پہ نازاں ہے
ترا بس ہو تو ان کو ٹانک دے خورشید خاور میں

تری فریاد کے تیروں سے چرخِ پیر نالاں ہے
جو تو چاہے تو رخنے ڈال دے سدِّ سکندر میں

تری چوٹی کے مضموں بھی عجب چوٹی کے مضموں ہیں
تجھے الجھا دیا ہے حلقۂ زلفِ معنبر میں

تری باریک بینی لے معاذ اللہ معاذ اللہ
فلک کو لا بٹھائے تو حبابِ ساغر میں

زمانے کی روش بدلی زمینِ شعر بھی بدلی
مگر اب تک پڑا ہے تو غزل گوئی کے چکر میں

تو خود بحرِ سخن کے موجِ پیچاں سے الجھ بیٹھا
ہزاروں گوہرِ نایاب بھی تھے اس سمندر میں

خدا کا نام لے اٹھ ملتِ بیضا کی خدمت کر
بجز آورد کیا رکھا ہے اس پارینہ دفتر میں

اگر تو شاعرِ فطرت ہے، دے پیغام بیداری
وہ جوہر لا درخشندہ تھے جو حالی و اکبر میں

تری غم دوستی تجھ کو سنبھلنے ہی نہیں دیتی
تجھے تو نیند آ جاتی ہے خود آغوشِ خنجر میں!!

انھی جذبات سے میدانِ ہمت سر کریگا تو؟
اسی مردہ دلی سے زندگی کا دم بھریگا تو؟

شاعر جانسوز

غزنی کی تباہی کا عبرت ناک افسانہ

۱

دارالسلطنت غزنی جہاں کسی وقت سبکتگین و محمود کا کوس فرمانروائی بجتا اور پرچم شہنشاہی لہراتا تھا۔ جہاں بڑے بڑے سرکشوں کے سر خم ہوتے تھے جس کا دبدبہ کسی زمانہ میں اطراف عالم پر طاری تھا اور جس کے در و دیوار اب تک فردوسی و عنصری کے روح پرور نغموں سے گونج رہے تھے ـــــ ایک لشکر جرار اسی غزنی کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔

سلطان محمود کی رحلت کو عرصہ گزر چکا تھا اور سبکتگین کا قائم کیا ہوا ہمیشہ کے لئے گل ہونے والا تھا۔ محمود کے جانشینوں کی خانہ جنگی اور امرائے دربار کی سیاست اور باہمی بغض و عناد نے دولت غزنویہ کو حالت سکرات میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس وقت اس جسد میں صرف ایک رمق باقی تھی جسے خارج کرنے کے لئے ایک خفیف ٹھیس درکار تھی وہ بھی قانون قدرت کے مطابق دنیوی اسباب کے ماتحت غور کی مردم خیز سرزمین سے ایک طوفان مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کی رو میں محمودی جاہ و جلال خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا یہ لشکر غور کے ایک سردار سیف الدین سوری کی سرکردگی میں غزنی کی فتح کے لئے گرمجوشی سے جد و جہد کر رہا تھا۔

۲

ملک عزالدین حسین والی غور کے سات بیٹے تھے جو "ہفت اختر" کہلاتے تھے۔ ان میں سے چار زیادہ مشہور ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں! قطب الدین محمد "ملک الجبال" یا "شاہ کوہستان"، سیف الدین سوری۔ علاء الدین حسین اور بہاء الدین سام۔ عزالدین کی وفات پر اس کی مملکت اس کے بیٹوں میں منقسم ہوگئی۔ سوء اتفاق سے ملک الجبال کسی بات پر اپنے بھائیوں سے ناراض ہوگیا اور ترک وطن کرکے غزنی چلا گیا۔ جہاں اس وقت بہرام شاہ غزنوی سریر آرائے سلطنت تھا۔ لایق آدمی ہر جگہ عزت پاتا ہے چنانچہ ملک الجبال نے بہت جلد اپنی سخاوت و شجاعت و مروت کی بدولت خلق کو اپنی طرف مائل کر لیا "الانسان عبید الاحسان" کے مطابق ایک کثیر جماعت اس کی دوستی و محبت کا دم بھرنے لگی۔ بہرام شاہ بھی اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھنے لگا حاسدوں کو اس کا یہ عروج ناگوار ہوا اور انھوں نے اس کو بادشاہ اور رعایا کی نظروں سے گرانے کے لئے یہ بہتان تراشا کہ قطب الدین ایک بد اطوار و جاہ طلب آدمی ہے اور اس کی بخشش و خیرات کا واحد مقصد یہ ہے کہ بادشاہ کے دربار میں تقرب حاصل کرکے اور رعیت کو اپنا ہمنوا بنا کر حکومت کے خلاف خروج کرے اور دولت غزنویہ کا تختہ الٹ دے۔ بہرام شاہ جو ایک کوتاہ اندیش و کم فہم آدمی تھا ان بیہودہ مفسدوں کی آتش زنی سے مشتعل ہوگیا اور ان کو حکم دیدیا کہ جس طرح مناسب خیال کرو اس مار آستین کا سر کچل ڈالو۔ یہ اجازت پاکر انھوں نے ایک روز شربت میں زہر ملاکر شہزادہ کو دیا۔ جس کو پیتے ہی اس بے گناہ کی انتڑیاں نکل پڑیں اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ اہل دربار نے حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کی بہت سعی کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ اور اس المناک حادثہ کی خبر برق سرعت سے غور و مضافات میں منتشر ہوگئی۔ سیف الدین سوری نے اپنے برادر مرحوم کا انتقام لینے کی نیت سے ایک فوج کثیر فراہم کرکے غزنی پر یورش کی۔

۳

غزنی میں سلطان سیف الدین سوری سیاہ و سپید کا مالک تھا اور بہرام شاہ ایک جلاوطن مجرم کی طرح پہاڑوں اور وادیوں میں حیران و سرگرداں مارا مارا پھرتا تھا۔ سیف الدین نے دل کھولکر اپنی سپاہ پر انعام و احسان کی بارش کی اور اعیان و ارکان دولت کو الطاف خسروانہ سے سرفراز کیا جملہ امراء و سادات غزنی نے اس کی اطاعت کی اور اس کو اپنی ہمدردی و تلون

اور وفاداری کا یقین دلایا۔ سلطان سیف الدین نے ان پر کامل اعتماد کیا اور اپنے قدیم احباب و اقارب کو غور واپس جانے کی اجازت دیدی۔ اب اس کے گرد سید مجدالدین موسوی وزیر اور چند غوریوں کے سوا تمام غزنوی اکابر کا ہجوم تھا جو ظاہراً اس کی ہواخواہی کے دعویدار تھے مگر درپردہ بہرام شاہ کو تخت حکومت پر بحال کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ ادھر بہرام شاہ بھی سست دل ہو کر بے فکر نہیں بیٹھا تھا۔ بلکہ اپنی گم شدہ سلطنت حاصل کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔

۴

جاڑے کا موسم تھا۔ سردی کی غیر معمولی شدت نے اہل افغانستان کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ برف باری کا یہ عالم تھا کہ سڑکوں اور میدانوں پر ہر جگہ چاندنی بچھی ہوئی نظر آتی تھی۔ سربفلک پہاڑ سفید پوشاک میں ملبوس اپنے پورے وقار و تمکنت سے کھڑے ہوئے زبان حال سے اپنے خالق یعنی فاطر السمٰوات والارض کے جلال و جبروت کی گواہی دے رہے تھے تمام دریا یخ سے مسدود ہو گئے تھے۔ کاروبار کی سرد بازاری تھی اور آمد و رفت کی دشواری۔

غزنی میں کامل امن و امان تھا۔ غزنوی خاندان کا ستارہ ڈوب چکا تھا اور غوریوں کا آفتاب نصف النہار پر اپنی ضیا باری سے دشمن کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

سیف الدین سوری اپنے قصر میں داد نشاط دے رہا تھا کہ دفعتہً وزیر نے یہ خبر وحشت اثر گوش گذار کر کے اس کو خواب غفلت سے بیدار کیا کہ "بہرام شاہ غزنویوں، خلجیوں، اور صحرا نشینوں کی ایک سپاہ گراں کے ہمراہ دارالحکومت کی طرف کوچ کر رہا ہے اور اس وقت شہر سے صرف دو فرسنگ کے فاصلہ پر ہے اور چشم زدن میں یہاں پہونچ جائیگا" یہ سن کر سیف الدین سوری کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ گھبرا کر اٹھا اور فوراً اہل دربار کو طلب کر کے ایک مجلس شوریٰ منعقد کی۔ سیف الدین کی ذاتی رائے یہ تھی کہ بحالت موجودہ برسر میدان نبرد آزما ہونا ہرگز قرین مصلحت نہیں ہے کیونکہ مخالف کی فوج قوی اور میری جماعت کمزور ہے اور برف باری کے سبب سے غور سے کوئی کمک نہیں آسکتی اس لئے بغرض مدافعت فی الحال کوئی پناہ ڈھونڈنی چاہیئے۔ مگر اس کے منافق۔ بدباطن و خود فروش گندم نما غزنوی امرا نے اس رائے کی مخالفت کی اور جنگ کی ترغیب دی۔ ناچار سیف الدین اپنے وزیر و احباب اور غزنوی سپاہ سمیت غنیم کا مقابلہ کرنے کے لئے شہر سے نکلا اور بہرام کے لشکر کے برابر صف آرا ہوا۔ پہلے ہی حملہ میں سیف الدین کے آدمی منتشر ہو گئے اور وہ خود مع وزیر اور چند آدمیوں کے بھاگ نکلا۔ اور ایک محفوظ جگہ پناہ گزیں ہوا لیکن بہرام کے سپاہیوں نے تعاقب کر کے اس کو جا لیا۔ سیف الدین نے تیروں سے ان کو روکا مگر جب ترکش خالی ہو گیا تو مجبوراً اس کو مطیع ہونا پڑا۔

اس کے بعد غزنی میں جو کچھ رونما ہوا اس کو تحریر کرتے ہوئے قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے۔ بہرام شاہ کے حکم سے سیف الدین سوری اور سید مجدالدین موسوی وزیر کے چہروں پر سیاہی مل گئی اور دونوں کو ایک ایک اونٹ پر سوار کر کے ذلت کے ساتھ تمام شہر میں پھرایا گیا۔ بالاخانوں سے لوگ ان کے سروں پر خاک اور نجاست پھینکتے تھے۔ بازاروں میں بچے اور سفید ریش بوڑھے بھی ان پر آوازے کستے شور مچاتے اور تمسخر کرتے تھے اس وقت ان کی مظلومیت دیکھ کر آسمان و زمین تک لرز رہے تھے اور اہل غزنین سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ گوش عبرت سے سنو اور چشم بصیرت سے دیکھو، عزت و ذلت خدائے قادر مطلق کے اختیار میں ہے وہ رحمان و رحیم ہونے کے علاوہ قہار و جبار بھی ہے۔ اس کے نبیؐ کا ارشاد ہے کہ قوم کے اس سردار کی عزت کرو جو اپنے مرتبے سے محروم ہو جائے۔ تم ایک ایسے نیک صفات، عادل و شجاع بادشاہ کی ایسی شرمناک تذلیل و تضحیک کر کے پاداش عمل سے نہیں بچ سکتے۔ اس کا خون رنگ لائیگا اور تم کو بہت جلد خوار و رسوا کر کے دنیا کو درس عبرت دیگا۔

اس تشہیر کے بعد سیف الدین اور مجدالدین کو پھانسی دیگئی اور اول الذکر کا سر تن سے جدا کر کے سلطان سنجر کے پاس عراق بھیجا گیا۔

۵

علاؤالدین حسین غوری جو رزم میں سبکتگین و محمود کی شجاعت کی یاد تازہ کرتا تھا اور بزم میں فردوسی و نظامی کی ارواح طیبات کو وجد میں لاتا تھا۔ محفل شعرا میں بیٹھا ہوا داد فکر دے رہا تھا کہ ناگاہ ایک ہرکارے نے سیف الدین سوری کا واقعہ جاں فرسا بیان کیا۔ جس کو سن کر علاؤالدین آگ بگولا ہو گیا۔ فرط غضب سے بدن کانپنے لگا۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اسی حالت

میں اس نے یہ آتشیں رباعی کہہ کر غزنی کے قاضی کے پاس ارسال کی ؎

اعضائے ممالک جہاں را بدنم جویندہ خصم خویش و لشکر شکنم
گر غزنی را ز بیخ و بن بر نکنم پس من نہ حسین بن حسین حسنم

علاءالدین نے فوراً ایک لشکر عظیم جمع کیا اور آندھی کی طرح ملغار کرتا ہوا بجلی کے مانند غزنی پر ٹوٹ پڑا۔ بہرام شاہ اس کی آمد کا متوقع تھا۔ کوچ کی اطلاع پاتے ہی سامنے آیا۔ مگر جنگ شروع کرنے سے پیشتر ایک قاصد کے ذریعہ پیغام بھیجا "کہ آپ اپنی حیثیت اور طاقت پر غور کرکے اپنے حال پر رحم کیجئے اور اپنی اور اپنے ہمراہیوں کی جانیں بیکار نہ تلف کیجئے۔ میں آپ کو آپ کے حسب خواہش مہلت دینے کے لئے آمادہ ہوں اس دوران میں آپ اپنی قوت کا اندازہ کرکے کوئی مفید شغلہ اختیار کرلیں اور مزید سلطنت کی طمع میں اپنی آبائی مملکت سے ہاتھ نہ دھوئیں۔ قناعت میں بہرحال حفاظت ہے۔ بے شک دریا میں منافع بہت ہے لیکن خطرہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس لئے سلامتی کے آرزومند کو کنارے پر رہنا بہتر ہے۔ اگر آپ میرا یہ مخلصانہ مشورہ نہیں قبول کرتے تو آپ کی مرضی مگر میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میرے پاس آپ کے استیصال کے لئے ہزارہا پہلوان شیر افگن و فیلان آہنیں تن موجود ہیں۔ ان سے پرہیز کیجئے۔ وما علینا الا البلاغ "

علاءالدین نے قاصد کے زبان سے یہ بیان سن کر جواب دیا کہ اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ میں اس کی کسی دھمکی کو قابل التفات نہیں سمجھتا۔ اس کو اگر اپنے ساز و سامان اور خدم و حشم پر بھروسہ ہے تو مجھکو خدائے ذوالجلال پر توکل ہے جو ظالم و مظلوم کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ میں نے اب تک اس کے کسی آدمی کو خفیف ایذا بھی نہیں پہونچائی۔ اور وہ دودمان غور کے دو مایۂ ناز فرزندوں کی جانیں ناحق لے چکا ہے۔ اس کے پاس اگر فیل ہیں تو میرے پاس خرمیل ہیں جو طرفۃ العین میں اس کے سارے لشکر کو کچل دینگے۔ کل کو دنیا دیکھ لیگی کہ میرے ایک ہاتھ میں خون آلودہ تلوار ہوگی اور دوسرے میں بہرام کا سر۔ کیا حق تعالیٰ کا یہ فرمان اس کے کانوں تک نہیں پہونچا ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطانا فلا یسرف فی القتل انه کان منصورا "

۶

غزنی کا میدان نمونۂ محشرستان بنا ہوا تھا۔ علاءالدین اور بہرام کی فوجیں باہم مصروف پیکار تھیں دونوں طرف اللہ اکبر کے بلند بانگ نعرے آسمان کی خبر لارہے تھے۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ تلواروں کی جھنکار اور مجروحین کے نالہ زار سے ساحت کارزار میں قیامت برپا تھی۔ گرد و غبار سے فضا اس درجہ مکدر ہوگئی تھی کہ کوئی شخص اپنے قریب بھی کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتا تھا سرفروشوں کے سر گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گر رہے تھے اور خون پانی سے زیادہ ارزاں ہورہا تھا۔ تیروں کی بوچھار بہادروں کے سینے کو چھلنی کررہی تھی اور طرفین کے سپہسالار پرجوش نظموں اور تقریروں سے اپنے آدمیوں کے دل بڑھا رہے تھے۔ علاءالدین کے لشکر میں دو سردار بلحاظ شجاعت یگانۂ روزگار تھے۔ دونو کا نام خرمیل تھا اس لئے بر سبیل امتیاز علی الترتیب خرمیل بزرگ و خرمیل کوچک کہلاتے تھے۔ علاءالدین ان کو بجا طور پر بنیاز دربازو تصور کرتا تھا۔ اس وقت اس نے دونوں کو اپنے پاس بلاکر کہا کہ "بہرام نے مجکو اپنے ہاتھیوں سے مرعوب کرنا چاہا تھا۔ لیکن میں نے اس کو یہ جواب دیا کہ اگر تم فیل لاتے ہو تو میں خرمیل لاتا ہوں۔ لہذا تم اس مقابلہ میں میری لاج رکھ لو اور بہرام کے ایک ایک ہاتھی کو زمین پر دے مارو"۔ دونوں نے زمین بوس ہوکر عرض کیا۔ "غلام بسر و چشم ہر ارشاد کی تعمیل کے لئے حاضر ہیں"۔ یہ کہکر دونوں بیچ معرکہ میں مست ہاتھیوں سے زور آزمائی کرنے لگے۔ خرمیل بزرگ نے ایک ہاتھی کے شکم میں خنجر بھونک دیا اور ہاتھی نے جھپٹ کر اس کو اپنے پیروں سے روند دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ڈھیر ہوگئے۔ خرمیل کوچک نے ایک اور ہاتھی کو مار گرایا اور اس کی زد سے صحیح و سالم بچ نکلا۔ اس گھمسان میں علاءالدین غوری کی اولوالعزمی اور شیر دلی قابل دید تھی اور دراصل وہی اپنی سپاہ کی شجاعت اور ثابت قدمی کا باعث تھا۔ بالآخر اس نے اپنی صفوں کو مجتمع کرکے فریق ثانی پر ایسی شدید تاخت کی کہ چشم زدن میں صدہا غزنویوں کو گھاس کی طرح کاٹ کر رکھدیا۔ بہرام شاہ کا بیٹا دولت شاہ بھی اسی حملہ میں کام آیا جس سے بہرام کی فوج بیدل ہوکر پسپا ہونے لگی۔ علاءالدین نے اس کا تعاقب کیا اور بڑھ بڑھ کر ایسے وار کئے کہ بہرام غش غش کرنے لگا کچھ دور جاکر بہرام نے از سر نو مقابلہ کیا مگر ہزیمت پائی الغرض اسی تعاقب و فرار کے سلسلہ میں طرفین کے مابین تین سخت لڑائیاں ہوئیں جنمیں ہر بار علاءالدین مظفر و منصور ہوا اور بہرام ناامید ہوکر پنجاب کی طرف بھاگ گیا غزنی میں پھر غوریوں کا علم نصب کیا گیا۔

۷

علاؤالدین غوری نے غزنی میں داخل ہوتے ہی اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ تمام شہر کو جلا کر خاک سیاہ کر دو اور جو سامنے آئے اس کو قتل کر دو۔ چنانچہ ہفت شبانروز غزنی میں آگ لگی رہی اور کشت و خون اور غارتگری کا بازار گرم رہا۔ راوی بیان کرتا ہے کہ اس آتشزدگی کے دوران میں رات اور دن میں تمیز کرنا مشکل تھا کیونکہ دن میں دھوئیں کی کثرت کا یہ حال تھا کہ رات کا شبہ ہوتا تھا اور رات کے وقت آگ کے شعلوں کی روشنی رات کو دن بنا دیتی تھی علاؤالدین کے حکم سے سلطان محمود غزنوی اور اس کے دو جانشینوں مسعود اور ابراہیم کے سوا تمام سلاطین غزنویہ کی قبریں کھود دی گئیں اور ان کی ہڈیاں جلا دی گئیں غوری سپاہی جس مرد کو دیکھتے تھے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیتے تھے۔ القصہ غزنی میں سات دن مسلسل تلوار چلی گلی کوچوں میں خون کے دریا بہہ گئے۔ ہر جگہ لاشیں اور شعلے نظر آتے تھے جنگلی درندے اور شکاری پرند لاشوں کو تکا بوٹی کر رہے تھے اور جابجا ہڈیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ادھر یہ قتل عام ہو رہا تھا ادھر قصر شاہی میں، علاءالدین غوری شراب و عشرت میں مشغول تھا اور اپنی مدح میں اشعار تصنیف کر کے صدائے چنگ پر گا رہا تھا۔ آٹھویں روز اس نے یہ نظم کہی؎

جہاں داند کہ من شاہ جہانم — چراغ دودہ عباسیانم
علاءالدین حسین بن حسینم — کہ دایم باد ملک خاندانم
چو بر گلگون دولت بر نشینم — یکے باشد زمین و آسمانم
اجل بازی گر نوک سنانم — امل سقرع زن گرد سپاہم
ہمہ عالم بگردم چوں سکندر — بہر شہرے شہے دیگر نشانم
بران بودم کہ از اوباش غزنی — چو رود نیل جوئے خوں برانم
ولیکن گندہ پیرانند طفلاں، — شفاعت می کند بخت جوانم
بہ بخشیدم بدیشاں جان ایشاں — کہ بادا جان شاں پیوند جانم

اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ اب یہ جدال و قتال موقوف کیا جائے اور بقیہ اہل غزنی کی جان بخشی کی جائے۔ اس کے بعد علاءالدین مع اپنے جملہ لشکریوں کے اپنے بھائیوں قطب الدین محمد ملک الجبال اور سلطان سیف الدین سوری کی تعزیت کے لئے ان کے روضہ پر گیا اور ایک ہفتہ تک وہاں ختمات قرآن اور صدقات کرائے۔ پھر بلاد داور و بست میں جا کر محمود غزنوی کی باقی عمارتوں کو منہدم کیا۔ اور غزنی کے تمام مضافات کو اجاڑ دیا۔ سیف الدین سوری کے وزیر سید مجدالدین کے قصاص میں اس نے غزنی کے متعدد سادات کو قید کر کے غزنی کی خاک سے تو بڑے بھر کر ان کی گردنوں سے باندھے اور انکو اپنے ساتھ فیروزکوہ میں لایا وہاں پہونچکر ان کو قتل کیا اور انکا خون تو بڑوں والی خاک غزنیں میں ملایا اور اس خاک سے فیروزکوہ پر چند برج بطور یادگار تعمیر کئے اپنے صدر مقام میں وارد ہو کر اس نے اپنے مقربوں اور ندیموں کو جمع کیا اور ایک قصیدہ کہہ کر مطربوں کو دیا کہ اسے مزامیر کے ساتھ گا کر سناؤ؎

آنم کہ ہست فخر ز عدلم زمانہ را
آنم کہ ہست جور ز بذلم خزانہ را
انگشت دست خویش بدنداں کند عدو
چوں بر زکماں نہم انگشتوانہ را
چوں جبت خانہ خانہ کمیتم میان صف
دشمن ز کوئے باز ندانست خانہ را
بہرام شہ بکینۂ من چوں کماں کشید
کندم بہ کینہ از کمرا و کنانہ را
پشتی خصم گرچہ ہمہ رائے ورانہ بود
کردم بگرز خرد سرائے درانہ را
کیں توختن بہ تیغ در آموختم کنوں
شاہان روزگار و ملوک زمانہ را
اے مطرب بدیع چو فارغ شدم ز جنگ
برگوی قول را و بیار آں ترانہ را
دولت چو بر کشید نشاید فرو گذاشت
قول مغنی و مے صاف مغانہ را

ان قہرمانی کارناموں کی وجہ سے وہ تاریخ میں آج تک "جہاں سوز" کے لقب سے مشہور ہے۔

۸

علاءالدین حسین غوری جہانسوز نے تخت فیروزکوہ پر متمکن ہو کر اپنی مملکت کی ترقی پر توجہ کی اور سلطان سنجر کے دربار میں نذریں بھیجنی بند کر دیں بنا بریں سنجر نے اس پر حملہ کیا۔ ہرات کے قریب دونوں لشکروں کا تصادم ہوا

جس میں سنجر فتحیاب ہوا اور علاء الدین قید کر دیا گیا۔ سنجر نے اس کے پیروں میں لوہے کا تختہ بند جکڑ وا دیا۔ علاء الدین نے کہلا بھیجا کہ میرے ساتھ وہی سلوک کیجئے جو میں آپ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آپ کے واسطے ایک زریں تختہ بند تیار کر رکھا تھا۔ سنجر نے یہ بات منظور کی اور اسی کے تیار کردہ تختہ بند کو اس کے پیر باندھ دیئے اور اس کو اونٹ پر بٹھا کر اپنے ہمراہ لے گیا۔ چونکہ علاء الدین جہاں سوز کی بصیرت افروز شاعری مشہور آفاق ہو چکی تھی اور اس حوالی میں اس کی لطافت طبع کا پرچا زبان زد تھا۔ اس لئے دارالحکومت میں پہنچکر سنجر نے اس کو رہا کر دیا۔ بڑے اعزاز و احترام سے اپنے دربار میں طلب کیا اور بیش قیمت جواہر کا ایک طبق انعام دیا۔ علاء الدین جہاں سوز نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ؎

بگرفت و نکشت شہ مرا در صف کیں   ہر چند بدم کشتنی از روئے یقیں
بخشید مرا یک طبق در ثمیں   بخشایش و بخشش جہاں بود و چنیں

سلطان سنجر نے اس کو جوہر قابل پاکر اپنا خاص ہم جلیس، حریف و ندیم بنالیا اور ہر طرح اسکی حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت سے سنجر کی بزم سخن میں علاء الدین جہاں سوز کی موجودگی سے چار چاند لگ گئے ایک دن علاء الدین نے سلطان کے کف پا پر نظر کی تو ایک بڑا تل دکھائی دیا اس نے فی الفور یہ رباعی پڑھی ؎

اے خاک سم مرکب تو افسر من   واے حلقہ بندگی تو زیور من
چوں خال کف پائے ترا بوسہ زدم   اقبال ہمی بوسہ زند بر سر من

سلطان سنجر نے خوش ہو کر اس کو بہت ساز و سامان۔ خزانہ اونٹ۔ گھوڑے اور بکرے انعام دیئے اور کہا۔ "اے علاء الدین! میں تجھکو اپنا بھائی سمجھتا ہوں میری طرف سے یہ خزائن و مواشی قبول کر میں تیری سلطنت بھی تجھکو واپس کرتا ہوں۔ اپنے وطن میں جاکر اطمینان سے بادشاہی کر۔"

۹

علاء الدین حسین جہاں سوز کی غیبت میں اکابر غور نے اس کے بھتیجے ناصر الدین محمد مادین کو تخت فیروزکوہ پر بٹھا دیا تھا اور ولایت کسی کے چند سرکشوں نے فساد کرکے ناصر الدین کے دربار میں تقرب حاصل کر لیا تھا۔ اور انعام و اکرام و صدقات کے حیلہ سے اس کا خزانہ اپنے تصرف میں کر لیا تھا علاء الدین جہاں سوز نے جب خراسان سے غور کی سمت کو کوچ کیا تو سب سے پہلے ولایت کسی کا رخ کیا اور وہاں کے باغیوں اور متمردوں سے انتقام لینے کے طور پر اس کے تمام رفیع الشان محلات و قصور جن کی تعداد کئی سو سے متجاوز تھی برباد اور مسمار کر دیئے۔ اس کے بعد فیروزکوہ کا راستہ لیا۔ اس کے وہاں پہونچنے سے قبل ناصر الدین مارا جا چکا تھا علاء الدین جہاں سوز نے تخت حکومت پر جلوس کیا اور اپنی قلمرو کی توسیع میں منہمک ہو گیا اور یکے بعد دیگرے بلاد۔ بامیان۔ تخارستان۔ داور۔ جروم بست وغیرہا سخر کئے اور چھ سال کی جد و جہد سے قلعہ تولک فتح کیا اور اتنی ہی مدت میں قلعہ سیکنی پر قبضہ کر لیا

۱۰

بہرام شاہ کے مرنے پر اسکا بیٹا خسرو شاہ اسکا جانشین ہوا لیکن اسکی سلطنت بہت محدود تھی کیونکہ علاء الدین جہاں سوز کی شمشیر خارا شگاف دولت غزنویہ کی اینٹ سے اینٹ بجا چکی تھی جب خسرو شاہ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ لاہور سے غزنیں پر چڑھائی کی تو علاء الدین جہاں سوز نے اسکو لکھا کہ اگر آپ ہم سے لڑنے کے بجائے مصالحت کر لیں تو بہتر ہوگا اس کی صورت یہ ہے کہ آپ غزنی پر قناعت کریں اور تکیہ باد میرے حوالہ کر دیں اس وقت سلطان سنجر غزنویوں کا حامی تھا اس لئے خسرو شاہ نے اس کی مدد کے بل پر علاء الدین جہانسوز کا مطالبہ رد کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں جہاں سوز نے یہ ابیات لکھکر اسکے پاس بھیجے تھے

اول پدرت نہاد کیں را بنیاد   تاخلق جہاں جملہ بہ بیداد افتاد
ہاں تا ندہی ز بہر یک تکیہ باد   سرتا سر ملک آل محمود بباد

بعد میں جب خسرو شاہ سلطان سنجر کی حمایت سے محروم ہو گیا تو علاء الدین جہانسوز نے اسکو لاہور کی طرف بھگا کر غزنی پر تسلط کر لیا۔
آخر کو ایک روز اس عجیب الخلقت و نادر الزماں سلطان جہانسوز کا پیمانہ حیات لبریز ہو گیا اور اپنے اسلاف کے جوار میں پیوند خاک ہوا۔

۱۱

میں اس مضمون میں علاء الدین جہاں سوز کی شاعری پر تنقید کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ اس مقالہ میں اس کے کلام کے جتنے نمونے (چار رباعیاں اور دو مختصر قصیدے) درج کئے گئے ہیں ان سے قارئین کرام اس کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہو گئے ہوں گے ایک ایک شعر فصاحت و بلاغت میں ڈوبا ہوا ہے۔ جوشش بیان، سادگی سلاست اور روانی کے نقطہ نظر سے اس کا فخریہ کلام اپنا جواب آپ ہے رباعیوں میں بھی اس کا زور و اثر نمایاں ہے اگر علاء الدین جہاں سوز کے کندھوں پر حکمرانی۔ گیتی ستانی کا بار نہ ہوتا اور وہ اپنا تمام وقت فن شعر کے نذر کرتا تو دنیائے سخن میں یقیناً خاقانی۔ نظامی و انوری وغیرہم کا ہمدوش و ہمسر مانا جاتا۔ فقط

صادق الوعدہ

اس زمانے میں کہ مسلم قوم تھی بیدار بخت — پادشہ تھے حضرتِ فاروق بے دیہیم و تخت
عادلِ کامل تھے ہوتی تھی عدالت ایسی سخت — جس طرح تقسیم سی ہر چیز ہوتی ہی دو لخت
تھے حکومت اور سیاست میں بھی بے مثل و نظیر
کانپتے تھے رعب سے جن کے سبھی برنا و پیر

سنیئے اس کو غور سے اک روز کا ہے ماجرا — کے واں دو بھائیوں نے خون کا دعوی کیا
اور قاتل کا نشان و نام بھی بتلا دیا — تھا وہ قاتل اور مجرم پر بڑا سنجیدہ تھا
حضرتِ فاروق نے پوچھا یہ مجرم سے شتاب
سچ بتا تو نے کیا ہے جرم کا کیا ارتکاب

کرتا تھا اس کو ملامت قدرتی ردِ عمل — قدرتی قانون جو اَن مٹ ہے اور بالکل اٹل
سرزنش سے نفسِ لوامہ کی آتی تھی نہ کل — گر چھپا پاتا آج اس کو کب چھپا سکتا تھا کل
فیصلہ ذہنی عمل کا اس نے آخر کر دیا!
جرم کا اقرار کر کے اس طرح گویا ہوا!

خونِ ناحق سے ہوا دامن اگرچہ داغدار — پر گناہِ کذب سے آتا ہے اس بندے کو عار
خود نظر میں اپنی مجرم کا نہیں ہوتا وقار — جھوٹ سے باقی نہیں رہتا کسی کا اعتبار
ہے قصاصِ اسلام کے آئین میں سرتا پا حیات
ہاں مگر للہ سن لیجے دکھی کی ایک بات

بات یہ ہے ہوں امانت کا یتامیٰ کی امیں — غالباً سچ بات پر میری ہوا ہوگا یقیں
مہلت سہ روزہ مل جائے امیر المومنیں — گنجِ مخفیٔ امانت جانتا کوئی نہیں
آپ نے فرمایا جا ان کی امانت پیش کر
ہاں مگر جانے سے پہلے تو ضمانت پیش کر

سن کے وہ لفظِ ضمانت مضطر و حیراں ہوا   سوئے دربارِ خلافت دیر تک دیکھا کیا
دیکھکر پھر حضرت بوذر کو وہ چلا اُٹھا   میری ضامن ہونگے بوذر میں نے ضامن پا لیا

آپ نے پوچھا ضمانت تم کو یہ منظور ہے
بولا انکارِ مدد مردانگی سے دُور ہے

تیسرے دن ہر صحابی حاضرِ دربار تھا   آگیا پھر وہ بھی جو کُل قوم کا سردار تھا
آتے ہی حضرت ابوذرؓ سے یہ استفسار تھا   آگیا آگیا وہ بھی جس کو خون کا اقرار تھا

عرض کی بوذر نے قاتل تو ابھی آیا نہیں
اِک ذرا مہلت مجھے دیجئے امیر المومنیں

حضرتِ فاروق نے چند سے تامل تو کیا   پر نہ قاتل ہی ملا ان کو نہ کچھ اس کا پتہ
سوچ کر کچھ دیر سردارِ خلافت نے کہا   قتلِ ضامن ایسی صورت میں روا ہی ہاں روا

اتنا سُنتے ہی صحابہ مضطرب تھے دنگ تھے
سب کے چہرے زرد تھے بے آب تھے بے رنگ تھے

حشر سے پہلے وہاں اک حشر نو برپا ہوا   چہرۂ بوذرؓ کا نقشہ ان کی آنکھوں میں پھرا
آہ کی نالہ کی ہر جانب سے آتی تھی صدا   جو وہاں تھا "خوں بہا" دینے کو وہ تیار تھا

سُن کے یہ بولے خلیفہ وارثِ مقتول سے
قتل رُک سکتا نہیں اس عذرِ نامقبول سے

قتلِ بوذر کیلئے جلاد اُدھر استادہ تھے   جان دینے کے لئے بوذر ادھر آمادہ تھے
جن کے اخلاقِ حمیدہ کے سبھی دلدادہ تھے   گو بڑے ذی رتبہ تھے پر بے تکلف سادہ تھے

ہر طرف تھی مضطرب کُن سنسنی چھائی ہوئی
حبس سی تھی اک موت کی سی خامشی چھائی ہوئی

یک بیک آواز "ٹھیرو" "ٹھیرو" کی آنے لگی!   ساکت و صامت فضا یکبار تھرانے لگی
دل کی دھڑکن اور حسرت بھی کمی پانے لگی!   جاں فزا امید چہرہ اپنا دکھلانے لگی

دیکھ کر قاتل کو حاضر جان میں جان آگئی
قولِ بوذر، عہدِ قاتل دونوں میں شان آگئی

عذر خواہی دیر سے آنے کی اس قاتل نے کی   عاجزانہ معذرت اس جرم کے قائل نے کی
عزت ایسے صادق الوعد کی سب کے دل نے کی   جاہلِ عالم نے کی ناقابل و قابل نے کی

وارثوں نے بخشدی اس مردِ صادق کی خطا
اے ذکی ایفائے وعدہ کا صلہ اچھا ملا

دو سہرے

[illegible]

[illegible]

ظہور آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہے، وہ اس دنیا سے جہاں پر کذب و ریا حکمرانی کر رہے ہیں، مکر و تلبیس مسلط ہیں، ظلم و خدع کا دور دورہ ہے، مدت ہوئی اٹھ چکا ہے، اُس نے خودکشی کی یہ ایک اٹل اور ناقابل انکار حقیقت ہے، اس نے وہی ریوالور جو اپنی جان کی حفاظت کے لئے اس کو دیا گیا تھا خود پر استعمال کیا، مگر کیوں؟ اس کا جواب ظہور کا خود نوشتہ افسانۂ غم دیگا۔

کسے معلوم تھا کہ ظہور جس کا تعلق پولیس جیسے غیر شاعرانہ اور خشک محکمہ سے تھا اپنے اندر اس قدر حساس دل رکھتا تھا! کون جانتا تھا کہ وہ اکھڑ پولیس والا مغلوب الجذبات ہو کر اس قدر جلد ایک "سراب" کے لئے خودکشی کر لیگا،

ظہور کا پسند خاطر شعر بار بار میرے لبوں پر آ رہا ہے ؎

کیا نزع کی تکلیفوں کا مزا جب موت نہ آئے جوانی میں
کیا لطف جنازہ اٹھنے کا ہر گام پہ جب ماتم نہ ہوا

ظہور نے اس کو عملی طور پر ثابت کر دیا!

میری خواہش ہے کہ یہ نوشتہ خونیں اس ہستی تک پہونچ جاوے۔ جو باعث ہے تمام تباہی کی۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ اس کا اثر کیا ہوگا ؎

فروغ شعلہ خس یک نفس ہے ہوس کو پاس ناموس وفا کیا!

مگر اس طرح میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ اگر اس عورت کے دل میں ایک لمحہ کے لئے یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اس کی بوالہوسانہ رغبت کے مقابلہ میں ظہور کی محبت بلند اور صحابہ کار تھی، اگر اس قتالہ کی آنکھوں سے ظہور کے لئے ایک آنسو صرف ایک قطرہ آب گر گیا اگر وہ ایک لحظہ مختصر کیلئے پشیمان ہوگئی تو میں سمجھ لوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی اور ظہور ایک کامیاب محبت سے سرفراز ہو گیا!

"خادم"

۴ر جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

ابھی ابھی والد صاحب کا خط ملا ہے کہ میری شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ لفظ "شادی" کانوں کے لئے کوئی غیر مانوس لفظ نہیں ہے۔ دنیا میں ہر روز، ایک نہیں۔ بیسوں نہیں، سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیاہے جاتے ہیں۔ اس وقت تک بیاہا جانا میری نگاہ میں ایک معمولی واقعہ تھا۔ مگر آج لفظ "شادی" حسیات کی دنیا لئے ہوئے ہے۔ جس وقت سے خط ملا ہے۔ جسم میں کپکپی سی ہو رہی ہے، اور دل میں عجیب سنسناہٹ سی محسوس کرتا ہوں "شادی" کس قدر عجیب لفظ ہے، ایک جہان نامعلوم میں قدم رکھنا ہے۔ اور پھر ہمارے یہاں کی شادی، یوں کہو کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر دریا میں چھلانگ لگانا ہے، یا یوں کہو کہ شادی ایک جوا ہے جوا، پانسہ پھینکا جاتا ہے اور بازی کا ہارنا یا جیتنا صرف دانوں پر منحصر ہے، مجھے معلوم نہیں کہ میری ہونے والی بیوی کیسی ہے؟ مدت ہوئی آج

سے غالباً دس سال پیشتر میں نے اس کو دیکھا تھا۔ اور اُس وقت مجھے اُس کے صحیح خد و خال یاد نہیں ہیں۔ کس قدر ستم ہے کہ دو شخصوں کو عمر بھر کے لئے باندھ دیا جاتا ہے نکاح کی نہ ٹوٹنے والی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ مگر کس حالت میں، ایک دوسرے سے قطعاً نا آشنا! بالکل بیگانہ!!

۲۰ر جنوری سنہ ۲۹ء

معلوم نہیں کہ جس عصبی بحران میں میرے ایام و لیالی آجکل بسر ہو رہے ہیں کبھی کبھی کسی پر طاری ہوا ہو۔ میرا دماغ محشرستان خیال بنا ہوا ہے، میرے جسم کی رگ رگ یوں معلوم ہوتی ہے کہ جل رہی ہے۔ رات کو بھر دن جاگتا رہتا ہوں۔ کام میں دل نہیں لگتا ہے اور آنے والے عظیم الشان انقلاب کی نسبت سوچ سوچ کر تخیل کی ایک دلپسند دنیا آباد کر لیتا ہوں۔ کاش اس خود ساختہ دنیا میں کوئی واقعیت، کوئی حقیقت ہو، کاش وہ روحانی خوشی جو میں تصور میں حاصل کرتا ہوں میری آئندہ زندگی میں مجھے حاصل ہو جائے،

مجھے حیرت ہے کہ بعض لوگ شادی کے معاملہ میں کیوں اس قدر جلدی فیصلہ کر لیتے ہیں، آسکر وائلڈ ایک جگہ لکھتا ہے "مرد شادی اس لئے کرتے ہیں کہ وہ بیتاب ہوتے ہیں، عورتیں شادی اس لئے کرتی ہیں کہ وہ متجسس ہوتی ہیں، دونوں دھوکہ کھاتے ہیں" - میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہاں تک درست ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ مجھ پر صادق آئے۔ اسی طرح ایک اور انگریز مصنف لکھتا ہے کہ "شادی چند کے لئے نعمت، بہتوں کے لئے لعنت اور سب کے لئے غیر یقینی" میرے لئے اس مقولہ میں صداقت کا ایک جہان مشتعل آباد ہے۔

۳ر فروری سنہ ۱۹۲۹ء

رخصت گذارنے کے بعد واپس آگیا ہوں، وہ انقلاب عظیم جس کا میں سالہا سال سے چشم براہ تھا۔ آخر کار ہو گیا۔ اس قدر قلیل عرصہ میں شادی کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنا میرے لئے مشکل ہے یہ کہہ سکتا ہوں کہ شادی ایک قسم کا مذاق ہے گویا کہ ناٹک کا ایک کھیل ہے جس کا حقیقت سے بہت کم تعلق ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ شادی کا کوئی خوشگوار اثر میری زندگی پر نہیں ہوا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مجھے شادی کے بعد روح افزا سکون حاصل ہوتا۔ مگر مجھ پر اداسی سی چھا گئی ہے۔ گویا کہ کوئی چیز کھو بیٹھا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری آزادی سلب ہو گئی ہے اور مجھے پابہ زنجیر کر دیا گیا ہے۔

کیا ان خیالات کا شکار صرف میں ہی ہو رہا ہوں، یا شادی کا یہ پریشان کن ردعمل ہر ایک پر ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے میں پابند محبت ہو جانا چاہتا تھا۔ کسی کی زلف سے دل کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب جب کہ مجھے ایک عورت سے وابستہ کر دیا گیا ہے، میں ان بندشوں سے پھر آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ مجھ پر مُردنی سی چھا گئی ہے۔ میری آرزوئیں ختم ہو رہی ہیں تمنائیں مرتی جاتی ہیں گویا روح حیات آہستہ آہستہ کھینچتی جا رہی ہے۔ میں اپنے اندر پھر وہی بیقراری اور بے چینی پیدا کرنا چاہتا ہوں ؎

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
اب دل کو اضطراب ہے پھر اضطراب کا

میں اپنی زندگی میں سکون نہیں چاہتا۔ سکون نام ہے موت کا، میں ہر وقت آتش بداماں، رہنا چاہتا ہوں اور یہ شادی میں مفقود ہے۔

۱۰ر فروری سنہ ۲۹ء

آج ممتاز کا طویل خط ملا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس نے شادی کے صرف اس پہلو پر غور کیا ہے جس کا تعلق دنیا داری سے ہے۔ اس کی نگاہ میں شادی کی اہمیت زیادہ اس لئے ہے کہ اس سے بقائے نسل قائم رہتی ہے، مانا کہ کسی حد تک یہ درست ہے، مگر شادی کو صرف بچے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ خیال کرنا بھی کس قدر ظلم ہے۔ ممتاز نے ساز کے اس تار کو ذرا جنبش نہیں دی جس کو میں چھیڑنا چاہتا تھا۔ لکھتا ہے "میں نے اس مسئلے پر آج سے پہلے کبھی غور نہیں کیا۔ اس معاملہ میں میرے پاس نہ کچھ جذبات، کچھ احساسات اور کچھ کیفیات ہیں افکار سے خالی ہوں" آہ! کس قدر خوش قسمت انسان ہے۔ خواہ اس نے شادی کے معاملے میں دھوکہ ہی کھایا ہے۔ مگر یہ تو ہے کہ وہ مطمئن ہے۔ مایوس تو نہیں ہے۔ اپنی ازدواجی زندگی سے میری طرح پریشان تو نہیں ہے۔ اس فقرہ کے جواب میں کہ "کیا وہ آرزوئیں جن کو ہم مدت سے پالتے رہتے ہیں شادی ہونے سے بالکل نہیں مر جاتیں اور ہمارے دل میں ایک قسم کا حسد پیدا نہیں ہو جاتا۔ ایک ایسی چیز کا انتظار جس کے لئے ہم مدت سے چشم براہ تھے ختم ہو کر ہماری زندگی کو غیر دلچسپ اور خشک نہیں بنا دیتا" ممتاز نے لکھا ہے۔ "آرزوئیں پوری ہونے یعنی مر جانے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ تمام عمر کے لئے ہمارے سینہ میں محشر مچانے کے لئے تو نہیں ہوتیں۔ ایک آرزو پوری ہو جاتی ہے تو سیکڑوں اور آ موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے آرزوؤں کے وداع کا غم نہیں چاہیئے۔ اسی سے وہ انتظار جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے یقیناً

ختم ہو جاتا ہے، مگر زندگی غیر دلچسپ نہیں ہو جاتی، اس کے سلسلہ میں ہزاروں انتظار، ہزاروں ارمان، ہزاروں آرزوئیں اپنے اپنے مقاصد کو پکارتی پھرتی ہیں ——"

ممکن ہے کہ ممتاز کا تجربہ اسی قسم کا ہو، مگر میرا تجربہ تو اس سے بہت زیادہ تلخ ہے۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر اچانک فالج گر گیا ہے، جس نے میرے جذبات اور احساسات کو شل کر دیا ہے۔ متعجب ہوں کہ کیا کروں؟ جی چاہتا ہے کہ شادی کی ان کڑی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اور ایک دفعہ پھر شتر بے مہار کی طرح آزاد ہو جاؤں۔ میں اس پابندی سے تنگ آ گیا ہوں اپنے اندر پھر وہی آزادی عمل پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

شادی سے قبل میری چشم تصور کچھ اور دیکھتی تھی۔ جو اس المناک حقیقت سے بالکل مختلف تھا۔ میری اس تباہی۔ اس پریشانی کی تاویل خواہ لوگ کچھ کریں مگر میری نگاہ میں اسکی وجہ لٹریچر ہے، وہ لٹریچر جس کو لوگ "انشائے لطیف" کہتے ہیں۔ کتابوں میں لکھے ہوئے خیالات پڑھ پڑھ کر میں نے اپنے لئے ایک غیر مرئی دنیا بنالی تھی جو سراسر غیر ارضی تھی، جس کی آرزو اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے رہتے ہوئے کرنا انتہا درجے کی بیوقوفی اور حماقت ہے۔

قدرتی امر تھا کہ اس حقیقت کا انکشاف میرے لئے درد انگیز ہوتا۔ کاش مجھی وہ چیز جس کو شادی شدہ لوگ "خوشی اور مسرت" کے نام سے پکارتے ہیں اور جو میری نگاہ میں "سکون یاس" ہے حاصل ہو جائے۔ کم از کم یہ بیتابی۔ یہ اضطراب، یہ جذبات کی جنگ تو ختم ہو جائے۔"

تھی وہ اک شوخ کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

۱۶ر مارچ ۲۹ء

ابھی ابھی رفعت کا خط، اس کا پہلا خط ملا ہے، میری سرد مہری کی شکایت کرتی ہے۔ اور خط نہ لکھنے کی وجہ دریافت کرتی ہے۔ حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس کی جانب سے اس قدر لاپرواہ ہو جاؤں اس قدر بے حس ہو جاؤں کہ وہ خود بخود مجھے بھول جاوے۔ کیونکہ اس کا ذرا سا خیال میری حالت کو بد سے بدتر بنا دیتا ہے۔ میں اسکو بھول جانا چاہتا ہوں، اس کے تصور کو ذہن کے پردوں سے محو کر دینا چاہتا ہوں۔

آہ! میں اپنے دل کو اس کی محبت پر کیونکر مجبور کروں "محبت ہو سکتی ہے۔ کی نہیں جا سکتی"

۱۵ر اپریل ۲۹ء

آج صبح ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے میری منجمد اور ساکن زندگی میں پھر ایک دفعہ ہلچل مچا دی ہے، میرے جذبات کو جو شادی تلخکام کی بدولت مردہ ہو چکے تھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ممکن ہے کہ میری نظر اور دل نے ہی دھوکا کھایا ہو اور صرف اپنے ہی خیالات کا عکس نظر آ رہا ہو مگر اسمیں بھی ایک لطف ہے۔

جب صبح میں بیدار ہوا تو آسمان پر کسی قدر بادل چھائے ہوئے تھے۔ نہایت خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ اس قسم کے موسم میں اپنی اس سنسان اور پریشان زندگی کا نہایت تیز احساس ہوا۔ آہ! یہ احساس کوئی نیا نہیں ہے!

اسی عالم میں اپنی صبر آزما تنہائی کے بوجھ کو جو ہر وقت دل کو دبائے رکھتا ہے ذرا ہلکا کرنے کے لیے میں نے ٹہلنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی غالب، امیر، داغ کے اشعار جو مجھے یاد تھے بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیئے (کون جانتا ہے کہ میں اپنے اضطراب اور بیتابی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کیا کیا ذریعہ اختیار کر چکا ہوں، اور مجھے ان سب کوششوں میں کس قدر ناکامی ہوئی ہے)

ٹہلتے ٹہلتے میری نظر اچانک سامنے والے بلند اور عالیشان مکان پر پڑی اور میرے جسم میں ایک برقی رو دوڑ گئی۔ کھڑکی میں سے چق کے پیچھے سے دو نسوانی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں،

مجھے اپنی آواز کے پرترنم ہونے کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں ہوا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ میری "موسیقی" اس کو وہاں تک کھینچ لائی تھی۔ بالکل بے معنی تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس کی موجودگی میرے لئے کوئی زیادہ اہم نہ تھی ایک آرام چوکی پر لیٹ گیا مگر میری نظریں بار بار اس طرف اٹھتی تھیں اور چق کی تیلیوں میں سے گذر گذر کر کسی کو دیکھ رہی تھیں۔

یکایک چق نے جنبش کی۔ میری نظروں کے سامنے ایک بجلی سی کوندگئی۔ چق ایک لمحہ کیلئے اٹھا اور گر گیا۔ اور اس عرصہ میں۔ اس لمحہ مختصر میں ایک حسین متبسم چہرے کے نقوش میرے دماغ میں ثبت ہو گئے۔

۲۰ر اپریل ۲۹ء

حالات نے عجیب صورت اختیار کر لی ہے۔ اگرچہ گذشتہ واقعہ کے بعد خوف کے مارے میں نے ایک شعر تک بلند آواز سے نہیں پڑھا۔ مگر چق کے پیچھے کسی

کی موجودگی مستقل صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

کیا جو توضیح و تشریح میرا دل کر رہا ہے درست ہے؟ متواتر ناکامیوں کا شکار ہو کر۔ اس قدر فرسودہ دماغ ہو چکا ہوں کہ اب کسی خوشگوار طرز حیات کی آرزو کرنا۔ اپنی زندگی میں کسی قسم کی رنگینی کی توقع رکھنا میرے لئے دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کسی کی نظر التفات مجھے منتخب کرے اور پھر ایسی ہستی جو خود مجسمہ جمال ہو۔ مجھے اپنی نسبت اس قسم کا خیال کرتے ہوئے ہنسی آتی ہے۔

۲۷ر اپریل ۲۹ء

مسلسل ایک ہفتہ واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں ایک ایسے نتیجہ پر پہونچا ہوں جو نہایت مضحکہ خیز ہے۔ لوگ کہیں گے کہ میں فریب نفس میں مبتلا ہوں، مگر کیا کروں کہ کوئی نامعلوم طاقت مجھے ایک ایسی بات قبول کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ جو میں قبول کرنا نہیں چاہتا، اگر میں دھوکا کھا رہا ہوں تو کوئی مجھے تبلائے کہ چق کے پیچھے پہروں کھڑے رہنے سے کیا مطلب ہے؟ کھڑکی میں آکر کسی دوسری طرف دیکھتے ہوئے اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میری طرف نہیں دیکھا جا رہا ہے۔ مجھ پر بجلیوں کی بارش کر دینا۔ چق کو اٹھاتے اور گراتے وقت جسم میں ایک ایسی لطیف حرکت دینا کہ میری نظریں خواہ مخواہ اس طرف اٹھ جاویں اور میرے اس اضطراب پر جو مجھ پر طاری ہو جاتا ہے مبہم طریق پر مسکراتے ہوئے اس طرح غایب ہو جانا جس طرح برق پردہ سحاب میں چھپ جاتی ہے، خدارا کوئی تبلائے کہ یہ سب کچھ کیا معنی رکھتا ہے؟ میں پہلے ہی اپنی زندگی سے کچھ مسرور نہیں ہوں، میرے رہے سہے صبر و شکیب پر کیوں بجلی گرائی جاتی ہے؟ مجھ میں طاقت نہیں ہے کہ اس کو برداشت کر سکوں۔ چق کا کنارہ ذرا ہلتا ہے اور میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ وہ قوت جس نے آج تک مجھ پر ضبط کئے رکھا ہے ہجوم جذبات کا مقابلہ کرتے کرتے اب عاجز آگئی ہے اور بہت ممکن ہے میں وارفتہ جذبات ہو کر کسی وقت کوئی ایسی حرکت کر دوں جو بعد میں باعث پریشانی و پشیمانی ہو۔

۶ر مئی ۲۹ء

وہی ہوا جس کا خوف تھا۔ انسان کم از کم مرد ہمیشہ جذبات کے مقابلہ میں بے بس ہو جاتا ہے۔ مجھے اس معاملے میں قابل الزام گردانا جائیگا۔ مگر وہ شخص جس کے سینے میں دل ہے اور دل میں جذبات یا وہ جو میری طرح بدقسمتی سے ناکام شادی کا شکار ہو کر مایوس محبت ہو چکا ہے میری حالت کا بہت اچھی طرح اندازہ لگا سکیگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کی نگاہ میں میری یہ حالت اس قدر مذموم نہ ہوگی جس قدر کہ دوسرے لوگ خیال کرینگے۔

شام کے سات بج چکے تھے، میں صحن مکان میں آرام چوکی پر لیٹا ہوا تھا کہ اچانک وہ مکان کی چھت پر نمودار ہوئی۔ شام کے دھندلکے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زہرہ آسمان سے اتر آئی ہے اور مصروف خرام ہے۔ دوپٹہ کا آنچل سر سے بار بار سرک جاتا تھا۔ اور سیاہ لانبے لانبے بال ہوا میں لہرانے لگ جاتے تھے یہ جانتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ کوئی از خود رفتہ اس کی ہر معمولی سے معمولی حرکت کو دیکھ رہا تھا اور دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اس سرکے ہوئے آنچل کو اک شان بے نیازی سے درست کرتے ہوئے اپنی بلوریں گردن کو ایک ایسا لطیف خم دیا جاتا تھا کہ میں لرز اٹھتا تھا۔ تڑپ اٹھتا تھا۔ جب تک حسن بے پرواہ ہے اپنی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا اس قدر دشوار نہیں ہے مگر باوجود خود بیں و خود آرا ہونے کے جب وہ اپنے اندر تصنع بیگانگی پیدا کرتا ہے آہ! اس وقت اس کی تاب لانا ناممکن ہے۔

میں انسان ہوں فرشتہ نہیں ہوں، اور انسان ایک کمزور و ناتواں ہستی ہے روزمرہ کے نظارہ ہائے حسن نے پہلے ہی بیتاب بنا رکھا تھا یہ منظر میری قوت ضبط پر آخری ضرب تھی۔ ایک عالم بے اختیاری میں میرے منہ سے یہ شعر نکل گیا۔

آہ وہ آنکھ جو ہر طرف رہی صاعقہ پاش
وہ جو مجھ سے کسی عنوان ملائی نہ گئی!

فاصلہ بہت کم تھا۔ میری آواز اس کے کانوں تک پہونچی۔ جس طرح لہراتا ہوا سانپ اپنے قریب ہی کوئی آواز سنکر اک دلفریب مگر خوفناک لچک کے ساتھ سر کو نہایت سرعت سے حرکت دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح وہ میری جانب مڑی اور مسکراتے ہوئے ایک دلکش انداز میں انگلی لبوں پر رکھکر خاموشی کے اشارے کرتی ہوئی غایب ہو گئی۔

۲ر جون ۲۹ء

دیکھئے کس جگہ ڈبوتا ہے
میری کشتی کا ناخدا ہے عشق

ایک ماہ گذر جانے کے بعد میں اپنے افسانہ محبت میں ایک باب کا

اضافہ کر رہا ہوں، اغلب تھا کہ اگر رفعت کی علالت کی خبر میرے خیالات کی زد میں قدرے تبدیلی نہ کر دیتی تو یہ صحیفۂ عشق نامکمل ہی رہ جاتا۔ محبت انسان کی تمام توجہ کو صرف ایک نقطہ پر جمع کر دیتی ہے اور دنیا کی باقی ہر چیز کی جانب سے گویا اندھا کر دیتی ہے۔ محبت کرنا بجائے خود نہایت لطیف ہے مگر محبت کیا جانا اس سے بھی زیادہ پر لذت ہے۔

اس شام کے واقعہ کے بعد میں دل ہی دل میں شرمسار تھا۔ جو کچھ ہوا تھا خلاف توقع تھا۔ نہ مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مجھ میں دفعتاً اس قدر جرأت پیدا ہو جائیگی۔ بہرحال اس واقعے کے اگلے روز مجھے ایک خط ملا۔ یہ خط مجھ تک کن وسائل سے پہنچا اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ ہاں مجھے صرف اس قدر یاد ہے کہ جس وقت میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کی تہیں کھول رہا تھا تو مجھے جیسے کہ پیچھے سے دیکھا جا رہا تھا۔ میرے اضطراب کا تماشا کیا جا رہا تھا۔ میری حالت یہ تھی کہ بدن کی رگ رگ لرزہ بار دست کپکپا رہی تھی۔ تمام جسم کا اشتیاق آنکھوں میں آ گیا تھا۔ لکھا تھا۔

اظہار اضطراب محبت میں جرم ہے — یوں ضبط کر کہ ربط امید ٹوٹ جائے
ان کی نگاہ لطف کا دل کو ہے انتظار — وہ تیر پھینک دیں تو یہ آئینہ ٹوٹ جائے
فطرت سے مجھے ڈر ہی کہیں اے ہزن ہوش — آکر نہ کاروان محبت کو لوٹ جائے

یہ شعر اور پھر ایک عورت کی طرف سے! کون ہے جو اس کو برداشت کرے؟ کس کے سینے میں اسقدر سخت دل ہے کہ اس دعوت محبت کو ٹھکرا دے! اللہ اللہ! ان تین شعروں میں مجھے گویا درس محبت دیدیا گیا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں ہوا میں تحلیل ہوا جا رہا ہوں۔ میں نے کانپتے ہوئے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ موجود تھی۔ ہم دونوں ایک ہی وقت میں مسکرائے اور اس دن سے آج تک ——— !

میں اور وہ محبت کے بے پایاں سمندر میں تیر رہے ہیں۔ میرے لئے تمام دنیا رنگین ہو گئی ہے۔ وہ ظلمتیں جو میرے دل پر چھائی ہوئی تھیں چھنٹ گئی ہیں اور میری گھٹا ٹوپ اندھیری راہیں کسی کی ضیائے تبسم سے منور ہو گئی ہیں۔

اس وقت تک میں نے اس سے گفتگو تک نہیں کی ہے۔ دل بھر کر دیکھا تک نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کوئی نہ معلوم طاقت مجھے اس کی جانب کھینچے لئے جا رہی ہے۔ جس وقت وہ چق اٹھا کر وہ مجھے ایک معصومانہ تبسم سے دیکھتی ہے تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا ہے میری خوش قسمتی کی بھی کوئی حد ہے کہ میں اس کو بیجا بانہ دیکھ سکتا ہوں میں وصال نہیں چاہتا۔ میری معراج آرزو یہی ہے کہ میں اس کو دیکھ لوں۔ اس کو نظروں ہی نظروں میں پیام محبت دیدوں، مجھے قرب کی ضرورت نہیں ہے میں ان تعلقات سے ذرا آگے بڑھنا اپنی فنا سمجھتا ہوں، محبت ایک روحانی تعلق ہے جو جسمانی اتصال سے بالکل بے نیاز ہے۔ مجھے ایک دردمند دل کی ضرورت تھی جو مجھے مل گیا ہے۔ اس سے زیادہ کی توقع رکھنا کفران نعمت ہے،

رفعت! جو اس عرصہ میں قریباً قریباً میری زندگی سے نکل چکی تھی آج اس کا پھر خط ملا ہے۔ دنیا کی یہی ایک چیز ہے جو کبھی کبھی میری توجہ کو اپنے مرکز سے ہٹا دیتی ہے۔

"پیارے! میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ تم خوش ہو خدا کرے خوش رہو۔ مجھے چند روز سے بخار اور کھانسی کی تکلیف ہے۔ ڈاکٹر گلے کی سوزش تشخیص کرتے ہیں مگر وہ کیا جانیں کہ اس مرض کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ روح سے ہے:

کیا کہوں! تمہاری جانگداز فرقت آخر رنگ لے آئی ہے۔ آہ تمہیں کیا معلوم کہ زندگی کے دن میں کیونکر کاٹ رہی ہوں! رات کو جب تمام عالم سو جاتا ہے میں کب تک جاگتی رہتی ہوں اور میری آنکھیں کیونکر آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ اس کی شہادت میرا تکیہ دے سکتا ہے جو ہر رات آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے۔ میں تم کو الزام نہیں دینا چاہتی مجھے معلوم ہے کہ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں بہت سے نقایص ہیں! مگر پیارے میں ان نقایص کو دور کر دونگی خود کو تمہارے قابل بنانے کی کوشش کرونگی! لیکن خدارا مجھے بتاؤ تو سہی کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ میری بیماری کوئی تشویشناک نہیں ہے۔ چند روز تک تندرست ہو جاؤں گی۔ کیا تم دو ایک دن کے لئے نہیں آ سکتے؟"

اس خط کے ساتھ ہی والد صاحب کا خط ملا ہے اس میں بھی رفعت کی علالت کا ذکر ہے۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ "رخصت ملنا دشوار ہے اس لئے آنے سے معذور ہوں"۔ آخر کس لئے جاؤں؟ جب مجھے رفعت سے محبت ہی نہیں تو اس پر منافقانہ اظہار محبت کر کے اسکو کیوں فریب دوں۔ اگر بیمار ہے تو تندرست ہو جائیگی ---

۱۵ اگست سنہ ۲۹ء

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اسمیں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

آہ! وہی قلم جس نے آج سے صرف دو ماہ پیشتر "داستان محبت" کو مزے لے لے کر لکھا تھا۔ آج اس عہد زریں کی جانسوز یاد میں نوحہ گری کر رہا ہے۔ اور میں خود جو کبھی اپنی طرز حیات سے اس قدر مسرور، اس قدر مطمئن اور اس قدر خوش تھا آج ایک سوگوار مجاور کی طرح اپنی محبت کے مزار پر ماتم کر رہا ہوں۔ جس طرح کوئی ملاح سمندر کے کنارے پر بیٹھا اپنے سے دور ایک عالم بے بسی میں اپنی کشتی کو ڈوبتے دیکھتا ہے آہستہ ــــ آہستہ ــــ پہلے کچھ حصہ زیر آب ہو جاتا ہے۔ پھر اور ــ پھر اور ...... یہاں تک کہ آخری حصہ بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور کشتی ملاح کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کو لیکر پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے بھی اپنی محبت کی ناؤ کو غرق ہوتے دیکھا ہے۔ اپنی تعمیر محبت کو اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا ہے۔

قبل اس کے کہ میں زندگی کی صعوبتوں سے آزاد ہونے کیلئے آخری جدوجہد کروں میری خواہش ہے کہ اپنی اس حکایت غم کو ختم کر دوں۔

اس سے یہ خیال نہ کیا جاوے کہ میں اپنی صفائی پیش کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں! گناہ کے بعد صفائی کیسی ــ گناہ کی تلافی صرف ایک چیز کر سکتی ہے ..... موت! ممکن تھا کہ ان حالات کے باوجود مجھ میں زندہ رہنے کی خواہش رہتی مگر رفعت! آہ مجسمۂ وفا رفعت کو کھو بیٹھنے کے بعد مجھے زندہ رہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ ماضی کا بالتفصیل اعادہ میرے لئے صرف مشکل ہی نہیں بلکہ نہایت تلخ اور درد انگیز ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ ایک ایک حرف لکھ ڈالوں۔ خود کو اصلی رنگ میں پیش کر دوں اس کے بعد دنیا میرے متعلق جو چاہے اندازہ لگالے۔

اس وقت جب کہ عہد رفتہ کے دلکش واقعات بائیسکوپ کی تصویروں کی طرح بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں اب تک ایک ایسی چیز کا تعاقب کر رہا ہوں جس کی کوئی حقیقت نہ تھی ایک سراب تھا! سراب، فریب نگاہ نے فریب نفس میں مبتلا کر دیا تھا۔ آہ! عورت ایک معمہ ہے جس کے سمجھنے سے انسانی عقل عاجز ہے۔

تین ماہ تک میں نے خود فراموشی کی زندگی بسر کی ہے۔ مجھ پر ایک قسم کی مستی اور مدہوشی سی طاری رہی۔ اور میں انجام سے بالکل بے نیاز تخئیل کے پردوں پر سوار ہو کر فضائے محبت میں اڑتا رہا۔ کس قدر لاحاصل محبت تھی۔ اب جب میں ماضی پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں گویا افق کے بعید کے بھی پرے کسی قبرستان پر نظر ڈال رہا ہوں۔ جہاں فرشتہ موت نے اپنے پر پھیلا کر ہولناک سکوت طاری کر دیا ہے۔

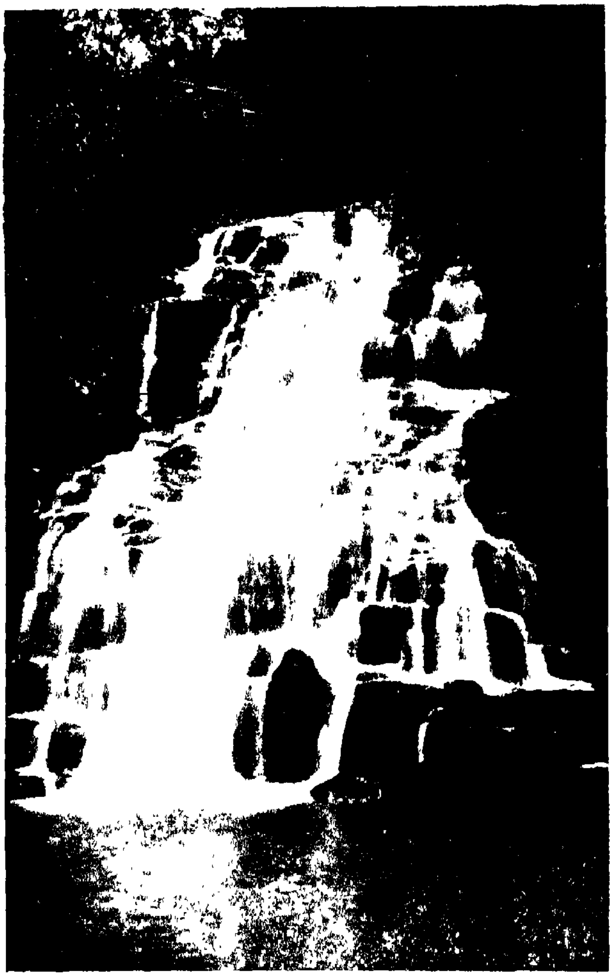
یہ روح فرسا انجام کیونکر واقع ہوا؟ اس کا قطعی اور مسکت جواب میرے لئے بہت دشوار ہے۔ میرے پاس صرف قیاسات ہی قیاسات ہیں، جس معاملہ میں عورت کو ذرہ برابر بھی دخل حاصل ہو۔ وہاں کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرنا ناممکن ہے جہاں تک قوت حافظہ میری امداد کرتی ہے اس بربادی کی بنا صرف یہ ہے کہ میں اس کی معمولی سی خواہش کی "تکمیل" سے قاصر رہا۔ اس کی ایک دعوت ملاقات قبول کرنے سے احتراز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس غیر متوقع دعوت کے لئے تیار نہ تھا چنانچہ جس وقت مجھے یہ پیغام ملا تو مجھے ایک قسم کا عصبی صدمہ گزرا۔ اور میرے کانوں میں خود اس کا بھیجا ہوا پیغام گونج اٹھا۔

فطرت مجھے یہ ڈر ہے کہیں راہزن ہوس
آکر نہ کاروان محبت کو لوٹ جائے

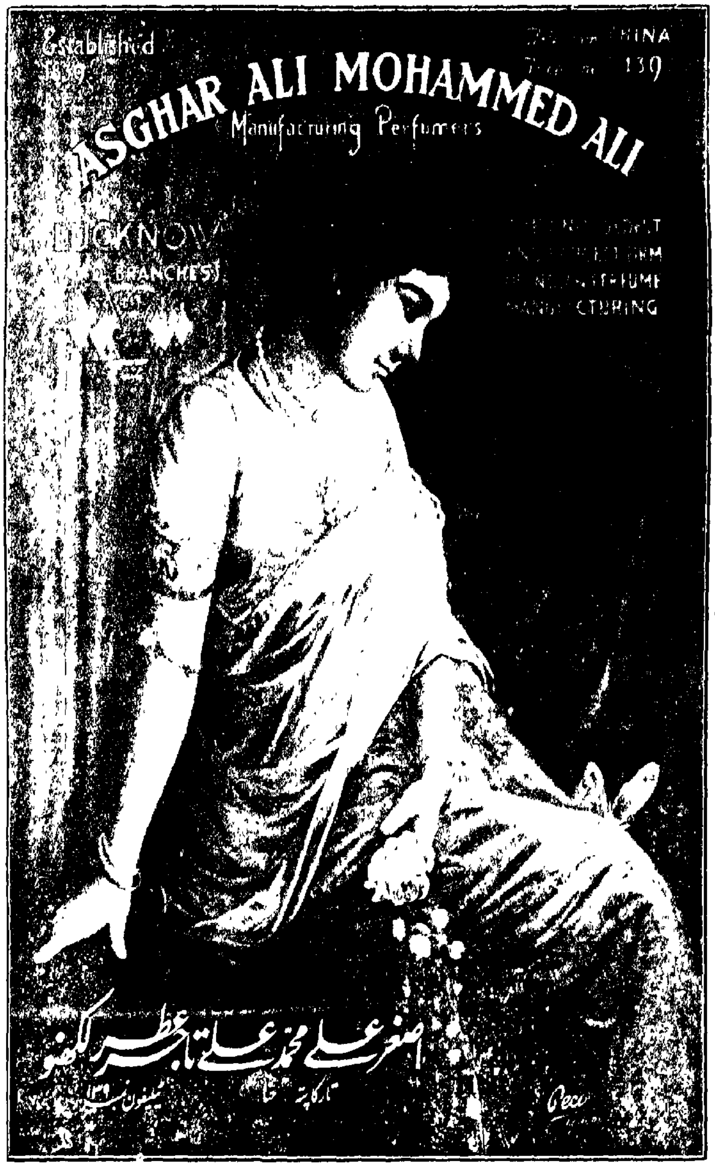
اس وقت اس دعوت کو منظور کر لینا گویا آگ سے کھیلنا تھا۔ اس خوف سے کہ شاید اس کے حضور میں سکون قلب کو کھو بیٹھوں اور اس طرح خود کو ذلت کے عمیق غار میں گرا دوں میں نے انکار کر دیا۔ آہ! میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ عورت کی معمولی سی معمولی خواہش کو رد کر دینا کس قدر خطرناک ہے۔ اور عورت کا انتقام کس قدر خوفناک ہوتا ہے۔ بس اس انکار کے بعد دفعتاً حالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ایک انقلاب برپا ہو گیا یہ میری بربادی کی ابتدا تھی۔

ہوا کیا! یہی کہ تعلقات محبت (کم از کم میں ان کو تعلقات محبت ہی خیال کرتا ہوں) یکدم قطع کر دیئے گئے۔ گو چہرے پر اب بھی تبسم ہوتا تھا مگر استہزا کا پہلو لئے ہوئے گویا میرا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ میرے انکار کو میری کمزوری پر محمول کیا جاتا تھا۔ اس پہلو تہی اور تغافل نے میری محبت سے وہی کام کیا جو تیل آگ سے کرتا ہے۔ میں پہلے سے کہیں زیادہ کشش کے ساتھ اس کی جانب کھنچ رہا تھا۔ جوں جوں وہ خود کو مجھ سے زیادہ دور کرتی جاتی تھی میں زیادہ سرعت سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ میرا رواں رواں اس کے لئے بیتاب ہو گیا تھا۔ میں نے تجدید محبت کی ہر ممکن کوشش کی مگر سب لاحاصل تھی۔ وہی ہستی جو صبح سے لیکر شام تک میرے انتظار میں چشم براہ رہتی تھی میری جانب سے اس قدر لاپرواہ اور بے حس ہو گئی تھی کہ گویا میں اس کی زندگی میں کبھی داخل ہی نہیں ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دفعتاً اس کے تمام جذبات منجمد ہو گئے ہیں۔ مر گئے ہیں،

اس تمام دور تعشق میں رفعت کے خطوط مجھے باقاعدہ ملتے رہے۔ آہ! ان



آبشار


Established
ASGHAR ALI MOHAMMED ALI
Manufacturing Perfumers
LUCKNOW
BRANCHES
MANUFACTURING
اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ
تار کا پتہ
ٹیلیفون نمبر ۱۳۹

[illegible] صورت اختیار کرلی، مگر میں نے شاید پرواہ نہ کی۔ والد صاحب نے [illegible] مگر میں نے بہلا کوئی نہ کوئی بہانہ بناکر ٹالدیا۔

[illegible] حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور آخرکار میں اس وقت جب [illegible] میری محبت کو ٹھکرا چکی تھی، میرے جذبات کو پاؤں تلے مسل [illegible] کی بے وقت مرگ کی اطلاع ملی۔ یہ قدرت کا انتقام تھا وہ رفعت جو اپنی زندگی ہی میں میرے لئے باعث [illegible] ہو رہی تھی۔ میری خوشیوں میں سد راہ معلوم ہوتی تھی اب ایک فرشتہ محبت کی طرح میری آنکھوں کے سامنے آرہی ہے۔ اس کا آخری خط جو مجھے کل ملا ہے اور جو اس نے اپنی موت سے چند گھنٹے پیشتر لکھا تھا۔ میری روح کو مجروح کر رہا ہے۔

میرے مالک! مجھے معلوم ہے کہ اب میں بہت کم عرصہ کی مہمان ہوں، عنقریب تم سن لوگے کہ رفعت! تمہاری پرستار محبت رفعت! تم پر نثار ہوگئی، میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہے کہ آخری دم تک تمہارا پیارا نام میرے لبوں پر ہے۔ میرے والدین نے جن ارمانوں سے تمہارے ساتھ مجھے وابستہ کیا تھا ان کا یہ حشر یقیناً افسوسناک ہے مگر نظام قدرت میں کس کو دخل ہے، میری قسمت میں یہی تھا۔ میری یہ نالۂ صد تمہاری رنگین زندگی کو شاید چند لمحوں کے لئے دھندلا دے مگر پیارے یہ خیال کرکے کہ ان چند حروف کے بعد تمہاری رفعت ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیگی اور تمہاری عشرتوں میں کبھی مخل نہ ہوگی مجھے معاف کردینا۔ اب میرا مرض آخری منزل تک پہونچ چکا ہے۔ ڈاکٹر اگرچہ اب بھی امید دلاتے ہیں مگر ان کے چہرے کا رنگ خود انکو جھٹلا دیتا ہے مجھے خود معلوم ہے کہ میرا آخری وقت آپہونچا ہے۔

میرے پیارے شوہر! عنقریب اس جہاں سے ایک دردمند دل اٹھ جائیگا۔ دنیا کی بدنصیب آبادی میں ایک کی کمی ہو جائیگی مگر خدا کا شکر ہے کہ میں امتحان محبت میں پوری اتری ہوں۔ مرتے دم تک تمہارے لئے میرے دل میں ایک غیر متزلزل محبت قائم رہی اور باوجود حالات ناسازگار کے میرے ایمان نے ذرا لغزش نہیں کھائی۔ تمہاری جانب سے ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں بدگمانی پیدا نہیں ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ جو شرط وفا میں نے باندھی تھی وہ آج پوری ہو رہی ہے۔

پیارے! میری ایک آرزو ہے۔ آج تک میں نے کسی خواہش کا تمہارے سامنے اظہار نہیں کیا۔ یہ پہلی اور آخری خواہش ہے۔ اگر تم کو زندگی کی دلفریبیاں اس قدر فرصت دیں کہ مجھ بدنصیب کے متعلق خیال کرسکو تو پیارے یہ سمجھ لینا کہ میں آخری دم تک تمہاری تھی اور شاید موت کے بعد بھی تمہاری رہونگی۔ کیا تم سے اتنا بھی نہ ہوسکیگا۔ پیارے خدا حافظ خدا تم کو ہر آفت سے محفوظ و مصئون رکھے۔ آمین۔

"تمہاری رفعت"

اس خط کے پہونچنے کے چند گھنٹے بعد والد صاحب نے بذریعہ تار خبر رفعت کی موت کی اطلاع دی، کون ہے جو اس سوختہ سامانی کی حالت میں اپنی تمام آرزؤں کو برباد ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہنے کی خواہش کرے۔

لوگ کہیں گے کہ میں نے ایک بیاہی ہوئی عورت سے محبت کی، ایک ایسی عورت سے محبت کی جس پر ایک دوسرے شخص کا بلا شرکت غیرے حق تھا اور اس طرح اخلاقاً، مذہباً، قانوناً، ایک قبیح جرم کا ارتکاب کیا۔ مگر خدا گواہ ہے کہ میری محبت کس قدر بے لوث اور مقدس تھی۔ میں نے اپنی تباہی گوارا کی مگر محبت کے دامن پر دھبہ نہیں آنے دیا۔

اس وقت وہ خطوط! آہ وہ گل محبت کی مرجھائی ہوئی پتیاں میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ وہ آتشیں الفاظ جن سے مجھے خطاب کیا ہے۔ پڑھتا ہوں اور تڑپتا ہوں۔

پھر تمہاری یاد نے تڑپا دیا — پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے
ہم تمہاری دید کے ہیں منتظر — دیکھ ان آنکھوں کی دریا بہ گئے

کوئی ہے جو سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہدے کہ وہ ان الفاظ کو برداشت کرسکتا تھا صبر سکون سے ان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ عورت جس وقت جذبات محبت کا اظہار کرتی ہے تو دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت اسکی تاب نہیں لاسکتی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اس دور محبت میں چند روز میں کاروباری مشکلات کی وجہ سے کچھ پریشان و مضمحل رہا اس عرصہ میں میری کم توجہی کو محسوس کرتے ہوئے جو خطوط لکھے گئے تھے وہ اس قابل ہیں کہ یادگار رکھے جائیں، مگر اس حالت میں بھی باوجود مایوس محبت ہو جانے کے بیوفائی نہیں کرسکتا پیشتر اس کے کہ میں خود ختم ہو جاؤں یہ تمام خطوط اس عہد دلفریب کی تنہا یادگار جلا دیے جائینگے میں اس وقت صحن مکان میں اس مقام پر بیٹھا جہاں کبھی بے تکلفی سے نظارہ ہائے حسن سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ یہ سطور قلمبند کر رہا ہوں۔ میرے سامنے

وہ مکان میری تمناؤں کا مدفن، میرے جذبات کی قربانگاہ ہے۔ لیکن کھڑکیاں بند اور حجت بے حرکت ہے۔ بار بار نظریں اٹھتی ہیں اور آخری مرتبہ دیکھنے کے لئے جدوجہد کرتی ہوئی مکان کی سنگیں دیواروں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہیں۔

صادق! جسے گو اس واقعہ کا پوری طرح علم نہیں ہے مگر جس کی مردم شناس آنکھیں اور معاملہ فہم دل مدت سے صورت حالات کو کچھ کچھ بھانپ چکا تھا دیکھنے روز آیا تھا۔ میری اندوہگیں حالت کو دیکھ کر اس نے ارادۃً "عورت" کے موضوع پر گفتگو چھیڑی میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے ڈرتا تھا کہ شاید جذبات کی رو مجھے بہا لیجائے اور اس طرح وہ راز جو میں اپنی زندگی میں راز ہی رکھنا چاہتا تھا خود میری زبان سے نکل جائے۔ صادق نے بہت کوشش کی کہ میں اعتراف کر لوں اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرے دل کے نازک سے نازک مقام پر ٹھیس لگانے کی کوشش کی مگر میں نے ہر بار ضبط سے کام لیا۔ گو میرا چہرہ میری آنکھیں میرے جذبات کے آئینہ دار بنے ہوئے تھے مگر پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ میرے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ اور آخر کار جب صادق اپنی کوششوں میں ناکام رہا تو اس نے اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں کو — ان آنکھوں کو جو دنیا کی ہر چیز پر ہنستی نظر آتی ہیں — میری آنکھوں میں ڈالکر اور میرے احمق دل میں ٹٹولتے ہوئے کہا، "میرے دوست! تم مجھ سے حقیقت کو چھپا رہے ہو مگر مجھ سے کچھ پنہاں نہیں۔ آج سے نہیں میں مدت سے حالات کو بھانپ چکا تھا۔ مگر میں تمہارے حساس دل کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم عورت کے فریب کے شکار ہو رہے تھے، ایک سراب کا تعاقب کر رہے تھے، مگر میں تم کو تمہارے عہد نشاط میں بدمزہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ برادر عزیز! یاد رکھو۔ عورت ایک معمہ ہے۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا خود کو بھول بھلیاں میں ڈالنا ہے۔ شکسپیر اس انسانی فطرت کے ماہر کا مشہور قول Frailty Thy Nameis Woman کو یاد رکھو۔ عورت کا جز سیماب سے بنا ہوا ہے۔ اس کے لئے ثبات ناممکن ہے عورت کی طبیعت کے مدوجزر کا یہ عالم ہے کہ وہ اچانک کسی فوری جذبہ کے ماتحت ایک چیز کے لئے بیتاب ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کی حالت قابل دید ہوتی ہے۔ ایک نہ ہلنے والی چٹان کی طرح وہ اپنی جگہ پر قائم ہو جاتی ہے۔ اور اپنے گوہر مقصود کے حصول کے لئے دشوار سے دشوار آزمائش میں کود پڑتی ہے۔ مگر تم کو حیرت ہوگی کہ جس وقت وہ اس چیز کو حاصل کر لیتی ہے تو خود بخود اس کی جانب سے متنفر ہو جاتی ہے۔

یاد رکھو عورت کا تعاقب مت کرو۔ اس کے معاملہ میں ہمیشہ لاپروائی اختیار کرو۔ گویا تمہارے لئے اس میں کوئی اہمیت نہیں ہے پھر دیکھو کہ تمہارے لئے وہ کیا کچھ نہیں کرتی۔ اگر تم نے عورت کا تعاقب کیا تو وہ تم سے دور بھاگیگی۔ اور اگر تم نے بے اعتنائی اختیار کی تو وہ خود تمہارا تعاقب کریگی۔"

داستان طویل ہوتی جاتی ہے۔ "ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک کیا جاوے"۔ اس قتالہ کی جانب سے نفرت کا ایک تلاطم خیز طوفان میرے دماغ میں برپا ہے۔ اور میرا قلم اس کی بے وفائی پر ورق کے ورق سیاہ کر رہا ہے۔ لیکن بیتابی دل کا یہ عالم ہے کہ لکھتے لکھتے بار بار آخری نظارہ حسن کے لئے آنکھیں ان کھڑکیوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ جو ایک مدت تک جلوہ گاہ حسن بنی رہی ہیں۔

آہ! کون یقین کریگا کہ وہ عورت جس میں اس قدر جرأت نہیں کہ چق کی نازک تیلیوں کو توڑ کر باہر آسکے میری تمام تباہی اور بربادی کی واحد ذمہ دار ہے۔

اس وقت تک میں صرف اس عورت کو ملزم گردان رہا ہوں! کیا میں خود ویسا ہی مجرم نہیں ہوں۔ اگر اس عورت نے اپنے جائز خاوند سے بے وفائی کی ہے تو کیا میں نے رفعت کے ساتھ ویسی ہی مجرمانہ ریاکاری سے برتاؤ نہیں کیا ہے۔ اگر میری خودکشی کا ذمہ دار اس عورت کو قرار دیا جاسکتا ہے تو کیا میں رفعت کا قاتل نہیں ہوں؟ مگر آہ! انسانی دماغ کا بنایا ہوا ناقص و نامکمل قانون ہم دونوں میں سے کسی کو بھی مجرم نہیں بناتا ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں جب اس عدالت عالیہ میں ہر شخص اپنے افعال کی سزا و جزا حاصل کریگا۔

"ظہور"



شاہِ دکن ظل اللہ
سلطنتہ و ملکہ و علا امرہ

از

حضرت کیفی حیدرآبادی!

وہ کون ہے ہم رتبۂ جم "آصف جاہ" ہے مدِ نظر جس کو رعایا کی فلاح
عثمان علی شاہِ دکن ظلِ اللہ سلطانِ گدا پرور و عادل باذل

دکن!

چپہ چپہ ہے اس کا گلشن گلشن! اہلِ اسلام کا ہے ملجا مامن
رشکِ فردوس حیدرآباد دکن قائم دائم رہے الٰہی یہ شہر

بیوی کا لکچر!

عالمگیر عید نمبر کیلئے!

دنیا میں جہنم!

عید کے موقع پر

از حضرت امین سلونوی!

ہاں ہاں سنتی تو ہوں کہ کل عید ہوگی پھر کیا کروں۔ خالی خولی کہیں عید ہوتی ہے۔ عید کے لئے سو سامان چاہئے کپڑے لتے چاہئیں۔ خیر خیرات کو چاہئے اعلیٰ تیل چاہئے، سوئیاں وعدہ سو چاہئے، برس برس کا تہوار ہے، خوشی خرمی کے دن مگر تم کو کیا پرواہ کیا۔ مگر بس زبان سے کہدیا کہ کل عید ہوگی۔ عید کیا ہوگی۔ نگوڑا بدن کے کپڑے تک تو ٹھیک ہی نہیں۔ چلے ہیں عید کی خوشخبری سنانے۔ عید تم کو ہوگی تمہارے ہونوں سوتوں کو ہوگی مجھکو کیا جیسے آج ویسے کل، نگوڑ مارا ابکی تمہارے یہاں دوسری عید ہے مگر کیا کہ جیسے سب دن ویسے آج بھلا اس طرح کہیں عید ہوتی ہے —— آج کتنے روز پہلے سے تم سے کہہ رہی ہوں کہ کل کو عید کا تہوار آنے والا ہے اور نہ سہی تو منے کے لئے ایک جوڑ جوتہ لادو، کوئی ریشمی قمیض بنوادو کوئی اچھی سی کامدار ٹوپی خرید دو مگر تم کو کہاں فرصت تو بھلا عید کیا ہوگی۔ یہ بھی تقدیر کی بات ہے اپنے ماں باپ کے یہاں ہوتی تو مجال تھی کہ وہ ہمارے ارمان نہ نکالتے۔ اس معصوم کی آج پہلی تھی۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ اباکے یہاں عید ہوتی ہے۔ توبہ کرو، اب ایک تم کو مذہب سے کوئی غرض واسطہ نہیں ہے تو کیا سب تمہاری ہی طرح ہو جائیں اور پھر مجھے کہتے ہو کہ کل عید ہوگی مجھکو چڑاتے ہو۔ کچھ مجھکو باہر نکلنا ہے یا دوگانہ پڑھنا جانا ہے۔ ہاں ہمارا منے البتہ سب کا منہ دیکھ کر رہ جائیگا۔ اچھا چلو سوئیاں لادو گے۔ بس ناں۔ تو کیا خالی سوئیوں سے عید ہو جائے گی اور بس سوئیوں ہی میں عید کی خوشی ہے، میں تو کہتی ہوں یہ بھی کاہے کو لاؤ گے رہنے دو فضول خرچی ہوگی۔ تم اپنا کسی کے یہاں مل جائے گی کھا پی لینا میں موئی کاہے میں ہوں۔ مگر نہیں تم کو تو اپنے یار احباب کو بھی سوئیوں کھلانی ہوں گی اسی سے تو کہتے ہو

کہ سوئیاں لادوں۔ تو ذرا کان کھول کر سن رکھو کہ یہ گھر ہے ماشاءاللہ سے دو چار آدمی نہیں کہ کوئی ہوٹل یا سرا تو ہے نہیں کہ سیر آدھ سیر سوئیوں میں کام چل جائیگا اور دام بھی آجائینگے۔ اگر دس پانچ دوست تمہارے زہر مار کرینگے تو یہاں بھی پچاس بھوت اور موجود ہیں ہر ہر پر جے کو سوئیاں دینا پڑیں گی۔ تم سمجھتے ہو کہ یونہی عید ہو جائیگی کہیں ایسی بھی عید ہوتی ہے اپنے منہ کے سواد کے لئے جو چاہے کرو۔ لیکن میرے گھر میں پھر سوئیاں نہ لانا۔ اس سے اچھا ہے کہ کہیں اور انتظام کر لو۔ چلے وہاں سے کہنے کہ سیر بھر سوئیاں لادوں، مجھکو تمہاری سوئیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ دس گھر پاس پڑوس کے ہیں سب ہی کے یہاں آمد و رفت ہے کھانا پینا۔ لینا دینا آنا جانا روز ہی لگا رہتا ہے بھلا یہ محلے والے کیا کہیں گے کہ کیسے منحوس لوگ محلہ میں بستے ہیں کہ جو عید کے موقع پر بھی ایک پیالی سوئیاں تک نہیں بھیج سکتے جو لیتا دیتا ہے وہ اس کی قید بھی جانتا پہچانتا ہے تم کو کیا تم تو مزے سے سوٹ ڈاٹے پھرتے ہو تم کیا جانو کہ عید کسے کہتے ہیں اور بقر عید کیا ہے۔ غضب خدا کا پورا رمضان گذر گیا اور تم کو ہوش نہ آیا اور آیا بھی تو کب کہ جب کل عید ہوگی۔ تو پھر بھلا اس طرح کیا عید ہوگی۔ کوئی بڑا بوڑھا اس جگہ موجود ہوتا تو تم کو بتاتا۔ اور پھر اگر کبھی تم کو ان خبروں سے سابقہ ہوتا تو جانتے کہ عید کسے کہتے ہیں اور عید کیسے ہوتی ہے موئی شبراتن آج دس روز پہلے سے تقاضے کر رہی ہے کہ بی بی عید آرہی ہے اپنے منے کا کوئی پرانا جھرتا۔ گلے کا اترن کرتہ میرے بچہ کو بھی دیدو۔ میری تنخواہ سے دو ایک روپیہ پیشگی دیدو مگر میں کیا کروں میری تو جان غضب میں ہے بھلا اس طرح کہیں عید ہوتی ہے۔ کریم بھی بال بچہ دار آدمی ہے اس کو بھی کچھ نہ کچھ دینا ہے۔ لاکھ بوڑھا سہی اپاہج سہی تو کیا ہوا عید تو سبھی کے لئے

خوشی کا دن ہوتا ہے۔ کیا تمہاری طرح لوگ کرتے ہیں کہ عین موقع پر بڑا انتظام یاد آیا اور بہت سامان کی خریداری بتائی تو سیر بھر سوئیوں کا لانا آگ لگے ان سوئیوں میں۔ اور پھر جب کہ کل صبح عید ہوگی، اچھا میں کہتی ہوں کہ یہ بھی سہی تو اب تمہیں دیکھو کہ آخر وہ سوئیاں بھونی کب جائیں گی رات جو شام وشام سوئیاں خرید کر لادو گے تو کیا عید ہو جائیگی ادھر اکیلے سوئیاں کھا کر عید کی خوشی منا جائے گی۔ ایسا ہی ہو تو پھر روز انسان پاؤ بھر سوئیاں پکائے اور عید منائے تم مذاق اڑاتے ہو بھلا یہ بھی کوئی بات ہے سمجھتے ہو کہ بس عید کے دن سوئیاں خالی پھانک لیجائینگی، دودھ شکر میوہ کا کہیں ذکر تک نہیں تو جی میں ایسی سوئیاں پکاؤں یوں تو بغیر سوئیوں کے بھی عید ہو جائیگی۔ ایک اگر تم سوئیاں لائے بھی تو کیا ——— کل عید کا دن ہوگا لوگ دوگانہ پڑھ کر واپس آئینگے تو عید ملنے آئیں گے آخر کچھ ان کی بھی خاطر تواضع کا سامان چاہیئے کہ نہیں دیکھتے ہو کمرے کا فرش کتنا میلا ہو رہا ہے سفید سفید چاندنی پر پان کی تھوک پڑی ہوئی ہے لوگ اچھے اچھے اجلے کپڑے پہنکر آئیں گے تو اسی پر بٹھاؤ گے وہ بھی کہیں گے کہ کس بدتمیز کے یہاں عید ملنے گئے آخر شرم وغیرت بھی کوئی چیز ہے۔ اکثر ستر ماحضوری بھی ایک ایک تمبیج سوئیوں کا ایک ایک پان۔ الائچی دو گے تو کم ازکم سو آدمیوں کے لئے۔ کتھہ۔ ڈلی۔ پان الائچی بھی منگانا پڑے گی۔ وہ ایک تولہ عطر ہونا چاہیئے۔ نہ ہو تو آدھا آدھا پیالہ سوئیاں محلہ والوں میں تقسیم کیا جائے۔ اور کیا یونہی عید ہو جاتی ہے۔ تم اپنے یار دوستوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر چکنے چپڑے ہو کر چلے جاناؤ دوگانہ پڑھ کر واپس آنا بس چلئے عید ہو گئی تمہاری بلا سے اگر میں کپڑے نہ بدلوں۔ تمہاری جوتیوں سے اگر بچہ عیدگاہ تک نہ جا سکے تم تو ہو جاؤ گے پورا مہینہ برکت کا گذر گیا دو چار دس کو کون کہے ایک روزہ بھی بھول کر نہ رکھا اب آج عید منانے آئے ہیں۔ تھو تھو۔ کہیں اس طرح عید ہوتی ہے کہ بس منہ سے کہہ دیا کل عید ہوگی۔ نائی آئے گا آئینہ دکھانے اور نہ ہو تو دو روپیہ تو اس کو انعام دیا جائے۔ مہترانی آئے گی وہ انعام مانگے گی دھوبی آئے گا وہ انعام مانگے گا بس برس کا دن ہے منے میاں کی کھلائی کو بھی ایک جوڑا کپڑا اور کچھ نقد دینا ہی چاہیئے دروازے پر سینکڑوں فقیر پھیری لگانے آئینگے تو کیا ان سب کو یونہی واپس کر دیا جائیگا۔ میری غیرت تو یہ کبھی گوارا نہیں کرے گی اور نہ مجھ سے یہ ہو سکتا ہے اور پھر اگر کبھی یہ سب باتیں دیکھی

ہوں تو وہ بھی سہی، کہ لاؤ سیر بھر سوئیاں منگا کر اپنے پیٹ میں بھر لوں بس عید ہو گئی ——— بات پر بات یاد آتی ہے کوئی ایک بات ہو تو کہی جائے ہزاروں جھگڑے ہزاروں بکھیڑے کئے جاتے ہیں تب جا کر کہیں عید ہوتی ہے؟ پہلے پہل منے میاں عیدگاہ جائینگے کیا میں ان کو خالی خولی بھیجوں گی۔ کبھو نہیں دو چار روپیہ کا غلہ ساتھ ہونا چاہیئے اور ایک روپیہ کی ریزگاریاں۔ کوڑیاں لٹانے کو ہونی چاہئیں اور نہیں کیا یونہی ہاتھ جھلاتے چلے گئے اور یونہی ہاتھ جھلاتے چلے آئے۔ ہو گی عید جس کو ہو گی ——— افوہ میں کہتی ہوا اللہ تمہاری طرح کسی کو نہ بنائے محلہ بھر میں آج دو روز سے عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں مہینوں پہلے سے گھروں میں پوشاکیں سلائی جا رہی ہیں۔ تھان کے تھان گھروں میں چلے آ رہے ہیں لوگ اپنے بچوں کو لئے خرید فروخت کر رہے ہیں کوئی ٹوپی خریدتا ہے کوئی جوتہ دیکھتا ہے کوئی کنٹوپ پسند کرتا ہے کوئی بنائین مانگ رہا ہے لیکن ایک تم ہو کہ کوئی حوصلہ نہیں۔ صبح کے گئے گئے دس بجے رات کو گھر آئے نہ روزے سے مطلب نہ نماز سے تم کو کیا خبر کہ عید کس کو کہتے ہیں تم کیا جانو کہ کب عید آئی اور کس طرح عید ہوئی۔ اور یہ تو جانے دو اسکا سوال ہی کیا کہ نئے کپڑے نہیں بنے۔ پرانے کپڑے تک تو ٹھیک نہیں ہیں۔ موئے چار جوڑ جوتے بلا پالش خراب ہو رہے ہیں نہ نیا جوتہ لائے نہ ایک شیشی پالش کی لائے کہ انہیں کو صاف کرلیں جب عید بقر عید میں بھی نیا کپڑا نیا جوتہ نہ میسر آئے تو اور کب ملے اور پھر اگر ملا بھی تو کس کام کا آج کے دن تو غریب امیر سبھی نئی پوشاکیں پہنے ہیں گھروں میں بیویاں نئے نئے زیور نئے نئے کپڑے پہنکر سج رہی ہوں ایک میں بدنصیب ایسی ہوں کہ ننگی بوچی بنی بیٹھی ہوں نہ نیا زیور ہوتا تو پھر سہی یہ پرانے ہی زیور کسی سنار کو دیدیتے صاف ہو جاتے، پھر کس برتے پر کہوں کہ کل عید ہوگی۔ ایک ساری کامدانی والے کے یہاں پیشتر روز سے پڑی ہے تم سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اس کو لا دیتے۔ اچھی بری جو کچھ تھی خیر اسی کو پہن لیتی۔ عید میں نئے کپڑے پہننا ثواب ہے۔ خوشبو لگانا سنت ہے مگر یہاں کہاں میسر کہ ثواب کمانے کا موقع ملے اور پھر کہتے عید ہوگی۔ بھاڑ میں جائیں لیونڈر کی شیشیاں مجھے تو ان کے نام سے نفرت ہوتی ہے میں خدانخواستہ ان کو کیوں لگانے لگی بس تمہیں کو یہ مبارک ہا مجھے خیر اپنی تو کوئی فکر نہیں ہے۔ بیسیوں مرتبہ عید کی خوشیاں منا چکی

اللہ میرے ماں باپ کو ہمیشہ رہتی دنیا تک رکھے میرے سب ارمان نکل چکے ہیں نہ مجھکو نئے کپڑے کی ضرورت ہے نہ مجھکو نئے زیور کی حاجت ہے نہ روپیہ پیسہ کی۔ بس جی کڑھتا ہے تو اس سے کہ ننھا دیا ایک چیتھڑا۔ معصوم۔ مٹا منا ملاتا اُس کی آج پہلی پہل عید تھی۔ اور اسکے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ سچ تو اگر مجھے یونہی کڑھاؤ گے تو میں آج ہی سیدھی نان دونگی اور صبح کو عید وہیں کر کے دم لونگی مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ محلے کے تمام لڑکے رنگ برنگے نئے کپڑے پہنے ہوئے عید گاہ جاتے ہوں گے اور میرا بچہ سب کا منہ دیکھ کر رہ جائے کس کام کی ایسی عید کریں اپنے بکس سے جھلاملی جوڑی نکال کر پہنوں اور معصوم بچہ کو دھلے ہوئے کپڑے پہناؤں۔ عید تو بچوں ہی کی ہوتی ہے اُنہیں کی خوشی سے گھر بھر کی خوشی ہوتی ہے جب وہ نہ خوش ہو کر تو ہمارے پہننے اوڑھنے سے کیا ہاں کرمنے کے پاس سیکڑوں جوڑی ہیں نیکر ہے کوٹ ہے بہت ہے مگر کیا یہ بہن کرو وکالہ پڑھنے جائے نئی نئی تشریف ہوتی عمدہ ٹوپی ہوتی۔ پائجامہ ہوتا۔ کون سا سو پچاس روپیہ اس کی پوشاک کی تیاری میں صرف ہوتے۔ ابھی پچھلی عید میں دیکھ چکی ہوں خالہ بی کے نواسے کے لئے ایک جوڑ کپڑا۔ سات روپیہ میں ایسا طیار ہوا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کیا چھپن ٹکے لگے تھے۔ کل سلائی وغیرہ ملاکر سب پندرہ روپیہ اللہ رکھے پندرہ روپیہ کہاں آتا ہے کہاں جاتا ہے ہاتھ کا میل جان کا صدقہ مال۔ تو پھر بھلا عید کیا ہوگی — اس دن آدمی خدا جانے کیا خرچ کر ڈالتا ہے اور سبھی کے نیچے ہوتے ہیں۔ غضب خدا کا آج چاند رات ہوگئی اور تم کو خبر نہیں کہ ایک پیسہ کا تو کوئی سامان عید کے لئے لاتے پھر کہتے ہو کل عید ہے تم جانا عید گاہ۔ اور منانا عید کی خوشی۔ اور سنو کل اپنا منہیں اور انتظام بھی کر لینا یہ نہ ہوگا کہ میں تمہارے لئے دنیا بھر کا مسح ہی صبح باپ پڑ جیوں گی اپنی تسبیح میں سب جائے جب میرے بچہ کے کپڑے ہو تے نئے نہ آئے تو پھر عید بھی نہ ہوگی دیکھوں کیسے عید کرتے ہو۔ فقط

(از بی مسلواتی)

غزل

شب کو گیسو بنائے جاتے ہیں — فتنہ حشر اُٹھائے جاتے ہیں

زیر لب مسکرائے جاتے ہیں — بجلیاں سی گرائے جاتے ہیں

اُف! قیامت اُٹھائی جاتے ہیں — مٹ چکا ہوں، مٹائے جاتے ہیں

آپ ہی دیکھتے ہیں آئینہ — آپ ہی مسکرائے جاتے ہیں

دین و ایمان، جان و دل لیکر — کیسی آنکھیں چرائے جاتے ہیں

خاک تربت سے بھی انہیں پرہیز — اپنا دامن بچائے جاتے ہیں

اے زبیدہ یہ ہے وفاداری
تم کو مر کر دکھائے جاتے ہیں۔

(از زبیدہ بیگم)

میری پکفورڈ

میری پکفورڈ کا ٹرام کار ٹکٹ

عید نمبر کیلئے

از جناب عبد الباری علوی کسمنڈوی

مشہور فلم اسٹار کی مختصر سرگذشت

ایک واقعہ

جس نے اس کو ناموری کی منزل تک پہنچا دیا

دنیا کی محبوب ترین ایکٹرس کو ایک ٹرام گاڑی اپنے آغوش میں لئے جا رہی ہے یہی اس کا پہلا سفر ہے جس نے دیو فلم میں ایک لاثانی شہرت دے کر جاہ و دولت کے سارے منازل طے کرا دیئے۔ اس وقت وہ یورپ جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ٹرام گاڑی کا وہ ٹکٹ جس کو اس نے پھر کبھی استعمال نہیں کیا۔ کیوں اس وقت تک اپنے پاس محفوظ رکھا ہے اس کا جواب وہ خود دیتی ہے۔ کہ یہی وہ ٹکٹ ہے جو پردہ فلم پر میری ناموری اور شہرت کا ذریعہ بن گیا جیسا کہ واقعہ ذیل سے ثابت ہوگا۔

بہت سی ہستیاں ایسی ملیں گی جن کے گذشتہ واقعات زندگی نے ان کے لئے کوئی کامیابی کی راہ کھول دی ہو منجملہ ان کم و بیش اشخاص کے میں بھی انہیں خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہوں میری مختصر سرگذشت ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ کو یقین ہو جائے گا کہ نیویارک کی ٹرام گاڑی میں میرا پہلا سفر ہی میری ناموری کا پہلا زینہ تھا۔

آپ نے کبھی لندن میں ٹرام کار کا ٹرالسفر ٹکٹ خریدا ہے میں نے چکی ہوں ایسے ٹکٹ کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک جانب سفر کرنے کے بعد بلا کسی مزید اخراجات کے دوسری جانب بھی اسی ٹکٹ پر سفر کر سکتے ہیں۔ اگر بوقت خریداری صراحت بالا کے ساتھ ٹکٹ نہ لیا جائے تو بعد کو انتظار کی بے حد تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میں اپنے بچپن ہی کے زمانہ سے ایسے طویل سفر تھوڑے اخراجات سے طے کرنے کی عادی ہو چکی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب محنت سے مزدوری بدرجہا کم ملا کرتی تھی

یقیناً بہت سے لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ میرا اصلی نام گلیڈ سمتھ ہے میں بمقام "ٹارن ٹو" علاقہ کناڈا میں پیدا ہوئی جہاں پانچ برس کی عمر میں "ڈالن ٹائن" کمپنی کے اسٹیج پر روزی کمایا کرتی تھی ہم لوگ غریب تھے ان کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بچوں کی کمائی ایک خاندان کی پرورش کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص ایک پنجسالہ لڑکی کی آ کیا خاک مدد دیتی۔ مجھے خود اس کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ اپنی والدہ کی امداد کی غرض سے یہ سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔ میری والدہ ایک خوددار دوراندیش۔ اور وہ زمانہ سے نہ مغلوب ہونے والی ایسی ہستی تھی جس نے میری اتنی عمر تک پرورش اور رہبری کی۔

کھیل کود کے دن گذر گئے میں ہمیشہ کام میں مصروف رہتی تھی اس وقت میری عمر آٹھ سال کی تھی اور اس عرصہ میں میری حیثیت ایک پختہ کار ایکٹرس کی ہو چکی تھی۔ اسی طرح رفتہ رفتہ میری عمر کا تیرھواں سال بھی گذر گیا۔ مجھے بمقام "براڈوے" ایک پارٹ "بیٹی وارن" کا لینا پڑا یہ ڈرامہ "وارنس آف ورجنا" کا تھا۔ اس کا منتظم ڈیوڈ بلیکو اس منیجر سے زیادہ تجربہ کار اور مہربان شخص مجھے مدت العمر نہیں ملا یہی وہ ڈیوڈ ہے جس کی نوازشات نے آج میری ناموری اور شہرت کو زیر بار کر رکھا ہے۔

نئے نام کا انتخاب

اس شخص سے میرا تعارف "بلانش بیٹ" نے جو ایک مشہور ایکٹرس تھی کرایا۔ میں اس کے ساتھ بلیکو کے تھیٹر میں گئی پہلے تماشہ میں ایک شام کو بعض چیزیں یاد دلانے کی غرض سے بلیکو کو مجھ سے ملنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ تھیٹر میں بالکل تاریکی تھی میں نے ادھر

ادھر مڑکر دیکھا مجھے دور سے ایک سفید دھبہ کا لوکی شکل کا دکھائی دیا میں سیدھی اس طرف بڑھی۔ یہی مسٹر بلیکو تھے انہوں نے مجھ سے یاد کیا ہوا سبق دھرانے کی فرمائش کی میں نے سنا دیا۔ اس کے بعد مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ دوسرے دن صبح کو ان کے دفتر میں آکر اقرار نامہ کی تکمیل کر دوں۔

حسب ہدایت جب صبح کو میں ان کے یہاں پہونچی اور میں نے اپنا نام ان کو بتلایا جسے وہ بالکل بھول گئے تو سنکر کہنے لگے میں تم کو اس نام سے نہ پکاروں گا۔ کوئی اور نام سوچو۔ میں نے کہا مجھے ہمیشہ "میری" نام پسند رہا ہے مسٹر بلیکو نے بھی میری ہی نام پسند کیا۔ مگر میری اسمتھ نہیں بالآخر متعدد ناموں کے رد و قدح کے بعد میں نے مسٹر بلیکو سے اپنی ایک عزیزہ کا نام لیا جس نے مسٹر پکفورڈ سے شادی کی تھی وہ چلا اٹھا۔ ٹھیک ہے آج سے تمہارا نام میری پکفورڈ ہوگیا۔ جب میں مسٹر بلیکو کے یہاں ایکٹرس کی خدمت انجام دے رہی تھی اسی وقت سے میری زندگی کا کامیاب دور شروع ہوگیا۔ میری تنخواہ بہت کم تھی اخراجات اتنے تھے کہ میں بمشکل تمام اس سے کچھ پس انداز کرسکتی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب محیر العقول متحرک تصاویر ایجاد ہو رہی تھیں ایکٹرس اس مباح کھیل میں شریک ہونے کو اپنی بے وقعتی تصور کرتے تھے اور اس وقت فلم میں شرکت حد درجہ بے عزتی خیال کی جاتی تھی۔

ملاقات اور خوش قسمتی

مجھے تھیٹر سے انس تھا اور اپنی نادانی کی وجہ سے میں بھی فلم کمپنی سے ہچکچاتی تھی کیونکہ اس کے متعلق ایکٹروں کے جو خیالات تھے اس کی بھنک میرے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ مگر اپنی ماں کی دلجوئی کے لئے میں نے اس سے اقرار کر لیا تھا۔ کہ میں "فورٹینتھ اسٹریٹ" پر جاؤں گی۔ ہمارے گھر سے اس مقام تک ٹرام کار کا ٹکٹ دس سینٹ تھا (امریکہ کا ایک کم قیمت سکہ جو ہمارے یہاں کے حساب سے تقریباً چار پائی کا ہوتا ہے) میں نے تقریباً ایک میل تک پیدل سفر طے کیا۔ اس کے بعد ٹرام میں بیٹھ کر ٹرانسفر ٹکٹ مانگا اور لے لیا میرا قصد تھا کہ حسب وعدہ جو میں نے اپنی ماں سے کیا تھا تصویر خانہ جا کر پلٹ آؤں اور اس قیمتی ٹکٹ سے ٹائمس اسکوئیر تک پہونچ جاؤں۔ جہاں مجھے تھیٹر کے ایجنٹ کے دفتر میں جانا تھا۔ اپنے ٹکٹ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تاریخی کتب خانہ میں داخل ہوئی میں نے ایک شخص کو اپنا نام بتلایا جو شیشے کی کھڑکی کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور اپنے کام کا مختصر سا مطلب بھی بیان کر دیا۔ میری پشت کی جانب سے دروازہ کھلا اور میں نے مڑکر ایک لمبے قد کے شخص کو دیکھا جس کے خوبصورت چہرے سے تدبر اور پختہ کاری ٹپک رہی تھی باہر آنے کے بعد وہ مجھے چند سیکنڈ تک گھورتا رہا پھر اشارے سے اندر بلایا۔ یہی مسٹر ڈیوڈ وارک گریفتھ تھے ان کے ساتھ میں دفتر میں داخل ہوگئی میں اس شخص کے حالات سے بالکل ناواقف تھی بالآخر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد اس نے کہا میں چاہتا ہوں تم میری فلم کمپنی میں کام کرو۔ میں تمہیں ملازمت دینے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے اسے قبول کر لیا۔ میری تنخواہ چالیس ڈالر (۸ پونڈ) ہفتہ واری قرار پائی۔ میں جس وقت گھر پہنچی اور اپنی ماں سے اس قصہ کو بیان کیا تو وہ مجھے گلے لگا کر مسرت کے آنسو بہانے لگی میں اپنے کمرے میں گئی اور ٹرانسفر ٹکٹ کو ایک چھوٹے سے قلمدان میں جس میں بعض خاص چیزیں محفوظ تھیں رکھکر قفل لگا دیا میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں یہی وہ ٹکٹ ہے جو میری کامیابی کا ذریعہ بن گیا اگر میں عجلت کے ساتھ تصویر گھر سے چلی جاتی جیسا کہ میرا خیال تھا۔ تو میں مسٹر گریفتھ کو کبھی نہ دیکھ سکتی اور ساری عمر تھیٹر کی ایکٹرس بنی رہتی۔ وہ ٹرانسفر ٹکٹ جس کو دیکھ کر لوگ تعجب کرتے ہیں اس وقت بھی میرے پاس ہے اور مثل دیگر قیمتی اشیاء کے اس ٹکٹ کی قدر کرتی ہوں۔ فقط



تصورات کی دنیا

تصورات کی دنیا بسا رہا ہوں میں
ترے خیال کی محویت فنا ہوں میں

صدف کے پہلو میں سختی کو جھیلتا ہوں میں
صفا طلب ہو جو۔ وہ قطرۂ آب کا ہوں میں

جفا ہو تم بہ ہمہ تن، تمہیں وفا ہوں میں
تمہیں بتاؤ کہ تم کیا ہوا اور کیا ہوں میں

بصد لطافتِ یک قطرۂ آبِ شبنم پر
فشارِ صد ورقِ غنچہ دیکھتا ہوں میں

میں رو بقبلہ نہیں ہوں تو عیب کیا میرا
کہ حلقۂ دو جہاں میں خدا نما ہوں میں

ہزار موج کے رشتوں کی بندشیں ہیں فضول
حبابِ بحر ہوں بن بن کے ٹوٹتا ہوں میں

درست رنگِ جفا نے کیا ہے نقشِ وفا
شکستِ دل سہی بنا عہد باندھتا ہوں میں

مری لحد پہ جو قاتل نے خاک ڈالی تھی
پکار اٹھی وہیں عاشق کا خوں بہا ہوں میں

امیدِ دشمنِ خارِ الم ہوں کیا کہیے
بہانہ پھوٹ کے بھی جو رہ آبلہ ہوں میں

جسے کوئی بھی نہیں بھول کر ہے اک تا
سوادِ شہرِ خموشاں میں وہ دیا ہوں میں

شکستِ دل ہی جہاں میں حصولِ جمعیت
حباب کی طرح بن بن کے ٹوٹتا ہوں میں

بھنور میں چھوڑ گیا ناخدا یہ کہہ کے مجھے
خدا نہیں۔ تری کشتی کا ناخدا ہوں میں

نمودِ حیرتِ دنیائے حسن مجھ سے ہے
گدازِ رنگِ خرد کا اک آئنہ ہوں میں

شہیدِ عشق ہوں بدلوں گا جامۂ ہستی
ابھی تو اپنے لہو سے نہا رہا ہوں میں

حرم کے سجدہ فروشوں سے کہہ رہا ہے وہ بت
صنم کدہ میں چلو دیکھ لو خدا ہوں میں

مجھی سے ملکِ سخن میں ہے روشنی خورشید
سخن کے چرخ کا سرمایۂ ضیا ہوں میں

جذبۂ بے اختیار

از جناب رؤف فلکی حیدرآبادی

فیروزہ ...... جمشید کی حور شمائل بیگم پیرسٹر شہریار کے ساتھ جو ہم سرما قرب وجوار ہی میں بسر کر رہا تھا باغ عامہ کی ایک پگڈنڈی پر خراماں، خراماں چلی جارہی تھی۔ اس کا گداز، متناسب الاعضا اور سفید جسم صراحی تمام دل آویزیوں اور شباب کی رعنائیوں سے، ایک ہلکے دھانی رنگ کی ساری میں ملبوس تھا۔ بالوں کی لٹیں، خاص پارسی وضع میں جوڑا بناکر ایک سفید کپڑے میں سر پر باندھ لی گئیں تھیں۔ گویا سیاہ ناگنوں کا ایک اجتماع تھا جنھیں اس خوف سے کہ کسی کو ڈس نہ لے مقید کر دیا گیا تھا۔ سفید ساٹن کی چست جاکٹ ایک ایسا منظر پیش کر رہی تھی جو کشمیر کی کسی فردوس نظر وادی ہی میں نظر آسکتا ہے۔ جہاں گلاب کے دو پھول برف کے سفید ذرات سے ڈھنکے ہونے کے باوجود چشم حسن طلب کو دعوت نظارہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ....

سر پر لکہ ہائے ابر ساکن تھے جن کی اوٹ سے بعض مقامات پر صاف دشفاف نیلگوں آسمان کے اکثر حصے جھانکتے ہوئے بھی نظر آرہے تھے بادل غیر متحرک تھے گویا وہ کسی خاص مقناطیسی قوت کے زیر اثر صنوبر کے تناور درختوں کے اوپر ساکت ہیں۔ آگے راستے پر ریل کی پٹری بچھی ہوئی تھی۔ اور گیٹ پر ایک سنتری بندوق اٹھائے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ یہاں سے کچھ فاصلہ پر ٹاؤن ہال کی عظیم الشان عمارت مع اپنے سر بفلک میناروں کے استادہ تھی۔

"مجھے مطلق امید نہ تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہوگی" فیروزہ نے اپنی چھتری کی نوک سے سالگذشتہ کے خشک پتوں کو بکھیرتے ہوئے کہا "بہرحال مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی ...... اس مرتبہ میں تم سے سنجیدگی سے گفتگو کرنی چاہتی ہوں میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ اگر درحقیقت تمھارے دل میں میری محبت اور عزت موجود ہے تو خدا کے لئے اس تعاقب کا خاتمہ کردو ...... تم سایہ کی طرح میرا پیچھا کرتے ہو ...... مجھے حریص نظروں سے گھورتے ہو ...... اپنی محبت کا دعویٰ کرتے ہو ...... اور عجیب وغریب نامہ و پیام کرنے سے تک دریغ نہیں کرتے ...... آخر اس کا کیا انجام ہوگا ...... اس کا کیا نتیجہ نکلے گا ......؟

شہریار نے ایک لفظ بھی نہ کہا ...... فیروزہ نے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس طرح اپنا سلسلہ کلام جاری کیا۔ "پانچ طویل سال کی بےغرض دوستی کے بعد ... میں سمجھ نہیں سکتی ......"

فیروزہ نے آہستہ سے اپنے ساتھی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ارادتاً نیم وا آنکھوں سے نرم وملایم ابر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرا ایک ایسے شخص کی طرح جو حالت کرب واضطراب میں فضول بکواس سننے پر مجبور ہو غصہ، نفرت اور برافروختگی سے تمتما رہا تھا ——

"مجھے حیرت ہے کہ تم سمجھتے نہیں ......" بیگم جمشید نے اپنے شانوں کو حرکت دیکر کہنا شروع کیا "تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کردار جو تم نے اختیار کیا ہے شریفانہ نہیں کہلایا جاسکتا۔ میں شادی شدہ ہوں ..... اپنے شوہر سے محبت کرتی ہوں ...... اور اس کا احترام اپنا فرض سمجھتی ہوں ...... خود میری ایک لڑکی موجود ہے ..... کیا تم ان چیزوں کو بے معنی خیال کرتے ہو علاوہ ازیں بحیثیت میرے دیرینہ دوست تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ازدواجی تعلقات اور تقدیس مناکحت کے متعلق میرے کیا خیالات ہیں ......؟"

یہ سنکر شہریار نے غصہ سے کھانسکر اپنا گلا صاف کیا اور آہ بھر کر کہا: "تقدیس مناکحت ... او ... خدا!"

"ہاں ... ہاں ... مجھے اپنے شوہر سے محبت ہے ... میں اس کا احترام

کرتی ہوں۔ اور اپنے گھر کی خوشحالی کو ہر حیثیت سے مقدم سمجھتی ہوں ...... اس سے پہلے کہ تم پیارے جمشید اور اس کی لڑکی کے لئے باعث ننگ و عار ثابت ہوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لینا گوارا کر لونگی ...... اور میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ خدا کے لئے مجھے میری حالت پر چھوڑ دو ...... ہم آج سے ایک دوسرے کو اپنا سچا دوست تصور کریں گے ...... ان آہ و زاریوں کو جو کسی طرح تمھیں زیبا نہیں ہیں ترک کر دو ...... بس اب ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ سمجھو۔ میں اب ایک لفظ بھی اس کے متعلق سننا نہیں چاہتی ...... بہتر ہے کہ اب ہم کسی دوسرے ہی موضوع پر گفتگو کریں ...... !"

فیروزہ نے دوبارہ شہریار کی طرف کنکھیوں سے دیکھا ...... وہ آسمان کی طرف اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا اور وہ انتہائی برافروختگی کے زیر اثر اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ وہ اس کی ناراضی اور برہمی کا سبب قطعاً نہ سمجھ سکی۔ مگر اس کی پژمردگی نے اس کے دل پر اثر ضرور کیا۔ "ناراض نہ ہو۔ ہمیں دوست بن جانا چاہیئے .." اس نے محبت آمیز لہجہ میں کہنا شروع کیا "راضی ہو نہ ...... ؟" "یہ لو میرا قول کا ہاتھ ...!"

شہریار نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہنا شروع کیا —

"میں کوئی طفل مکتب تو ہوں نہیں ...... کہ اس عورت کی تجدید دوستی سے جس سے مجھے حقیقی عشق ہے خوش ہو جاؤں ......"

"بس ...... بس ...... اس کا تو ذکر ہی لاحاصل ہے ... ہم نشست کے قریب پہونچ چکے ہیں ... بہتر ہوگا اگر تھوڑی دیر بیٹھکر سستا لیں"

فیروزہ اپنے دل میں ایک مسرت آگیں اطمینان محسوس کر رہی تھی، سب سے زیادہ نازک اور مشکل ترین چیز کا اظہار کر دیا جا چکا تھا۔ اس روح فرسا سوال سے اس کو ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو چکی تھی۔ اپنے گھر کی پر امن فضا میں اب وہ اطمینان سے رہ سکتی تھی اور اسکو اپنے شوہر کی محبت اور فرمانبرداری میں کسی کے دخل انداز ہونے کا احتمال نہ تھا۔ اس شخص کے چہرے پر نظر ڈالکر جو اس کا پرستار تھا صنف نازک کی اس امتیازی فوقیت کے لحاظ سے جو ان کو مرد پر حاصل ہے وہ ایک مخصوص خوشی محسوس کرنے لگی ...... وہ یہ دیکھکر آپ ہی آپ خوش ہو رہی تھی کہ یہ تنومند، قوی الجثہ، باعز چالاک، اور بقول شخصے "ذہین" شخص جس کا چہرا تکلیف دہ دلی کیفیات اور دماغی ہیجان کا صحیح مرقع بنا ہوا تھا۔ فرمانبردارانہ انداز میں سر تسلیم خم کیا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ ثانیہ تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے ....

"کس چیز کا تصفیہ ہوا نہ فیصلہ ...... " شہریار نے کہنا شروع کیا۔ "کسی کتاب سے یاد کئے ہوئے جملے تم میرے سامنے دہرا رہی ہو ...... میں اپنے شوہر سے محبت کرتی ہوں ...... اس کا احترام فرض سمجھتی ہوں ...... تقدیس مناکحت ...... میں تم سے حلفیہ کہتا ہوں کہ خود تجھے اپنے گناہ آلود اور مجرمانہ طرز عمل کا اعتراف ہے ...... اس سے زیادہ کوئی شخص اور کیا کہہ سکتا ہے ...... مگر جو بات اظہر من الشمس ہے اس کے اظہار سے حاصل ...... ؟ کاش کہ تم اپنی ان چکنی چپڑی باتوں کے بجائے میرے متعلق سنجیدگی سے کچھ کہتیں یا ٹھنڈے دل سے غور کرتیں ...."

"میں نے جو کچھ کہنا تھا کہدیا ہے ...... بس اب یہاں سے چلے جاؤ۔"

"تم بخوبی جانتی ہو کہ میں پانچ دفعہ گیا ...... مگر ہر مرتبہ واپس آیا ...... اگر تمھیں یقین نہ ہو تو میں اپنے ٹکٹ بتا سکتا ہوں ...... وہ سب میرے یہاں محفوظ ہیں ...... تمھاری جدائی میں ہرگز ...... ہرگز برداشت نہیں کر سکتا ...... میں مقابلہ کر رہا ہوں ...... اور مردانہ وار مقابلہ کر رہا ہوں مگر جب مجھ میں قوت مدافعت نہیں ہے اور اگر میں کمزور اور بزدل ہوں تو آخر اس نکمی زندگی سے کیا فائدہ ...... ! آہ میں فطرت کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتا ...... تم کیا سمجھتی ہو ...... میں ہرگز نہیں کر سکتا ...... میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں ... اور وہ میرا دامن تھام لیتی ہے ...... اور مجھے کشاں کشاں لے آتی ہے ...... قابل نفرین ... شرمناک کمزوری ...!"

شہریار کا چہرہ جذبات کی برانگیختگی سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور اپنی نشست کے قریب ٹہلنے لگا ...... "میں اپنے ہاتھوں سے ذلیل ہو رہا ہوں ... " اس نے اپنی کلائی کو ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے کہنا شروع کیا "خود مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی ہے ......"

"او خدا ...... میں ایک ناعاقبت اندیش، رذیل، طفل مکتب کی طرح دوسرے شخص کی منکوحہ بیوی پر اپنی محبت جتانے کی سعی بیجا حاصل کر رہا ہوں ...... اس کے نام عشقیہ خطوط روانہ کر رہا ہوں ...... اور حقیر ہو رہا ہوں"

شہریار اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر غصہ میں بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گیا ... "اور تم اپنی دروغگوئی تو دیکھو ..." اس نے انتہا درجہ کے

نفرت آمیز لہجہ میں کہا۔ "جب تمہیں میرا طرزِ عمل پریشان کن اور ناگوار تھا تو یہاں تک قدم رنجہ فرمانے کی تکلیف کیوں کی ... وہ کیا کشش ہے جو تمہیں یہاں کھینچ لائی ... میں نے اپنے خطوط کے ذریعے تم سے ایک راست اور فیصلہ کن جواب طلب کیا تھا ... ہاں یا نہیں ... مگر تم نے بجائے راست جواب دینے کے ان "تعا تیہ ملاتاتوں" سے کسی کتاب کے مقولے گوش گذار فرما کر میری عزت افزائی کی ... ."

بیگم جمشید خوف و پشیمانی کے زیر اثر خاموش بیٹھی تھی۔ اچانک اس نے ایک مہذب عورت کی طرح جو اپنے کسی حصہ جسم کو عریاں دیکھ کر پریشان سی ہو جاتی ہے اپنی از خود فراموشی کا احساس کیا۔ "تو غالباً تم یہ سمجھتے ہو کہ میں مذاق کر رہی ہوں ... میں نے ہمیشہ تمہیں راست جواب دیا ہے ... اور ... اور آج میں نے تم سے التجا بھی کی ... ."

"اُف ... ! گویا ایسے معاملات میں التجا کی جاتی ہے ... اگر تم مجھے کبھی سنجیدگی سے "نکل جا" کہتیں تو میں کب کا چلا گیا ہوتا ... مگر تم نے کبھی ایسا نہ کہا ... عجیب ناانصافی ... ہاں بیشک ! تو تم مذاق کر رہی ہو ... یا ... !"

شہریار نے یہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ فیروزہ نے دل ہی دل میں ابتدا سے اس وقت تک اپنے طرزِ عمل پر تبصرہ کرنا شروع کیا صرف اس کا ظاہرا برتاؤ ہی نہیں بلکہ اس کے پوشیدہ جذبات بھی اس بات کی تائید کرتے تھے کہ اس نے ہمیشہ شہریار کی محبت کی مخالفت کی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ بیرسٹر کے الفاظ میں کچھ حقیقت کے شائبے بھی موجود ہیں ... مگر اس حقیقت سے لاعلمی کی بنا پر شہریار کی شکایت کا اس کو کوئی جواب بن نہ پڑا تاہم اس نے غور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ... خاموشی قرینِ مصلحت نہ تھی اس لئے اس نے اپنے شانوں کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "تو گویا میں موردِ الزام ہوں ... معلوم تو یہی ہوتا ہے"

"تمہاری دروغگوئی کی وجہ سے میں تمہیں الزام نہیں دینا چاہتا"، شہریار نے آہ سرد بھر کر کہا۔ "میں نے جو کچھ بھی اس کے متعلق کہا ہے اس سے میرا مطلب یہ نہ تھا ... !" واقعات کی کشمکش کا لحاظ کرتے ہوئے تمہاری دروغگوئی کوئی غیر فطری چیز نہیں ... اگر لوگ یونہیں متفق ہو کر حق گوئی اپنا شعار بنالیں تو دنیا کا سارا انتظام درہم برہم ہو جائے ...."

فیروزہ اس فلسفیانہ گفتگو کو سننے کے لئے قطعاً تیار نہ تھی۔ مگر گفتگو کا موضوع بدلنے کے اس موقع کو بھی وہ ہاتھ سے دینا نہ چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے دریافت کیا۔ "آخر اس کی وجہ کیا ہے ؟"

"چونکہ وحشی جانور اور عورتیں ہی وفادار ہو سکتے ہیں ... مثلاً صنفِ نازک کی پارسائی ... وفاداری تو خارج از بحث ہے۔"

شہریار نے غصہ میں اپنی چھڑی سے زمین کھرچنی شروع کی۔ بیگم جمشید نے اس کے الفاظ کو غور سے سنا اور اس کی تقریر بھی پسند کی۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر چیزیں اس کے لئے بعید از فہم ضرور تھیں۔ سب سے زیادہ وہ یہ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ایک قابل شخص ایک معمولی عورت سے مخاطب ہو کر نفسیاتی مسئلوں پر خیال آرائی کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس برافروختہ نوجوان کے زرد اور پژمردہ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بھی محظوظ ہو رہی تھی اس کی گفتگو کے اکثر حصوں کو سمجھنے سے وہ قاصر ضرور تھی مگر جو چیز اس پر واضح تھی وہ اس کی جاذبِ نظر جرأت تھی۔ جس کے زیرِ اثر دورِ جدید کا یہ فرد اعلیٰ مسائل کو حل کر کے مدلل نتائج اخذ کر رہا تھا ... اس نے اچانک محسوس کیا کہ وہ اس کی قدر کر رہی ہے اور اس خیال سے کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"معاف کیجئے ... مگر میں نہیں سمجھ سکتی ..." اس نے قدرے جلدی سے کہا۔ "کہ تم دروغگوئی کا الزام مجھے کس وجہ سے دیتے ہو ... میں دوبارہ درخواست کرتی ہوں کہ مجھے اپنا سچا اور حقیقی دوست سمجھو ... مجھے تنہا چھوڑ دو ... میں تم سے منت کرتی ہوں ... ."

"بہت خوب ... میں کوشش کرتا ہوں ..." شہریار نے افسردگی سے کہا۔ امکانی کوشش کرنے سے دریغ نہ کرونگا ... مگر مجھے یقین نہیں کہ اس جدوجہد کا کوئی نتیجہ نکلیگا ... یا تو میں گولی سے اپنا دماغ اڑا دونگا۔ یا ایک احمق کی طرح بادہ نوشی اختیار کر لوں گا ... تاکہ ہمیشہ کے لئے اس بے عزت زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے خود فطرت سے مقابلہ کی بھی ... تم ہی کہو جنون کا ہم کس طرح مقابلہ کر سکتے ہیں کیا تم شراب پینے کے بعد نشہ کی مدافعت کر سکتی ہو ... میں قطعی مجبور ہوں اگر میری روح پر تمہارا تصور مستور ہو چکا ہے۔ اور تمہارا ... صرف تمہارا خیال شب و روز میری آنکھوں کے سامنے ہے ... اس صنوبر کے درخت کی طرح ایک لحظہ کے لئے بھی نہیں ہٹتا ... تم ہی بتاؤ میں وہ کونسا مشکل ترین اور سخت طریقہ اختیار کروں تاکہ مجھے اپنی اس نفرت انگیز اور تکلیف دہ حالت

سے نجات حاصل ہو سکے۔ جس کی وجہ سے میرے تمام تصورات، تمنائیں اور تخیلات اب میرے قبضہ اختیار میں نہ رہے... بلکہ ان پر کوئی دوسری ہی طلسمی قوت مسلط ہو گئی ہے.... میرے دل میں تمہاری طرف سے جذبۂ عشق موجود ہے.... اور اس شدت کے ساتھ موجود ہے کہ میری ہستی تمام تر تمہاری یاد میں جذب سی ہو کر رہ گئی ہے... میں نے اپنے فرائض کو نظر انداز کر دیا۔ ... عزیز و اقارب سے ترک قطع تعلق کی نوبت پہونچ گئی... انتہا یہ کہ خدا کی یاد کے لئے بھی میرے دل میں اب جگہ نہ رہی.... اس نوعیت کی محبت سے مجھے اپنی ساری عمر میں کبھی سابقہ نہ پڑا......"

فیروزہ جس کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ گفتگو یہ موضوع اختیار کرلیگی پرے ہٹ کر اس کی صورت کو مایوسانہ نظروں سے گھورنے لگی... اُس کی آنکھوں میں قطرہ ہائے اشک جھلک رہے تھے... اس کے لب شدت گریہ سے لرز رہے تھے.....اور اس کا چہرا... یاس، حرماں، حسرت و ناکامی کا صحیح مرقع بنا ہوا تھا

"آہ میں تمہاری پرستش کرتا ہوں—" اس نے اپنی آنکھیں اس کی خوف زدہ اور نرگسی آنکھوں کے قریب لاکر کہنا شروع کیا— "تم حسن و خوبی کی ملکہ ہو.... گو اس وقت میں ناقابل برداشت کرب و اضطراب میں مبتلا ہوں لیکن خدا کی قسم میں اپنی ساری عمر یوں ہی بیٹھا ہوا تمہاری نشیلی آنکھوں کا نظارہ کرتے ہوئے بسر کردونگا.... مگر تم منظور کرلو...... میں تم سے التجا کرتا ہوں......!"

فیروزہ جو سخت حواس باختہ ہو رہی تھی۔ اس کو روکنے کے لیے جس قدر جلد ممکن ہو کوئی عذر تلاش کرنے لگی۔ "مجھے چلا جانا چاہیئے" آخرکار اس نے ارادہ کر لیا۔ مگر اس سے قبل کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہناتی شہریار اس کے روبرو گھٹنوں پر استادہ ہو چکا تھا... اس کے دونوں نرم و نازک ہاتھ اس کی مضبوط گرفت میں موجود تھے۔ اس کی پر جذبات آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں.. اور اس کی زبان۔ جوش، بیخودی اور روانی سے چل رہی تھی۔ خوف اور از خود فراموشی کی وجہ سے ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کسی وجہ سے جب کہ اس کے گھٹنے آزادانہ طور پر پکڑ لئے گئے تھے۔ اس کے سارے جسم میں ایک آگ سی لگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کسی قدر غصہ سے اپنے برانگیختہ جذبات پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرنی شروع کی۔ اس کو یہ دیکھکر غصہ آرہا تھا کہ اس قابل اعتراض حرکت سے برافروختہ ہونے کے بجائے وہ ایک شرابی کی طرح جس کو اپنے نفع نقصان کی مطلق پروا نہیں ہوتی بے حس، کمزور، اور کچھ مغلوب سی ہو گئی ہے...... صرف اس کے دل کے کسی گوشہ میں کوئی شئے نیش زنی کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "تو یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتی...... کیا یہی شرافت کا شیوہ ہے......!"

وہ کوئی بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ مگر وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ اس نے کس لئے اپنا ہاتھ جس کو شہریار جونک کی طرح لپٹا ہوا تھا کھینچ نہیں لیا.... اور دیکھو اپنے دائیں بائیں پرخوف نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے" آسمان پر ابر کے ساکن و غیر متحرک ٹکڑے اور اطراف و اکناف کے صنوبر کی درخت جو عالت سکوت میں استادہ تھے ان کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ سنتری گیٹ کے قریب کھڑا ہوا چپ چاپ ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"انھیں دیکھنے دو—" فیروزہ نے دل میں کہا—

"مگر— مگر سنو..." وہ مایوسانہ لہجے میں کہنے لگی۔ "آخر اس سے فائدہ.... اس کا کیا نتیجہ ہوگا..."

"میں نہیں جانتا..... میں مطلق نہیں جانتا..." اس نے آہستہ سے اس کے تکلیف دہ سوال کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ اتنے میں گاڑی کی سیٹی نے فیروزہ کے سلسلہ خیال کو منقطع کر دیا۔

"میں اب ٹھہر نہیں سکتی..... مجھے اس وقت تک گھر پہونچ جانا چاہئے تھا" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جمشید اسی گاڑی سے آرہا ہے... مجھے اس کے لئے کھانا بھی تیار کرنا ہے...!"

یہ کہتے ہوئے فیروزہ نے اپنا تمتمایا ہوا چہرہ گیٹ کی طرف پھیر لیا۔ گاڑی کا طاقتور انجن دھوئیں کے بادل اڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس کے پیچھے ڈبے آہستہ آہستہ چلے آرہے تھے۔ یہ ٹرین خلاف توقع مسافروں یا گجر کی بجائے مال گاڑی نکلی۔ ٹاؤن ہال کی مخالف سمت میں ڈبوں کا منظر سلسلہ حیات انسانی کے مسلسل ایام کی طرح ترتیب دیا ہوا تھا۔ گو وہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا......

آخرکار گاڑی روانہ ہو گئی۔ اور آخری ڈبہ بھی معہ گارڈ اور ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔"

فیروزہ جلدی سے مڑ کر بغیر شہریار کے چہرے پر نظر تک ڈالے تیزی سے قدم اٹھانے لگی ...۔

فیروزہ نے اپنے جذبات پر قابو حاصل کر لیا تھا — مگر اب بھی اس کے چہرے پر شرم کی وجہ سے ارغوانی رنگ کی ایک جھلک نظر آتی تھی — شہریار کے طرزِ عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اپنی بزدلی اور فطری کمزوری کے خیال سے کہ کیوں اس نے ایک مہذب اور پابندِ قواعد عورت ہو کر ایک غیر شخص کو اتنی آزادی کا موقع دیا۔ اس وقت اس کا دماغ صرف ایک خیال کا مرکز بنا ہوا تھا وہ یہ کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے گھر کو پہنچ جائے۔ شہریار اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ ایک راستہ پر مڑ کر اس نے جلدی سے شہریار کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ مگر اس کو سوائے اس کے گھٹنوں پر لگے ہوئے ریت کے ذرات کے اور کوئی چیز نظر نہ آئی۔ کافی دور نکل جانے کے بعد اس نے صرف ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا اور نظروں سے اوجھل ہو گئی —

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرہ میں کھڑی ہوئی پانچ منٹ تک چپ چاپ دریچہ سے باہر بے معنی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے اپنی میز پر ایک نظر ڈالی —

"کمینے انسان —" اس نے اپنے بالوں کو شانوں پر منتشر کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا "کمینے کمزور انسان —"

وہ خود اپنی ہستی سے متنفر ہو رہی تھی۔ اس نے واقعات کی نوعیت پر غور کرنا شروع کیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ شہریار کے دعویٰ عشق کی مخالفت کے باوجود وہ کیا قوت ہے جو اب اس کو شہریار سے ملنے کے لئے دوبارہ مجبور کر رہی ہے .. اور لطف یہ کہ جس وقت وہ انتہا درجہ کی مجبوری اور انکسارانہ انداز میں اس کے پائے ناز پر جھکا ہوا تھا وہ اپنے دل میں ایک مسرت اور ناقابلِ اظہار خوشی محسوس کر رہی تھی۔ ..... خیالات کا ایک لاانتہا ہی سلسلہ اس کے دماغ میں تھا دیر متحرکہ کے فیتہ کی طرح گذرنے لگا ...... اپنی فطرت کی کمزوری کے احساس سے وہ دم بخود تھی۔ اگر بس چلتا تو اپنی اس لغزش کی پاداش میں وہ اپنے گال پر ایک طمانچہ رسید کر لینے سے تک دریغ نہ کرتی ......!

"غریب جمشید ...." اس نے اپنے چہرہ پر لطیف سے لطیف جذبہ کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے خیال کیا۔ "نسرین .... میری معصوم چھوٹی بچی ...... اس کو کیا خبر کہ اس کی ماں کس قسم کی عورت ہے ..... آہ میری تمناؤں کے مرکز ...... مجھے معاف کر دو ...... تمہیں کیا خبر کہ میرا دل تمہاری ..... اور صرف تمہاری محبت سے کس قدر معمور ہے ....."

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ اب بھی ایک جاں نثار ماں اور وفادار انیس زندگی ہے اور اپنے تقدیس مناکحت کے خیال پر ہنوز ثابت قدم ہے جس کا اس نے شہریار سے تذکرہ بھی کیا تھا وہ دوڑی ہوئی باورچی خانہ کی طرف گئی اور ملازموں پر خفا ہونا شروع کیا۔ کہ انہوں نے کیوں اب تک اس کے پیارے شوہر کے لئے دسترخوان نہیں بچھایا۔

اس نے اپنے شوہر کے خستہ چہرے کا تصور ذہن نشین کرنے کی کوشش کرنی شروع کی اور اپنی ازدواجی زندگی میں پہلی دفعہ خود اپنے ہاتھوں سے دسترخوان بھی چن دیا ...... اپنی لخت جگر نسرین پر نظر پڑتے ہی اس کو اپنی آغوش میں لیکر سینہ سے لگا لیا ..... گو بچی کا جسم بہ نسبت پہلے کے سرد اور کسی قدر وزنی بھی محسوس ہوتا تھا۔ مگر وہ اس کا سبب معلوم کرنے کے لئے تیار نہ تھی ..... اس کے بعد اس نے اپنی لڑکی سے اپنے شوہر کے اوصاف بیان کرنے شروع کئے کہ اس کے ابا کس قدر نیک، شریف، اور باعزت ہیں"

مگر کچھ ہی دیر بعد جب جمشید مکان میں داخل ہوا تو نہ اس نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور نہ اسکے آنے سے اس کو کچھ خوشی ہوئی۔ عارضی جذبات بغیر اپنی حقیقت ظاہر کئے اس کو صرف کسی قدر برافروختہ بنا کر سرد پڑ گئے تھے اور وہ دریچہ کے قریب عجیب پریشانی اور کشمکش و پیچ کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی مصیبت کے وقت ہی انسان اندازہ لگا سکتا ہے کہ کسی کے احساسات اور خیالات پر قابو پانا کس درجہ دشوار اور مشکل امر ہے، بعد میں خود فیروزہ نے کہا کہ وہ ایک ایسی الجھن میں مبتلا تھی جس سے نجات حاصل کرنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کہ آسمان پر محوِ پرواز ابابیل کی ٹکڑیوں کا حساب لگانا۔

اسی واقعہ کے مدنظر اس کو اپنے شوہر کی آمد پر ذرہ بھر بھی خوشی نہیں ہوئی اور دسترخوان پر اس کے حرکات کو بھی وہ ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے دل میں اپنے شوہر کی طرف سے خفیف سا تنفر پیدا ہو رہا ہے ......

جمشید جو بھوک اور تھکن سے خستہ ہو رہا تھا غیر معمولی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا —

"یا خدا ...... میں اس سے محبت اور اس کا احترام کرتی ہوں" فیروزہ نے اپنے دل میں کہا۔ "مگر وہ اس بدتہذیبی سے کیوں کیوں کھانا کھا رہا ہے ....؟"

صرف اس کے خیالات ہی پراگندہ نہ تھے۔ بلکہ اس کے جذبات میں بھی ایک انقلاب عظیم برپا ہو چکا تھا۔ دوسرے اور لوگوں کی طرح جنھیں ناخوشگوار خیالات پر قابو حاصل کرنے کا مطلق تجربہ نہیں ہوتا۔ بیگم جمشید نے بھی اس تکلیف دہ خیال کو دل سے دور کرنے کی [illegible] امکان کوشش کی ...... مگر اس نے جس قدر کوشش کی اسی قدر شہریار ...... اس کے گھٹنوں پر لگے ہوئے ریت کے ذرات ... سیاہی مائل ابرکے منتشر ٹکڑے ..... ٹرین ...... الغرض ساری چیزیں اس کی نظروں کے سامنے پھر رہی تھیں ...

"تو آخر میں آج ایک بیوقوف کی طرح وہاں گئی ہی کیوں تھی ..." اس نے خود پر ملامت کرتے ہوئے اپنے دل میں کہا — "کیا در اصل میں اس قدر کمزور ہوں کہ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں ......"

خوف خطرہ میں اور اضافہ کرتا ہے! جمشید اپنا کھانا ختم کیا ہی تھا کہ اس عرصہ میں اس نے تہیہ کر لیا کہ اس کے سامنے اصل واقعات کا اظہار کر کے ہمیشہ کے لئے اس خوف سے نجات حاصل کر لے ......

"میں تم سے ایک معاملہ میں سنجیدگی سے گفتگو کرنی چاہتی ہوں" کھانے کے بعد اس کا شوہر اپنا کوٹ اور موزے تھوڑی دیر لیٹ رہنے کی خاطر اتار رہا تھا کہ اس نے کہا ——

"خوب ......"

"ہمیں اس مقام کو چھوڑ دینا چاہئے ..."

"ہاں ... مگر جائیں کہاں؟ بمبئی کا جانا تو قبل از وقت ہوگا ..."

"نہیں بطور تفریح ..... یا اسی طرح ......"

"تفریح ......!" جمشید نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "تفریح ...... میں خود اس کے خواب دیکھ رہا ہوں ...... مگر سوال یہ ہے کہ خرچ سفر کہاں سے لاؤں ...... اور یہ دفتر کس کے تفویض کروں"

پھر کچھ سوچکر اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری کیا .... "بیشک تم اکتا گئی ہوگی ... اگر مناسب سمجھو تو خود کیوں نہیں چلی جاتیں ......"

فیروزہ راضی ہو گئی تھی مگر پھر اچانک اس کو خیال آیا کہ شہریار کے لئے اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا ہے ...... یہ اسی گاڑی میں سفر کریگا اور اسی ڈبہ میں بیٹھے گا ... وہ غور کر رہی تھی ... اس کو اب کس قدر [illegible] حاصل ہو چکا تھا۔ مگر طبیعت میں اب بھی کسی قدر بے چینی سی باقی تھی ... کشمکش میں اس نے اپنے شوہر پر ایک نظر ڈالی اور کسی وجہ سے اس کی آنکھیں اس کے چھوٹے نازک بلکہ زنانی پیروں پر جو دھاری دار موزوں میں پوشیدہ تھے جم کر رہ گئیں ...

دریچہ پر آویزاں پردہ پر کوئی کیڑا بھنبھنا رہا تھا ...... فیروزہ نے موزوں کو دیکھا ... کیڑے کی نغمہ سرائی بھی سنی ...... اور سوچنا شروع کیا کہ وہ کس طرح سفر کریگی ..... شہریار اس کے پہلو بہ پہلو رات دن ٹکٹکی لگائے اپنی کمزوری سے پراگندہ اور روحانی اذیتوں سے پژمردہ بیٹھا رہے گا ......

وہ اپنے آپ کو رذیل، طفل مکتب کے نام سے مخاطب کریگا ...... اپنے سر کے بال نوچیگا ... مگر رات میں مسافروں کے سو جانے کے بعد یا اسٹیشنوں پر اتر جانے ہی موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے روبرو دوزانو ہو جائیگا ...... اس کے پیر پکڑ لیگا ... اس کا گذشتہ تجربہ ان تمام واقعات کا شاہد تھا

آخر کار اس نے ان تمام پریشان کن خیالات سے گھبرا کر کہا۔ "سنو ... میں تنہا ہرگز نہ جاؤنگی ..... تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"احمق نہ بنو" جمشید نے جواب دیا۔ "ذرا عقل کے ناخن لو۔ اس طرح غیر ممکن چیزوں کی خواہش سے فائدہ ......"

"اصل واقعات سے باخبر ہونے کے بعد چلنا ہی پڑیگا" فیروزہ نے اپنے دل میں کہا ——

بہرحال جانے کا عزم صمیم کرنے کے بعد اس نے خود کو خطرہ سے محفوظ سمجھ لیا۔ آہستہ آہستہ اس پر اپنے خیالات واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردا سا اٹھتا ہوا محسوس ہوا اور اب وہ اس قابل تھی کہ اپنے حالات پر ایک نظر ڈال سکے۔ اس نے بہتیرا غور کیا۔ سوچا اور سمجھا مگر اسکو سوائے اس کے کہ یہاں سے چلی جائے اور کوئی صورت بہتری کی نظر نہ آئی —

اس کا شوہر بستر استراحت پر پڑا ہوا خرانٹے لے رہا تھا۔ شام کی دھندلی سیاہی چاروں طرف فضا پر چھا گئی اور اس نے ملاقات کے کمرہ میں داخل ہو کر پیانو سے دل بہلانا شروع کیا۔ بیرونی زندگی کے کیف آگیں لمحات، موسیقی کے ترنم خیز نغمے ... سب سے زیادہ اپنی عقل و فراست کا احساس کہ اس

نے کس آسانی کے ساتھ اپنی ساری مشکلات سے مخلصی حاصل کر لی۔ اس کی روح میں طمانیت اور سرور کا ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ اس کے گراں کن عنصر نے اس کے دل میں یہ بھی خیال پیدا کر دیا کہ اگر اس کی جگہ پر کوئی دوسری عورت ہوتی تو فوراً فریب میں آجاتی اور اس کے لئے ثابت قدم رہنا محال ثابت ہوتا ۔۔۔ اور یہ تو صرف اسی کی نرم دلی اور ضبط کا نتیجہ تھا کہ اس کے پیر کو لغزش نہ ہونے پائی اور اب وہ اس خطرہ کے خوف سے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے یہاں سے کوچ ہی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اس پر اپنی مستقل مزاجی اور پاکدامنی کا کچھ اس درجہ اثر ہوا کہ اس نے آئینہ میں اپنے چہرے کو دو تین دفعہ غور سے دیکھنے سے تک دریغ نہ کیا ۔۔۔

جشن نوروز کی طرب انگیز رات تھی۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی دعوتوں کی آمد شروع ہو گئی۔ مرد کمرہ طعام میں بیٹھے ہوئے تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ خواتین برآمدے میں یا ملاقات کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ آخری مہمان خود شہریار تھا۔ بظاہر وہ بے حد مضمحل اور انتہا درجہ کا شکستہ اور پژمردہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک گوشہ میں صوفہ پر خاموش بیٹھا رہا اور کسی قسم کی کوئی حرکت تک نہ کی۔ یہ زندہ دل اور باتونی شخص خلاف معمول مغموم اور برافروختہ تھا۔ اگر اتفاقاً اس سے کوئی سوال بھی کیا جاتا تو وہ مجبوراً اپنے چہرہ کو متبسم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے یونہی بے معنی اور مہمل سا جواب دے دیتا۔ دو چار دفعہ اس نے کچھ مذاق بھی کیا تو مگر یہ مذاق ترش اور تنزیہ تھا فیروزہ نے یہ سمجھا کہ شاید اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

پیانو پر بیٹھے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ یہ غمزدہ شخص انتہا درجہ کا ثابت قدم ہے ۔۔۔۔ اسکو کوئی روحانی اذیت ستا رہی ہے ۔۔۔۔ اس کے لئے سکون و اطمینان کا خیال تک نایاب ہو رہا ہے ۔ اس کی اور صرف اسی کی خاطر وہ اپنی زندگی کے نشاط انگیز اور بیش بہا دن تباہ کر رہا ہے اپنی آمدنی کا آخری حصہ بھی وہ وہاں اپنی ماں اور بہنوں کی طرف سے بے پرواہ ہو کر صرف کر رہا ہے ۔ اور علاوہ ازیں وہ ایک دماغی الجھن اور روحانی اذیت میں مبتلا ہے۔ عام انسانیت کا تو یہ تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا جائے ۔۔۔

ان تمام چیزوں پر غور کرنے کے بعد اس نے اپنے دل میں ایک ٹیس محسوس کی۔ اگر وہ اس وقت اس کے قریب جا کر صرف "نہیں" کہہ دیتی تو اس کی آواز میں ایسا درد ظاہر ہوتا جو اس کی دلی کیفیات کی صحیح ترجمانی کرتا مگر نہ وہ اٹھی نہ اس کے قریب گئی درحقیقت اس نے اس کا خیال تک نہ کیا۔

شباب کی باطل خود نمائی کا احساس اس کے دل میں آج کی رات جس شدت سے پیدا ہوا اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ شہریار مضطرب اور غمگین ہے اور اس کو اس کا بھی یقین تھا کہ وہ صوفے پر اس طرح بیٹھا ہے گویا اس پر سرخ انگارے رکھے ہوئے ہیں اسکو یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوا مگر ایک ایسے شخص کی موجودگی کے خیال سے جو اس پر دیوانہ وار فدا تھا اس نے اپنے دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ اپنے قابل رشک حسن کی کارفرمائیوں اپنی ناقابل گرفت شرافت اور زیادہ تر اس لئے کہ اب اس نے یہاں سے چلے جانے کا ہی ارادہ کر لیا ہے۔ اس نے آج کی شب جس قدر ممکن ہوا عیش و عشرت میں بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ ادھر اُدھر ناز و انداز کے تیر برساتی ۔۔۔۔ قہقہے لگاتی اور خاص انداز کے گیت گاتی رہی ۔۔۔ وہ دل ہی دل میں گذشتہ ملاقات، سنتری اور ریت کے ذرات کو یاد کر کے خوش ہو رہی تھی ۔۔۔ وہ اپنے مہمانوں کی خوش مزاجیوں اور شہریار کے تنزیہ مذاق سے لطف اندوز ہو رہی تھی ۔۔۔ اس نے پہلی مرتبہ شہریار کی واسکٹ میں طلائی مارکا پن دیکھا اور اس قدر پسند کیا کہ اگر بس چلتا تو اس پن کا بوسہ لینے سے تک دریغ نہ کرتی ۔۔۔

فیروزہ نے جوش اور بے پناہ خنگی سے نصف مدہوشی کی سی حالت کے زیر اثر گانا شروع کیا ۔۔۔۔ اس کے منتخب اشعار زیادہ تر یاس انگیز اور درد ناک تھے جن کا تعلق ایام گذشتہ کی یاد پامال حسرتوں اور دوری وغیرہ سے تھا ۔۔۔ معلوم ہوتا تھا کہ اشعار کے در پردہ کسی الم نصیب کی زندگی کا مضحکہ اڑایا جا رہا ہے ۔۔۔ ۔۔۔۔

"کہ خزاں کے دن بھی ہیں سامنے نہ لگانا دل کو بہار سے" اس نے اس مصرعہ کو بار بار گایا مگر بھلا "خزاں کے دن" کی یاد سے اس کو کیا غرض ۔۔۔

"معلوم ہوتا ہے کہ میں آج کچھ بدل سی گئی ہوں ۔۔۔" اس دور نشاط وطرب میں یہ خیال اس کو بار بار ستا رہا تھا۔

شب کے بارہ بجے یہ محفل برخواست ہو گئی۔ رخصت ہونے والے مہمانوں میں شہریار سب سے آخری مہمان تھا۔ فیروزہ دروازہ تک آ کر اسکو خدا حافظ کہنے کیلئے سخت مضطرب تھی۔ چونکہ وہ اپنی روانگی کی خبر اس کے گوشش

گذار کر کے اس کا اثر دیکھنا چاہتی تھی ....

گو ماہتاب پر [illegible] کے ٹکڑے آگئے تھے جس کی وجہ سے فضا پر ایک دھندلا پن طاری ہو گیا تھا۔ مگر اب بھی وہ اچھی طرح دیکھ سکتی تھی کہ ہوا کے سنکے جھونکے اس کے کوٹ کے دامن سے اٹھکھیلیاں کر رہے ہیں ..... اس کے لئے یہ دیکھنا بھی مشکل نہ تھا کہ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا ہے اور وہ مسکرانے کی ناکام کوشش بھی کر رہا ہے ....

"عزیز از جان ..... میری پیاری" اس نے فیروزہ کو گفتگو کرنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "میری پیاری ......"

بھرائی ہوئی آواز میں اس نے محبت آمیز اور شیریں الفاظ کی بوچھار شروع کر دی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے الفاظ میں محبت کی چاشنی بڑھتی ہی جا رہی تھی ...... یہاں تک کہ وہ لفظ "تو" سے مخاطب کرنے سے تک نہ جھجکا گویا وہ اس کی منکوحہ بیوی ہے .....

"راحت جان ... میری پیاری" اس نے فیروزہ کی صراحی دار گردن پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے کہنا شروع کیا "رحم کرو ..... آہ خدا کے لئے میرے ساتھ چلے آؤ ....!"

اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور غصہ و ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے اپنے سر کو مخصوص انداز میں حرکت بھی دی ..... مگر اس کے چہرے پر کسی قسم کی برہمی کے آثار نہ تھے .....

اس کی وہ ساری نارسائی اور ثابت قدمی نے صرف یہی ایک جملہ جس کو صنف نازک کا ایک مخصوص طبقہ ایسے موقعوں پر استعمال کرتا ہے اس کو یاد دلا دیا۔ "شاید تم دیوانے ہو گئے ہو۔"

"چلو ہم یہاں سے چلے جائینگے" شہریار نے اپنا سلسلہ کلام جاری کیا "مجھے اس سے قبل بھی اس کا یقین تھا اور اب بھی ہے ... میری پیاری .... کہ تم میری طرح بالکل مجبور ہو ..... میری طرح بے چین و مضطرب ہو ..... تمہارے دل میں میری محبت ضرور ہے .... مگر اس کو چھپانے کے لئے کیوں ناکام کوشش کر رہی ہو —— "

یہ دیکھکر کہ وہ جانے کے لئے قدم اٹھا رہی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیا اور جلدی سے کہنا شروع کیا۔ "اگر آج نہیں تو کل سہی ..... مگر تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

میری پیاری ..... سزا ستادگی ... پھر امید و بیم کس لئے ..... کیوں خود کو دھوکہ میں مبتلا کر رہی ہو ....."

فیروزہ نے بمشکل خود کو اس کے پنجہ سے چھڑا کر فوراً دروازہ بند کر دیا۔ ملاقات کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے غیر ارادی طور پر پیانو کو بند کیا۔ اور بہت دیر تک موسیقی ستادہ کی طرف دیکھتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اب اس میں اتنی سکت باقی نہ تھی کہ کھڑی رہتی اور کچھ غور کرتی۔ اس کا وہ سارا غرور اور جوش و خروش اب ایک خوفناک کمزوری۔ عدم توجہی۔ اور تھکان کی شکل میں بدل گیا تھا۔ اس کا ضمیر رہ رہ کر ملامت کر رہا تھا کہ اس کا طرز عمل سخت معیوب اور ایک دیوانی لڑکی کی طرح احمقانہ تھا۔

کچھ ہی دیر پہلے اس کو نیم آغوشی کا موقع ملا تھا۔ جس کی گرمی ایک بجلی کی صورت میں اب تک اس کی طبیعت میں باقی تھی۔ کمرہ میں ہر طرف ایک سکوت طاری تھا۔ صرف ایک موم بتی آہستہ آہستہ جل رہی تھی۔ بیگم جمشید پیانو کے سامنے ایک تپائی پر بیٹھ گئی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی ہے ...... کمرہ کی دھندلی تاریکی اور خود اس کی فطرت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ایک ناقابل ضبط اور مغلوب کن خواہش نے اس پر قابض ہونا شروع کیا ..... ہر لحظہ اس خواہش کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا ...... یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وہ اس کی ساری روح پر مستور ہو گئی اور کچھ دیر بعد اس کے پورے اعصاب اسی ..... ناقابل بیان ...... عجیب اور مسحور کن خواہش کے زیر اثر تھے۔ مگر پہلے کی طرح وہ اس کے لئے تکلیف دہ ثابت نہ ہوئی۔ بلکہ وہ اب ایک خوش آہنگ شکل میں مع اپنی پوری عریانی کے اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔

تقریباً نصف گھنٹہ تک وہ غیر متحرک اور دم بخود بیٹھی رہی ..... مگر شہریار کا تصور اس کے دل و دماغ ...... اس کے تخیلات ...... اور اس کی ساری خواہشات پر حکمرانی کر رہا تھا۔ ...... اس کے بعد وہ اٹھی اور لڑکھڑاتے ہوئے پیروں سے عجیب اضطرابانہ انداز میں خوابگاہ کی جانب روانہ ہوئی ..... جمشید بستر پر پڑا ہوا سو رہا تھا۔ وہ ایک کھلے ہوئے دریچہ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ کر پھر کسی گہرے اور عمیق خیال میں مستغرق ہو گئی ...... اب اس کے دماغ میں کسی قسم کا ہیجان باقی نہ تھا ..... اس کے تمامتر خیالات صرف ایک تمنا کی گرد مرکوز تھے۔ ابتداً اس نے اس کی مخالفت کی کوشش بھی کی مگر کچھ دیر کے بعد ہی مایوس ہو کر اس سے ہاتھ اٹھا لیا ... اس کو اب یقین ہو چکا تھا کہ اس

کا مقابل کس قدر غاقتور اور کس درجہ مستقل مزاج شخص ہے ..... اس کے مقابلہ کیلئے قوت، خود اعتمادی اور ہمت کی ضرورت تھی ۔ مگر جس فضا میں اس کی نشو ونما ہوئی تھی اور جس ماحول میں اس نے تعلیم و تربیت پائی تھی اس کے مد نظر اسکو سوائے ہتھیار ڈال دینے کے اور کوئی طریقہ کار نظر نہ آیا ..... !

"کم بخت بزدل عورت" اس نے خود بخود ملامت آمیز لہجہ میں کہنا شروع کیا "بیشک تجھ سے یہی امید تھی ــــ"

اپنی اس لغزش اور کمزوری کی وجہ سے اسکے احساس خودداری کو اسقدر صدمہ پہونچا تھا کہ اس نے جس قدر گالیاں یاد تھیں اپنے اوپر صرف کر دیں .... اور اشتعال طبع کے زیر اثر اس نے اپنے بعض ایسے عیوب کا بھی اظہار کر دیا جو واقعی حقایق پر مبنی تھے ....! مثلاً اس نے کہا کہ اسکی زندگی کبھی پاکدامنی سے نہیں گذری ... اور نہ اسکو کبھی ایسے حوصلہ شکن رنج و آلام کا سامنا کرنا پڑا .... سچ تو یہ ہے کہ اسکی ساری رد عمل کی کشمکش سوائے تصنع اور بناوٹ کے کچھ حقیقت نہ رکھتی تھی ۔ ...

"بفرض محال اگر میں نے مقابلہ بھی کیا ہے ... تو کس کا مقابلہ ..." اس نے دل میں کہا ۔ "ایک فروخت شدہ عورت بھی ... جسکو اپنی حفاظت کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا .... مقابلہ کرتی ہے ... مگر اس سے فائدہ .... آہ میں دودھ کی طرح کس قدر جلد بدل گئی ..... صرف ایک دن میں ــــ"

"سر میں چکر، پاؤں زخمی، بال دپر ٹوٹے ہوئے" کوئی آوارہ گرد باہر سڑک پر ادبی آواز میں گاتا ہوا جا رہا تھا ــــ

"اگر میں جا رہی ہوں ..... تو بس یہی وقت ہے" فیروزہ نے خیال کیا جس کے ساتھ ہی .... اس کے دل کی حرکت بھی تیز ہو گئی ....

"جمشید ......!" اس نے پر رعشہ اور بھرائی ہوئی آواز میں ــــ "ہم جا رہے ہیں ...... کیوں .... ؟"

"ہاں میں نے پہلے ہی تم سے کہہ دیا ہے ...... تم تنہا جا سکتی ہو .... !"

"مگر ..... غور سے سنو ...." اس نے جلدی سے کہا ــــ "اگر تم میرے ہمراہ نہ چلوگے تو مجھے خوف ہے کہ کہیں تمھیں ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہونا نہ پڑے ..... کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں محبت کے ہاتھوں فروخت ہو چکی ہوں ...."

"محبت .... کس کی محبت .... "جمشید نے دریافت کیا ۔

"خیر ..... تمھیں اس سے کیا فائدہ ..." فیروزہ نے بے پروائی سے جواب دیا

"شاید خواب دیکھ رہی ہے" شوہر نے خیال کیا ۔

اسمیں شک نہیں اس کو اپنی ناز آفرین بیوی کی طبیعت میں اس حیرت انگیز تبدیلی کی ہرگز توقع نہ تھی ..... تاہم ایک نامعلوم خوف اچانک اس کے دل میں پیدا ہو گیا .... پھر سنبھل کر اس نے اپنی بیوی کے سامنے ازدواجی تعلقات اور وفاداری وغیرہ پر ایک مختصر سی تقریر کی .... اور اپنے بستر پر لیٹ کر محو خواب ہو گیا ۔

جمشید کی پر مغز تقریر اس کے لئے مطلق موثر ثابت نہ ہوئی ۔

رات بہت زیادہ بھیگ چکی تھی ۔ مگر ہنوز سڑک پر کچھ لوگ نظر آتے تھے فیروزہ نے ایک ہلکی سی چادر اوڑھ لی .... تھوڑی دیر تک خاموش کھڑی ہوئی کچھ سوچتی رہی .... اپنے رخسار سے ایک قطرہ اشک کو جو آنکھ سے ڈھلک رہا تھا انگشت شہادت سے صاف کیا ... اب بھی وہ اپنے خوابیدہ شوہر پر اپنے ارادہ کا اظہار کرنے کے لئے بیچین تھی ..... "کیا تم سو رہے ہو .... میں کچھ دیر کیلئے تفریحاً باہر جا رہی ہوں .... کیا تم بھی میرے ساتھ چلوگے ..... ؟"

یہ اسکی آخری امید تھی ۔ کوئی جواب نہ پاکر وہ باہر نکل آئی ــــ

آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے مگر کہیں کہیں ایک دو ستارے بھی ٹمٹماتے ہوئے نظر آ جاتے تھے .... ہوا خنک اور سرد تھی .... مگر اس کو نہ ہوا کا خیال تھا اور نہ تاریکی کا خوف .... "آل سینٹ" کے عظیم الشان مینار سے گھنٹہ کی صدا تاریک فضا میں گونجتی ہوئی فضائے بسیط کی گہرائیوں میں غائب ہو رہی تھی ... مگر وہ قدم اٹھاتی رہی اور چلتی رہی ... کوئی مقناطیسی کشش اسکو اپنی جانب جذب کر رہی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر وہ کہیں رک بھی جائے تو کوئی غیبی قوت دھکے دیکر اسکو آگے بڑھا دیگی

"کم بخت ... بزدل عورت" غیر ارادی طور پر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی ۔ "بزدل عورت ... . ."

اسکی سانس پھول رہی تھی ۔ شرم و پشیمانی کی وجہ سے اسکے ہوش و حواس قائم نہ تھے ۔ خود اسکو خبر نہ تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے .... مگر جو قوت اس وقت اس پر حکمرانی کر رہی تھی وہ شرم ..... سبب ..... اور خوف سے کہیں زیادہ موثر تھی .... ! فقط (ماخوذ)

"افسانہ بنا دیں!"

دنیا ہی کو خود جنت فردا نہ بنا دیں
وہ چاہیں تو اس آج کو ہم کیا نہ بنا دیں

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دیں
میں اُن کو بھلا دوں مجھے ایسا نہ بنا دیں

وہ چاہیں تو ہر جنبشِ مژگاں ہی بنیں لفظ
ہم چاہیں تو ہر لفظ کو افسانہ بنا دیں

اب آہ عیادت کی تمنا بھی ہے دشوار
وہ آ کے کہیں اور تماشا نہ بنا دیں

چشمک ہے ستاروں میں وہ کیا سوچ رہے ہیں
غمخانہ کو ہمدوشِ ثریا نہ بنا دیں

کیوں فکرِ مداوا وہ کریں کیوں مجھے پوچھیں
وہ صرف تڑپنے کو تمنا نہ بنا دیں

پھر گردشِ تقدیر کے ہمراہ چلے دور
ممکن ہو تو ہم چاند کو پیمانہ بنا دیں

وہ آتشِ سیال ہے ہر اشک میں بیتاب
ہم چاہیں تو ہر خاک سی پروانہ بنا دیں

اپنا تو بنانا اُنہیں آسان ہے طالب
وہ صرف مجھے آپ سے بیگانہ بنا دیں

سنگین

رشید اور سلام نے باپ کے مرنے کے بعد میراث کے دو حصے کر لئے۔ آم کے دس درخت امرود کے سولہ پیڑ، دس ایکڑ کی اراضی، دو بیل، ایک گاڑی، ہر ایک کے حصے میں آئی۔ ماں نے بہت پہلے داغ مفارقت دیا تھا ان کے پہننے کے چاندی کے بازو بند، چاندی کے کڑے، چاندی کے پتے بالی، اور چاندی کی ہنسلی، ایک بوسیدہ موزے میں بند سے ہوئے سیٹھ جیٹھمل کے ہاں امانتاً رکھے تھے ۱۸ء کے سرکاری قرضہ جنگ کے تمسکات بیس روپے کے دو عدد تھے، یہ بھی دونوں نے آپس میں بانٹ لئے۔ گاؤں کے نمبردار، اور پندرہ سولہ گھر کے کاشتکار تعجب ہی کرتے رہ گئے کہ بٹوارے کے وقت ان سب کو کیوں مدعو نہیں کیا گیا! پولیس میں کسی فوجداری کی رپورٹ کیوں نہیں ہوئی، ان کو بیچ بچاؤ کرانے کا موقع کیوں نہ ملا؟ نمبردار صاحب کی چوپال پورے گاؤں کی عدالت عالیہ ہے، اسمیں سماعت کے لئے دونوں میں سے ایک بھی فریق نے استغاثہ نہیں دائر کیا! کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں بھائیوں کی نشو ونما امن پسندی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ ان میں کبھی فساد نہیں ہوا تھا باپ اور ماں دونوں نے مرتے دم اپنے دونو بیٹوں کو سرہانے بلا کر ہاتھ میں ہاتھ دے کر وصیت کی تھی تم ایک ہی خون کے دو قطرے ہو۔ ہم نے تمہیں قصص الانبیا پڑھائی ہے۔ ہابیل اور قابیل کا قصہ تم دونوں نے پڑھا ہے۔ یوسف اور ان کے بھائیوں کی کہانی بھی تمہارے مطالعہ میں آچکی ہے۔ خبردار اس قسم کا سلوک آپس میں روا نہ رکھنا اگر تم نے ہمارا کہا مانا دنیا تمہارے لئے بہشت بن جائے گی۔ دونو بھائیوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر اسوقت اقرار کیا تھا۔ انشاءاللہ آپ ہمیں ایسا ہی پائیے گا۔ ماں باپ کا سایہ اُٹھنے کے بعد اسی اقرار کو دونو نباہتے رہے۔ لیکن عورت کی سرشت کا جن لوگوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ عالم کے بڑے بڑے انقلاب اسی کے اثر و نفوذ سے برپا ہوئے ہیں۔ تمام خوں آشامیاں، تمام معرکہائے کارزار، قوموں کے تمام عروج و زوال کی تہ میں عورت کی کارفرمائیاں شامل ہوتی ہیں جس حوا نے آدم کو خلد سے نکلوایا، اس کی بیٹیوں نے دنیا کے ہر اہم واقعہ کا بانی مبانی ہونے کا شرف ہمیشہ حاصل کیا ہے۔

رشید اور سلام کی باہمی علیحدگی کی تہ میں بھی دونوں کی بیویوں کے ہاتھ کام کر رہے تھے۔ عورت چاہتی ہے کہ میں اپنے گھر کی ملکہ بن کر رہوں۔ ہر ایک طاقت میرے سامنے سرنگوں ہو۔ رشید کی عورت بڑی تھی۔ غلے کے کوٹھے کی کنجیاں ہمیشہ اسی کے کمر بند میں بندھی رہتی تھیں۔ جتنا روپیہ پیسہ غلے کی فروخت کا آتا سب اسی کے صندوق میں رہتا۔ آم اور امرود کی بکری بھی وہی اپنے پاس رکھتی تھی۔ سلام کی عورت کو اگر ایک پیسے کی بھی ضرورت ہوتی تو وہ اپنی منہ بولی بڑی آپا سے مانگتی یہ بات اس کے دل میں بہت کھٹکتی اور ہمیشہ اسے دھن رہتی کہ کوئی ایسی تدبیر نکالی جائے جس سے وہ بھی غلے کے کوٹھے کی چابیاں اپنے کمر بند میں باندھنے کا اعزاز حاصل کر سکے! اس کے صندوقچے میں بھی آمدنی رہنی چاہئے اور گھر اور کھیت میں کام کرنے والی نوکر عورتوں کے سامنے وہ بھی بار بار چابیے کھنکھنا کر گنتی رہے، اور دیکھنے والوں پر چھوٹی دلہن کی عظمت اور جبروت کا سکہ بیٹھ جائے

پہلے چھوٹی دُلہن نے اپنے باپ اور بھائیوں سے اپنی تمناؤں کا

اظہار کیا۔ اس نے کہلوایا۔ لیکن سلام نے عقیدت اور احترام کے جذبات کو ذرا پامال نہ ہونے دیا جو اس کے دل میں اپنے بڑے بھائی اور بھاوج کی طرف سے موجزن تھے۔ ساس سسر اور سالے نے دبی زبان سے یہاں تک کہہ دیا کہ تمہارے بڑے بھائی بہت خود غرض ہیں۔ ابھی تم نے دنیا نہیں دیکھی ہے۔ یقیناً ایک دن تمہیں اپنے طرزِ عمل پر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ وہ زمانہ آنے والا ہے جب تم میاں بیوی بیک بینی و دو گوش اس گھر سے نکالے جاؤ گے۔ تمہارا مستقبل تاریک ہو گا وغیرہ وغیرہ۔

پھر چھوٹی دلہن اپنی بڑی آپا اور بڑے بھائی جان کے حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے لگیں اور ان کی تمام کمزوریوں کو پیر جی مشہور عامل اور ڈاکٹر راتھر صاحب کے موٹی موٹی سرخیوں والے اشتہارات کے طرز میں مرتب کر کے رات کی خاموشی میں اپنے شوہر کے سامنے پیش کرنے لگیں۔ اس مسلسل پروپاگنڈا کا نتیجہ ان کے حسبِ دلخواہ ظاہر ہوا۔ سلام کے ذہن پر اس پے در پے اشتہار بازی کے اثرات مرتسم ہونے گئے، یہاں تک کہ اس نے اپنی اقبال مندی اور خوش بختی کا راز اسی میں مضمر دیکھا کہ بڑے بھائی سے علیحدگی اختیار کرے۔ چھوٹی دلہن نے اس دن اپنی ماں کے ہاں سے جہیز میں ملی ہوئی بھوری بھینس کے گھی کا چراغ جلایا ہو گا، جبکہ اس نے سلام کو بڑے بھائی سے یہ درخواست کرتے ہوئے سنا کہ:۔

"بھائی جان اب نباہ نہیں ہو سکتا۔ لایئے ترکۂ پدری حصہ رسد بانٹ لیں۔"

رشید اس فقرے سے گوش آشنا نہیں تھا۔ اسے خواب میں بھی وہم نہیں گزرا ہو گا کہ کبھی سلام اس سے اس قسم کی بات چیت کرے گا۔ رشید کی صورت اتر گئی۔ یہ خیال کر کے اس کا جی بھر آیا اور آنکھیں پرآب ہو گئیں کہ اس کا چھوٹا بھائی سلام جسے ہمیشہ اس نے اپنے خون کا جزو سمجھا، آج اسے بے ایمان تصور کرتا ہے۔

چند لمحات کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جواب دیا —

"مناسب ہے۔ جو تمہاری رائے ہو۔ مجھے اسمیں کوئی عذر نہیں۔"

اسی دن شام کو چپ چپاتے بٹوارہ ہو گیا۔ سلام نے اپنی بیوی کے ایما سے جو جو چیزیں پسند کیں رشید نے وہی اس کے حوالے کر دیں۔ اس نے بیلوں کی بہتر جوڑی چھانٹ کر لی اور بڈھے بیل بڑے بھائی کے لئے چھوڑ دیئے۔ جس کھیت میں زیادہ پیداوار ہوتی تھی وہی اپنے لئے پسند کیا۔ جو نئی گاڑی ابھی بنی تھی اور جس کے پہیے ببول کی مضبوط لکڑی سے بنے تھے سلام نے اپنے حصے میں لی۔ جتنے زیور نرم چاندی کے تھے بہت خوشی سے انہیں مانگ لیا۔ رشید نے بڑی دلہن کو بھی ڈانٹ بتا دی کہ خبردار سلام یا اس کی دلہن کی دل شکنی نہ کرنا۔ جو چیز وہ پسند کریں لینے دو۔ ہمیں کوئی عذر نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک ماں کے جائے ہیں۔ دنیا کو تماشہ مت بتاؤ کہ دو بھائی کس طرح آپس میں لڑتے ہیں۔ خدا ہمیں مکئی اور باجرے کی روٹی نمک اور ابالی دال ہی کھلائے گا، گاڑھے کا کرتہ پاجامہ پہنائے گا۔ ہم اسی پر قناعت کریں گے۔

واقعات کو بہت مدت گذر گئی۔ رشید کی فصلیں سابق دستور آتی رہیں۔ اس قناعت پسند دہقان کے خرمن میں غلے کا اتنا ہی انبار رہتا جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا تھا۔ اپنے اپنی بیوی اور بچوں کے تن ڈھانکنے کے لئے سستے سے سستے کپڑے اسے میسر آ جاتے اور کھانے کے واسطے اور کچھ نہیں تو چٹنی روٹی ضرور مل جاتی۔ اس نے کبھی سرکار سے تقاوی نہیں مانگی، محکمہ زراعت سے بیج قرض نہیں لیا۔ کواپریٹو بینک سے روپیہ نہیں اٹھایا۔ اسکا وہی مختصر سا بانس کی ٹٹی کا مٹی سے چھپا ہوا گھر تھا، وہی پرانے نوکر تھے، اور سست رفتار بیل تھے، جن کے گلے میں گھنگرو بھی نہیں تھے۔ ایک بھینس تھی جس کی سب پسلیاں ہرا چارہ بہم پہنچنے کے زمانے میں بھی شمار کی جا سکتی تھیں، بس اتنی کائنات سے وہ مطمئن تھا۔ سال بسال بلاناغہ اراضی کی لگان پٹواری صاحب کا نذرانہ، گاؤں کے چوکیدار کا حقِ خدمت اور نوکروں کی تنخواہ نقد اور غلے کی شکل میں وہ ادا کرتا رہتا تھا۔ اپنے بچوں کی مدرسے کی فیس اور کتابوں کے دام بھی اسی میں سے مہیا کرتا۔

اس کے برعکس سلام کا کاروبار بہت وسیع ہو گیا تھا۔ ہر ایک استفسار کرنے والے کو جب معلوم ہوتا کہ سلام کے ہاں بارہ ہل چلتے ہیں تو اس کی سطوت اور امارت کا گہرا اثر سوال کرنے والے کی طبیعت پر

جم جاتا تھا۔ ایک ہزار روپیہ لالہ جھبل سے اس نے سود پر لیا تھا اور پندرہ سو روپے کو آپریٹو بینک سے اُٹھا لئے تھے۔ باقی اپنے پاس سے ملا کر اس نے جگنا تھ پور کی آٹھ آنے کی پٹی خرید لی تھی۔ پاس ہی فرید نگر کا جو بانس کا جنگل تھا وہ بھی ٹھیکے پر لے لیا تھا۔ اب اس کی ساس، اسکے سسر اور سالے اسی کے سہارے آکر اقامت گزین ہوئے تھے۔ بھلا اتنا بڑا کاروبار اکیلا سلام کیسے چلا لیتا؟ اسے منشی اور کارندوں کی حاجت نہ ہوتی؟ پھر اگر اسی کے سسرال والے اس کی جانب سے کام کی دیکھ بھال کرنے لگیں تو اسمیں کونسی بے شرمی کی بات تھی؟ سلام کے سسر کا الیقین عین حقیقت تھا کہ اس جوصاحب نے زمیندار کو خان صاحبی کا خطاب ضرور مل کر رہے گا۔ چنانچہ ہر نئے سال کے پہلے ہفتے کا پہلا اخبار خاص اہتمام سے منگایا جاتا اور خطابات جو اعزاز سال نو کے لئے دی اتنے غور سے تلاوت کی جاتی جیسے پادری زویمر صاحب بائبل میں بہشت کی خوشخبری دینے والے آیات کی تلاش کرتے ہوں! سلام کے دونو بیٹے بقول اپنے نانا جان کے بلا کے ذہین تسلیم کئے گئے اگرچہ دو سال سے بڑے چوتھی اور چھوٹے دوسری ہی جماعت میں پڑھتے رہے۔ ان کے لئے ایک لڑکا مقرر تھا جو بستہ لیکر پیچھے پیچھے چلے۔ اور وہ ان سب لڑکوں کو بنظر استحقار دیکھتے تھے جو اپنے بستے اپنی ہی بغل میں دبائے ہوئے آتے۔

سلام کے لڑکوں کی ختنہ کے موقع پر دور دور کے رشتے دار آئے تھے۔ چھوٹی دلہن جن لوگوں سے پردہ کرتی تھیں جب وہ بھی آگئے تو دو شالوں کو سوت کی ڈوری سے پردے کی شکل میں باندھ دیا گیا تھا تاکہ صحن میں جو پلاؤ اور زردے کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں ان کے پاس جمع ہونے والے نامحرموں سے آڑ ہو جائے۔ اس دن ایک گھی کا کنستر محض اس واسطے نالی میں بہا دیا گیا تھا کہ اسمیں کچھ چیونٹیاں گر گئی تھیں، اور اگر وہ چھانا جاتا تاہم لطیف مزاج مہمانوں کو کراہیت آجاتی! رشید اور اسکی بیوی اور بیٹے بھی اس تقریب میں مدعو تھے۔ وہ اپنا پرانا بنا ہوا ریشمی جوڑا جسے ہر تقریب اور تیوہار کے موقع پر پہنا کرتی، زیب تن کئے تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کے کڑے اور کانوں میں چاندی کے پتے بالی تھے۔ لیکن اس کی چھوٹی دیورانی کے ایک ایک عضو میں سونے کا زیور تھا۔ وہ پٹرومکس کی روشنی میں جب ادھر سے ادھر ٹہلتی تو اسکا رنگین ریشمی دوپٹہ گردن کی جنبش پر خود بخود نیچے کھسک جاتا اور سب عورتوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ سونے کی چمپا کلی، سونے کے تعویذ، سونے کا ہار، سونے کے پتے بالی، سونے کے جھومر، سونے کی بندی، سب ایک دم کھل جاتے تھے۔ ہاتھوں کی طلائی چوڑیاں اور کنگن، جڑاؤ پہنچی، آرسی، اور بازو بند بھی ایک دم کھل جاتے۔ چھوٹی دلہن کمبخت دوپٹے کے کھسک جانے پر زور سے جھنجھلاتی تھیں اور اپنی جٹھانی سے خطاب کرتیں ——

"بڑی آپا! یہ کمبخت ریشمی ململ خراب ہوتی ہے۔ ذرا سر پر نہیں ٹکتی!"

بڑی آپا گال کو ہاتھ لگائے اپنی دیورانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتیں اور اضطراب آمیز لہجے میں کہتیں —— ہاں بہن بہت چکنا ہوتا ہے بغیر ہاتھ لگائے پھسل جاتا ہے۔

اسی رات چھوٹی دلہن نے اپنے شوہر کو علیحدہ بلا کر یہ بھی کہا آج خدا نے جو عزت ہمیں دی یہ میری امی جان اور ابا میاں کے صدقے ملی ہے۔ ورنہ تم اگر سات سر کے ہو جاتے تو یہ بات نہ نصیب ہوتی۔ وہی دیکھو نا تمہاری بھابھی جان آئی ہیں پرانے چیتھڑے اور چاندی کے دو عدد زیور پہنے ہوئی۔ خدا جانتا ہے وہ آج مجھے حسد بھری نظروں سے گھور گھور کر کھائے جاتی تھیں۔ یا الٰہی تو نے ان حاسدوں سے اچھا پیچھا چھڑایا!"

سلام نے مسکرا کر اپنی بیوی کے دونو ہاتھ پکڑ لئے اور زور سے دبا کر کہا —— ہاں میری ملکہ یہ سب تمہارے اور تمہارے ماں باپ ہی کے طفیل ہے!

* * * * * * * * * * *

سلام نے اپنی نئی عمارت اس بلند ٹیلے پر بنوائی تھی جہاں سے گاؤں کی سب آبادی نظر آتی تھی۔ دوسری جانب اس کے کھیت اور باغات دکھائی دیتے تھے۔ نیچے سے اسکا صاف اور سفید مکان ایسا معلوم ہوتا تھا گویا صاحب لوگوں کے ٹھہرنے کا ڈاک بنگلہ یا کسی رئیس کی کوٹھی ہے۔ مکان کے اردگرد ہری ہری دوب اور انگریزی پھولوں کی کیاریاں تھیں تار کے کھمبوں سے گھری ہوئی حدود تھیں۔

جاڑوں کی صبح جب آفتاب کی سنہری کرنیں موجودات کو درخشاں کرتیں۔ وہ اپنے اورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے پارک کی سبز دوب پر چہل قدمی کرتا۔ بہت دور دامن کوہ تک اسے اپنے گیہوں کے زمرّدیں کھیت نظر آتے، سب بیدار پاسبان اپنے کالے کمبل اوڑھے ہوئے نیچی تانیں لیتے کھیتوں کی خس پوش جھونپڑیوں میں سے نکل کر اسکے روبرو حاضری دیتے نظر آتے، تو اس کا سر پیٹھ کی طرف اٹھ جاتا اور فخر سے اس کی گردن کی رگیں پھول جاتیں، وہ اندازہ لگاتا رہتا کہ اکی مرتبہ کتنا اناج پیدا ہوگا۔ جب وہ دوسری طرف نظر ڈالتا تو آبادی کے تمام پست اور مختصر مکانات نظر آتے۔ اسے وہ چھوٹا سا بانس کا بنا ہوا گھر بھی نظر آتا جہاں اس نے جنم لیا تھا، اور جس میں اب اس کے بڑے بھائی رہتے ہیں۔ اس گھر کے چھپر پر کدو اور سیم کی بیلیں منڈھی ہوئی دکھائی دیتیں، اور دھوئیں کے ستون کھپریل میں سے بلند ہوتے نظر آتے تھے۔

جب وہ سڑک پر نظر ڈالتا تو اس کے لڑکے نفیس اونی اورکوٹ پہنے ہوئے چمکدار پالش شدہ بوٹ سے زمین پامال کرتے اسکول کی جانب جا رہے ہیں ان کا نوکر بستے لئے پیچھے چل رہا ہے، تو اس کا دل عارضی مسرت سے سرشار ہو جاتا۔ پھر وہ یہ بھی دیکھتا کہ اس کے بڑے بھائی کے دونوں بیٹے سفید گاڑھے کے کپڑے پہنے، روئی کی مرزائیاں زیب جسم کئے اپنی کتابیں اور سلیٹ خود ہی لئے ہوئے اسکول جا رہے ہیں تو اسے ان پر بڑا غصہ آتا اور وہ کہتا —— نرے دہقان ہی رہے! بھائی کو کیا اتنا نہیں سوجھتا کہ ان کو ایک ایک اورکوٹ ہی بنوا دیتے؟

سلام کو رات میں نیند بہت کم آتی تھی۔ حساب کی جانچ، قلیوں کی اجرت کی ادائیگی، ٹھیکے کے بانسوں کی نکاسی کا انتظام، فصل کا انتظام، قرضخواہوں کے روپے ادا کرنے کا فکر اسے دو دو بجے رات تک سونے نہ دیتا تھا۔ ہمیشہ نئی نئی تجاویز اس کے ذہن میں آتی رہتیں، آمدنی کے نئے ذرائع کی ہمیشہ اسے عالم خیال میں تلاش رہتی۔ یہ یہ کروں گا میں وہ کروں گا، پھر میں اور بھی مالدار کہلاؤں گا، وغیرہ خیالات سے کبھی اس کا دماغ خالی نہ رہتا۔

تین برس کے بعد عید کا دن ہے۔ سلام کے سسر سالے، اور ساس اپنے گھر چلے گئے تاکہ پانچ سال کے بعد اب وہ گھر ہی کی عید کرینگے۔ گزشتہ تین سال سے فصلیں برباد ہوتی رہیں، اور کھلیان میں بہت کم غلہ آیا جس کے سبب سلام پر قرضے کا بوجھ بڑھتا چلا گیا۔ سرکاری مالگذاری بصد مشکل وصول ہوئی، قرضخواہوں نے نالش فریاد کر کے تمام جائداد حاصل کر لی۔ پھر بھی لالہ جیٹھ مل کے ایک ہزار روپے باقی رہ گئے۔ لالہ جیٹھ مل نے سناہے ڈگری بھی لے لی اور اسی بنا پر سلام اور لالہ مذکور کا خاندانی دوستانہ ختم ہو گیا۔

بخلاف اور رمضانوں کے امسال سلام نے بالالتزام پورے روزے رکھے۔ وہ مغرب سے عشا تک مسجد ہی میں وظیفہ کرتا اور نفل پڑھتا دیکھا گیا اس کے پہلے روزہ رکھنا اس کی دانست میں فاقہ کرنا تھا۔ اس کی بیوی کے زیورات کچھ تو قرض کی ادائگی میں گئے، باقی خبر نہیں کس طرح اس کی سسرال والوں کی آنکھوں دیکھتے خود بخود غائب ہوتے گئے؟

اس کے ہاں ہر عید کو لکھنؤ سے سیویوں کا پارسل آتا تھا۔ لیکن اب کی مرتبہ نہیں منگایا جا سکا۔ مسجد کے قریب ایک خام گھر میں کرائے سے سلام رہتا ہے۔ جس بلند و بالا کوٹھی کو اس نے کبھی بڑے شوق سے بنایا تھا اس کی جانب نظر کرنے سے بھی اسے روحانی صدمہ ہوتا ہے۔

اب کی سال عید کے موقع پر وہ اسکول کے لڑکوں کو مٹھائی بھی نہیں تقسیم کرے گا جو ہر سال اس کی جانب سے بانٹی جاتی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے اور اپنے بچوں کے کپڑے صابون منگا کر خود دھوئے ہیں، شاید انہی کو پہنکر وہ عید کی نماز پڑھنے جائے گا۔ آج بات بات میں اس کی آنکھیں پُر آب ہو جاتی ہیں، شاید اسے وہ تمام عید کارڈ یاد آتے ہوں جو آج اس کے نام بڑی تعداد میں موصول ہوتے تھے۔ یا شاید اسے خیال آتا ہو کہ آج کے دن اسکے ملنے والے قرب و جوار سے گھوڑے، سائیکل، موٹر اور چھکڑوں میں بیٹھ کر آیا کرتے تھے اور عید کی شادمانیوں کا ٹھکانا نہیں رہتا تھا۔

رشید نے اپنے دونوں بیٹوں کے ہاتھ سے سلام کے گھر سوئیاں

یں جب دونوں بیٹے اپنے چچا کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ کئی آدمی سرکاری ردی پہنے کھڑے ہیں، اور سلام کو آوازیں دے رہے ہیں، کیونکہ لالہ ٹھو مل نے سلام کی گرفتاری کا وارنٹ ایک ہزار روپے کی عدم وصولی کی بنا پر ن عید ہی کے دن کے لئے نکلوایا ہے۔ اور اب سلام کو گرفتار کر کے یرگ ح کے جیل میں لیجائیں گے۔ چچی جان رو رہی ہیں اور چچا گھر سے نکلتے نہیں ہتے وہیں کھڑے ہوئے سسک رہے ہیں۔ لڑکوں نے سویاں اپنے تھ سے چولہے پاس لیجا کر ڈھک کر رکھ دیں کیونکہ آج سلام کے گھر میں ئی خادمہ موجود نہیں، اور اپنے والد کو اطلاع دینے چلے گئے۔

یہ خبر سنتے ہی رشید کی روح کانپ اٹھی۔ اس کی محبت نے جوش را۔ وہ فی الفور اٹھا۔ اپنی بیوی کو آواز دی اور جوشیلی آواز میں کہا ——
ہی ذرا لوہے کے صندوق کی کنجی دینا!"

بیوی نے کنجی حوالے کر دی۔ رشید نے جلدی جلدی گن کر ایک ہزار روپے لے، بیوی کی خفیف برہمی پر اسے گھور کر دیکھا اور چلا کر کہا —— کیا یں میرے بھائی کی بے عزتی کا تماشہ دیکھنے میں لطف آئے گا؟" پھر ے تحاشا سلام کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

رشید نے پہنچتے ہی وارنٹ لانے والوں سے کہا "لالہ ھیٹو مل کو را صبر نہ ہوا، خیر۔ یہ لیجیے روپے اور رسید لکھئے۔" پھر رشید روپے لینے لگا۔

سلام کے کانوں میں اپنے بھائی کی آواز کی بھنک پہنچ گئی تو وہ بند روازے کے قریب آکر درزوں میں سے جھانکنے لگا۔ پھر دونوں پٹ کھول کر باہر ل آیا۔ لیکن رشید ایسے جوش کے عالم میں تھا کہ اسے سلام کی موجودگی کا لق احساس نہیں ہوا۔

ایک وقفے کے بعد جب رشید نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سلام کھڑا ا تھا، اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپک کر رخسار پر چکی تھیں، جنہیں بڑے بھائی سے چھپانے کے لئے اس نے منہ یر لیا تھا۔

رشید کا جی بھی بھر آیا، اور اس نے گلوگیر آواز میں کہا —— نادان و گیا ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ کیا بھول گیا کہ ہم ایک مشترک خون کے قطرے ہیں؟"

یہ سنتے ہی سلام پر اور بھی رقت طاری ہو گئی۔

رشید نے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— مصیبت کا مقابلہ جوانمردی سے کرنا چاہئے۔ چل سلام اب چپ رہ۔ چل گھر میں چلیں گے۔

پھر دونوں اندر داخل ہوئے۔

چھوٹی دلہن کا سیاہ پرمٹے کا پاجامہ گھٹنے پر سے پھٹ گیا تھا۔ اپنے جیٹھ کو دیکھ کر اس نے دوپٹے کے پلو سے اسے چھپایا اور گھونگھٹ ڈال کر سر جھکا لیا وہ بھی آہستہ آہستہ رو رہی اور ناک صاف کر رہی تھی۔

رشید کی بیوی بھی اپنے دونوں بیٹوں کو لئے ہوئے بیل گاڑی میں آ پہنچیں۔ رشید نے ان کی طرف دیکھ کر کہا —— "ہیں تم بھی آگئیں" اور اس کے گال سرخ ہو گئے مسرت کے سبب کہ عورت وہی نیک ہے جو شوہر کے اشارۂ چشم کو محسوس کر لے اور اس کی مرضی میں خود پیش قدمی کرے۔

چھوٹی دلہن نے "بڑی آپا!" کہا اور لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

سلام ایک گنہگار کی طرح الگ بیٹھا ہوا، گال کو ہاتھ لگائے لگائے، نگاہیں زمین کی طرف گڑوئے ہوئے رو رہا تھا۔

سلام سے رشید کی بیوی نے رو کر کہا —— "چلو چپ رہو بھائی۔"

پھر چھوٹی دلہن سے کہا —— "لو یہ عید کا تحفہ تمہیں نذر کرتی ہوں۔"

پھر انہوں نے کھیت کا نیا بیع نامہ ہے جو سلام میں ایک زمیندار نے لیا تھا اور رشید نے اسے روپے دے کر اس وجہ سے لے لیا کہ آبائی جائداد ہے۔ بزرگوں کی نشانی ہے۔

رشید نے غمگین ہنسی کے ساتھ کہا —— اب تم میری بات یاد رکھو دنیا میں تسکین اسی کے لئے ہے جس کی امیدیں کم ہیں۔ صدمے اسی کے لئے ہیں جس کی امیدیں زیادہ ہیں۔ سب امیدیں پوری نہیں ہوتیں۔ اور جب وہ پوری نہیں ہوتیں تو بہت صدمہ گذرتا ہے۔ اگر امیدیں کم ہونگی تو صدمے بھی کم ہوں گے۔

رشید کے دونوں بیٹے، سلام کے دونوں بیٹے، بھی چپ چاپ سنتے رہے۔ پھر سب مل کر عید کی نماز پڑھنے چلے گئے۔

حسن عزیز جاوید



عید کا چاند



یہ بات آسانی سے ممکن تھی کہ مضمون زیر نقل کو میں اپنی جودتِ طبع "اور زورِ قلم" کا نتیجہ کہتا یا لکھتا اور اس کو اپنے نام سے موسوم کرکے قارئین سے تو تحسین تحریر حاصل کرتا اور ایڈیٹروں سے تقاضہائے "رائلٹی فریڈ" کی بلا اپنے سر مول لیتا۔ لیکن یہ بات قرینِ انصاف نہیں کہ میں کسی دوسرے کی قلم کاری کو "اپنالوں" اور اس طرح کسی غلط شہرت کا مالک بن بیٹھوں۔

مجھے اس کا مطلق علم نہیں کہ یہ کاغذات کس کے ہیں اور ان کا صحیح مالک اور اصل کاتب کون ہے۔ جو نام اس میں لکھے گئے ہیں وہ اصلی ہیں یا فرضی۔ بہر نوع بالکل اتفاقیہ طور پر یہ مختصر مگر دلچسپ پلندہ مجھے مسوری میں اس سڑک کے کنارے پڑا ملا کہ جس پر مہاراجہ کپورتھلہ کا عالیشان محل واقع ہے۔ اپنی عادتی صباحی چہل قدمی سے فارغ ہو کر میں اپنے مکان کی طرف واپس ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسی محل کی دیوار کے قریب کوئی چیز تہ بہ تہ لپٹی پڑی ہے اوپر کا کاغذ شبنم آلود تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ پلندہ تمام رات یہیں پڑا رہا ہے۔ ورنہ یہ واقعہ اگر صبح کے وقت پیش آتا تو یہ نہ تو شبنم آلود ہوتا اور نہ یوں سڑک کے کنارے پڑا رہ جاتا۔

بہر حال میرا دل بے اختیار اس کے اٹھا لینے کو چاہا کیونکہ اس کے اٹھا لینے کا مجھے ویسا ہی حق حاصل تھا جیسے کہ پولیس والوں کو سرِ راہ پڑی چیز کے اٹھانے مال خانہ میں داخل کرنے یا ضبط کرنے کا حق ہوا کرتا ہے۔ باحتیاط کاغذ کو کھولا کیونکہ اوپر کی تہ کو شبنم کی نمی نے گلا سا دیا تھا۔

ابتدائی چند فقروں پر جو ایک سرسری نظر پڑی تو تحریر دلچسپ و عجیب سی معلوم ہوئی۔ اس لئے باطمینان پڑھنے دیکھنے کے خیال سے مکان لے چلنے کا قصد کر لیا لیکن آپ یقین کیجئے کہ جب تک میں اپنے حصارِ امن میں بخیریت داخل نہیں ہو گیا مجھے یہی کھٹکا لگا رہا کہ کہیں کوئی میری طرح سفید پوش راہ گیر اس کی ملکیت کا دعوے دار بن کر اس کو مجھ سے چھین نہ لے۔ چنانچہ میں اتنی تیزی بلکہ بدحواسی سے مکان کی طرف گریزاں تھا کہ آج اگر میں اس وقت کی صرف نقل ہی اتارنا چاہوں تب بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اس قسم کی تیزروی صرف دو شخصوں کے لئے مناسب کہی جا سکتی ہے یا تو وہ بوڑھا جو مدتِ دراز کے بعد وطن کی طرف لوٹ رہا ہو اور یا وہ نوجوان عاشق جو اپنے محبوب سے ملنے کے لئے بیقرار افتاں و خیزاں چلا جا رہا ہو۔

برسبیل تذکرہ یہ بھی گوش گزار کر دینا ضروری ہے کہ آپ کو چھپوا دینے کی مجھے کبھی جرأت نہ ہوتی اگر میرے ایک نہایت عزیز اور بے حد نہایت دوست کی عظمت اس میں شامل نہ ہوتی اور یہ بھی عجیب حسنِ اتفاق تھا کہ میرے یہ دوست خلافِ معمول میرے ہمراہ نہ تھے ورنہ یہ قطعی ناممکن تھا کہ ان کی خوش کلامی کی محویت کے باعث میری نظر اس پلندہ کی جانب اٹھتی اور نہ ان کی محتاط طبیعت کے خوف سے میں اس کے اٹھانے کی جرأت ہی کر سکتا۔

گھر پہنچا تو شاید مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی کیونکہ ناشتہ پر وہ میرے منتظر تھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"دیر کیوں ہوئی؟ یہ کیا ہے؟"

"کچھ کاغذات!"

"کچھ کاغذات! یعنی؟"

مجھے خود معلوم نہ تھا کہ یہ کیا بلا ہے لہذا میں نے ٹھیک اسی متانت و انداز کے ساتھ جیسی کہ دار العوام میں وزیرِ ہند کسی ممبر کے سوال پر یہ جواب دیں کہ

"تفصیل کا انتظار ہے اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے" میں نے بھی عرض کیا" ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دیکھ لوں تو عرض کروں"

کاغذات کمرے میں رکھ میں ناشتہ نوازی کے لئے میز پر آ بیٹھا مگر میں جو ناشتہ پر "بسم اللہ" سے بھی پیشتر بنظر اشتہار معاملہ جانچ لیا کرتا تھا کون سا طیب مال پہلے نقل کرنا پڑے گا۔ آج اُن کاغذات کے پڑھنے کی پُر لطف بد حواسی میں سب سے زیادہ نامرغوب غذا جس کو انگریزی میں شاید "پارج" اور اُردو میں "دلیہ" کہتے ہیں کھانے لگا میرے دوست نے اپنا کھانا روک کر مجھے گھورتے ہوئے فرمایا۔

"کیوں صاحب آج آپ کا پرہیز ٹوٹ گیا؟"

"کیا مطلب؟"

"یعنی آپ پارج کھا رہے ہیں۔"

"ایں ـــ واقعی ـــ لاحول ولا ـــ میں نہیں کھا رہا ہوں"

کہ کر میں نے رکابی تو سامنے سے ہٹا دی اور جلدی سے چا بنالی اس کے بھی دو ایک گھونٹ ہی حلق سے فرو ہوئے ہوں گے کہ میرے عزیز دوست نے پھر اسی طرح ٹوکا جیسے وائسرائے کی سواری نکلتے وقت غریب ہندستانی کو سڑک پر غلط چلتے ہوئے پولیس کا سرکارہ ٹوکے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"چا پی رہا ہوں۔"

"خوب ـ تو سب سے آخری چیز آج سب سے پہلے نوش جان ہو رہی ہے"

تب تو مجھے بھی انگریزی میں خیال آیا کہ پہلے "بریڈ بٹر بسکٹ" تو تناول کرنے چاہئیں یہ چا کیسی۔

غرض یہ کہ اس سارے بکھیڑے سے جوں ہی نجات ہی میں کمرے میں پہنچا اور داب جان کاغذوں کو پڑھتا ہوں تو بس میری ... نکل جاتا آ گیا۔ آہ کس قدر اچھی یہ تحریر یا تحریریں تھیں کہ میں دل سے چاہا کہ اس کو یوں ہی ضائع جانے دوں یا میرے سوا اور شوقین دل اس لذت سے محروم رہیں لہٰذا میں نے اسی اہتمام سے نقل کر کے جیسے لکھے گئے ہیں بلا اجازت و اطلاع و واقفیت شائع کر دینے کا ارادہ کر کے اپنے عزیز دوست پر اس کا اظہار کر دیا تو فرمایا کہ" پہلے مجھے" میں نے سنا دیا۔ وہ متاثر ہوئے۔ محظوظ ہوئے اور مؤید۔ لہٰذا اسی حق سے اس کو شائع کرائے دیتا ہوں کہ جس حق کی وجہ سے یہ ہندوستان کی ریلوے کمپنیاں غریب مسافروں کے گم شدہ سامان ملازموں کے بکس اور بیمار کے بستر کو نیلام کر کے روپیہ انگلستان کے حصہ داروں میں تقسیم کر دیا کرتی ہیں یا اپنی جیب میں رکھ لیا کرتی ہیں کہنا بھی ضروری ہے کہ اگر حسن اتفاق یا سوء اتفاق سے یہ کاغذات مجھے ملتے تب بھی اس مضمون کا اصلی کاتب اس کو شائع کر دیتا۔ لہٰذا بقدر تو اس فرض کو میں نے انجام دیدیا ہے اب اس سے آگے اگر وہ صاحب کچھ چاہیں تو مجھے تلاش کر کے خواہ اصالتاً یا وکالتاً اپنے کاغذات واپس لے لیں

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم (محمد عبدالحی خاں)

(گذارش ہے کہ اس مضمون کا کوئی عنوان اس کے کاتب نے نہیں لکھا ہے)

جس طرح کہ دنیا نے عبدالملک کو "المشک لحرمات اللہ"۔ ولید کو "جبار"۔ یزید کو "تکبیر"۔ سلمان کو "اکال" اور مسلکہ کو مرادہ مسخر کا خطاب دے رکھا تھا اسی طرح میں نے اپنے پیارے دوست شاہد کو "خیرہ چشم" کا لقب دے رکھا تھا

اس کی وجہ بھی سُن لیجئے۔ باوجود اس کے کہ ہمارا باہمی اتحاد قدم اور دوستی ضرب المثل تھی پھر بھی ہمارے درمیان اختلاف کی ایک ایسی پوشیدہ خلیج حائل تھی کہ جس کو دوسرے تو محسوس تک نہ کر سکتے مگر میں اسی بنا پر ہمیشہ اُس سے دست و گریباں رہتا۔ بات یہ تھی کہ کچھ تو وہ تھا ہی بارد مزاج اس پر فلسفہ کے عمیق مطالعہ نے اس کو اور بھی خشک و خاموش بنا دیا تھا یہ حالت تھی کہ اگر کتب بینی پر اُتر آتا تو دن دن بھر کمرے سے نہ نکلتا اور اسی دھن میں باہر نکل جاتا تو گھنٹوں اخیر شب گرد کی طرح میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ بعض وقت اس کی سرد مزاجی اور رُکے ہوئے پانی کی طبیعت سے میں اُکتا جاتا اور دوست کے اس انتخاب پر اپنے تئیں ملامت کرتا اگرچہ مجھ کو اس کا اعتراف ہے کہ وہ نہایت خوش شمائل دستودہ خصا

شخص تھا اور اسی باعث میں نے اپنے چند ملنے والوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ کاش اُن کا بھی کوئی ایسا دوست ہوتا۔ بیشک وہ ایک بڑی زبردست سیرت کا مالک تھا اور اس کی طبیعت میں گناہ و منہیات سے محترز رہنا ودیعت کیا تھا۔

اور میری طبیعت ہمیشہ کی تماشہ طلب اور مناظر پسند واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ جب ہم دونوں شام کی تفریح کے لئے اِدھر اُدھر جاتے تو بس وہ اپنی فلسفیانہ خاموشی میں گم ہو جاتا اور میں حُسن فطرت میں محو۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ میں نے اس کے سکوت کو اپنی گویائی سے شکست دی ہو۔

پارک میں حوض کے کنارے کوئی نوخیز لڑکی مچھلیوں سے کھیلتی ہوتی تو میں اس سے کہتا

"شاہد دیکھتے ہو — اس کے رنگین شباب کو — گویا فطرت نے فضا کی ساری پوشیدہ خوش نمائیوں کو اس کے رخ و رخسار میں بھر دیا ہے — !"

وہ یوں ہی سا مسکرا دیتا۔ کبھی میں کہتا:۔
"آسمان پر قوس و قزح نے نکل کر تیرہ و تار ابر کے بھیانک پن کو کس طرح دور کر دیا ہے"

تو وہ دیکھتا مگر اس طرح کہ نظر تو آسمان پر لیکن خیال کہیں اور۔

غرض آفتاب کا طلوع۔ اس کا غروب۔ چاند اور اس کی چاندنی۔ باغوں کے سبزہ و گل۔ گلوں کی مہک۔ دریا کا بہاؤ۔ چشمہ کا رساؤ۔ سرو کی راستی۔ شمشاد کا تناسب۔ پھولوں کی جد ولیں۔ حوض کے فوارے کوئی چیز اس کی برودت، اس کی ساکت مزاجی میں ذرہ برابر انقلاب نہ پیدا کر سکتی یا شاید یہ بات ہو کہ مجھے زبان سے کام لینے کی عادت تھی اور اُس کو آنکھوں سے۔ بہرحال اس کے چہرہ پر نہ تو خوشی کی وجہ سے کشائش ہوتی اور نہ رنج کے باعث انقباض۔ اس کو نہ تو حسن و عشق کے افسانوں سے وجد آتا اور نہ جنگ و جدل کے ہنگاموں سے جوش و خروش۔

ایک روز کسی بات پر مجھے غصہ آگیا تو میں نے کہا

"شاہد تمہارے دماغ کو تو ارسطو و ابن رشد کے فلسفہ نے کھوکلا کر دیا ہے۔ قدرت کے عطیات سے بہرہ اندوز ہونا تمہارے مقدر میں نہیں ہے تمہاری بے نور آنکھ تو اس فطرت کا نظارہ کرنے سے معذور ہے۔"

وہ مسکرایا۔ اس طرح جیسے کوئی مُنہ چڑاتے یا طعن مارتے وقت مُسکراتا ہے اور کہنے لگا

"منظور تم ایک بچہ کی طرح خیال آرا۔ ایک شاعر کی طرح تخیل پرور اور ایک نوجوان کی طرح اسیر جذبات ہو"

ایسے طرار فقرے سُن کر میرے آگ ہی تو لگ گئی اور میں نے جل کر کہا۔

"بچہ و شاعر ہونا تو میں اپنے لئے تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن اسیر جذبات ہونے میں تم اور میں دونوں برابر ہیں — فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ تمہارے جذبات کو فلسفی کی تحریر" اسیر کرتی ہے اور میرے جذبات کو حسن کی تنویر۔ میں حُسن کو ید قدرت کا شاہکار سمجھتا ہوں اور تم اس کو انسانیت کا عار۔ تم ارسطو سرشت اور فلاطون فطرت ہو اور میں مضطرب طبیعت حسن پرست۔ شاہد۔ حُسن اور اس کی حقیقت نہ تو افلاطون کا نظریہ تصورات ہے اور نہ ارسطاطالیس کا علم مکاشفہ اور فلوطونوس کا فلسفۂ وحدت الوجود کہ تمہارے جیسے خشک دماغ اس کے عمق تک پہنچ سکیں — اس کی حقیقت کی رسائی کے لئے حساس قلب کی ضرورت ہے اور نہایت نازک دماغ کی۔ شاہد — حُسن اور اس کے اثرات سے انکار وہ مجرمانہ تغافل شعاری ہے کہ جس کے لئے دنیا میں ابھی تک کوئی سزا تجویز نہیں ہوئی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ میں اپنے جوش و خروش میں بکے جاتا اور وہ بے حس و حرکت سُنے جاتا اور نتیجہ صرف ایک کہ میں تھک کر خاموش ہو جاتا اور وہ میری خاموشی سے مطمئن۔

سردی شروع ہو چکی تھی ایک روز مجھ سے کہنے لگا۔

"آج ذرا بازار چلو اور کوٹ کا کپڑا خریدنا ہے جاڑا بہت معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے پہلے تو ایک قہقہہ لگایا اور پھر کہا:۔

"اوہو! تم نے تو آج اپنے ذی روح و ذی حس ہونے کا ثبوت

دے دیا اللہ۔ اللہ تم کبھی موسم کی حدت و شدت کا احساس ہونے لگا ——— میں تو ایسی چیز نہ دوں گا بلکہ فضول چیز خریدنے کی تم کو رائے نہ دوں گا۔"

اُس نے متعجبانہ کہا۔ "فضول نہیں ضروری ——— کیا مجھے پوشش کی ضرورت نہیں ——— تو پھر میرے لئے ضروری کیا چیز ہے؟"

"تمہارے لئے ضروری چیز کیا ہے؟ ——— میں بتاؤں؟ ——— کسی کتب فروش کی دکان پر جاؤ اور پرانی کتابوں کے انبار پر بیٹھکر فلسفہ کی ایسی کتابیں تلاش کرو کہ جو طوفان نوح سے بچی ہوئی ہوں یا کم از کم ہزار برس قبل مسیح کی تصنیف ہوں ——— اُن کو پڑھو اُن پر حاشئے لکھو۔ اور ان کو لکھا کرو اگر اس پر بھی سردی ستائے تو چپ لیٹو اور آگ تاپو۔"

مجھے بتانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے مذاقیہ لب و لہجہ میں جواب دیا۔ "بھلا میری ایسی لیاقت کہاں کہ ایسی کتابوں کو پڑھ بھی سکوں حاشیہ لکھنا تو بڑی بات ہے۔"

"تم ——— تمہاری قابلیت کا تو چار دانگ عالم میں شہرہ ہے۔ آخر وصیت نامہ نوشیرواں بنام ہرمزکس کا لکھا ہوا ہے۔ عہد نامہ اردشیر بابکاں بنام شاپور کس کی دماغ کاوی کا نتیجہ ہے۔ سلاطین ایران کے عہد نامہ۔ توقیعات و فرامین کسریٰ یہ سب کس کی محنت کا ثمر ہیں اور ارسطو کی کتاب "بوطیقا" پر کس نے تلخیص لکھی ہے۔"

اس کا جواب آپ جانتے ہیں کیا تھا؟ وہی اُس کا محبوب و مخصوص تبسم جو نہ صرف میری بات کو ختم کرنے کے لئے ہوا کرتا بلکہ مجھے اور بھی پیچ و تاب میں ڈالنے کے لئے۔

کالج موسم سرما کی تعطیلات کے لئے بند ہو چکا تھا اور شاہد وہیں اپنے وطن میں مقیم۔ معلوم نہیں کہ اس کو کیونکر علم ہو گیا کہ میں عازم مسوری ہوں۔ ایک روز کی ڈاک سے مجھے اس کا مختصر سا خط ملا

"برادر منظور۔ سلام علیکم۔ سنا ہے کہ تم مسوری کا قصد رکھتے ہو کیا میں بھی چلوں - - - تمہارا شاہد"

میرا تو خود یہی ارادہ تھا کہ جیسے ہی قصد مسوری مصمم ہو جائے میں اُس کو معیت کے لئے لکھوں ——— نہیں بلکہ مجبور کروں۔ شاہد کے اس ارادے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی میں نے فوراً ہی جواب لکھا۔

"پیارے شاہد۔ وعلیکم السلام۔ میں خود ہی تم کو لکھنے والا تھا۔ خدا جانے کیوں نہ لکھا۔ تمہارے لئے تمہارا وطن و مسوری دونوں برابر ہیں۔ میری دلچسپی کے لئے تو شاید وہاں سیر و تفریح کے سامان ہوں گے مگر تم وہاں بیکار رہوگے۔ شاید وہاں کوئی عجائب خانہ بھی نہیں ہے کہ جہاں تم گھڑی دو گھڑی کے واسطے جا کر قدیم سکے اور پرانے زمانہ کی صنعت کاری کے نمونے۔ پرانے آلات حرب۔ مشہور لوگوں کے خستہ و کرم خوردہ مخطوطہ قلمی کتابیں مرقع یا قطعات سے اپنا دل بہلا سکو مگر ہاں بھولا تمہارے لئے تو وہاں کا قدرتی منظر ہی ایک عجائب خانے کے برابر ہوگا۔ تم وہاں بڑی فرصت کے ساتھ فطرتی اشیاء پر غور کیا کرنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ یہ تمام اشیاء جو دیکھ رہے ہو کیا چیزیں ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے۔ ان کی غرض و غایت کیا ہے۔ کہاں سے آئی ہیں۔ منفرد ہیں یا مرکب۔ ان میں باہم کچھ ربط ہے۔ اگر ہے تو کس قسم کا کسی ارادے کے تحت ہیں یا خود بخود وجود میں آئی ہیں۔ فوق الادراک ہیں یا تحت ادراک۔ خیر مجھے ان سب باتوں سے کیا غرض مطلب میرے لئے تمہاری موجودگی ہی باعث صد ہزار مسرت ہے خواہ وہ کسی طرح ہو۔ تم فوراً یہاں چلے آؤ اور یہاں سے ہم تم ایک ساتھ مسوری چلے چلیں گے۔ تمہارا منظور"

اس کے جواب میں چار روز بعد شاہد معہ ایک کتابوں کے بنڈل کے میرے پاس آ گیا اور اس کے تین روز بعد ضروری سامان ساتھ لیکر ہم لوگ مسوری روانہ ہو گئے۔

میں درمیان کی دلچسپ تفریحات کو بخیال طوالت قلم انداز کر کے ایک عجیب ماجرے کو نقطۂ آغاز قرار دیتا ہوں۔

لغرض الاتفاق ایک روز ہم دونوں سیٹھ کیمپ سینما گئے وہاں اس شام کو

"عقاب آسمانی" کے نام سے ایک تماشہ ہونے والا تھا۔ سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تماشہ میں اگرچہ ابھی خاصی دیر تھی مگر ہر شخص بے حد شوق و انتظار کے ساتھ پردے کی طرف نگراں تھا۔

جس قطار میں ہم دونوں بیٹھے تھے وہ [illegible] آخری قطار تھی۔

وقت گزاری کے لئے جیسا کہ ایسے مواقع پر ہوا کرتا ہے انسان خواہ مخواہ ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ ہم نے بھی سارے ہال کا جائزہ لیا لیکن بیکار تھی۔ شاہد کی کرسی کے پیچھے نظروں کے لئے ایک دام رنگین بچھا ہوا تھا۔ یعنی اس کرسی پر ایک بدیع جمال - ایک کرشمہ قدرت - ایک نازنین و نازک دوشیزہ سر سے پاؤں تک ایک سادہ مگر پر وقار ارغوانی ساڑھی میں ملبوس اس طرح ساکت و صامت بیٹھی ہوئی تھی جیسے کسی سنگ تراش نے سنگ مرمر کی دیوی کا بت رکھ دیا ہو [illegible] اس کے آئینہ سیما چہرہ پر امارت، حشمت، تمکین اور تسلیم و عظمت کے آثار ہویدا تھے ——— یہی دوسری و آخری نظر اس وقت حیرت ہوئی۔ حقیقتاً تماشہ شروع ہو چکا تھا میں نے دیکھا کہ دیوی اس عارضی تاریکی میں جو تماشہ کے وقت پیدا کی جاتی ہے اس کا منور چہرہ بالکل چمک رہا تھا جیسے خاموش و گہری رات میں بدر کامل۔ اس کی کیفیت انتہائیت اس کے ملتفت ہونے سے بھی بالاتر تھی کہ جو سینما ہال میں اعلیٰ کئے جانے کے قابل ہو۔

میں اپنی دلی کیفیت کو تو شاید الفاظ میں واضح کر سکوں لیکن میں نے دیکھا کہ شاہد پر ایک ایسی حالت طاری ہے کہ جس میں واقعی بڑی شامل تھی ——— اس کی صورت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی غیر محسوس و غیر مرئی شے اس کے عمق وجود میں اتر گئی ہے اور وہ محو و متحیر ہی نہیں بلکہ کچھ پریشان بھی ہے اور لطیف ایسے سوچ میں مستغرق ہے کہ جس کا تعلق سینما کے موجودہ قصے سے نہیں ہے۔

تماشہ شروع ہو چکا تھا۔ شاہد کرسی کے بالکل دوسری جانب کسی قدر ترچھا بیٹھا تھا جیسے کوئی بالارادہ ایسا کرے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کا پتہ چلا کہ اس کا یہ فعل ایک بڑا معقول سبب رکھتا تھا وہ شاید یہ کہ وہ اپنے پیچھے بیٹھنے والی خاتون اور تماشہ کے درمیان حائل نہ ہو ——— اللہ ری بلند خیالی ——— اور پھر پورے دو گھنٹے اس نے اسی طرح گزار دیئے۔

تماشہ ختم ہوا اور لوگ باہر نکلنے شروع ہو گئے ہجوم زیادہ تھا کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ نامعلوم محویت کے باعث ہم دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے میں نے باہر نکل کر جب نظروں سے اسے تلاش کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی کی روانگی کے نظارہ میں ایسا محو ہے کہ ایک بچہ بھی اس کی اس غیر معمولی حالت کو پہچان سکتا تھا۔ مجمع تو رفتہ رفتہ کم ہو گیا مگر اس کی محویت بدستور یہاں تک کہ میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا "چلو" تو وہ اس طرح چونکا جیسے کوئی نیند سے چونکے۔ راستہ بھر نہ تو میں نے اس سے کوئی گفتگو کی اور نہ وہ ہی بولا۔

اختصار اگر ضروری نہ ہوتا تو درمیانی تفاصیل بہت ہی دلچسپ تھیں مگر خیر ——— اس خاص واقعہ کے بعد اکثر ایسا ہوا کہ وہ دوشیزہ دور دور سے دیکھنے کو ملی۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے شاہد کی خاموشی گہری ہوتی چلی گئی۔ مجھے اس کی حالت پر پہلے تو حیرت تھی پھر تاسف ہونے لگا اور اب پریشانی کہ خدا معلوم اس نظارے نے اس کو کتنا متاثر کر دیا تھا کہ بعض وقت اس کی افسردگی دیکھی نہ جاتی تھی۔

ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ نہ معلوم کیوں رات کو سوتے سوتے یکایک میری آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہوں کہ شاہد میز پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا ہے گھڑی نے اس وقت چار بجائے تھے مجھے حیرت تھی کہ ایسے ناوقت خلاف عادت وہ کونسی ضروری بات ہو سکتی ہے کہ جو یہ چند [illegible] لکھنے میں مصروف ہے اور کیا اس نے ساری رات اسی طرح گزاری ہے یا ابھی چند منٹ سے لکھ رہا ہے۔

میری آنکھیں اس دماغی کشمکش کے باعث نیند سے بالکل خالی ہو چکی تھیں یہاں تک کہ سپیدہ صبح نمودار ہونے لگا تو وہ کھڑکی کے شیشوں کی طرف دیکھ کر چونکا۔ ایک متجسس نظر مجھ پر ڈال کر بہ آہستگی کاغذات کو سمیٹا۔ لیمپ گل کیا اور بہ قدم چلتا ہوا پلنگ پر آ بیٹھا کاغذات کو تکیہ کے نیچے چھپا دیا۔

آفتاب کی روشنی لحظہ بلحظہ بڑھ رہی تھی میں اس طرح جیسے کوئی آہستہ

آہستہ نیند سے بیدار ہوا اُٹھ بیٹھا۔ شاہد کو خواہ مخواہ آواز دی مگر وہ چپکا لیٹا رہا۔ جیسے کوئی گہری نیند میں ہو۔ بہرحال کچھ دیر بعد جب میں پھر کمرے میں واپس پہنچا تو شاہد وہاں نہ تھا۔ غالباً وہ ٹہلنے چلا گیا تھا۔

میں نے اُس کے سرہانے سے وہ کاغذات چرا لئے اور جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ اُفوہ۔ میرے تحیّر کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ بے نیاز فلسفی حسن کا شکار ہو چکا ہے۔ یہ مضمون اس کے فقروں کا اثر اس وقت تک میرے دل و دماغ پر موجود ہے۔ کیا لکھوں کہ اس نے کیا لکھا تھا اس کا آسمان پیما تخیّل۔ اُس کے جذبات کی بلندی اس کے دل کی گہرائی —— آج معلوم ہوا کہ شاہد کیسی عمیق روح لے کر آیا تھا —— اور وہ ایسے حسن کا متلاشی تھا کہ جو اس عالمِ کون و فساد میں نہ ہو۔ —— تو کیا اُس نے یہاں پا لیا —— اور کیا اُس پر حُسن کے دیوتا کا افسوں چل گیا؟ واقعی انسان کی ذات سارے امکانات کا گنجینہ ہے جس طرح کہ مایوسی دنیا کا مِی حکیم اسپینوزا کو ایک فیلسوف بنا دیتی ہے۔ اور میرؔ کو ایک بلند پایہ شاعر اُسی طرح حسن کا ایک پرتو بے نیاز فلسفی اور جھگڑالو منطقی کو عاشق بھی بنا سکتا ہے۔

اے حسن تیری تاثیر و گیرائی کا اندازہ امکانِ بشری سے باہر ہے۔ سچ ہے دل چاہے فلسفی کے سینہ میں ہو یا زاہد شب بیدار کے یا رندِ خرابات کے حسن کے اثر کو قبول کرنے میں سب یکساں ہیں۔

مجھے خیال تھا کہ وہ ضرور ان کاغذات کے متعلق مجھ سے دریافت کرے گا۔ مگر انتظار فضول گیا اور اس نے کچھ نہ پوچھا۔ میں نے ایک روز خود ہی اسے چھیڑنے کے لئے اس کی تحریر کے مختلف فقرے اپنے حافظہ پر زور دے کر سُنائے تو اُس کا چہرہ بوجہ استعجاب کے اس بچہ کا سا ہو گیا کہ جو پہلی مرتبہ مداری کے کرتب دیکھے۔ اُس نے رُکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم نے —— میرے سرہانے سے —— وہ کاغذات —— (وہ بیتاب و متوحش تھا)

"میں نے —— ہاں میں نے —— اور وہ میرے ہی قبضہ میں ہیں۔"

"دے دو"

"نہیں"

"کیوں"

"اس واسطے کہ وہ کاغذات اس بات کا ثبوت ہیں کہ تم ایک بچہ کی طرح خیال آرا۔ ایک شاعر کی طرح تخیّل پرور اور ایک نوجوان کی طرح پُر جذبات ہو۔"

اُس پر ایک شدید افسردگی چھا گئی اور اس کا چہرہ اس طرح زرد ہو گیا۔ جیسے شام کا زوال پذیر آفتاب۔ اس نے سر کو اپنے ہاتھوں سے سہارا دیا مگر شدتِ فکر سے اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور اس کا سر اس طرح ایک طرف کو لٹکا ہوا تھا۔ جیسے چمن کا کوئی دلآویز پھول طوفانِ باد سے مضمحل ہو کر شاخوں میں جھک جاتے۔

کسی کے بلانے پر میں دوسرے کمرے میں چلا گیا اور وہاں مجھ کو کچھ دیر لگ گئی واپسی پر شاہد کمرے میں نہ ملا —— شاید پھر کہیں ٹہلنے چلا گیا ہوگا۔

مگر گھنٹے گزر گئے اور وہ نہ لوٹا —— شام ہوئی —— رات آئی اور گئی مگر وہ نہ لوٹا —— اب تو میں پریشانی کے جہنم میں جلا جا رہا تھا —— ہر امکانی جگہ اُس کو تلاش کیا تمام دن کوہ نوردی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نہ ملا ——

کوئی چار روز بعد میرے ایک دلچسپ دوست نے مجھے لکھا:۔

منظور صاحب۔ کل شام میری چھوٹی بچی جس کو سب پیار سے "بی بی" کہتے ہیں دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور ننھی ننھی تالیاں بجا کر کہنے لگی "ادہو جی۔ چھاہد چچا آتے ہیں" مجھے اس کے منہ سے یہ سُن کر تعجب ہوا بھاگا ہوا باہر آیا۔ واقعی شاہد تھے —— مگر بہت ہی مضمحل —— کیوں؟

میرے و تمہارے دوست اندر کوڑائی اسٹیٹ میں ملازم ہو گئے اور عنقریب ان کی شادی بھی ہونیوالی ہے۔ دونوں کی مبارکباد لکھ بھیجو۔ خاکسار: اصطفیٰ

عائشہ منیر

اب میرے جال میں جان آئی ۔ وہ خیریت کی خبر سے دو مسرت مجھے حاصل ہوئی کہ جو شاید جو نیس سیزر کو فرانس فتح کرنے کے بعد بھی حاصل ہوئی ہوگی۔

قبل اس کے کہ شاہد کے نوشتہ پریشان کی میں نقل کروں اس تمنا کا اظہار بھی ضروری ہے کہ کاش ہمارا ہندوستان عرب قدیم کی طرح ہوتا کہ جہاں با کمال شعرا بڑے بڑے مجمعوں میں علی الاعلان اپنے زمانہ کی پری جمال دوشیزاؤں کی تعریف و توصیف میں ایسی ایسی فصاحت و بلاغت دکھلاتے کہ سننے والوں کی زبانوں پر ایک حرف تحسین باقی نہ رہتا۔ خواص و عوام ان کو شوق سے سنتے اور فخر و مباہات کے ساتھ یاد کرتے دوشیزہ کو سنتے اور سراہتے ۔ لیکن رسوم و قیود کے مجبور ہندوستا ایسا کریں تو نہ معلوم اس کی ان کو کیا سزا ملے ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ دوست نے جو کچھ لکھا ہے اگرچہ وہ چند شعر ہیں بحر شکستہ میں مگر صحیح کر صحت کو بھی ان پر ناز ہے ۔ بعض ہستیوں کی طبعی خصو اس قدر نمایاں ہوتی ہیں کہ ان کا بیان کرنا نہ تو غلط ہوتا ہے اور نہ خو اسی طرح یہ کمسن شہزادی اپنے وقار ۔ خود داری ۔ پاکیزہ صفاتی اور عل کے باعث ادب و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے اور بیشک انسان ہونے کے بہ نسبت ملکوتی اوصاف رکھنے والی ایک زندہ دیوی۔

زندہ باد حُسن اور زندہ باد حسن کی ساحری جہانگیری فراوانی !!

تاثراتِ حُسن کا ایک نا تمام ورق !

یہ عنوان میں نے قائم کیا ہے نہ معلوم شاہد اس کے لئے کیا عنوان تجویز کرتا میرے کاغذات چرا لینے سے نہ صرف عنوان باقی رہ گیا بلکہ شاید مضمون بھی نامکمل ۔ منظور۔

آہ ! کیا ایک تنکا آندھی کو روک سکتا ہے ؟ کیا ایک تنکا سمندر کے تموج کو کم کر سکتا ہے ؟ کیا ایک ذرہ آفتاب کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکالنے پر قادر ہو سکتا ہے ؟ نہیں ہرگز نہیں ۔ بس اسی طرح اے شہزادی تیرے حُسن کی توصیف و تشریح میرے امکان سے خارج ہے۔ لیکن ہاں جس طرح کسی دشوار و دقیق مسئلہ میں تمہید و مقدمات قائم کر کے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اسی طرح میں تیرے حُسن کو مثالیں اور تشبیہیں دے کر سمجھانے کی سعی لاحاصل کروں گا۔

میرا کبھی ادعا نہیں کہ میں تیرے حسن جہاں تاب کی ایک ادنےٰ تعریف بھی اپنی زبان قلم سے کر سکتا ہوں لیکن جس طرح شبنم کی ہلکی و بے حقیقت بوندوں کو سبزہ اپنی پتیوں پر جگہ دے کر اُن کو موتی بنا دیتا ہے یا جس طرح آفتاب اپنی ضیا باری سے ایک حقیر ذرہ کو جگنو کی طرح چمکا دیتا ہے اسی طرح یہ تیرے ہی کوکب حسن کا پرتو ہوگا کہ جو میرے قلم سے الفاظ بن کر کاغذ پر مرتسم ہو جائے گا۔

جیسے حد نظر پر ہمالیہ کا بلند تر سلسلۂ کوہی اپنے سروں پر ... کے تاج رکھے ہوئے سربلند نظر آتا ہے اُسی طرح اے دوشیزہ تو مع اپنی جمیل نسوانیت ۔ بے عدیل حُسن ۔ عزت و استغنا ۔ عصمت و حیا و حجاب کے زریں و مرصع تاج کے ساتھ حسینان جہاں کی سرتاج اور جیسے سر آسمان اگر آفتاب کا وزن اٹھا لیتا تو چرخ چہارم کو اس ... مخصوص نہ کیا جاتا ایسے ہی اگر ہر حسن ان صفات عالیہ سے متصف ... تو تیرے ہی حُسن کو اُس کے لئے منتخب نہ کیا جاتا ۔ تیرے حُسن کا نظام ... کنول و نیلوفر سے بھی زیادہ نازک و دلکش ہے۔

تیرے نازک چہرہ کے آگے کوثر و سلسبیل کی نزاکت بھی مات ہے اس پر راستی و معصومیت کے چمکنے والے نور نے اسکو آسمان کے عقد ثریا کی ... دیا ہے۔

بیشک تو انسان ہونے کی بہ نسبت ایک آسمانی ہستی ہے ۔ تیر ی شگفتگی اُن پھولوں کی طرح ہے کہ جو صرف ماہتاب کے خنک نور سے ... تو ایک فرشتہ ہے جو ابھی ابھی پیدا ہوا ہو۔

تیرے گلگوں رخساروں کا گلابی رنگ شاید موسم گرما کے کھلے ...

بنایا ہے ست باہر سے رخساروں نے فضا کی رنگینی کو پھولوں کی نکہت [illegible] فصل بہار کی شادابی و شباب کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔

ملک کنعان کے گل چہرہ پریزاد بھی اپنے اندر وہ ساحرانہ دلکشی نہیں رکھتے کہ جو خدا نے تجھ کو عطا فرمائی ہے۔

اے عالی مرتبہ شہزادی جب تو باہر آیا کرے تو اپنے رخ پر نقاب ڈال لیا کر کیونکہ یہ مشہور ہے کہ آفتاب حسینان عالم کے رخساروں سے سرخی چرا کر پھر تو [illegible] دیتا ہے اور اس کو یاقوت بنا دیتا ہے۔

اے [illegible] کیا تیرے حسن نے گل [illegible] کی بھینی بھینی خوشبوؤں۔ دلآویز رنگوں ہلکی ہلکی روشنیوں اور ترنم ریز آوازوں کا عطر کھینچ لیا ہے؟

تو اگرچہ میری نظروں کی رسائی سے اتنی دور ہے جیسے کوئی روشن ستارہ زمین سے لیکن میری نظریں فضائے لامتناہی کا ایک جزو بن کر تیرے نظارہ میں محو ہیں اور تیرے حسن کی طلعت ریزیوں سے منور۔

اے حوران ارضی کی ملکہ حسن کی جن گرانمایگیوں سے تو مالا مال ہے اگر سارے جہان کی خوبرو دوشیزائیں ان میں سے ایک کی بھی مالک ہوتیں تو ان کے پندار حسن کی حد و پایاں نہ ہوتی

تیری صورت قدرتی دلفریبیوں کا ایک مکمل انکشاف ہے اور تیرا یہ وصف سر تقیب کر دیکھنے والے پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ تو حسین ہے ——— تجھے اس پر [illegible] ہے ———۔

اے آئینہ رو تیری [illegible] جمال سے حفاظت ناممکن ہے تو عالم انوار کا ایک [illegible]

تیری [illegible] جو شرمیلی و شاہانہ ہیں خوبصورت پلکوں کے سایہ میں مطمئن ہیں اور حسین ابروؤں کے نیچے ساکن لیکن ہزاروں مطالب حسن کی راز دار اور حسن [illegible] سحر طرازی و رشنت جمالی آشکار ——— ان میں جو وقار و عزت نفس [illegible] اور جن میں بڑی پراسرار دلفریبیاں پوشیدہ ہیں اور جن کو دیکھ کر بڑے بڑے دیدہ ور سکتے میں ہیں ایسی ہیں کہ انسان اپنی عمر میں دو ایک ہی مرتبہ دیکھ سکتا ہے۔ جیسے برسات کے شروع ہونے کی یہ خاص علامت ہے کہ جنگل میں مور ناچنے لگتا ہے اسی طرح اے شہزادی جب تو اپنے عظیم الشان محل سے نکلنے والی ہوتی ہے تو وہ فضا کچھ [illegible] دیا کچھ زیادہ پر رونق اور ہو کچھ زیادہ سبک خرام ہو جاتی ہے جس میں اور سمجھ جاتا ہوں کہ تو اپنے حسن کدہ سے اب برآمد ہونے والی ہے۔

قدرت کی شائستگی نے ساری دلفریبی کو تجھ پر ختم کر دیا ہے تو اس چمنستان دہر کے گلزار کی دلفریبی کا ایک ایسا جزو ہے اگر وہ اس سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہاں کچھ بھی نہ رہے۔

تیرا حسن ایک پر رعب و داب ہیکل ہے کہ جس کے دروازے پر [illegible] دیوتا حفاظت کے لیے موجود ہیں۔

تو بہر و عناصر کا ایک ایسا دلفریب مجسمہ ہے کہ کسی مو شگاف مصور کی ندرت خیال بھی تیری تصویر کشی سے معذور ہے۔

اے شہزادی شاید تجھے اس کا علم نہیں ہے کہ تیرے حسن کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور ساری دنیا اس میں ڈوبی جا رہی ہے ———

تجھے دیکھ کر زبان سے واہ اور دل سے آہ نکلتی ہے۔

اے شہزادی تجھے سب ہی نے دیکھا ہے مگر کس طرح ؟ اس طرح جیسے آسمان کے کسی تابندہ ستارے کو ہم دور سے دیکھا کرتے ہیں

"و آنستہ" کا بنایا ہوا کوئی بت بھی ایسا حسین نہ ہوگا جیسی کہ تو ——— تیری رفتار کے آگے طاؤس طناز کی خوش خرامی ہیچ ہے۔ تیرا چلنا ایسا ہے جیسے کسی چشمہ کے کنارے ہرنی کی شاخیں لچکیں۔

جب تو کسی مجمع سے گزرتی ہے تو تیری جھکی نظریں۔ تیرا [illegible] اور رفتار کی متانت [illegible] تیری [illegible] [illegible] تابناک ثبوت ہے اور تیرے طبعی وقار پر شاہد۔

[illegible]

عالم [illegible] تیرے نظارہ سے بہرہ مند [illegible]

تیرا حسن [illegible] ہے تو کسی سرگرم مزاج کی قوت نفس کافی ہوتی [illegible] ترین [illegible] تعداد اس میں بار یاب سے [illegible]

[illegible] رصدگاہ کا وہ گروہ جو ثوابت و سیاروں کی تلاش میں طاقتور دوربینوں میں آنکھیں جمائے بیٹھا ہے۔ گر وہ ایک دفعہ بھی تجھے دیکھ لے تو وہ حیرت سے [illegible] کہ جس ستارے کو وہ آسمان پر تلاش کر رہے ہیں وہ تو ان کی زمین پر ہی موجود ہے۔

برق ومقناطیس کی حیرت انگیز بوالعجبیوں میں غلطاں و پیچاں انسانی ہستیاں اگر ایک مرتبہ تو اُن کے پاس سے گزر جائے تو وہ اپنی سرگردانیوں کو یہ کہ کر ختم کر دیں کہ :-

اف اثر ےحسن جہانتاب کی یہ زور کشش
تو رسب کھینچ لیا چشم تماشائی کا

کیمیا کے اجزا ءپریشان کو مہذب ومرتب کرنے والے اپنی محنت وکارکردگی کا صلہ پالیں اگر ان کو تیری خاک پاکی تاثیر کا پتہ چل جائے۔

جب تو نے اپنی ہمراہی خاتون سے جو عمر میں تجھ سے زیادہ لیکن حسن میں آنکھوں درجہ کم تھی یہ کہا " آئی تو ہو بڑے شوق سے اور جو فلم اچھا نہ ہوا تو " اس وقت تیری آواز ایسی سرود آفریں تھی کہ جس سے روح وجد میں آگئی اور دماغ پردہ پر کیف اثر طاری ہو گیا جو کسی اعلیٰ مطرب کی مضراب ستار پر کافی کی دھن سے پیدا کر دے۔

اے نازنین دیاک طینت شہزادی اگرچہ تجھے گوشۂ چشم سے دیکھنے سے بھی نگاہ خیرہ ہو ہو جاتی تھی پھر بھی خوب یاد ہے کہ تجھے ایک دفعہ مسکراتے ہوئے دیکھا گیا ہے اب یا تو تیرے مونگے جیسے سُرخ ہونٹوں پر واقعی مسکراہٹ تھی اور یا قدرت نے اُن لب ہائے نازک کو اسی طرح بنایا تھا کہ تیری روح کی شیرینی نامعلوم طریق پہ متبسم بن کر تیرے ہونٹوں پر رقص کناں رہے۔

اے سرخیلِ خوباں تیری چھوٹی سے چھوٹی چیں جبیں دنیا کی بزرگ ترین مصیبتوں میں سے ایک مصیبت ہے اور تیرا ایک تبسم معصوم عمر ابدی سے زیادہ پُر لذت۔

جیسے گلاب کا پھول اپنی خوشبو سے لاعلم اور درخت اپنے ثمر کی شیرینی سے بے خبر ہوتا ہے اسی طرح اے شہزادی تجھے بھی اس کی اطلاع نہیں ہے کہ تو اس جہان کی حسین ترین اور پاکیزہ ترین ہستی ہے

جی چاہتا ہے کہ اپنی روح کی ساری قوتیں۔ دل کی آرزوئیں اور دماغ کا سارا تخیل ان صفحات پر ختم کر دوں مگر پھر سوچتا ہوں کہ کہاں وہ شہسوار اور کہاں میرا غبار

جس طرح آسمان کے سارے ستارے مل کر بھی رات کی تاریکی کو دور نہیں کر سکتے اور ایک چاند سارے عالم کو نور سے بھر دیتا ہے اسی طرح حسینان عالم کی ساری حسن آرائیاں اور جلوہ تابیاں ماند پڑ جائیں اگر تیرے حسن کی ایک کرن اُس کے سامنے آجائے

تیرے حُسن کی جلوہ فرمائی نے میرے سینے میں چھپ چھپ کر تیری ہزار دل تصویریں بنالی ہیں

غرض کہ تو سراپا ناز ہے اور سارا عالم مجبورِ نیاز

اے نازنین سمن بر خدا تیری زندگی کو خوش الحانیوں سے بھر دے
—— تیرے حسن جہانتاب کی درخشندگی میں ذرہ برابر بھی کمی نہ آئے
—— اور تیرے حُسن کی نظر شیشہائے ہوش کو یوں ہی چکنا چور کرتی رہے
—— اور جب تک کہ میں تجھ کو ایک مرتبہ اور نہ دیکھ لوں مجھے موت نہ آئے۔

اے شہزادی میں تیرے قدموں پہ عزت واحترام کے پھول چڑھانے لایا ہوں ان کو فرش خاک پر بچھائے دیتا ہوں تو اپنے پائے ناز سے ان کو روندتی ہوئی گزر جا —— بس میرا تحفہ قبول ہوا۔

یک نظر کردی وآداب فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاک مرا وا سوختی

+ + + + + + +

ہر شخص حکیم بن سکتا ہے

اور ہر شخص اپنا اپنے اہل وعیال کا اپنے دوستوں اور عزیزوں کا اسی طرح اور زود اثر اور ہر جگہ مل جانے والی ادویات سے کامل علاج کر سکتا ہے لیکن ہر شخص کو ضروری ہے کہ اگر آپ حکیموں کی فیس اور ان کی خوشامدوں سے چھٹکارا حاصل کر کے خود اپنا علاج کرنا چاہتے ہیں تو

کتاب

مجربات طبی!

کو خرید فرمائیے جسمیں سر سے لے کر پاؤں تک کی تمام امراض انسانی کا مفصل حال ان کی تشخیص اور ان کا مجرب اور آزمودہ اور زود اثر مکمل علاج درج ہے اس کتاب کا ایک ایک نسخہ سینکڑوں نامور طبیبوں اور فاضل حکیموں کا تجربہ شدہ ہے۔ مردوں اور عورتوں کی خاص امراض کیلئے ایسے ایسے مجرب اور زود اثر اور سہل ترین نسخے درج ہیں جو آپ کو طب کی بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بھی نہ مل سکیں۔ غرضیکہ یہ کتاب تمام طبی کتابوں کا نچوڑ اور زمانہ حال وقدیم کے تمام نامور اطباء کے تجربات کا بہترین انتخاب ہے آج ہی اسکی ایک جلد منگا کر مطالعہ کیجئے اور ہمیشہ کیلئے زندگی آرام سے گذاریئے قیمت باوجود اسقدر خوبیوں کے لئے صرف عہ ر

(بالتصویر)

دولت غزنویہ

تاریخ ہند میں جدید اکتشاف انقلاب

غازی سلطان محمود غزنوی اور اسکے جانشینوں کی ولولہ انگیز [illegible] اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ

قیمت دو روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک

سوانح [illegible] قیمت آٹھ آنے (۸ر)

سوانح مصطفےٰ کمال پاشا مکمل دو روپے (عہ)

صلیبی جنگوں کی داستان یعنی

حیات صلاح الدین ایوبی

شیر اسلام صلاح الدین غازی کے مکمل حالات عیسائیوں کے ٹڈی دل لشکر سے مقابلے اور عیسائیوں کی شکستیں عبرتخیز۔ اس کتاب کو پڑھکر ہر دل مسلمان کے دل میں بھی ایک دفعہ مجاہدانہ شوق پیدا ہو جاتا ہے قیمت ۱۲ علاوہ محصولڈاک

تعبیر نامہ خواب صدیقی

موجودہ زمانہ کی ایجادات مثلاً ریل تار۔ ڈاک ہوائی جہاز۔ پوسٹکارڈ گراموفون۔ بائیسکوپ۔ موٹر کار بائیسکل وغیرہ وغیرہ خوابوں کی مفصل تعبیریں درج ہیں اس کے علاوہ قیافہ شناسی کے متعلق ایک نایاب مضمون کتاب کے آخر میں درج ہے

قیمت!

ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصولڈاک

استاد روزگار

یہ وہ خاص کتاب ہے کہ جسمیں اس کے مصنف نے خلق خدا کی بھلائی کے لئے ہر قسم کے صنعت و حرفت کے کام نہایت آسانی سے سمجھا کر تجربہ کر کے درج کر دیئے ہیں معمولی سے معمولی آدمی بھی اس کتاب کے مطالعہ سے کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے اور اگر چند روز تک مستقل مزاجی سے کام کرتا ہے تو یقیناً ہزار دو نہیں بلکہ لاکھوں روپے کا مالک بن سکتا ہے۔ اس میں صابون سازی کے ہر قسم کے طریقے۔ ہر قسم کے شربت۔ ہر قسم کے حلوے۔ ہر قسم کے اچار ہر قسم کے مربے کی ترکیبوں کے علاوہ خضاب کے نسخے۔ امرت دھارا کے نسخے۔ بال اڑانے کا پوڈر بنانے کے طریقے۔ ہر قسم کی سیاہیوں کے تیار کرنے اور ان کو فروخت کرنیکے راز۔ ڈبل روٹی بسکٹ کیک وغیرہ بنانا نقلی سونا۔ نقلی چاندی نقلی ہیرا بنا کر فروخت کرنا۔ فوٹوگرافی گھڑی سازی عطاری حکمت غرض کوئی ایسا ہنر کوئی ایسا کام نہیں جس کی سہل ترکیب اس کتاب میں درج نہ ہو مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس سے پیشتر ایسی اعلیٰ ایسی مفید اور ایسی عمدہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت بلا جلد کے لئے ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ
مہتمم کتب خانہ دار الادب اندرون بھاٹی دروازہ لاہور

ضد

از جناب منشی فضل حق قریشی دہلوی

ایلین کے ساتھ ولیم اور ڈورا ایک کھیت کے قریب چھوٹے سے جھونپڑے میں اپنی زندگی کے دن بسر کرتے تھے ولیم اس کا لڑکا اور ڈورا اس کی بھتیجی تھی۔ وہ اکثر ان دونوں کو گہری نگاہ سے دیکھتا اور اپنے دل میں خیال کرتا۔ "ان میں زن و شوہر کا رشتہ بہت مناسب رہے گا۔"

ڈورا کو اپنے چچا کی مرضی کا احساس کامل طور پر ہو گیا۔ اور اسی لئے وہ اپنی طبیعت کو ولیم کی طرف مائل کرنے لگی۔ لیکن نوجوان ولیم نے ——— جو ہمیشہ سے اس کے پاس رہتا تھا ——— ڈورا کی مطلق پروانہ کی۔ یہانتک کہ ایک دن ایلین نے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا ——— "میرے نورچشم! میں نے کافی عمر گزر جانے کے بعد شادی کی تھی۔ لیکن میری آرزو ہے کہ اپنے پوتے کو بہت جلدی اپنے آغوش میں کھیلتا ہوا دیکھوں میں نے تمہارے لئے ایک شریکِ زندگی کا انتخاب کر لیا ہے۔ لہٰذا اب تم ڈورا کا خیال رکھا کرو۔ اور اس سے اظہار محبت کرتے رہا کرو۔ وہ میرے مرے ہوئے بھائی کی نشانی ہے۔ عرصہ ہوا کہ مجھ میں اور اس میں کچھ سخت کلامی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ مجھ سے جدا ہو گیا۔ اور کسی غیر سرزمین پر انتقال کر گیا۔ اس وجہ سے میں نے ڈورا کی پرورش کی ہے۔ اب تم اس کو اپنی شریک زندگی تصور کرو کیونکہ مجھے اس شادی کی بہت آرزو ہے۔"

ولیم نے بہت مختصر طور پر جواب دیا ——— "میں ڈورا سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔"

بڈھے ایلین کو غصہ آ گیا۔ اور اس نے سخت لہجہ میں کہا "کیا! .... کیا تم شادی نہیں کرو گے؟ ——— یہ جواب دینے کی تم کو کس طرح جرأت ہوئی۔ میرے ایام جوانی میں والدین کے الفاظ اولاد کے لئے اٹل قانون ہوتے تھے۔ یقیناً میرے قول کی بھی اسی قدر عزت ہونی چاہئے ——— ولیم! اچھی طرح سُن لو۔ میں تم کو صرف ایک ماہ کی مہلت دیتا ہوں۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ اور اس عرصہ کے بعد میری مرضی کے مطابق مجھے جواب دو۔ ورنہ خالقِ حقیقی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارا اس مکان سے کوئی سروکار نہیں ہو گا اور میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے بند ہو جائیں گے۔"

لیکن ولیم نے کوئی جواب نہیں دیا ——— وہ جس قدر ڈورا کو دیکھتا تھا۔ اسی قدر نفرت کے جذبات اس کے دل میں پیدا ہوتے جاتے تھے اس کا طرز عمل بہت بدل گیا تھا لیکن ڈورا بڑے صبر و استقلال سے تمام باتوں کو برداشت کرتی رہی۔

مہینہ ختم ہونے سے پیشتر ولیم نے اپنا آبائی مکان چھوڑ دیا اور ایک ملحقہ کھیت میں ملازمت کر لی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایک کاشتکار کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ جب قریب کے گرجا میں اس کے بیاہ کا شادیانہ بج رہا تھا تو ایلین نے اپنی بھتیجی کو بلا کر کہا۔ "میری پیاری بچی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ لیکن اگر تم نے میرے لڑکے ولیم سے آئندہ گفتگو کی یا کوئی پیغام اس کی بیوی کو بھیجا تو یقین مانو کہ میرا گھر تمہارے لئے بھی بند ہو جائے گا۔ تم جانتی ہو کہ میرا ارادہ میرا قانون ہے۔"

ڈورا نے تعمیل حکم کا وعدہ کیا۔ اس کو یقین تھا۔ کہ اس قدر سخت طرز عمل ناممکن ہے۔ ایک نہ ایک دن اس کے چچا کا ارادہ بدل جائے گا ———

ایک عرصہ گزر گیا اور اسی اثنا میں ولیم ایک بچے کا باپ ہو چکا تھا لیکن مصائب و آلام نے اس کا گھر دیکھ لیا تھا ـــــ اس کی کھیتی برباد ہو گئی تھی ۔ اور وہ خود مختلف امراض میں مبتلا تھا ۔ وہ روزانہ اپنے باپ کے دروازے کے سامنے سے پریشان حالت میں گزرتا ۔ لیکن اس بے رحم بڈھے نے کبھی توجہ نہیں کی ۔ البتہ ڈورا سے جس قدر ہو تا پس انداز کر رکھتی اور پوشیدہ طور پر ان دونوں کو بھیج دیتی ۔ انہیں اس کا علم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کا محسن کون ہے ۔ یہانتک کہ ولیم ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہو گیا ۔ اور ایسے وقت میں جبکہ فصل بونے کا زمانہ تھا اس کی زندگی کا پیمانہ چھلک گیا ۔

ایک دن ڈورا نے مخفی طور پر میری سے ملاقات کی جو اس وقت پریشان حالت میں بیٹھی ہوئی حسرت بھری نگاہوں سے اپنے لختِ جگر کو دیکھ رہی تھی ڈورا نے کہا ـــــ "میں نے اب تک اپنے چچا کی فرمانبرداری کی لیکن اب ناممکن ہے ۔ میں گنہگار ہوں ۔ کیونکہ ولیم پر یہ تمام مصیبتیں میرے ناپاک وجود کے باعث معرض ظہور میں آئی ہیں ۔ لیکن پیاری میری! اس کی خاطر ـــــ جو اس دنیا کو خیرباد کر گیا ہے ـــــ اور تمہاری خاطر ـــــ کیونکہ وہ تم سے محبت کرتا تھا ـــــ اور اس یتیم کی خاطر ـــــ جو اس متوفی کی واحد نشانی ہے ـــــ میں اپنا عہد توڑ کر تم سے ملنے آئی ہوں مجھے معلوم ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں تمہاری فصل مطلق فائدہ مند ثابت نہیں ہوئی ہے ۔ اب میں اس معصوم بچہ کو لے جا کر کھیت میں اپنے چچا کی نظر کے سامنے بٹھا دوں گی ۔ فصل عمدہ ہونے کی وجہ سے آجکل اس کا دل بہت خوش و خرم ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اس ہستی کی خاطر ـــــ جو اس جہاں سے کوچ کر گئی ہے ـــــ اس بچہ پر نوازش کرے ۔"

چنانچہ ڈورا بچہ کو لے کر کھیت میں چلی گئی ۔ اور ایک ایسے ٹیلے پر بیٹھ گئی ۔ جو غیر مزروعہ تھا ۔ اس مقام پر بہت سے گل لالہ کھلے ہوئے تھے ۔ ایلین بہت فاصلے سے آتا ہوا دکھائی دیا ۔ لیکن اس پر نظر نہیں ڈالی ۔ کیونکہ ملازموں میں سے کسی نے بھی اس کو اطلاع نہیں دی تھی کہ ڈورا ایک بچہ کو لئے ہوئے اس کی منتظر ہے ۔ اور ڈورا نے اس لئے پیش قدمی نہیں کی کہ وہ کسی قدر مایوس ہو چکی تھی ـــــ کاشتکار فصل کاٹتے رہے سورج غروب ہو تا گیا اور تمام دنیا تاریک ہو گئی لیکن جب صبح ہوئی تو وہ دوبارہ بچے کو کھیت میں لے گئی اور اسی ٹیلے پر بیٹھ گئی ۔ اس نے خودرو پھولوں کا ایک ننھا سا ہار بنایا اور اس معصوم بچے کے گلے میں ڈال دیا تاکہ وہ اپنے دادا کی نظر میں زیادہ خوشنما معلوم ہونے لگے ۔ تمام دن گزر جانے کے بعد ایلین کا اس کھیت میں گزر ہوا اور اس کی نگاہ بچے پر پڑی ۔ وہ اپنا ضروری کام چھوڑ کر قریب آیا اور کہنے لگا ـــــ "ڈورا کل تم کہاں تھیں؟ ..... اور یہ بچہ کس کا ہے؟ .... تم اکیلی اس جگہ بیٹھی ہوئی کیا کر رہی ہو؟"

ڈورا کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں ۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس نے بڑی مشکل سے اپنے لبوں کو جنبش دی اور جواب دیا ـــــ "یہ ولیم کی نشانی ہے ۔"

بڈھے کسان نے ترش رو ہو کر کہا ۔ "کیوں؟.... کیا میں نے تم کو منع نہیں کیا تھا؟ ..... تم نے میرے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی؟"

ڈورا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔

آخر اس نے آہستہ سے کہا ـــــ "بیشک یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس شکستِ عہد کی جو سزا دینا چاہتے ہو ۔ مجھے دے دو ۔ مگر خدا کے لئے اس بچے کو اپنے آغوش میں اٹھا لو ۔ اور اس مرنے والے کی خاطر جس کی تخلیق تمہارے خون سے ہوئی تھی ـــــ اس معصوم ہستی پر رحم کرو ۔ اس کی پرورش تمہارا فرض ہے ..... میری فکر مت کرو ۔ جہاں بھی ممکن ہو گا ۔ میں اپنی چند روزہ زندگی بسر کر لوں گی ۔ لیکن میں گوارا نہیں کر سکتی کہ اس بچہ کو تکلیف پہنچے ۔"

ایلین نے اپنا سفید سر ہلاتے ہوئے کہا ۔ "اچھا! میں سمجھ گیا یہ ایک جال ہے جو میرے پھانسنے کے لئے بچھایا جا رہا ہے ۔ مجھے اپنے فرائض کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔ رہا تمہاری بابت ـــــ سو تم جانتی ہو کہ میرے الفاظ قانونی حیثیت رکھتے ہیں ۔ میرے منع کرنے کے باوجود تم نے اس عورت سے ملاقات کی ۔ خیر! میں بچے کو لے جاتا ہوں اور تم ہارے جہاں سینگ سمائیں چلی جاؤ اور مجھے اپنی شکل کبھی مت دکھانا ۔"

یہ کہکر اس نے بچہ کو اٹھا لیا ۔

بچہ نے رونا شروع کر دیا ۔ اور بڈھے کی گود میں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا ۔ اس کشمکش میں پھولوں کا ہار ٹوٹ کر ڈورا کے قدموں میں گر گیا ۔ وہ سر جھکا کے بیٹھ گئی اور بچہ کے رونے کی صدا دیر تک سنتی رہی ۔ ایام گزشتہ کی یاد اس کے

دل میں تازہ ہوگئی اس وقت سے جب سے وہ پہلی مرتبہ ایلین کے گھر میں آئی تھی۔ تمام واقعات ایک ایک کر کے اسے یاد آ رہے تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ـــــ کاشتکار فصل کاٹ رہے ہیں۔ سورج غروب ہوتا گیا اور تمام دنیا تاریک ہوگئی۔

ڈورا میری کے مکان پر گئی۔ اور دہلیز پر خاموش کھڑی ہوگئی۔ میری نے یہ دیکھکر کہ اس کا بچہ ڈورا کے پاس نہیں ہے خدا کا شکر ادا کیا اور بہت خوش ہوئی مگر ڈورا نے کہا ـــ "میرے چچا نے بچے کو لے لیا ہے۔ لیکن بہن! میں آئندہ تمہارے ساتھ رہوں گی اور ہم دونوں محنت و مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالیں گے کیونکہ چچا نے ہمیشہ کے لئے مجھے نکال دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں اپنی شکل اس کو کبھی نہ دکھاؤں۔"

میری نے جواب دیا ـــ "یہ غیر ممکن ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میری وجہ سے تم مصائب و آلام برداشت کرو۔ میں اپنے بچے کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ سکھا پڑھا کر بچہ کو ہمارے حق میں سنگدل کر دے گا۔ اور وہ بھی جوان ہو کر اپنی ماں کی مطلق پروا نہیں کرے گا۔ پس میں تمہارے ساتھ جا کر اپنے بچے کو لے آؤں گی اور تمہارے چچا سے التجا کروں گی کہ وہ تم کو واپس بلا لے۔ اور اگر وہ اس بات کو منظور نہ کرے تو ہم اور تم ایک جگہ رہنے کا انتظام کر لیں گے۔ اور محنت و مزدوری کر کے اس بچہ کی پرورش کریں گے تاکہ وہ نوجوان ہو کر ہماری مدد کر سکے۔"

دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو بوسہ دیا اور بوڑھے کسان کے جھونپڑے کی طرف روانہ ہوگئیں۔ دروازہ کی جھری کھلی ہوئی تھی۔ انھوں نے جھانک کر دیکھا کہ ایلین بچے کے بازو پکڑے ہوئے اپنے گھٹنوں پر جھولا جھلا رہا ہے۔ اور جوش محبت میں اس کے منہ اور نازک ہاتھوں کو چوم رہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ بچہ اس سنہری زنجیر کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے جس میں ایلین کی گھڑی آویزاں ہے۔

وہ دونوں اندر داخل ہوگئیں۔

بچہ نے اپنی ماں کو دیکھتے ہی اس کے پاس آنے کے لئے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

میری نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ابا جان!۔ اگر مجھ کو اجازت ہو کہ میں اس نام سے آپ کو مخاطب کر سکوں ـــــ ابا جان! میں اپنے نفس کی خاطر یا ولیم کے واسطے یا اس بچہ کی ذات کے لئے کچھ طلب کرنے نہیں آئی۔ البتہ میں ڈورا کے لئے سفارش کرنے حاضر ہوئی ہوں۔ خدا کے واسطے اس پر رحم کرو۔ یہ تم سے محبت کرتی ہے ـــــ میرے محترم باپ! جب ولیم کا انتقال ہوا تھا تو اس کے دل میں آپ کی طرف سے کوئی کدورت نہیں تھی۔ ہر چند کہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور اسی لیے شادی بھی کر لی تھی تاہم اسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس نے باپ کی نافرمانی کر کے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ "خدا میرے باپ پر نزول رحمت فرمائے اور اس کو اس بات کا علم نہ ہو کہ میں نے اس کی جدائی میں کس قدر صدمے برداشت کئے ہیں ـــــ اب برائے مہربانی اس کے بچے کو میرے حوالے کر دو۔ ورنہ تم اسے سنگدل کر دو گے یہ اپنے باپ کو فراموش کر دے گا۔ اور میری مدد کرنے سے بھی احتراز کریگا۔ خدا کے لئے اسے واپس کر دو اور ڈورا کو حسب معمول اپنے مکان میں رہنے کی اجازت دیدو۔"

چند لمحہ تک ایک سکوت طاری رہا۔

لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ طلسم بوڑھے کی پیہم سسکیوں سے ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے روتے ہوئے کہا ـــ "میں مورد الزام ہوں ـــــ میں قصوروار ہوں ـــــ میں نے خود اپنے لخت جگر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے ـــــ آہ! میں اس کا قاتل ہوں ـــــ لیکن خدا گواہ ہے کہ مجھے اس سے محبت تھی ـــــ لیکن میری ضد ـــــ آہ! اس ضد کا بُرا ہو ـــــ میرے پیارے بچے! خدا تجھ کو معاف کرے تیری روح کو ابدی چین عطا کرے۔ یقیناً میں قابل الزام ہوں ـــــ میری پیاری بچیو! ـــ آؤ ـــ آؤ ـــ میری پژمردہ پیشانی کو بوسہ دو ......

دونوں جوان لڑکیاں بڈھے کسان سے لپٹ گئیں۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اب وہ چاروں اس مکان میں زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن ڈورا نے تمام عمر ولیم کی یاد میں گزار دی اور کسی سے شادی نہیں کی ... ...

(فضل حق قریشی دہلوی)

بدنصیب کی عید

بپتا کا خط!

آفت نگر،

۲۹۔ رمضان ۱۳۴۸ھ

اچھی علقمہ، سلام

محبت نامہ ملا۔ مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ آج تمہارا خط ضرور آئیگا پہلے خط کو آئے ہوئے سات دن سے زیادہ ہوچکے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جواب کا پورے ایک ہفتہ انتظار کرنے کے بعد تم دوسرا خط ضرور لکھتی د . . . . خط آیا تھا یا تم خود . . . . . یقین جانو جب وہ نیلے آسمانی لف کا لفافہ مجھے ملا اور اس پر تمہارے گورے گورے نازک ہاتھ کا لکھا اپنہ دیکھا تو میں فرطِ مسرت سے بے خود سی ہوگئی، مگر افسوس اس خوشی بہت جلد خاتمہ ہوگیا۔ پانچ منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ تمہارے لہ بھائی آگئے۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ انھوں نے میرے ہاتھ سے لفافہ جھپٹ کر آگ میں ڈال دیا۔ میں نے بہتیری منتیں کیں کہ یہ میری سہیلی خط ہے آپ نے پہلا خط بھی جلا دیا تھا۔ خدا کے لئے ایک مرتبہ پڑھ لینے بجئے خبر نہیں کیا لکھا ہے . . . . مگر ایک نہ سُنی جب تک لفافہ جل کر اک نہ ہوگیا کھڑے دیکھتے رہے اور اس کے بعد چلے گئے۔

پیاری علقمہ اب تو معلوم ہوگیا کہ میں پہلے خط کا جواب کیوں نہیں دی۔ نہ مجھے تمہارا وہ خط پڑھنا ملا نہ یہ . . . . کاش وہ چند منٹ گھر میں نہ آتے، جہاں پانچ چھ دن سے غائب تھے ذرا دیر اور چھپے رہتے . . . . جب تمہارا پہلا لفافہ آیا تو اتفاق سے یہ مکان میں تشریف لتے تھے، لفافہ کو دیکھکر آگ بگولہ ہو گئے اور فوراً چھین کر چولھے میں پھینک یا۔ میں نے ہرچند کہا کہ میں آپ پڑھکر سنا دوں گی یہ میری جان سے زیادہ زیز سہیلی کا خط ہے . . . . مگر خدا معلوم وہ کیا سمجھے اور اسی پر بس نہ کی۔ قلمدان دیوار سے دے مارا، قلم توڑ ڈالے۔ دوات نہیں پھوڑ دیں کاغذ وغیرہ سب کچھ جلا دیئے۔ اور . . . . . اور میرا وہ انڈیپنڈنٹ ہولڈر جو تم نے مجھے میری شادی کے موقع پر تحفتہً دیا تھا، توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا یہ پنسل جس سے تمہیں خط لکھ رہی ہوں، دوسری جگہ رکھی تھی ورنہ اس کی بھی خیر نہ تھی۔

علقمہ میں نے تمہیں دھوکا دیا۔ پورے دو سال دھوکا دیا جس کے لئے سخت نادم ہوں اور معافی کی خواستگار بھی۔ مصلحتِ وقت کا یہی تقاضا تھا . . . . جب تک میں ان مصائب کا مقابلہ کرسکی کیا مگر اب تو ان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہی . . . . . . میں لکھتی تھی کہ میں آرام سے ہوں، تندرست ہوں، مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ میں بے حد مصیبت میں مبتلا تھی، بیمار تھی اور خوشی سے کوسوں دور . . . . میرے رنج و مصائب میں دن رات اضافہ ہوتا رہا۔ ہر صبح ایک نئی مصیبت لے کر آئی اور ہر شام ایک نیا غم دے کر رخصت ہوئی۔ کیا یہ سب کچھ والدین کی عنایت کا نتیجہ نہیں . . . . ہاں البتہ تقدیر بھی موردِ الزام ٹھہرائی جاسکتی ہے . . . . . علقمہ! مجھے ذلیل نہ سمجھنا میں نے دو سال ان کی خدمت کی، جتنی مجھ سے ہوسکی بلکہ اس سے بھی بڑھکر اور . . . . . . انھوں نے مجھے ایک زرخرید لونڈی سے بھی بدتر جانا۔ میری التجاؤں کو جی بھر کے ٹھکرایا۔ میری درخواستوں کو دل کھول کر رد کیا۔ اور میری تمناؤں کو خوب سیر ہو کر برباد کیا۔ مختصر یہ کہ مجھے ہر طرح سے تکلیف دی . . . . . . تم کیا کہوگی علقمہ! میں نے اُن کی خوشی اور صرف اُن کی خوشی کے لئے بازاری عورتوں کے پاؤں دبائے، اُن بازاری عورتوں کے جو چند کھوٹے ٹکوں کے بدلے عصمت جیسی قیمتی چیز بیچ ڈالتی ہیں

جو میرے زیور فروخت کر کے کچھ عرصہ کے لئے خریدی جاتی تھیں جو دولت کے
ہاتھ اپنے چاہنے والوں سے آنکھیں پھیر لیتی ہیں۔ ہاں! اُن بازاری عورتوں
کے جو اس وقت "ان" کے پسینہ پر اپنا خون بہانے کے لئے تیار تھیں اور اب
شاید بات بھی نہیں پوچھتیں

علقمہ پیاری! کس کس بات کو روؤں ... گئی جمعرات کی بات
ہے کہ اپنی کسی محبوبہ کو لے کر چار روز کے بعد گھر میں تشریف لائے ...
آہ! نسیمہ کو تین روز سے بہت تیز بخار ہو رہا تھا کوئی پیسہ نہ تھا کہ دو پیسے کی
دوا لادے۔ یہ تین رات دن میں نے جس بے چینی سے کاٹے تھے بس
میں جانتی ہوں یا میرا خدا ...... میں انہیں دیکھ کر منتظر کھڑی ہو گئی
صحن میں قدم رکھتے ہی ارشاد ہوا کہ کچھ کھانا تیار کرو۔ میں کھانا میں اور ان کی عذر
پیش کر لی اور پھر اپنے "ہمدرد" کے سامنے علقمہ! سچ جاننا میں نے
تین دن سے ایک لقمہ نہ رکھا تھا اور کھاتی بھی کیونکر میری بچی، لاڈلی
اور پیاری بچی بیمار تھی اور بہت زیادہ ...... پانی کی چند بوندوں سے
روزہ افطار کر لیتی اور بس۔ اٹھی اور ٹھنڈا آگ سلگانے لگی۔ نسیمہ آخر کم عمر
تھی ناسمجھ تھی، رونے لگ گئی۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی جب انھوں نے
اسے گود میں اٹھا لیا (پہلی اور آخری مرتبہ) اور دل ہی دل میں ڈر بھی کہ
خدایا خیر کرنا یہ آج خلاف معمول بات کیوں کی۔ نسیمہ تین دن کے بخار سے
تنگ آئی ہوئی تھی ان کے چمکارنے پر بھی چپ نہ ہوئی۔ آخر دھمکانے لگے
بچی تھی کرخت آواز سے اور زیادہ بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ وہ شراب
کے نشے میں چور تھے اور اس پر ستم ظریف بولی "کیسی لڑکی ہے چپ ہی
نہیں ہوتی" اس بات سے ان کے غصہ کی آگ اور زیادہ مشتعل ہو گئی
پہلے سے زیادہ چیخ کر کہنے لگے "اگر اب کے خاموش نہ ہوئی تو دیوار سے
دے ماروں گا" نسیمہ کو اس طرح بلکتے دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا
"تم اسے چارپائی پر لٹا دو، روتی ہے تو رو دے، تمہیں کیا، تمہیں کھانے
سے غرض ...." میری بات سن کر ان کے چہرہ کا رنگ ذرا دیر کے لئے
سرخ ہو گیا اور دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹنے لگے۔ اس کے فوراً بعد انھوں
نے نسیمہ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھا لیا اور اپنی محبوبہ سے کہنے
لگے "چلو یہاں کیا رکھا ہے؟" میں آگ چھوڑ کر لپکی مگر قسمت ...
کھائی .... جب ہوش آیا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ...

ٹھنڈی ہوئی پڑی ہے، سر پھٹا ہے اور کپڑے خون آلود۔ میں نے اٹھنے
کی کوشش کی مگر بے سود۔ میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی ...... انھوں نے
غالباً نسیمہ کو بہت زور سے پلنگ پر دے مارا ہو گا۔ غریب پہلے چارپائی پر
گری ہو گی اور پھر اچھل کر نیچے فرش پر جا پڑی ہو گی ...... آہ ...... بچی کی
لاش بے گور و کفن دو دن تک گھر میں پڑی رہی۔ یہ خیال تھا کہ شاید کوئی زیور لینے
آئیں تو انہیں اس کے کفن دفن کے انتظام کے لئے کہوں، مگر جب امید کی
آخری کرن نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تو ...... تو میں نے خود نسیمہ کے لئے
اپنی پیاری نسیمہ کے لئے صحن کے ایک گوشہ میں گڑھا کھودا اور اپنی شادی کے
دوپٹہ میں لپیٹ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے "سرمایہ انبساط" کو خاک میں
ملا دیا ... کاش میرے ہاتھ اس کے دفن سے پہلے ٹوٹ جاتے۔

کاش اس کی موت سے پہلے میں اس دنیا سے، اس رنج و مصائب کی دنیا
سے رخصت ہو چکی ہوتی ...... علقمہ! میں قریب المرگ ہوتی
ہوں۔ مجھے اپنے گرد و پیش ایک مہیب تاریکی مسلط کرتی دکھائی دے
رہی ہے۔ آہ ... علقمہ! آج رمضان کی ۲۹ تاریخ ہے، چاند ہو چکا
ہے ...... تمام دنیا مسرت و انبساط کے سمندر میں غوطہ زن ہے ... کل
عید ہو گی ...... عید یا محرم ...... زمانہ کے نئے سے نئے کپڑے پہن کر
اپنی ماؤں کا دل خوش کریں گے اور میرا ...... میرا دل خوش کرنے والی خاک کے
بچھونے پر بے خبر سو رہی ہے۔ مجھ سے الگ ہو کر دو گز کے مکان ہی چلی گئی ...
... مجھ بدنصیب سے روٹھ گئی ... سچ ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی
اور برے وقت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا ... عید کا چاند جو ہر سال
مسرتیں اور راحتیں لے کر آتا تھا، دو سال سے بدل گیا۔ اس مرتبہ تو
خاص طور پر تمام جہاں کا رنج لے کر آیا ہے مجھے دینے کے لئے ....
تقدیر کتنی زیادہ موذی ہے۔ کمبخت نے کس غریب کو تختہ مشق بنایا۔
جس میں ان مصائب کے برداشت کرنے کی ذرا بھی طاقت نہ تھی
جو ناز و نعمت میں پلی تھی، جو غم کی صورت سے قطعی ناآشنا تھی۔
اُف یہ رسمیں۔ یہ خونی اور ظالم رسمیں کیا میرے لئے اور صرف میرے لئے
معرض وجود میں لائی گئی تھیں ...... اگر والدین شاہی خاندان سے
تعلق رکھتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ایسی فضول اور بیہودہ رسموں
کی پیروی ... اس کا یہ مطلب ہے کہ لڑکیوں کو جیتے جی مصیبتوں

کے گڑھے میں دھکیل دیا جائے۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ان کا پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیں...... تمہارے بھائی کو جواب دینے کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے...... افسوس یہ بھی تو خیال نہ کیا کہ ان سے بہتر داماد....... آہ۔ میری قسمت پھوٹی بھی تو کہاں...... جہاں ایک لمحہ بھی خوشی کا مُنہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا، جہاں میرے تمام علمی مشاغل کا خاتمہ ہو گیا، جہاں ایک کتاب پڑھنے کو نہ ملی اور یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ جتنی میں پڑھی لکھی ہوں اتنے ہی وہ.......

یہ دو برس، یہ آفتوں کے دو برس جو کسی طرح دو صدیوں سے کم نہ تھے، کاٹے جس طرح خدا نے کٹوائے۔ آئندہ ان آفتوں کے جھیلنے کی طاقت نہیں...... پیشتر اس کے کہ یہ خط تمہیں ملے میں اس دنیا سے جس کا ایک ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا ہے، سفر کر چکی ہوں گی.. اس وقت میری نظروں کے سامنے تمہارے بھائی کی شبیہ پھر رہی ہے .. جب اس طرف سے کورا مل گیا تو یکایک کیسے غائب ہو گئے اور غائب بھی ایسے ہوئے کہ آج تک کہیں پتہ نہ چلا... آفریں ہے تم پر، بجائے نفرت کرنے کے مجھ سے محبت ہی کرتی رہیں علقمہ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جب یہ خیال کرتی ہوں کہ میری بیسیوں بہنیں شہزادوں کے خاندان میں شوہر نہ ملنے کی وجہ سے اب تک کنواری بیٹھی ہیں اور ان کی عمریں تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ اور چالیس ۴۰ سال سے بھی تجاوز کر گئی ہیں۔ میں حیران ہوں ان کی عقلوں پر یہ جہالت کے پردے کہاں سے آ پڑے۔ اسلام میں یہ باتیں کہاں جائز ہیں۔ وہاں تو صرف مسلمان ہونے کی شرط ہے اور نمازی پرہیزگار۔ یہ کہیں نہیں کہ خاندان شہزادگان کی لڑکیوں کو صرف شہزادوں کے لڑکوں سے بیاہنا چاہیئے، خواہ وہ کیسے ہی بدچلن ہوں اور ناکارہ بھی یا ان میں کوئی عیب ہو...... آخر اور قومیں کیا اتنی ذلیل ہیں کہ ان میں اپنی لڑکیوں کو دینا اتنا بُرا سمجھ رکھا ہے .... قسمت سے گھر بھی ایسا ملا جس میں ان کے سوا کوئی اور بھی نہیں

... پیاری علقمہ اب مجھ سے زیادہ نہیں لکھا جاتا...... چاروں طرف سے غم، مایوسی، حرماں نصیبی اور حسرت نہایت ڈراؤنی شکلیں بنائے گھور رہے ہیں..... اچھا خدا حافظ...... ہاں میری سب خطاؤں کو معاف کر دینا..... یقین تو ہے نہیں کہ یہ خط تمہیں ملے گا کیونکہ میرے پاس محلہ کے کسی بچے یا عورت کو آنے کی اجازت نہیں انہوں نے نہایت سختی سے منع کر رکھا ہے۔ بہرحال میں یہ خط اپنے قریب رکھ چھوڑتی ہوں اور ایک دوسرا پرچہ بھی کہ اس خط کو بیرنگ ڈاک کر دیا جائے۔ والسلام۔

بستر مرگ پر آپ کی بدنصیب بہن

شریفہ

نقد و نظر!

طبیب مرغی خانہ ۲۰×۳۰ سائز۔ ۷۶ صفحات۔ کاغذ کتابت۔ طباعت دیدہ زیب ولائتی مرغیوں کی نصف درجن قابل دید تصاویر اور سرورق نہایت خوبصورت ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول ملنے کا پتہ: مینیجر دارالبلاغ ملتانی سٹریٹ لاہور۔

پیش نظر کتاب جناب خواجہ بدر الاسلام صاحب فروغی پولٹری ایکسپرٹ ایم۔ آئی۔ پی۔ سی۔ کی قابلِ قدر تصنیف ہے جس میں مرغیوں کی رہائش۔ خوراک۔ پرورش۔ زیادہ سے زیادہ انڈے حاصل کرنے اور ان کو سال سے زائد عرصہ تک محفوظ رکھنے کی تدابیر۔ حفظانِ صحت کے اصول وبائی بیماریوں کی روک تھام کے طریق کے علاوہ جملہ امراض کے اسباب۔ علامات اور آسان مجرب دیسی علاج درج ہیں۔ مصنف ممدوح نے سالہا سال کی شبانہ روز محنت اور کاوش سے دریافت کئے ہوئے مجرب نسخہ جات بغیر بخل کے سب کے سب لکھ دیئے ہیں تا کہ مرغیوں کی کثیر اموات کی شکایت رفع ہو جائے اور عوام اس تجارت کی طرف متوجہ ہوں۔ کتاب سلیس اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے اور جا بجا تصاویر سے مضمون کو واضح کیا گیا ہے تا کہ معمولی تعلیم یافتہ زن و مرد بھی کماحقہ اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ اُردو زبان میں مرغیوں کے امراض و علاج پر یہ پہلی مستند جامع اور نایاب کتاب ہے جس کا ہر شوقین اور کاروباری کے پاس ہونا بیحد مفید ہے۔ ہم بڑے زور سے اس کی خریداری کی سفارش کرتے ہیں ◆



ایرانی دوشیزہ

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور

قربانی!

ایک حسرتناک قصہ (عید نمبر کیلئے)

۱

مکان کی دوسری منزل میں گیس کی روشنی سے جگمگاتے کمرہ میں شوہر اور بیوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ ایک تو صاف کمرہ، اس پر آراستگی اور غضب ڈھا رہی تھی۔ روشنی کی کرنیں چاروں طرف لگے ہوئے آئینوں پر پڑ کر آنکھوں کو چندھیا رہی تھیں۔ لیکن ان سے بڑھکر اس جوڑے کا جہاں سوز حسن تھا۔ اور اٹھتی ہوئی جوانی کے ماہتاب بشرے، جس نے اس کمرہ کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔ اگرچہ ان کے چہروں سے گہری فکر کے آثار ہویدا تھے۔

یکایک بیوی کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اس نے تفکر کے عکس کو اپنے چہرے سے دور کر کے بڑی بڑی آنکھوں سے مسکراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے نہایت پیار سے شوہر کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور کہا "تمھیں میرے سر کی قسم۔ میری یہ بات مان لو۔ میں نے آج تک تم سے کسی بات کا تقاضا نہیں کیا۔ آج پہلا دن ہے مجھے ناامید نہ کرنا۔"

شوہر نے سر اوپر اٹھایا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "یہ تقاضا کیا مناسب ہے ——"

"کیوں نہیں بڑے بوڑھوں کے دل کو صدمہ پہونچ رہا ہے۔ اتنے بڑے خاندان کا نام و نشان مٹ جائیگا۔ کیا اس پر بھی میرا تقاضا نامناسب ہے۔ کیا میں سب سے بڑھکر ہوں، جو میرے لئے ناقابل برداشت نقصان برداشت کیا جائے۔ اپنے ماں باپ کے آنسوؤں کو دیکھو، پھر کہو کہ یہ کہنا نامناسب ہے۔"

"نہیں صرف تمھارے لئے نہیں بلکہ اس سے میری راحت قلبی کافور ہو جائیگی۔"

"کیا ہوا۔ یہ فرض ادنی کی ادائیگی ہے۔ اگر اس کے لئے تمھیں کچھ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی تو خوشی سے کرو۔ اور اگر نہیں کر سکتے تو تم مرد کاہے کے ہو۔"

"لیکن اس کا علاج اور بھی ہے۔ لڑکا گود لے لینا"

"پھر وہی بات۔ میں اپنا لڑکا چاہتی ہوں۔ پرایا نہیں ——"

شوہر نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "تو کیا تمہیں کوئی اور چیز درکار ہے؟"

"اور کیا علاج۔ اچھا ہوگا میری ایک بہن اور آجائیگی۔ میں اکیلی ہوں —— سہیلی ملے گی ——"

بابو تاراچرن نے خشک تبسم ہنستے ہوئے کہا "اس کے بعد سوت کا سپنا تمہاری محبت کے حصہ میں شریک ہوگا۔ اور حسد تو نہ کرو گی۔"

"—— ہوں کہ میری دولت وہ لے کر رکھی ہو اور مجھے حسد ہو ——"

تاراچرن نے پرچل کو گلے سے چمٹا لیا۔ اور اس کے چہرے پر محبت کی مہر ثبت کردی۔ پرچل کہنے لگی۔ "ان پیار کی باتوں میں مجھے مت رجھاؤ۔ ؟" صاف صاف کہو بیاہ کرو گے یا نہیں؟ تاکہ کل ماں سے کہدوں"۔ تاراچرن پھر کہنے لگے۔ پرچل! سوچ لینے دو۔ اور دو دن ٹھہر جاؤ ——

پرچل نے کہا "نہیں اب میں ایک دن بھی انتظار نہیں کر سکتی۔"

۲

ماں نے شوہر کو پیغام دیا کہ لڑکا شادی کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ اور بہو کہتی ہے کہ اس کے میکے میں ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ نہیں ہے۔ مگر لڑکی نہایت خوبصورت۔ سادگی مجسم اور حیادار ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ بیاہ کردو۔"

پرچل نے ہنستے ہنستے شوہر سے جاکر کہا۔ تاراچرن چپ ہو گئے اور شرم سے گردن نیچی کر لی۔ دونوں ہاتھوں سے شوہر کے منہ کو اوپر اٹھاتے ہوئے پرچل کہنے لگی۔ "چہرے پر یہ پژمردگی۔ کیا مجھ سکھی دیکھ کر تمھیں خوشی نہیں ہوتی۔"؟

تاراچرن کہنے لگے۔ "پرچل وقت ہے۔ اب بھی مان جاؤ۔ تم نادانی کر رہی ہو۔"

"بس یہ نہیں اس وقت رہنے دو"۔

"دیکھو جسے بیاہ کر لاؤنگا اس کے متعلق بھی میرا کوئی فرض ہوگا"

پرچھل نے ایک نرالے انداز سے کہا۔ "تو حرج ہی کیا ہے تم اسے بھی میری طرح پیار کرنا —————"

"تم تو پاگل ہو۔ انسان کیا کبھی دو کو ایک جیسا پیار کر سکتا ہے؟ دونوں پلڑے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے —"

"نہیں ہو سکتے تو تم اسی کا پلڑا بھاری رکھنا۔ میں اس پر ناراض نہ ہونگی"

بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ کوئی خوشی کا بیاہ تھوڑا ہی تھا جو دھوم دھام ہوتی۔ اس بیاہ سے گھر کی مالکہ۔ ناک۔ نوکر چاکر۔ پڑوسی سب سنجیدہ تھے آہستہ آہستہ بیاہ کا دن نزدیک آگیا۔ ماتھے پر ٹلٹ لٹکا۔ سنجیدہ چہرہ بنائے فٹن پر سوار ہو بانو تاراچرن بیاہ کر لائے۔

دولہا دلہن کے آنے پر مالکن آنسو پونچھتے ہوئے ان کی آرتی اتارنے چلی آگے بنارسی ساڑی زیب تن کئے سر سے پاؤں تک زیور دل سے آراستہ ہنستی اتراتی ہوئی پرچھل بھی چلی۔ مدعو شدہ عورتیں اور محلے کی عورتوں نے بھی مالکن کی دیکھا دیکھی اپنے آنسو پونچھے۔ پرچھل نے نہایت بیتابانہ انداز میں پہلے تو ننھی بہو کا منہ دیکھا اور اس کے بعد اپنے بدن سے یکے بعد دیگرے تمام زیور اتار کر اس کو پہنانے لگی۔ جس نے دیکھا اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ ایک شور مچ گیا۔ "یہ تو ست یگ ہے۔ ورنہ کون ایسی عورت ہے جو اپنی سوت سے اس محبت۔ اس احترام کا سلوک کرے" پرچھل نے ان کی بات کاٹ مسکراتے ہوئے کہا "کیوں تم بار بار سوت سوت کہہ رہی ہو۔ کلیانی میری چھوٹی بہن ہے" مالکن کہنے لگی "بیٹا تاراچرن کہاں جاتا ہے ٹھہر جا۔ آرتی اتار لینے دے۔ ورنہ بدشگونی ہوگی"۔ لیکن تاراچرن نے ایک نہ سنی اور باہر چلے گئے۔ اس کے بعد بہو کی چہرہ کشائی کی رسم ادا کی گئی۔ منہ دیکھ کر سب چپ ہو گئیں ——

بہو اگرچہ اچھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ پھر بھی پرچھل سے اس کو کیا نسبت صرف مالکن کہنے لگی "بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں بڑی رسیلی ہیں۔ بیٹا ہمیشہ تک سہاگن بنی رہو۔ جس لئے آئی ہو۔ وہ امید پوری کردو۔ میں کا بیٹی میں اور کچھ نہیں چاہتی"۔ مالکن کی یہ بات سن کر سب نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے ماں جی"۔ ایسی ستی۔ لکشمی اور درگا کی سی بہو ہوتے ہوئے بھلا کوئی شوق سے دوسری بہو لائی گئی ہے۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ ہم دل سے دعا دیتے ہیں کہ اس کی گود ہری بھری ہو۔ ایک للّو ہو۔ خاندان کا نام رہ جائیگا۔ اسی لئے تو بیاہ کیا جاتا ہے ورنہ بہو کا کام ہی کیا ہے۔"

اس کے بعد دوسری رسمیں ادا کی گئیں۔

تاراچرن اپنے کمرہ میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے پرچھل نے آکر کہا "ذرا سر اونچا کرو"۔ بات کا مطلب سمجھ کر تاراچرن اور بھی جھک کر کتاب پڑھنے لگے۔ پرچھل نے ترچھی چتون سے کہا۔ "اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ میں نے تمھیں کوئی بری چیز تو نہیں دی آنکھیں بھر کر دیکھ تو لو"۔ تاراچرن خاموش ہو گئے۔

"نہیں دیکھوگے کیا —————؟"

تاراچرن کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "مجھے کچھ ضروری کام ہے میں نیچے جاتا ہوں"۔ پرچھل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہنستے ہوئے کہا "بھاگتے کیوں ہو جس کے ڈر سے بھاگے جاتے تھے وہ خود ہی چلی جا رہی ہے"۔ ہاں کلیانی جاؤ۔ انوجی کے پاس چلی جاؤ۔"

بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ کلیانی چلی گئی۔ تب پرچھل کہنے لگی۔ "لو اب بیٹھو۔ ہر بات میں تمھارا نخرہ ہے۔ خوامخواہ چڑھ جاتے ہو۔"

"کون۔ میں یا تم"

"بھلا تم نے شادی کی ہے۔ دو باتیں بھی نہ کر دئے"

"یہ سب کچھ تم نے کیا ہے۔ اس کی ذمہ دار محض تم ہو"

آہستہ سے مسکراتے ہوئے شوہر کے گلے میں باہیں ڈال کر پرچھل نے کہا۔ "کیوں کیا اور کوئی پسند نہیں آتی —؟"

"نہیں" کہہ کر تاراچرن نے بیوی کا منہ چوم لیا۔

۳

انوجی ان لوگوں کے خاندان میں ستی ہے۔ وہ بیوہ ہے اس لئے ہمیشہ وہیں رہتی ہے۔ نئی بہو کلیانی دوسری منزل کے ایک علیحدہ کمرہ میں ہمیشہ اسی کے پاس سویا کرتی ہے۔ انو بھی اسے دوسروں کی نسبت زیادہ مانتی ہے۔ نہ سکھ ہے نہ دکھ۔ نہ رنج ہے نہ راحت یونہی کلیانی کے دن گذر رہے ہیں مفلس اور مفلوک الحال گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ امور خانہ داری سے ناواقف تو نہیں ہے۔ وہ محنت اور جفاکشی کی عادی تھی۔ لیکن صبح اٹھتے ہی جب وہ انوجی کے ساتھ کام کے لئے جانے لگتی تو پرچھل آکر اسے ہاتھ پکڑ کر لیجاتی اور کہتی۔ "واہ تم کیوں کام کرتی ہو"؟ کبھی مالکن کوئی کام کرتے دیکھتی تو کہہ دیتی بہو تمھیں یہ کام زیب نہیں

دیتے تم اوپر جاؤ" مہرانی روٹی پکاتی۔ کلیانی اس کے پاس جا بیٹھتی تو اُسے ہاتھ پکڑکر وہاں سے ہٹا دیتی "بہو یہاں مت بیٹھو۔ دھوئیں کی وجہ سے آنکھیں خراب ہو جائینگی" کلیانی پرپھل کے پاس جاتی "مجھے ریشم کے بیل بوٹے کاڑھنا سکھاؤ" پرپھل ہنسکر جواب دیتی "بس اتنی محنت اور تکلیف کاہے کے لئے۔ بس جو جانتی ہوں اس سے تمھارا کام چل جاویگا۔ بس تمھاری گود ہری بھری ہو۔ اس سے ہمارے دل کے ارمان پورے ہو جائینگے" یہ باتیں بڑے پیار بڑی نسبت سے کہی جاتیں لیکن کلیانی ان کا مطلب نہ سمجھ سکتی۔ اس کے رشتہ دل پر ٹھیس لگتی اور وہ منہ پھلائے ایک کونہ میں جا بیٹھتی۔ نہ کام ہے نہ دھندا۔ کوئی ایسی بات نہیں جس میں کلیانی کا جی لگے اس لئے ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کا پیارا اور خوشنما چہرہ پھرا کرتا اور اسکی یاد میں بیچاری کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔

تیسرے پہر اس کے بال گوندھتے گوندھتے پرپھل نے کہا "کلیانی تمھارا چہرہ اس قدر اترا کیوں گیا ہے"۔ کلیانی کیا جواب دیتی خاموش رہ گئی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا منہ اترا ہوا ہے۔ بال باندھ چکنے پر پرپھل نے کہا "تم ذرا بیٹھو میں ابھی آئی"

پرپھل کے جانے کے بعد نوکرانی نے پوچھا "کیوں چھوٹی بھابی۔ بھائی کے ساتھ تمھارا دل مل گیا یا نہیں" کلیانی نے شرم سے گردن نیچی کر لی۔

"بولتی کیوں نہیں۔ شرم کیوں کرتی ہو۔ باتیں ہوئی ہیں یا نہیں۔"

کلیانی نے حسرت آمیز لہجے میں کہا "میں تو انو جیجی کے پاس رہتی ہوں"

"تو کیا بھیا نے ایک دن بھی اپنے پاس بلاکر باتیں نہیں کیں"

"نہیں"

نوکرانی محبت آمیز لہجہ میں کہنے لگی۔ انھوں نے تو اشتیاق سے شادی نہیں کی ہے۔ اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے دوسری شادی کی۔ ورنہ پرپھل جیسی عورت کے گھر میں ہوتے کون کسی دوسرے سے محبت کر سکتا ہے۔

بات تو سچ کہی۔ کلیانی کم سمجھی پر بھی یہ بات سمجھ سکتی ہے وہ خاموش بیٹھی رہگئی،

۴

رات کے دس بج چکے۔ تاراچرن سونے کے کمرے میں گئے۔ دیکھا کہ ابھی تک پرپھل نہیں آئی۔ آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ وہ حسرت بھرے دل سے پلنگ کی طرف منہ پھیرتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے کے پاس ایک لمبا گھونگھٹ نکالے ایک لڑکی کھڑی بید کی طرح کانپ رہی ہے۔ تاراچرن کا خون منجمد ہو گیا۔ وہ خاموش کھڑے رہے۔ کلیانی بھی کھڑی رہی۔

کچھ عرصے بعد تاراچرن نے کہا۔ "پرپھل کہاں ہے؟" کلیانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ انھوں نے پھر پوچھا "پرپھل کہاں ہے؟" کان میں ایک باریک آواز آئی "نیچے" تاراچرن نے پھر دیر کے سکوت کے بعد کہا "معلوم ہوتا ہے اس نے بھیجا ہے" "ہاں" "تم نیچے جاکر اسے یہاں بھیجدو"۔ کلیانی چلی گئی۔ اس وقت بیچاری کے ننھے سے دل میں کیا کیا جذبات اٹھ رہے تھے۔ کیا کیا خیالات موجزن تھے۔ تاراچرن ایک ٹھنڈی آہ کھینچکر رہ گئے۔ اسی وقت برابر والے کمرہ سے کچھ مسکراتی اور کچھ سنجیدہ صورت بنائے پرپھل آن موجود ہوئی اور بولی یہ کیا حرکت ہے؟ کیا وہ تمھاری بیوی نہیں ہے؟ ہم لوگ اُسے یہاں سکھ دینے کے لئے لائے ہیں یا دکھ دینے کے لئے۔ تم بھی جانتے ہو کہ کس فرض کی ادائگی کے خیال سے تم نے اس سے بیاہ کیا ہے۔ اور اسی کے لئے میں نے اپنا سب کچھ — تمھیں — اس کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے فرض کو یاد کرو۔ کلیانی سے محبت کرو۔ تمھاری سرد مہری اس کے شکستہ دل کو چور چور کر دیگی"۔ تاراچرن نے پرپھل کے یہ الفاظ سنے انھوں نے شرم سے گردن نیچی کر لی اور خاموش ہو گئے۔

پرپھل نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا "کیا ناراض ہو گئے"؟

"نہیں پرپھل میں ناراض نہیں ہوا۔ تم نے مجھے اپنا بھولا ہوا فرض یاد دلادیا اب میں تمھارے ہی بتلائے ہوئے راستہ پر چلونگا۔

پرپھل نے نہایت محبت آمیز لہجہ میں کہا "میری بتلائی ہوئی راہ پر؟ آہ یہ نہ کہو۔ میں سچ کہتی ہوں میں جتنا دکھلاتی ہوں اتنی کلیانی سے محبت نہیں کرتی میرا پیار۔ میری محبت بے غرضانہ نہیں ہے وہ محض اپنے لئے ہے۔ اور تمھارے لئے۔ میں تمھاری محبت کی سب سے اونچی چوٹی پر پہونچ چکی ہوں۔ اس لئے کلیانی پر رحم کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ اگر ذرا سی محبت سے خاندان کا نام رہ جائے تو اس میں اپنا کیا ہرج۔ دیکھنا تم اب کلیانی سے زیادہ بے توجہی نہ کرنا"

تاراچرن نے پرپھل کو چھاتی سے چمٹا لیا۔ اور ہنس کر کہا "جس کو ایسا وزیر ملا ہے اس کو عقل کی کیا ضرورت! اچھا ایسا ہی ہوگا"۔

پرپھل کی کوششوں سے کلیانی تاراچرن کے کمرے میں آنے جانے لگی۔ وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ آہستہ آہستہ ایک سال گذر گیا۔

۵

تاراچرن کے گھر میں آج شاہانہ دھوم دھام ہے۔ مکان کا کونہ کونہ آراستہ کیا گیا ہے۔ نوبت بج رہی ہے۔ درگاچرن بابو کی زندگی آج سپھل ہوئی تاراچرن

کی مسرت کی مراد بر آئی ہے۔ سب کے دلوں میں ایک خاص ولولہ ہے ایک خاص جوش ہے اور ایک خاص خوشی ہے ——— کلیانی کے لڑکا پیدا ہوا ہے"
بدقسمت عورتوں کی زندگی کے لئے ایک آزمایش کی گھڑی ہوتی ہے بچہ پیدا ہونے کے بعد ہی کلیانی انتہا درجہ کی کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی اس کی حالت خراب ہی رہی۔ پرمل زچہ خانہ میں جاکر نوزائیدہ بچہ کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ کیلا پاکر اس نے تاراچرن کو بلوایا اور لڑکے کا منہ دکھلا کر ہنستی ہوئی بولی "کیوں کیسا ہے؟" تاراچرن نے بھی اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ "بہت خوبصورت ہے"۔
"کیسے"
"کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمھارا ہی بچہ ہے"
"ہے تو سہی"
تاراچرن نے سنجیدہ صورت اختیار کرلی اور کہنے لگے کاش ایسا ہوتا"
تکلیف میں مبتلا کلیانی نے ایک بار گھونگھٹ میں سے ہی شوہر کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ پرمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم دل کے بہت اچھے ہو"

۶

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ برآمدے میں کہیں کوئی نہ تھا۔ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کلیانی جنگلہ پکڑے نہ معلوم دل میں کیا سوچ رہی تھی۔ بچہ چار مہینہ کا ہو گیا لیکن اس نے اس اثنا میں شوہر کا منہ تک نہیں دیکھا۔ وہ اتنی سخت بیمار رہ چکی ہے لیکن اس کے شوہر اس کے مجبوراً ایک دن بھی اس کے پاس نہ آئے کلیانی کو خیال آیا کہ گھر کا کوئی ادنیٰ ملازم جب کبھی بیمار ہوا اس کے سوامی ہمیشہ اس کی پرسش و خاطر تواضع کرتے رہے۔ اس خیال سے کلیانی کا شیشہ دل چور چور ہو گیا وہ ایک آہ سرد بھر کر رہ گئی ——— وہ ادنیٰ ملازموں سے بھی حقیر تھی؟ ———
اسی خیال میں وہ آگے بڑھی۔ اس کے کانوں میں کچھ آواز آئی۔ اس نے کھڑکی سے مکان کے اندر جھانک کر دیکھا ——— ایک صوفے پر تاراچرن بیٹھے ہیں پرمل ان کے زانو پر سر رکھے لیٹی ان کا منہ تک رہی ہے۔ باتیں پیار و محبت کی ہیں۔ ایک ایک لفظ سے محبت ٹپک رہی ہے ———"
مٹھائی کے تھال کو سامنے دیکھ کر جو حالت بھوکے کی ہوتی ہے وہی کلیانی کی ہوئی۔ مگر بیچاری للچائی اور پیاسی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے ننھے سے دل میں خون کا فوارہ ابل اٹھا۔

ملازمہ کمرے میں آکر بچے کو دے گئی۔ بچہ کو دیکھتے ہی دونوں شوہر اور بیوی کے چہرے پھول کے مانند کھل اٹھے۔ پرمل کہنے لگی۔ "کلیانی کو آج بخار نہیں آیا اب اچھی ہے" تاراچرن خاموش رہے۔
"اچھا بچے کا نام کیا رکھا جائے" "ان پر مشن کو اب زیادہ دن نہیں رہے"
"تمھیں تبلاؤ نا ———"
"امولیہ کمار۔ یہ نام اچھا رہے گا یا نہیں"
"ہاں یہی نام رہنے دو۔ دیکھو نا لڑکا کیسا ہنس رہا ہے۔ اتنا ہنسنا اس نے کہاں سے سیکھا ہے"؟
دونوں نے ایک ساتھ ہی بچے کا منہ چوم لیا۔ اس کے بعد تاراچرن نے پرمل کے منہ پر مہر محبت ثبت کر دی۔ پرمل ہنس پڑی۔ کلیانی نے اپنی جگہ سے ہٹ جانا چاہا لیکن نہ ہٹ سکی۔
پرمل کہنے لگی "اب معلوم ہوتا ہے کلیانی اچھی ہو جائیگی"
تاراچرن ذرا رک رک کر بولے۔ "اتنا فکر کاہے کا۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت تھی وہ تو مل گئی"۔
"نہیں نہیں ایسی باتیں نہیں کرتے"۔
کلیانی زیادہ دیر وہاں نہ ٹھیر سکی آہستہ آہستہ جنگلہ پکڑے نیچے اتر آئی اور اپنے بستر پر پڑ گئی۔ خدا کی قدرت ایک ہی وقت میں دو مختلف ہستیوں کے دل میں کیسے متضاد خیالات اٹھ رہے تھے۔ ایک طرف پرمل بچے کو گود میں پیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "کلیانی کس قدر خوش نصیب ہے" دوسری طرف کلیانی کسی اور ہی کی خوش نصیبی پر غور کر رہی تھی۔
دوسری صبح انو جیجی نے پرمل سے آکر کہا۔ "کل رات سے چھوٹی بہو کو بہت زور کا بخار ہے۔ ابھی تک نہیں اٹھیں"۔

۷

وقت مقررہ پہ بچے کا کرن سنسکار ہوا۔ نام امولیہ کمار ہی رکھا گیا کلیانی آہستہ آہستہ بستر کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی گئی۔ ڈاکٹر دیکھ جاتا ہے۔ دوا دی جاتی ہے۔ تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ لیکن کلیانی کی بیماری اچھی ہونے میں نہیں آتی۔ لوگ سوچتے ہیں "پرماتما سارے سکھ انسان کو نہیں دیتا ورنہ دولتمند لوگ ہی زیادہ بیمار کیوں ہوتے ہیں"۔
انو نیچے کسی کام میں مصروف تھی۔ کلیانی اپنے کمرہ میں اکیلی پڑی تھی۔ کھڑکی

ہوئی کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا اس کے زرد چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ کھیل رہی تھی یکایک اس کے منہ پر کسی کا ٹھنڈا ہاتھ لگا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا ——— شوہر ہیں۔

کلیانی کے پاس بڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد تاراچرن نے کہا "کلیانی کیسی ہو؟" آج کلیانی کے منہ پر اس کا معمولی جواب "اچھی ہوں" نہ آیا آج اس کے شوہر کی آواز میں رقت تھی اور سوز۔ کلیانی نے ایک بار آنکھیں پھاڑ کر شوہر کو دیکھا۔ دیکھتے ہی آنکھیں جھک سی گئیں۔ ان سے اشکوں کا دریا بہہ نکلا۔ تاراچرن نے دھیرے سے کہا۔ "روتی کیوں ہو کلیانی" "ڈاکٹر کہہ گیا ہے تم اچھی ہو جاؤ گی"

کلیانی نے ایک گہرا سانس لیا اور کہا "اچھی ہو کر کیا کرونگی۔؟"

"کیوں کلیانی ایسا کیوں کہتی ہو۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی"

"نہیں میرا کام پورا ہو گیا۔ اب جی کر کیا کرونگی"

تاراچرن قصوروار مجرم کی طرح چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کلیانی کا دبلا اور مرجھایا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر گھبرائے ہوئے بولے "یہ کیا کہتی ہو ایسی بات زبان پر نہ لاؤ ———"

کلیانی نے کروٹ بدلی۔ اسکی آنکھوں سے آنسو امڈے چلے آرہے تھے جیسے چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ تاراچرن نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیوں کلیانی ایسا کیوں کہتی ہو۔ کیا بہت تکلیف ہے؟"

"ہاں"

"کیسی تکلیف"

بڑی دقت سے کلیانی نے کہا "سر پھٹا جاتا ہے"۔

"اچھا یہ خوشبو سونگھو۔ منہ نہ پھیرنا۔ خوشبو ناک میں جانے دو"

دماغ کو ٹھنڈک اور فرحت بخشنے والی خوشبو سے کلیانی کا دل کچھ ٹھکانے آیا۔ محبت آمیز الفاظ میں کہنے لگی "بس آرام سا معلوم ہوتا ہے"

کلیانی نے ہاتھ سے شیشی کو دور ہٹانا چاہا۔ تاراچرن نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ "ہٹاؤ نہیں! میری یہ معمولی سی خدمت قبول کرو!"

کلیانی شوہر کے منہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "بجھے ہوئے چراغ میں تیل ڈالنے سے کیا فائدہ؟ سوکھی ہوئی شاخ پر پانی کے ٹھنڈے چھینٹے دینے سے کیا نفع ———" کلیانی نے آنکھیں بند کر لیں۔ تاراچرن کہنے لگے۔ "کلیانی میں پہلی دفعہ تمھیں ایک چیز دینے آیا ہوں —— کیا نہ لوگی"؟

کلیانی نے زور سے آنکھیں بند کر لیں اور غصہ آمیز لہجہ میں کہا "نہیں لونگی۔ نہیں لونگی۔ تم جاؤ۔ چلے جاؤ۔ اس وقت میرے پاس کیا کرنے آئے ہو۔ اب میرے مرنے کی پرواہ ہی کیا ہے۔ تمھیں جس چیز کی ضرورت تھی اسے پالیا ہے"۔

کلیانی اور کچھ نہ کہہ سکی۔ غم و غصہ کے اظہار سے نحیف و زار کلیانی پر غشی طاری ہو گئی ———

۸

کلیانی دن بدن کمزور ہونے لگی۔ اب وہ بستر سے اٹھ نہیں سکتی۔ زیادہ بول نہیں سکتی ———

شام کی دھندلی روشنی میں انو کلیانی کے لئے گلاس میں دوا ڈال رہی تھی عالم بیہوشی میں پڑی ہوئی کلیانی یکایک بول اٹھی۔ "اب نہ آنا۔ میں نہیں چاہتی"۔

"کلیانی کیا بکتی ہو؟"

"جیجی وہ چلے گئے۔ کیا ناراض ہو گئے۔؟"

"یہ کیا بکتی ہو کلیانی۔ یہ لو دوا کھاؤ؟"

"دوا۔ دوا۔ اب تو مجھ سے نہیں کھائی جاتی"

"نہیں کھاؤ گی تو بیماری کیسے دور ہو گی"

"بیماری۔ بیماری۔ کیا اب دور ہو گی۔ کیا اس سے نجات ملیگی۔ یہ ہم کو یہ خیال ہے۔ انھیں اب میری ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے میں نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ اب مجھے زندہ رکھنے کی کوشش نہ کرو"

انو کہنے لگی۔ "میں واری کلیانی تمھیں دکھ کا ہے کا ہے۔ تم راجہ کی رانی راجہ کی ماں ہو ———"

مرتی ہوئی کلیانی کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔

آدھی رات کے قریب کلیانی واہی تباہی بکنے لگی۔ انو ڈر کے مارے مالکن اور پریمل کو بلا لائی۔

پریمل نے آتے ہی کلیانی کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ مالکن اسے پنکھا کرنے لگی۔

کلیانی کا اضطراب اور بے چینی بڑھنے لگی۔

"کیوں بہن ایسا کیوں کر رہی ہو"

"سخت تکلیف ہے"

"بابو تاراچرن بلائے گئے۔ آدمی ڈاکٹر کو بلانے کے لئے دوڑا۔ گھر میں کہرام سا مچ گیا ———

پربھل کہنے لگی۔ "اموکو گود میں لوگی؟"

"نہیں بہن"

مالکن نے حسرت آمیز لہجہ میں کہا۔ جاؤ لے آؤ نا۔ ہو ذرا بچے کو گود میں لو"

کلیانی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "بہن مجھے راحت قلبی کے ساتھ مرنے دو۔ اس کی یاد دل سے محو ہونے دو۔ ہائے بہن وہ میرے پیٹ سے کیوں پیدا ہوا تمھارے پیٹ سے کیوں نہ ہوا۔؟"

آہ کیا حسرت آمیز الفاظ تھے۔ کیا درد بھرے لفظ تھے۔ پربھل کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگی "کلیانی ٹھہرو ———— کلیانی کا جوش جیسے رو کے نہ رکتا تھا۔ کہنے لگی۔ "بہت دن ہوئے۔ جب میں ننھی سی لڑکی کی حالت میں اس گھر میں آئی تھی۔ اس دن سے سنتی آئی ہوں کہ تم محض بچے کے لئے مجھ سے محبت کرتے ہو یہ کیوں۔ کیا میری کوئی حقیقت نہیں؟ نہ سہی۔ مجھ سے تم لوگ محبت نہیں کرتے لیکن مجھے یہاں کیوں لایا گیا۔ کون لایا؟ مرا اس میں کیا قصور"؟

مالکن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ "بہو تم سے کون محبت نہیں کرتا۔ تم تو میرے گھر کی لکشمی ہو۔"

"نہیں نہیں۔ میں کوئی نہیں ہوں۔ کوئی نہیں"

ڈاکٹر نے کہا "آخری وقت ہے"

مالکن نے روتے روتے کہا۔ "اتو! تایا جی کو بلا لاؤ"

اتو روتی ہوئی چلی گئی۔ کلیانی رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی اس وقت بھی اسے پورا ہوش نہیں تھا اتو واپس آگئی اور کہنے لگی "بھائی تو نہیں کہیں چلے گئے ہیں"۔

مالکن کے آنسو چھوٹ پڑے۔ عین اس وقت ملازمہ نے آکر کہا "بھابی جلدی آؤ امو رو رہا ہے کتنا بہلاتی ہوں کتنا پیار کرتی ہوں۔ پر مانتا نہیں ہے"۔

پربھل جھٹ پٹ واپس چلی گئی۔ کلیانی بولی ——— "بس کیا وہ نہیں آئے؟ ——— وہ آئے تھے پر میں نے انھیں واپس جانے کو کہا۔ اب بلاؤ اب جانے کو نہیں کہونگی ———"

لیکن کوئی بھی نہ آیا۔

اتو اس نے منہ کے پاس منہ رکھکر دیکھا۔ کلیانی کلیانی کیا کہتی ہو؟

نیم وا اور نیم بند منہ سے کلیانی کہنے لگی۔ "آؤ اب جانے کو نہ کہونگی آؤ ———"

عید کے دن

عجب ادا سے کیا اس نے وار عید کے دن
تو بڑھ کے میں نے بھی کی جاں نثار عید کے دن

میرے ستانے کو سوچی نہ ہو نئی تدبیر
یہ چاہ اور یہ الفت، یہ پیار عید کے دن؟

ہزاروں حسرت و ارماں ہیں دل میں پوشیدہ
نکال آ ادھر اے گلعذار عید کے دن

بغیر دید کے تیری کہاں ہو میری عید!
یہی ہے عید کہ آنکھیں ہوں چار عید کے دن

نگاہ ناز کے صدقے ہو اور بھی اک وار
تڑپ رہا ہے دل بیقرار عید کے دن

وفا کا میری صلہ واہ کیا ملا مجھ کو
نکالتا ہے وہ دل سے غبار عید کے دن

زبان یار کا بوسہ میں مست ہو کے لیا
مزہ ہی دے گئی دشنام یار عید کے دن

خدا کے واسطے ساقی ادھر بھی دے اک جام
ہے منتظر نگہہ انتظار عید کے دن

حسین ہاتھوں سے ملتے ہیں جام اک پر اک
اڑاتے جاتے ہیں مے بادہ خوار عید کے دن

چہک رہی ہے جو بلبل تو گل بھی ہنستے ہیں
غرض ہے پھیلی ہوئی اک بہار عید کے دن

ہلال عید میں پیغام عید لایا ہے
کہ عاشقوں کو ہے دیدار یار عید کے دن

[illegible]

رسالہ عالمگیر کے عید نمبر کے لئے

خوش قسمت اور بدقسمت دولتمند!

از شوداس کھنہ درپن

خوش قسمت واقعی خوش قسمت دولتمند وہ ہے (۱) جو سادگی اور پاکیزگی خیال کا مالک ہو اور حق و صداقت جیسی سماوی نعمتوں کو بنظر استحسان دیکھے۔

(۲) جو دولت کی سنہری اور روپہلی دلفریبیوں کے زیر اثر ترغیب و تحریص کا شکار نہ ہو۔

(۳) جو برائیوں سے دامن کشاں ہو کر نیکیوں کو دل میں جگہ دے۔ جس کے چہرے پر مسکراہٹ ہمیشہ کھیلتی رہے۔

(۴) جو زمانے کے پامال شدہ مفلوک الحال اور آزردہ فلاکت زدگان خدا کی ویران زندگیوں کو سرسبز و شاداب کر سکے اور محبت کے چراغ سے مسکینوں۔ اپاہجوں یتیموں اور بیوہ زنوں کی تاریک دنیا کو روشن کر دے

ایسا دولتمند حسنِ مجاز کا گرویدہ نہیں ہوتا۔ شباب کی حکومت اور حسن کی بادشاہت کو نہیں مانتا اس کی نظروں میں جام و شیشہ و پیمانہ کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ حسنِ انسانیت کے طوفان سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دولتمندی کے نشے کا سرور نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہی آنکھیں شاہدِ حقیقی کے جلووں سے منور ہونے کی تمنا رکھتی ہیں۔ وہ اپنا دل کسی کو نہیں دیتا لیکن سب کے دلوں کو جیت لیتا ہے۔ وہ سخاوت کے ذریعے منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرنے والا راستہ معلوم کرنا چاہتا ہے اور نام کا بھوکا نہیں ہوتا +

بدقسمت یقیناً بدقسمت دولتمند وہ ہے (۱) جس کے ذاتی فضائل ناخوشگوار ہوں۔

(۲) جس کے سر میں کبر و تفاخر کی ہوا بھری ہو جس کی آواز میں رعونت ہو اور رفتار میں تمکنت

(۳) جو مجلسی رعنائیوں کا دلدادہ اور جمالیات کی سحر طرازیوں کا متوالا ہو۔

(۴) جو ادبی یا مذہبی محفل میں شامل ہونے سے احتراز کرے۔ لیکن رقص و سرود کی محفل میں بصد شوق بصد خوشی شامل ہو۔

(۵) جو فلک ناہنجار کے ستائے ہوئے انسانوں کی صورتیں دیکھنے سے بیزار ہو اور آبا و اجداد کا نام ڈبونے والی شکلوں کو دیکھنے کے لئے بیقرار۔

(۶) جو کار خیر کے لئے اپنی تجوری کا منہ بند رکھے۔ لیکن عیش و عشرت کے لئے روپیوں کی تھیلیوں کا منہ کھول دے

ایسا دولتمند حق و باطل کی تفریق کو پہچاننے والے خدا کو بھول جاتا ہے۔ قدرت کی رمز شناسی اور کائنات کے اسرار سے بے خبر رہتا ہے۔ اور عالم ارضی کی تمام برائیوں کو اپنے دل میں جگہ دے کر اپنی عاقبت کو بگاڑ لیتا ہے +

جو رسالہ عالمگیر کو ایجنٹ حضرات سے خریدتے ہیں، چونکہ کتاب کی یہ رعایتی قیمت بالکل **مفت** کے برابر ہے اس لئے اسکا بہت تھوڑے عرصہ میں ختم ہو جانا یقینی ہے، اگر آپ بھی اس قابل دید کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی فرمائش خریداری بھیجدیجئے، ہمیں یقین ہے، کہ اس کتاب کو

وہی خوش قسمت اصحاب حاصل کر سکیں گے،

جو اعلان ہذا ملاحظہ فرماتے ہی فرمائش خریداری بھیجدینگے، ورنہ ختم ہو جانے کے بعد دس روپیہ میں بھی ہم اس کو نہ بھیج سکینگے۔

واضح رہے، کہ کتاب نہایت دلچسپ ہے، اور ایسے عمدہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے، کہ آپ کو ختم کئے بغیر چین نہ آئیگا، اور جو لوگ علامہ ابن القیم کی بلند پایہ شخصیت و قابلیت سے واقف ہیں، وہ تو جانتے ہی ہیں، کہ جو کتاب علامہ ممدوح کے زور دار قلم سے لکھی گئی ہو، وہ موتیوں سے تول کر لینے کے قابل ہے، یہ سطور محض ان حضرات کیلئے لکھی گئی ہیں، جن کی نظروں سے علامہ ممدوح کی کسی تصنیف کا کوئی اردو ترجمہ نہیں گذرا،

یقین جانئے کہ اس گرانقدر کتاب کے پونے آٹھ سو صفحات میں ایسے گراں قیمت اور بیش بہا موتی بکھرے پڑے ہیں، جن کی قیمت کا اندازہ صرف مرتبہ دان علامہ ابن القیم ہی لگا سکتے ہیں،

آج سب سے پہلی فرصت میں کتاب کی خریداری کیلئے کارڈ بھیجکر اس لاجواب شاہکار کتاب کو حاصل کیجئے اور اس بڑی بھاری رعایت سے فائدہ اٹھایئے ورنہ

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

علاوہ محصول ڈاک

نیاز مند

مینیجر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور

لایا! وہ لایا!!

لایا! وہ لایا!! غواص فکر ذہن رسا و اقبال کے بحر دم سے شہوار دُر نکال لایا

غلطی ہوئی! دُر شہوار نہ ہو، بلکہ لاکھوں در شہوار جب ایک سلک میں پرو کر کسی کے زیب گلو ہوں تو اُس شئے عجیب کو کیا کہو گے؟ وہ دُر جس پر سے ان گنت در شہوار لٹائے جائیں اس کی قیمت کیا ہو سکتی ہے؟ قسمت! بڑا ہی خوش قسمت انسان، جو ڈھونڈا، پایا ـــــــ اور ساتھ لایا!

کیا لایا؟ عالم اسلام کے خون سے سینچے ہوئے انمول دُر کو لایا! دنیائے تمدن کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جس صدف اسلام نے پرورش کی تھی اور جس کی تہذیب نے ایک بے بہا موتی پیدا کیا تھا وہ ہاتھ لگا، اس کو لایا ـــــ خوب لایا!

اسلام کی تیغوں کی آب میں جن نایاب موتیوں نے نشو و نما پائی تھی ـ اور جو اصول فطرت کے تحت اپنے سے دوسرے میں ضم ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک زبردست موتی نے جنم لیا جو نہ بجھنے والی تیغوں کی آگ کے پانی سے ظاہر ہوا ـ نسیم مشیت نے ہوا سے جلا دیکر جسم خاکی میں ڈھال لیا ـ یہ دُر، یہ خدائی دُر لایا! کون لایا؟

گولکنڈہ کا "کوہ نور" جاذبیت اور کشش سے بحر روم کا "در شہوار" نکال لایا!

مشرق کا شاہزادہ مغرب کی شاہزادی لایا! صدیوں کے لطمۂ حوادث سے بچھڑے ہوئے عالمگیر اسلامی اخوت کے خون کے قطرے، پیکر انسانی اختیار کرنے کے بعد مشرق و مغرب سے ایک مرکز پہ ہم آغوش ہوئے! مغرب کے بجور کو مشرق کے پہاڑ نے پی لیا، مغرب اسلام کی سرد زمین کو شرقی اسلامی گرمی نے حد اعتدال پہ کر دیا ـ قیشلاق اور اوتراق نے سطح مرتفع کو جگہ دیدی! مغربی اور مشرقی ایوان نعمت دکنی دسترخوان پر چنے گئے ـ اپولو کی راگ دیپک میں گم ہو گئی خدائے راگ نے دنیا کا دل ہلا دینے والی نئی اسلامی تان لی: عالم مادی کے تخیل میں ہوائی گھوڑے دوڑانے والی مخلوق، خود ساختہ محفل میں شریک ہو کر بد ہوش ہوئی، اہل فن سر دھننے لگے! واہ، واہ، کی صدا نے غیرت، حمیت اور اخوت میں جان ڈالدی ـ مجلس کا رنگ بدلا ـ خدائے راگ نے ایک اور تان لی، ہر ایک عمل کنان ایک دوسرے کی محبت میں سرشار بے جستجوئے حق ہوا، ساوات کی لہر دوڑ گئی، خوشی سے چہرے دمک اٹھے جسم بیجاں میں روح آگئی، دنیا پہ از سر نو انبساط نے پرتو ڈالا!! فلکیات سے لے کر سمندروں کی کنکریوں تک نے اپنی اپنی دھن میں ایک خاص شاہانہ گیت گایا، کائنات کا ہر ذرہ محو حیرت ہوا،

رفتم کہ کہنگی ز تماشہ بر افگنم

کے نغموں نے بھولا ہوا سبق یاد دلایا ـ غیرت حق کو جوش ہوا!

دنیا کو امن و امان کے دائرہ میں اکٹھا کرنے، قوانین فطرت کے مطابق تہذیب دیئے ہوئے مذہب کی سچی نگہبانی کرنے ھوالحی القیوم کے حاجب اور رازداں کے اقوال کی پیروی، صدیق رض کی صداقت عمر رض کی سیاست عثمان رض کا عرفان اور علی رض کی شجاعت کو زندہ کرنے ایہ ان الملوک ہا سرمایہ داروں کی جادوگری کو خوب سمجھنے، غطا کو کشف سے مبدل کرنے، جہالت کو مشعل علم سے روشن کرنے حرکت میں برکت جتلانے ـ نمود و نمائش کو مٹانے حقیقی راہ بتلانے، عالم کو ہیجان میں ڈالنے والے نیا پودا لگانے ـ خداوندان مادہ کے اس بساط زرگری پہ مختلف چالوں کو جاننے کے بعد اپنے شہ مات دینے کے منصوبے کو سوچنے اور اب نہیں تو کچھ دیر بعد اپنے خاندان کے ذریعہ عالمگیر اسلامی فتح و نصرت کا پرچم لہرانے کا یقین رکھنے کے صلہ میں، اس محفل کے صدر، بیسویں صدی کے مجاہد اعظم کو غیب سے ایک خاص نور کا نغمہ عطا ہوا ـ جس کی ضو سے عالم اور عالمیوں کی آنکھیں، چوندھیا گئیں، ـــــ

ان واقعات تنقیحی متعلقہ میں مبالغہ اغراق و غلو کو دخل نہیں

؎ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست ، مزدور ہے ، اس حلقہ دام خیال کی فضا میں زور ایک مہذب حربہ ہے ، مگر مقابل بھی شرط یہ ہے کہ اسی اصول پر عمل پیرا ہو۔ اگر مقابل جان صداقت و حریت ہو تو اس فریب کا تار و پود خود بخود اپنی ہی سیاست کے چکروں سے بکھر جاتا ہے۔ واقعات ماضی حال کے لئے آئینہ کا کام دیتے ہیں، مستقبل حقیقت میں حال کے اعمال کا نام ہے تو بس !! وہ نیک اعمال جو اسباب قدرت کے ساتھ وابستہ ہوں۔ ان کا مستقبل نہایت ہی شاندار رہا ہے اور ہوگا ،

ہاں ! تو اس شاندار مستقبل قریب کی کامیابی کا مبارک سہرا اسی قائد اعظم ، صدر نشین محفل جان اسلامیاں کے سر رہا۔ جس کے نور نظر کے تار نظر میں ، دُر شہوار منسلک ہوا۔ جس کی چشم بصیرت نے اپنے نور چشم میں عالمگیر اسلامی نور کو دیکھ لیا۔ جس کی فرخندہ فالی نے اپنے سعادت آثار میں نیک کرداری دیکھ لی۔ جس کے فرخ و اقبالمند طالع نے اپنے لخت جگر کے عروق میں آل عثمانی کا خون زندگی دوڑتے دیکھ لیا۔ جس کے ظل الہیٔ اپنے حمایت میں خورشید اسلام کو درخشاں دیکھ لیا ، اس پاک و مبارک ہستی پر دست غیب سے نور کے پھول نچھاور کئے جا رہے ہیں۔ کائنات کے ہر گوشہ سے مبارک بادی کی دھوم مچی ہوئی ہے ، سمندروں کا ہر قطرہ اور اس عالم کا ہر ذرہ خوشی سے اچھل کر مبارک باد پیش کر رہا ہے۔ مبارک باشد و شد مبارک

ایں مبارک ارض و جملہ جہاں مقبول باد

۱ ، ۲ "قیشلاق" اور "ییلاق" ترکی الفاظ ہیں جن کے معنی گرمیوں میں سرد مقامات پر بسر کرنے کی جگہ اور سردیوں میں گرم مقامات پر گذارنے کے ہیں دکن چونکہ سطح مرتفع ہے نہ زیادہ اونچا نہ زیادہ نیچا اس لئے معتدل کیفیت رکھتا ہے۔

۳ اپولو ، یورپ میں گانے کا خدا مانا جاتا ہے۔

۴ یہاں سے جہاں کہیں خبر نکالی گئی ہے سب کچھ ہمارے آقائے ولی نعمت خلد اللہ سے منسوب ہے چنانچہ صدر نشین محفل بھی وہی ہیں ،

۵ حمایت سے مراد شہزادہ اعظم جاہ نواب میر حمایت علی خان بہادر دام اقبالہٗ ولی عہد بہادر سلطنت آصفیہ ہیں ۔

لمعات تجلّی

از حضرت تجلّی حیدر آبادی

بن بن کے نکلتا ہے وہ کافر کئی دن سے
قابو میں نہیں ہے دلِ مضطر کئی دن سے

اغیار کو پہلو میں بٹھا کر کئی دن سے
کیا وہ ستم کرتے ہیں مجھ پر کئی دن سے

ہوں غرق جو دریائے محبت میں کسی کی
آنکھوں سے بہاتا ہوں سمندر کئی دن سے

منہ پھیر لیا کرتے ہیں وہ دیکھ کے مجھ کو
برگشتہ ہے میرا ہی مقدر کئی دن سے

کھلتا نہیں کچھ حال کسے قتل کریں گے
باندھے ہوئے پھرتے ہیں وہ خنجر کئی دن سے

باز آؤ تجلّی نہ کرو عشق بتاں تم !
چرچے ہیں اب اس بات کے گھر گھر کئی دن سے

ارمغانِ عید

لائی ہے باغِ دہر میں کیا کیا بہارِ عید
سرسبز کر گئی چمنِ روزگارِ عید

کوئی سمجھتا ہے اسے ایماں کی روشنی
اور ہے کسی کے واسطے روئے نگارِ عید

ہر اک نشے میں عیش و مسرت کے چور ہے
گو مے نہیں ہے رکھتی ہے پھر بھی خمارِ عید

ہے سرخ پوشیوں کا وہ عالم کہ ہر طرف
دکھلا رہی ہے آنکھوں کو اک لالہ زارِ عید

سج دھج نرالی اور ادائیں وہ دل رُبا
لائی ہے مہوشوں پہ انوکھا نکھارِ عید

دیدارِ یار جس کو میسر ہو رات دن
اسکے لئے سدا ہے یہ لیل و نہارِ عید

وعدہ کیا کسی نے جو ملنے کا عید پر
سمجھا ہے اس کو بھی دلِ امیدوارِ عید

کیا خوب ہے یہ طاعتِ سی روزہ کا صلہ
بندوں پہ ہے یہ رحمتِ پروردگارِ عید

نازل ہوا کلامِ الٰہی رسولؐ پر!
اس رحمتِ خدا کی بنی یادگارِ عید

قرباں ہو ایسے دین پہ جسکے طفیل میں
ملتی ہے روزہ داروں کو یہ بار بار عید

اب کیا ہے اسکے پاس غم و رنج کے سوا
کیونکر منائے مسلمِ حسرت شعارِ عید

اختر خدا کے فضل سے احباب کو مرے
ایک عید کیا نصیب ہو ایسی ہزار عید

آزارِ محبت

بچپن میں تو تقاضائے عمر سے میں نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس کی شرمندگی آج تک ہے لیکن ہوش سنبھال کر پہلے پہل جس دن میں نے . . . کو دیکھا خدا ہی جانے کہ وہ کیسی گھڑی تھی اور انہوں نے جادو کر دیا کہ اسی دن سے میں نے ان کی بارگاہ محبت میں نذرانہ دل پیش کر دیا اور آستانہ ناز پر اپنی جبین نیاز جھکا دی۔

اب تک تو میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی لیکن اس دن سے میں تھی اور سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ان کا خیال اور ان کا تصور۔ کبھی کبھی تو اس میں اس قدر ترقی ہوتی کہ میں سمجھتی کہ واقعی وہ میرے سامنے ہیں آنکھیں ان کی صورت دیکھتیں اور کان ان کی آواز سنتے۔ خواب میں کبھی ان کو دیکھ لیتی تو آنکھ کھل جانے پر بھی گھنٹوں پڑی لیٹی رہتی اور اس امید پر نیند آجانے کی کوشش کرتی کہ شاید وہ صورت پھر نظر آجائے اور خواب ہی میں کبھی ہمکلامی کا لطف حاصل ہو۔ ہم وطن اور عزیز ہونے کے باعث جب کبھی وہ اپنے گھر آتے تو مجھے بھی لطف دیدار و ہمکلامی حاصل ہوتا۔ اس آرزو میں میں اکثر انہیں اپنے دل کے تار گھر سے بے تار کے برقی پیغام بھیجا کرتی۔ یہ کہیئے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے یا جو کچھ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ آ ہی جاتے۔ اس وقت کی خوشی کوئی میرے دل سے پوچھتا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن جہاں ان کی پرستاری میں مجھے ہزارہا لذتیں حاصل تھیں وہاں یہ خیال بھی کانٹے کی طرح دل میں کبھی کبھی کھٹکتا تھا کہ خدا جانے ان کے دل میں بھی میری جگہ ہے یا نہیں۔ وہ مجھ سے بیحد محبت سے پیش آتے تھے مجھ سے باتیں کرنے میں جو پھول ان کے منہ سے جھڑتے ان میں محبت کی بو آتی لیکن ؎

عشق است و ہزار بدگمانی

یہ وہم ضرور گذرتا کہ خدا جانے مجھے جیسی محبت ان سے ہے ویسی ہی انہیں بھی مجھ سے ہے یا نہیں۔ اسی ادھیڑبن میں چند ہی دن گذرے تھے کہ ایک دن میں نے ان سے ایک اہم کام انجام دینے کی فرمائش کی انہوں نے اس کے جواب میں کہا "کچھ انعام کی امید ہو تو کردیں" میں نے کہا کہ جو کچھ مانگئے۔ بات ہو گئی۔ مجھے اس وقت تو اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوا کہ واقعی مجھ سے کچھ مانگیں گے نہ یہ خیال میں آیا کہ کیا مانگیں گے اس کے علاوہ میں یہ بھی سمجھتی تھی کہ میری ہر چیز ان کی ملک ہے۔ انہوں نے خوبی کے ساتھ وہ کام پورا کردیا۔ اب مجھے خود بخود یہ خیال پیدا ہوا کہ دیکھوں وہ کیا مانگتے ہیں۔ دل نے گدگدانا شروع کیا کہ اگر وہ کچھ نہ کہیں تو تم خود پوچھو کافی انتظار کے بعد آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور موقع پا کر میں ان سے پوچھ ہی بیٹھی "ہاں آپ نے اپنا انعام نہیں لیا؟ جو کچھ آپ کہیں وہ حاضر کروں" انہوں نے کہا "تم دوگی؟" میں نے جواب دیا "ضرور دوں گی" اور ہمہ تن انتظار ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ انہوں نے محبت اور امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر یہ شعر پڑھا ؎

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سب کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی، ایک سوال اچھا ہے

کہاں تو ان سے نظریں لڑی ہوئی تھیں کہاں فوراً نیچی ہو گئیں۔

اب تک چونکہ ان کے دلی جذبات کا مجھ پر اظہار نہ ہوا تھا اس لئے میں ان سے بے تکلف مخاطب ہوتی اور گفتگو کرتی تھی۔ لیکن اس وقت انکی نظروں اور زبان نے جو کچھ کردیا اس سے ایک طرف تو سارے جسم میں انتہائی

خوشی کی لہر دوڑ گئی دوسری طرف فطرتی حیا غالب آئی اور میں ایک عجیب عالم میں آنکھیں جھکائے کچھ دیر بالکل سکوت میں رہی وہ جواب کے منتظر تھے لیکن خود ہی میری قوت گویائی سلب کر چکے تھے۔ آخر اس خیال نے کہ وہ اور کچھ نہ سمجھیں مجھے مجبور کر دیا۔ میں نے بمشکل اتنا کہا "میں آپ کی تھی کب نہیں" اور گھٹنوں پر سر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ وہ ہنستے ہوئے یہ کہ کر "شکریہ" چلے گئے۔

اب میری مسرت کا کیا کہنا تھا۔ دن رات ان کے خیال میں محو طرح طرح کی آرزوؤں اور ہزاروں تمناؤں سے خانہ دل کی آبادی اور زیبائش میں مصروف رہتی۔ رفتہ رفتہ میری اس حالت کا اندازہ سب کو ہونے لگا چونکہ ان کا غم میری غذا۔ ان کا تصور میرا آرام اور ان کی یاد میرا شغل رہ گیا تھا۔ اس لئے صحت پر بھی اچھا خاصہ اثر پڑ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی سمجھایا اور بتایا گیا۔ والدین ناراض اور مایوس۔ اعزا برا بھلا کہتے احباب آپس میں اشارے کرتے میں یہ سب دیکھتی اور سنتی تھی مگر سودائے محبت نے مجھے ان باتوں سے بالکل بے نیاز اور بے پرواہ کر رکھا تھا۔ اگر کبھی ذرا دیر کو ان باتوں کا اثر دل قبول بھی کرتا تو یہ خیال فوراً اس کو زائل کر دیتا کہ "وہ تو مجھے محبت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں"

یہ گویا میری اس مسرت افزا زندگی میں مصیبت کا روگ لگنے کی ابتدا تھی جس نے یہاں تک ترقی کی کہ میری مسرت ہی نہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ میری زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا اور دنیا کے چارہ گر اس کا مداوا نہ کر سکے۔

والدین اور اعزا نے جبر و تشدد شروع کیا اور اسکی تکمیل انہوں نے میری قسمت کے اس فیصلے سے کی جو ہر لڑکی کے حق میں لازمی ہے خواہ وہ مجھ جیسی گنہگار ہو یا نہ ہو۔ میری شادی کی فکر شروع ہوئی۔ پہلے تو مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ شاید یہ تدبیر میرے درد کا مداوا ہو جائے لیکن بہت جلد مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ میری بدقسمتی سے بہ اعتبار قانون و مراسم دنیا وہ میرے اور میں ان کی نہیں ہو سکتی۔ آہ اب جو میری حالت تھی اسے کیا کہوں میری دنیا بدل چکی تھی۔ اب دل تھا اور افسردگی۔ جگر تھا اور سوزش۔ دماغ تھا اور پریشانی۔ میں خود تھی اور یاس و بیکسی میں جامہ انسانیت کے جس صنف سے تھی وہ جیسی کچھ مجبور، اور دوسروں کے بس میں ہے وہ دنیا سے پوشیدہ نہیں۔ میرے لئے بجز ضبط و سکوت کے چارہ ہی کیا تھا۔

ان باتوں کی اطلاع انہیں بھی ہوئی اور وہ بھی اثر لئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس روح فرسا صورت نے ہم دونوں کو گھلانا شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں دونوں ناکامی اور مایوسی کی مجسم تصویریں ہو کر رہ گئے۔ لیکن میری تسکین کے لئے وہ اپنی حالت بہت سنبھالے رہے اور اس درمیان میں جب کبھی مجھ سے ملے اور موقع ملا تو انہوں نے مجھ سے یہی کہا کہ میرا خیال اب چھوڑ دو۔ والدین کی خوشی کرو۔ خدا کی مرضی پر شاکر رہو۔ اپنی حالت سنبھالو اور میرے بجائے اب اپنے دل میں اسے جگہ دو جس کی تم اب ہونے والی ہو۔ وہ مجھے یہ کہتے اور بہ الفاظ دیگر یہی میں ان سے کہتی۔ لیکن کیا یہ اختیاری بات تھی یا ہے۔ محبت اگر قصداً کی جاتی ہو یا مصنوعی ہو تو البتہ ممکن ہے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کی صبح کو میں اپنے خیال میں تو دنیا سے رخصت ہونے والی تھی لیکن اور سب کے نزدیک ماں باپ کے گھر سے رخصت ہو کر ایک دوسرے گھر جانے والی تھی اور ان کی ملکیت سے نکل کر دوسرے کی ملک ہونے والی تھی۔ میری حالت بہت ردی ہو چکی تھی۔ لوگ تو خدا جانے کن کن باتوں کے منتظر انتظام میں مصروف گھڑیاں گن رہے تھے لیکن میں گویا اپنی زندگی کی بقیہ سانسیں گن رہی تھی اور فکر و تمنا میں تھی صرف ان کے آخری دیدار کی۔ تھوڑے دنوں سے وہ آتے ہی نہ تھے اور اس طرح میں ان کے دیدار سے بالکل محروم تھی۔ مجھے بالکل مایوسی تھی کہ وہ ایسے وقت میں کیا آئیں گے اور آئینگے بھی تو مجھ تک کیا پہنچیں گے۔ یہ خیال اور زیادہ بے چین کئے تھا کہ خدا جانے اُن کا کیا حال ہو۔ دفعتاً میں نے سُنا کہ وہ آ گئے۔ اب اضطراب اور بڑھا۔ میں سمجھی کہ خدا نے میری مشکل آسان کرنے انہیں بھیجا اور شاید یہ چند سانسیں جو باقی ہیں وہ اسی لئے کہ وہ آئیں اور میں اُن کے قدموں پر سر رکھ کر دم توڑ دوں۔

اسی اضطراب اور بےچینی میں دن گزر گیا۔ رات آئی۔ میری مایوسی بڑھتی جاتی تھی۔ میں ایک گوشے میں ایک چارپائی پر علیحدہ پڑی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے سرہانے کسی کے پیروں کی چاپ معلوم ہوئی سر اُٹھا کر

دیکھتی ہوں تو وہی کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے میرے سارے غم غلط ہوگئے اور میں نقش حیرت بنی ان کی طرف دیکھتی رہی کہ یہ خواب ہے یا واقعہ۔ وہ میرے سرہانے بیٹھ گئے اور پوچھا "کیسی ہو؟" میری حیرت یقین سے بدلی اور میں نے جواب دیا "اچھی ہوں"۔ خدا جانے ان کی صورت اور اس سوال میں کیا برقی قوت تھی کہ واقعی میں اتنی دیر کے لئے بالکل اچھی ہوگئی تھی۔ کاش وہ اس وقت مسیحائی سے کام نہ لیتے اور مجھے اپنے اوپر قربان ہوجانے دیتے لیکن آہ محبت تو جس سے جو کچھ نہ کرائے کم ہے۔ بشدت غم سے خود ان کی حالت غیر ہورہی تھی لیکن اس وقت بھی میرا ہی خیال تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ میری طرف دیکھا کئے اسکے بعد یہ کہہ کر اُٹھے اور چلے گئے "اور اچھا خدا حافظ پریشان نہ ہو۔ ضبط و صبر سے کام لو" فرطِ غم کے مارے وہ زبان سے تو اور کچھ نہ کہہ سکے لیکن ان کی نظریں معترف تھیں کہ ان کو میری مجبوریوں کا یقین ہے اور وہ مجھ سے ذرا بھی شاکی نہیں۔ وہ کیا آئے گویا مجھ میں جان آگئی اور میں موت سے بدتر زندگی کے

بقیہ دن پورے کرنے کو بچ گئی۔ عزیزوں نے اپنی خوشی کرلی۔ میرے مرض کا جو علاج انہوں نے تجویز کر رکھا تھا وہ بھی کر دیکھا۔ میں بظاہر دوسرے کی ملک میں ہوں اور اپنے حتی الامکان جس کے جو فرائض مجھ پر اب عائد ہیں وہ انجام دیتی ہوں لیکن دل۔ جان اور ایمان تین چیزوں پر جس طرح وہ قابض ہیں کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا ہے۔ میں بالکل مجبور ہوں۔ اگر اس تمام سرگذشت میں محض نفسانی لگاؤ تھا یا یہ محبت کسی قصد اور ارادے کے ساتھ تھی تو کیا وجہ ہے کہ باوجود ان تدابیر اور دشواریوں نیز مایوسیوں کے ان کا خیال دل سے نہیں جاتا اور میری حالت میں کوئی تغیر نہیں نہ انکی حالت میں۔ اور اگر یہ واقعات سچی اور بے لوث (بلکہ معصومانہ) محبت کے نتائج ہیں تو ہیں یا میری محبت کیوں قابلِ الزام ہے اور حقارت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے خصوصاً جب اہل دل و اہل اللہ کا بھی یہ قول ہو کہ محبت ہی وہ امانت ہے جس کی طرف "وحملها الانسان" میں اشارہ ہے۔ آہ محبت! تو اسقدر پیاری ہے کہ کیونکر دل سے نکالی جائے۔ دل تیرے ہی لئے بنا اور عطا ہوا ہے۔

(بیمارِ محبت)

نگارشِ جمیل ←

اشکہائے سیمیں!

"نغماتِ طاؤس" کی ایک صنعت کار نظم!

(بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی ایک بے پناہ تحریر)

(ترجمہ: مسٹر ظفر قریشی دہلوی بی اے)

"زندگی" نے مجھے جملہ سامان عیش و طرب مہیا کئے
کیا کیا جلوہ زار میرے لئے پیدا نہیں کئے!؟
نفیس و نازک ہدایا میرے قدموں میں ڈالے
مگر میرے محبوب! میرے دلِ وحشی کی تسکین کسی سے نہ
ہوئی مگر تیرے "غم" کے چند اشک ہائے سیمیں
سے!!

"زمانہ" نے مجھے کیا کیا نہ دُکھ دیا؟
مسرت چھین، صحت برباد کی ——— آزادی کا نشیمن
اُجاڑا مجھے برباد کیا ———
مگر میرے دلِ وحشی کے لئے تیرے غم کے اشکہائے سیمیں
سے زیادہ کوئی چیز مایۂ تسکین نہ تھی!! ———
آہ! میرا سکون غم آگیں!!

سامانِ نشاط!

انجامِ غم ہے دامنِ عنواں لئے ہوئے
ہے صبحِ ہجر ساتھ شبستاں لئے ہوئے

روزِ فراق دیدۂ گریاں لئے ہوئے
بیٹھا ہوا ہوں "ورطۂ طوفاں" لئے ہوئے

میں ہوں کہ ضبطِ عالمِ امکاں لئے ہوئے
وہ ہیں کہ جورِ حسنِ فراواں لئے ہوئے

شمعِ ستم نصیب بھی دلسوز ہے مری
تھرا رہی ہے "شعلۂ عریاں" لئے ہوئے

مرکز کی سمت روح کی پرواز مرحبا
اُس چشمِ "نیم باز" احساں لئے ہوئے

جلووں کی جستجو میں ہوں آغوش وا ہنوز
نظارگی شوق کا ارماں لئے ہوئے

کیا کیا نمودِ عشق کی اُبھری ہیں داغِ دل
جوشِ شبابِ حسن گلستاں لئے ہوئے

باغِ جمالِ دوست سے آئے ہوائے گل
میں اڑ چلوں کا دوشِ پہ زنداں لئے ہوئے!!

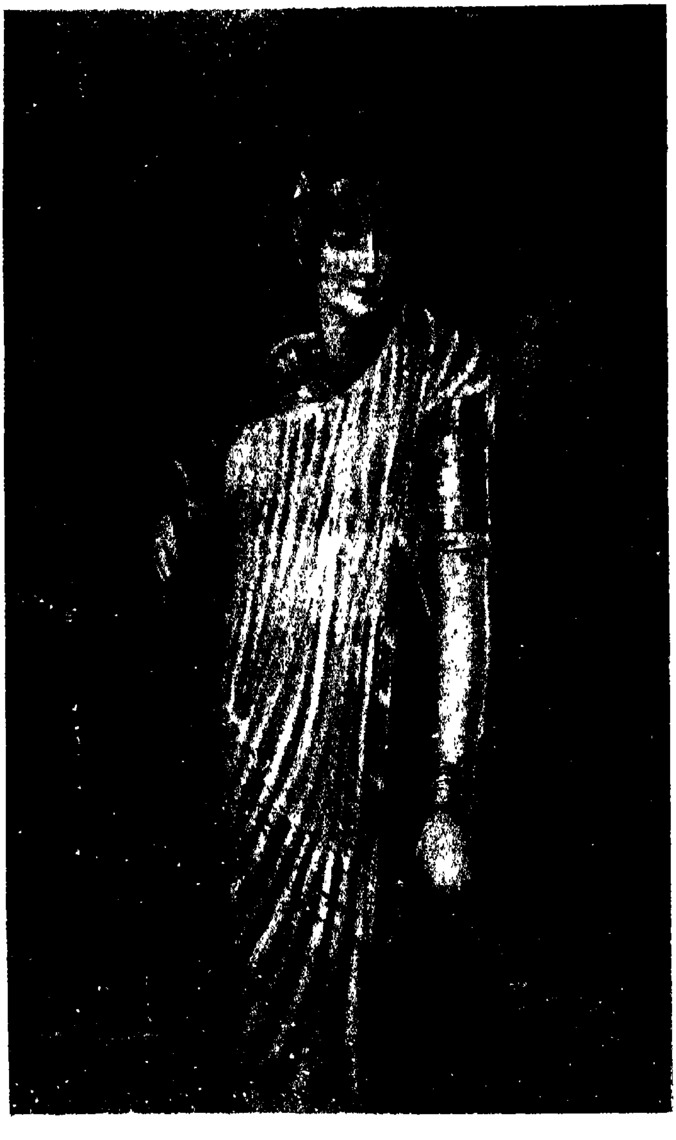
کم مائگی پہ بس نہیں جوشِ نیازِ دل
غنچہ ہوں پھر بھی ہوں چمنستاں لئے ہوئے

یارائے دید کس کو کہ ساقیِ حسن تھا
مستیِ الست کا ساماں لئے ہوئے

وہ دل کہ تھا جو بے خبرِ کیفِ حسن و رنگ
سامانِ صد نشاط ہے پنہاں لئے ہوئے

لائیگی جب صبا خبرِ "جنبشِ نقاب"
ذرّے بھی اُڑ چلیں گے بیاباں لئے ہوئے

حافظ نہیں ہے موت، مگر جانِ زندگی
ہستیِ دردِ ہجر، درماں لئے ہوئے



ندی کنارے

روپ متی کی ٹریجیڈی کا ایک منظر!

مُصنفہ ادیب جلیل حضرت محشر عابدی بی اے

سین، امرناتھ کے مکان کا اندرونی حصہ جو دیہاتی طرز اور سامان سے آراستہ ہے۔ دیا تی بچھی ہوئی کچھ پڑا رہتی ہے۔ امرناتھ گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے —"

روپ متی پتا جی اس وقت بہت پریشان سے معلوم ہوتے ہیں آپ؟

امرناتھ (نہایت مغموم انداز سے) روپا — کیا بتاؤں۔ ایک بہت بڑی مصیبت نازل ہو گئی ہے —"

روپ متی (متوحش و مبہوت ہو کر) کیسی مصیبت؟

امرناتھ شاید تم سنکر تاب نہ لا سکو!

روپ متی آخر بتایئے تو پتا جی (وہ باپ کے بالکل قریب آجاتی ہے)

امرناتھ بیٹی — بیٹی — (وہ صدمہ اور غصہ سے کانپنے لگتا ہے)

روپ متی، کہیے۔ کہیے۔ پتا جی۔ اتنے کیوں بے چین ہو رہے ہیں؟

امرناتھ، مالوہ کے بادشاہ باز بہادر نے تمہارے لئے شادی کا پیغام بھیجا ہے!

(روپ متی کے دل میں یہ خبر سن کر مسرت کی ایک لہر دوڑنے لگتی ہے مگر وہ ضبط سے کام لیتی ہے اور چپ رہتی ہے)

روپ متی، (مصنوعی گھبراہٹ سے) پھر پتا جی — آپ نے کیا جواب دیا؟

امرناتھ، کیا جواب دوں، یہی پوچھنے آیا ہوں؟ یہ سخت ذلت کی بات ہے۔ میں انکار کر دوں گا —

روپ متی، پتا جی — انکار کر دیں گے آپ؟

امرناتھ، اور پھر اقبال کیسے کر سکتا ہوں۔ روپا! بادشاہ مسلمان ہے اور یہ ہمارے دھرم کے خلاف ہے کہ میں تمہیں ایک مسلمان سے بیاہ دوں!

روپ متی (اس جواب سے دل ہی دل میں بے چین ہو کر)۔ ہاں انکار کر دیجئے پتا جی — مگر اس سے بادشاہ کیا خیال کرے گا —!

امرناتھ، کچھ خیال کرے، (رونے لگتا ہے)

روپ متی، آپ میں ان کے مقابلہ کی طاقت کہاں ہے؟

امرناتھ، ہو تو کیا ہوا؟

روپ متی، معلوم نہیں کیسے کہہ رہے ہیں آپ —؟

امرناتھ، مرجانا اس ذلت سے بہتر سمجھتا ہوں —

روپ متی، پتا جی — پتا جی — میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں، میری وجہ سے آپ کو صدمہ پہونچے — یہ ممکن نہیں — تو کیا کروں گی —؟

امرناتھ، کیا کروگی — روپا — کیا کہتی ہو؟

روپ متی، (لڑکی کی وجہ سے باپ کی جان جائے —) مجھے مشکل کر میں کیسے جیوں گی —؟

امرناتھ، اور کیا کر سکتا ہوں اس کے سوا؟

روپ متی، پیغام قبول کر لیجئے — پتا جی — مجھ پر جو مصیبت بنے گی میں جھیل لوں گی — مگر آپ کو اس بڑھاپے میں غمگین نہیں دیکھ سکتی —

امرناتھ، (خفیف ناراضگی سے) روپ — روپ متی — تو میری بیٹی ہے تو امرناتھ کی بیٹی ہے — یہ الفاظ تیری زبان سے سن کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔

روپ متی۔ غصہ نہ ہوں پتا جی — میں آپ کو زندہ اور آرام سے دیکھنا چاہتی ہوں — اور اس لئے جائز اور ناجائز سب کچھ سہنے کے لئے تیار ہوں پتا جی — پتا جی —!

(روپ متی باپ سے چمٹ جاتی ہے اور امرناتھ بھی اسکو گلے لگا لیتا ہے)

امرناتھ، روپ متی — میری بیٹی — تم بھی مجھے سکھ اور شانتی کی دنیا میں پھلتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ باپ کی یہ خواہش کب ہوتی ہے کہ وہ اپنی لڑکی کو بھاڑ میں جھونک دے — مگر۔ مگر بیٹی دھرم کا خیال ہے۔

روپ متی، پتا جی ۔ ایسا کرنے سے دھرم میں کیا داغ لگ جائیگا ۔۔ ؟ دنیا وی رسم و رواج کا نام دھرم نہیں ہے ۔ پتا جی ۔ دھرم تو سب کے دل کے ساتھ ہے ۔۔۔ وہ بھی کوئی انسان ہے ۔ اس کو بھی اسی خدا نے پیدا کیا ہے جس نے ہم سب کو جنم دیا ۔ اس کی نگاہ میں سب برابر ہیں ۔۔۔ یہ دھرم کا امتیاز ہم نے قایم کرلیا ہے ۔۔۔ پتا جی سوچئے تو پھر ایسا کرنے میں کیا ہرج ہے ؟

امرناتھ، (متاثر ہوکر) روپ متی ۔۔ روپ متی ۔۔ تو جھوٹ نہیں کہتی ۔! مگر دنیاوی رسم و رواج کے قانون دماغ پر اس طرح مسلط ہوگئے ہیں جیسے سیاہ بادل صاف آسمان پر چھا جاتے ہیں ۔ اور سارے آسمان کو ڈھک لیتے ہیں اور پھر چاند اور تارے نظر نہیں آتے ۔۔۔ اسی طرح اس رسم و رواج کے دیوتاؤں کا خوف بھی ہمارے دلوں میں ایسا سما گیا ہے کہ وہ اچھی اور بری باتوں میں فرق کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا ۔۔۔

روپ متی، پتا جی ۔۔۔ پھر آپ اس رسم و رواج کے دیوتاؤں کا خوف کیوں دل سے نہیں نکال ڈالتے ۔۔۔ بہادر راجپوتوں نے بھی اسی خوف کو دل سے مٹا کر شہنشاہ اکبر کے ساتھ اتحاد قایم کیا ہے ۔۔۔ پھر دنیا تو ان کو کچھ نہیں کہتی ۔۔۔

امرناتھ، (مستفسرانہ انداز سے روپ متی کو دیکھکر) روپ متی !

روپ متی، پتا جی ، اگر آپ نے انکار کردیا تو وہ دن دور نہیں جب بادشاہ کی فوج سارے شہر کو ویران کردیگی ۔۔ اور میں زبردستی بادشاہ کے محل میں پہونچائی جاؤنگی ۔۔۔ اور صرف میری ایک جان کے لئے ساری آبادی کا خون کیا جائیگا ۔ اور تمام شہر کو بربادی اور تباہی کا منہ دیکھنا پڑیگا ۔۔

امرناتھ، مجھے بھی انکار کرنے میں یہ ہنگامہ محشر اور غارتگری دیکھنی پڑیگی

روپ متی، اور پتا جی ۔۔ میں تو اس دلخراش نظارے کے خیال ہی سے کانپ اٹھتی ہوں ۔ جب بادشاہ کے سوار شہر میں داخل ہوکر مار دھاڑ شروع کردینگے ،

امرناتھ اپنی جان سے زیادہ مجھے اپنی غریب اور کمزور رعایا کی جان کی فکر ہے ۔۔۔ ،

روپ متی، رعایا کی بہبودی کے لئے اس قربانی کو منظور کر لیجئے ،

امرناتھ، تجھے بادشاہ کے گھر بھیجدوں ؟ روپا ۔۔۔ روپا ۔۔ ؟

روپ متی، پتا جی ۔۔۔ سینے پر صبر کی سل رکھ کر مجھے اپنی گود سے جدا کر دیجئے ۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ آپ کے گھر میں پلوں ۔۔ بڑھوں اور دیگر کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے مجھے پیدا کیا گیا ہے اس کے گھر بھیج دی جاؤں ۔۔۔

امرناتھ، باپ کی محبت ۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔ امرناتھ کی محبت اس سے بہت زیادہ ہے ۔۔۔

روپ متی، مگر پتا جی کنیا کو ایک نہ ایک دن ماں باپ سے ضرور جدا ہونا پڑتا ہے ، اور اسے تمام تعلقات اور سب کی محبت کو خیرباد کہکر صرف ایک ہی کے پریم کو من میں بسا لینا پڑتا ہے ۔۔۔ میں بھی ویسی ہی ایک کنیا ہوں ۔۔۔ مجھے آپ کب تک یونہیں بٹھا رکھینگے ۔۔۔ ایک نہ ایک دن دوسرے گھر جانا ضرور ہے ،

امرناتھ، آہ ! روپا ۔۔۔ تیری باتوں میں پرماتما نے معلوم نہیں کہاں کی ذہانت اور فہم بھردی ہے کہ تیرا ہر ہر لفظ اپنے اندر ایک ایک دنیا لئے ہوئے ہے ۔۔ تیری فطرت میں ایک کنیا کی فطرت سے زیادہ جوہر موجود ہیں ۔ تجھے وہ سب کچھ معلوم ہے جو ایک عورت اچھی طرح سمجھدار ہونے کے بعد جان سکتی ہے ۔۔ روپا ۔۔۔ روپا ۔۔۔ تو ایک انمول موتی ہے ،

روپ متی، میں کچھ نہیں ہوں پتا جی ! میری فطرت کوئی انوکھی فطرت نہیں ۔۔۔ ایک لڑکی کی فطرت ماں باپ کی فطرتوں کا نچوڑ ہوا کرتی ہے ۔۔ پتا جی ۔۔ یہ سمجھ ماتا جی کی فطرت سے مجھے ملی ہے اور ذہانت آپ کی طبیعت سے ،

امرناتھ، تیری ہر بات ، روپا دماغ سے نکل کر دل کی گہرائیوں میں اتر رہی ہے ۔۔ میں تجھے ۔۔۔ تجھ جیسی لڑکی کو کیسے ایک پٹھان کے حوالے کردوں ۔۔۔ جس کی فطرت ہماری فطرت سے مختلف ہے ۔ اور تیری فطرت کے بالکل برعکس ہوگی ۔۔۔ اس کا سلوک تیرے ساتھ معلوم نہیں کس قسم کا ہوگا ۔۔۔ اس کے محل میں کئی رانیاں ہونگی جو تجھ سے رشک و حسد کرینگی ۔۔۔ اور تجھے ضرر پہونچانے کی فکر میں رہینگی ۔۔۔ تو وہاں ایک قید کی سی زندگی بسر کرے گی ۔۔ ماں باپ سے شاید ہی مل سکیگی ۔۔ تیری سب سکھیاں چھوٹ جائینگی ۔۔ تو اس قفس میں تو گرفتار پرند کی طرح پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر رہیگی ۔۔ آہ ۔۔۔ روپا ۔۔ روپا یہ باتیں مجھے جب یاد آتی ہیں ۔۔ تو ۔۔ میرا سینہ پاش پاش ہوجاتا ہے ۔۔۔

روپ متی: آپ کا خیال صحیح ہے پتا جی — گر مجھے اطمینان ہے کہ وہ سب سختیاں مجھ پر نہ ہوں گی —— وہ سب تکلیفیں جو عموماً رانیوں کو ہوا کرتی ہیں — میں ان سے محفوظ رہوں گی — گو یہ صحیح ہے کہ مجھے بالکل قفس کی سی زندگی بسر کرنا پڑے گی — اور پتا جی — پٹھان گو حقیقت ایک جاہل اور سخت گیر قوم ہے — مگر سب پٹھان یکساں نہیں ہوتے — اور بادشاہوں کی طبیعت میں تو پہلے ہی سے ایک خاص قسم کی محبت رعایا کے لئے پیدا ہو جاتی ہے — جو اسے رحم و التفات کا سبق پڑھاتی رہتی ہے اور پتا جی —— بادشاہ جو پھول اپنی مرضی سے توڑ رہا ہے — مجھے امید ہے کہ اسے کانٹوں میں فنا ہو جانے کے لئے نہ پھینکدے گا ——

امرناتھ: روپ متی —— میرا دل بھی یہی کہتا ہے — گر رسم و رواج کے بھوت نے مجھے راستی سے بھٹکا دیا تھا ——

روپ متی: تو اب جا کر بادشاہ کے ایلچی کو ٹھہرائیے —— اور اُسے کچھ تحفے اور نذرانہ دیکر روانہ کیجئے —— آپ جاگیردار ہیں —— ممیند رہیں ——

امرناتھ: ہاں اب ایسا ہی کرونگا ——

روپ متی: اس ایلچی نے آپ سے کیا کہا تھا؟

امرناتھ: بادشاہ کا پیغام دے کر مجھے شادی کے متعلق رضامند کرنا چاہتا تھا —،

روپ متی: آپ نے کیا جواب دیا —؟

امرناتھ: میری طرف سے صاف انکار تھا۔

روپ متی: یہ آپنے بُرا کیا —

امرناتھ: گو پرتاب نے مجھے سمجھایا —— مگر غصہ اور پریشانی سے میں نے اس کی باتوں پر زیادہ توجہ نہ کی —،

روپ متی: اب اس کو سمجھا دیجئے —— تاکہ بادشاہ کو ناگوار نہ گذرے —

امرناتھ: ہاں —— اب جا کر ایلچی کو اطمینان بخش جواب دے دونگا ——،

(امرناتھ وہاں سے نکل جاتا ہے — بادشاہ کا خط گر کر وہیں پڑا رہ جاتا ہے — روپ متی دیکھ کر اٹھا لیتی ہے اسے بوسہ دے کر دل سے لگاتی ہے اور آنکھوں پر رکھتی ہے)

روپ متی: آہ —— بادشاہ! پیارے شہزادے —— وہ دن کب آئے گا —— وہ مبارک گھڑی —— جب میں اپنے حیات پرور نغموں سے تیری دنیائے پریشاں کو سکون میں متبدل کر سکوں گی —— تیرے پیارے چہرہ کو دیکھکر میری دنیا پر مسرت کے ابر چھا جائیں گے —— اور —— ہم دونوں مسرور ہو کے ان بادلوں میں گم ہو جائیں گے ——،

(روپ متی کسی کی آہٹ پا کر وہ خط وہیں
پھینک کر چلی جاتی ہے)

(پردہ)

گلزارِ خلیل

منہ پھیر کر جو روٹھ گیا میں۔ وہ من گیا
میرے بگڑنے ہی سے مرا کام بن گیا

دو پھول گل چڑھانے جو وہ گلبدن گیا
میرا مزار غیرتِ گلزار بن گیا

شاید چمن سے لطفِ بہارِ چمن گیا
سودائیانِ عشق کا دیوانہ پن گیا

آگے جب آئینے کے وہ سیمیں بدن گیا
آئینہ رعبِ حسن سے آئینہ بن گیا

نکلا وہ جس طرف سے اُدھر شور یہ اٹھا
پہلو کو تاکتا کوئی ناوک فگن گیا

دیتا ہے کون کس کا۔ پریشانیوں میں ساتھ
نکہت کے ساتھ اُڑ کے۔ نہ رنگِ چمن گیا

کس بھولے پن سے پوچھتے ہیں سب سے بعدِ مرگ
زیرِ مزار کون یہ پہنے کفن گیا

گلشن میں اوس پڑ گئی کیسی بہار میں
گلگشت کو جو باغ میں وہ گلبدن گیا

رُخ پر جو بکھری زلف گرہ گیر غل مچا!
مُلکِ حلب میں نافۂ مُشکِ ختن گیا

میں نے بہار دیکھی کسی نو بہار کی!
وہ عمر بھر نہ سیر کو سوئے چمن گیا

گزرا اگر اں نہ توبہ سے مینا کا ٹوٹنا
ٹوٹا بھی وہ تو لوٹ کے بیمار بن گیا

زلفوں کی لیں بلائیں تو چومے کسی کے لب
تبت کبھی گیا کبھی ملکِ یمن گیا

پیری میں حال پوچھتے ہو کیا شباب کا
وہ دن گئے وہ فصل گئی وہ چمن گیا

سمجھائی ہم نے اس کو زمانے کی اونچ نیچ
دل ڈوبنے کو جب سوئے چاہِ ذقن گیا

کیوں وہ ہوائیں آج بھری اسکے سامنے
کچھ شاخِ گل تنی تھی کہ وہ شوخ تن گیا

اُترے بھی لوگ قبر میں لیکن نہ پایا ساتھ
اک ہم گئے لحد میں ہمارا کفن گیا

آئی صبا کہاں سے کہ دل باغ باغ ہے
چھیڑا کسی نے غنچے کو جو پھول بن گیا

جبتک رہا جہاں میں رہا آن بان سے
جب میں گیا تو ساتھ مرا بانکپن گیا!

لیں زلف کی بلائیں تو جھنجھلا کے یہ کہا
لو آجتک نہ آپ کا دیوانہ پن گیا!

شاید جگہ ملے تری پھولوں کی سیج میں!
جو پھول جس چمن سے گیا خندہ زن گیا

رطب اللسانِ مدح جنابِ خلیل ہیں —— نامِ خلیل ماہرِ فن تا دکن گیا!

بہارِ عید!

ٹھیک اس وقت جب کہ سورج کی شفق آلود کرنیں سطح ارض پر منتشر ہونے والی تھیں۔ آفتاب عالمتاب اپنی آخری منازل طے کر کے محو آرام ہونا چاہتا تھا۔ لیلائے شب کی زلف سیاہ فام کا سایہ افق عالم پر پڑ رہا تھا۔ آسمان پر بادل کے چھوٹے چھوٹے مگر رنگ برنگ کے ٹکڑے ادہر اودہر دوڑتے نظر آتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ گویا کسی رازِ سربستہ کا انکشاف کرنے کے لئے مضطرب و بیقرار ہیں۔ یا کسی نوید جانفزا سے مسرور ہو کر بے چین ہیں۔

ہاں اس وقت جبکہ آبشاروں نے اپنی روانی کے مترنم جذبات میں غیر معمولی جوش پیدا کر دیا تھا۔ چمن میں نسیم بہار، شگفتہ کلیوں سے اٹھکیلیاں کرتی اور گلاب کے دلفریب ہونٹوں اور سرخی مائل رخساروں کو مس کرتی ہوئی محو گلگشت تھی۔ کہ یکایک کچھ دیر کیلئے دنیا پر سکوت طاری ہو گیا۔ . . . . کائنات خاموش فضا میں ساکت ہو گئی . . . . . . ہر متنفس بلند و بالا مقام پر کھڑا ہوا آسماں کی جانب بار بار نگاہِ حسرت اٹھاتا تھا۔ لیکن اس کی نگاہیں کسی آئینہ رُو . . . . پیکرِ حسن جمال کے دیدار کے لئے تڑپ رہی تھیں، اس کا قلب بےچین جگر مضطرب۔ اور دلِ منتظر تماشا تھا . . . . .

آخرکار بعد شوق و انتظار "ہلالِ عید" نیلگون بام فلک سے جھانکا۔ اور کائنات و موجودات عالم کو مسرور کر کے نظروں سے اوجھل ہو گیا . . . . دریا کی لہریں ادائے مترنم و دلربائی کے ساتھ بہنے لگیں۔ جوانان گلشن و شہ زادان چمن انگڑائیاں لے لے کر مسکرانے لگے۔ اور غنچہ ہائے لب بستہ بھی نشۂ شباب سے مست ہو کر جھومنے لگے چمن میں ہر طرف حسن کی فراوانی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شانِ حسن نے گلہائے رنگا رنگ کھلا کھلا کر اس دنیائے آب و گل کو رشکِ بہشت بنا دیا ہے۔ ہر بوٹا رنگ و بو کا مجموعہ اور ہر غنچہ اپنے انوکھے انداز میں مجسم فتنہ نظر آتا ہے۔

شہر میں دھوم دھام اور خلقت کے اژدہام نے بازاروں کی رونق کو چار چاند لگا دیئے۔ ہر طرف عید کی خوشی دل کو سرور اور آنکھوں کو نور پہنچانے لگی۔ الغرض روشنی کی تیاری اور آرائش کی گلکاری سے ہر کوچہ بیت نمونہ باغ بن گیا۔

صبح دم نماز کی تیاری ہونے لگی ہر شخص گلنار۔ گلابی۔ پیازی۔ بسنتی۔ دھانی۔ سبز کاہی۔ ماشی۔ زنگاری۔ نلفلی۔ کشمشی۔ عنابی۔ عباسی۔ کپاسی۔ پستئی۔ زعفرانی۔ سوسنی۔ کاسنی۔ کافوری۔ شربتی۔ صندلی۔ اگرئی۔ سردئی۔ لاگیری۔ آبی۔ کاکریزی۔ سرمئی۔ بینجنی۔ فاختائی۔ نارنجی۔ گیندئی۔ سنہری۔ گل شفتالوی اور قرمزی لباس سے آراستہ اور پیراستہ نظر آنے لگے ادہر گھروں میں عورتوں نے بھی تیاری کی۔ نئی نئی ریشمین لوشاکیں دوپٹے۔ رنگ برنگ آنچل۔ پلو۔ لوٹہ۔ ٹھپہ۔ لچکا۔ لہر۔ گوکھرو۔ بنت اور کرن سے سجائے کرتے اور مشروع۔ گلبدن۔ کمخواب۔ اطلس۔ زری۔ زربفت تمامی کے مشرق مصالحہ دار پائجامہ پہنے اور طرح طرح کے زیور جڑاؤ۔ مرصع کار۔ بالے۔ بالیاں۔ بندے۔ سہرے۔ پتے جھمکے۔ پچلڑی۔ ست لڑی۔ دھکدکی۔ جگنو۔ چمپاکلی۔ موتی بالا۔ موہن بالا۔ نورتن۔ نونگے۔ جوشن۔ بازو بند۔ انگوٹھی۔ چھلے۔ آرسی۔ پری بند۔ علی بند۔ ٹیکا۔ پہنچی۔ جہانگیری

چوبے وتنی۔ توڑے۔ پازیب گھنگروسے مزین، جھماتے اور جھلملاتے ہوئے جواہرات قیمتی ہیرا۔ لعل۔ الماس۔ پکھراج۔ نیلم فیروزہ۔ یاقوت زمرد۔ لہسنیا۔ اور آبدار موتیوں سے بھی سجائی شب سمن نظر آنے لگیں۔

العرض نہایت شان وشوکت اور تزک و احتشام کیساتھ فریضہ نماز ادا کیا گیا۔ واپسی پر حلوائیوں کی دوکان پر غول کے غول مٹھائیاں خرید خرید کر اپنے دولتکدہ کو جانے لگے۔ گھروں میں پہنچکر غل ہوا۔ ماحضر منگاؤ۔ کھانا لاؤ۔ بس حکم کی دیر تھی۔ بڑے بڑے دسترخوان سفید محمودی اور چندیریں بچھ گئے۔ ستھرے ستھرے مخمل و کمخواب کے زیرانداز اور بہتر سے بہتر چلمچی آفتابے ہاتھ دھلانے کے لئے حاضر ہوئے۔ کھانا آنا شروع ہوا۔ شیرمال۔ باقرخوانی۔ گاؤدیدہ۔ گاؤزبان۔ نان ظہیری نان تنک پھلکا۔ چپاتی۔ پراٹھے۔ شامی کباب۔ خطائی کباب۔ گولہ کباب نرگس کباب، کوفتے۔ پسندے۔ بھیجا۔ تکے۔ مرغ مسلم۔ تنکی۔ اور

مچھلی قلیہ۔ قورما۔ شش۔ نمش۔ بکہ۔ یخنی۔ پلاؤ۔ قورمہ پلاؤ۔ مزعفر۔ متنجن۔ قبولی۔ بریانی۔ دست پیچ۔ یاقوتی۔ شیر برنج۔ فرنی۔ فالودہ۔ ورق سنبوسے نانخطائی۔ حریرہ۔ ہریسہ۔ گلتھی۔ مربا۔ حلوہ۔ اچار چٹنی وغیرہ وغیرہ غرضیکہ قسم قسم کے کھانے چن دیئے گئے۔ جن کے بیان سے قلم کے منہ میں پانی بھر آئے۔ اور حلاوت اس کی لذت کی قسم کھائے۔ دن بھر اسی عیش وعشرت میں گذرا۔ شب کو رقاصہ کی فوج خوش وخوش رو۔ پشوازیں ملبوس اور قیمتی جواہرات سے مزین وآراستہ۔ ہر ایک پری۔ سرمہ کاجل۔ مسی لگا مانگ چوٹی سنوار۔ سولہ سنگار سے درست اور زیور و پوشاک سے چست ہوکر جو آئی تو مکان کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دیا۔ کچھ دیر کے بعد گانا شروع ہوا۔ مجلس محو ہو گئی۔ عش عش کرنے لگی۔ ازاں بعد نورانی شب اسی شوکت اور عظمت کے ساتھ ختم ہوئی۔ اور صبح کی سنہری اور جھلملاتی ہوئی کرنیں نظر آنے لگیں۔

نگارش جمیل ←

موسم گلاب

(بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی ایک نظم پر)

(ترجمہ: مسٹر لطف اللہ فرنبستی دہلوی بی اے)

محبوب! یہ موسم بہار ہے! ہر طرف گلاب! گلاب ہی گلاب ہے
—— گلاب پر بہار ہے!
دشت وچمن لالہ زار ہیں! دیکھو غنچے کیسے کھل رہے ہیں! ان کی بتیوں
اور مناروں پر چھائے ہوئے ہیں —— ایک سیل آتشیں کی طرح کائنات
پر محیط ہو گئے ہیں!
گلاب شہد کی مکھیوں کو کیونکر اپنی طلسمی خوشبو کے سنہری دام میں پھنسا رہے
ہیں —— اور ہوا کو اپنی نزاکتیں اور آسائشیں کیونکر ودیعت کر رہے ہیں!

دیکھو! آب رواں میں گلاب کیسے اتراتے ہوئے تیر رہے ہیں گویا

مرصع کار جہازوں کا ایک بیڑہ ساحل سیمیں کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے
گیاہ دشت کے زمردیں فرش پر چاندی کے سیمیں کرنوں کے نیچے
لالہ کے بوٹوں کو دیکھو! آہ کیسا حسین منظر ہے!!
جیسے کسی نوخیز پیکر جمال کی رنگین چادر عروسی!!
جب کائنات گل پوش ہے —— مستور ہے گلاب کے بدن
تو دوں میں —— تو مجھے بھی ایک "تربت گل" میں چھپا دو!
مجھے "شراب گل" میں غرق کر دو
مجھے بھی گلابوں کی ایک چتا پر رکھ کر "آتش گل" میں جلا دو!
—— اور سر پہ "محبت کا تاج محل" رکھ دو!!

محلّات کی عید!

قمر النساء دوڑتی ہوئی سپہر آرا بیگم کے کمرہ میں آئی اور سانس درست کر کے کہنا شروع کیا بیگم صاحب کنیز مجرا بجا لاتی ہے بیگم صاحبہ نے ابھی روزہ افطار کیا ہے۔ ایک تو نازک مزاج اس پر تراوئے کی گرمی تیکھے تیوروں سے کہا! چھوکری کچھ دیوانی ہوئی ہے یا میری چڑھ نکالی ہے آنے دو مغلانی کو چار چوٹ کی مار نہ دلوائی تو تو سہی۔ قمر النساء رسٹ پٹا گئی کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ ساری مسرت کافور ہو گئی۔ لیکن فوراً سنبھلی دوڑ کے آنے کا اضطراب بھی دور ہو چکا تھا دست بستہ عرض کیا۔ "حضور کیا مجال کنیز کی کہ سرکار کی شان میں کوئی گستاخی کرے سرکار اوپر والا دیکھا تھا اس لئے سب سے پہلے حضور کے پاس حاضر ہوئی"

اے ہاں سچ تو ہے۔ آج ۲۹ تاریخ تھی آج کے چاند کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بی قمر النساء معاف کرنا مجھے اس کا خیال بھی نہ تھا پہلے ہی روزہ کھول کے ایسی طبیعت سنسناتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اسی دھن میں تم پر اُلٹ پڑی۔ چلو میں بھی اوپر والا دیکھنے چلوں گی۔ سامان کیا جائے نماز واپس آ کے پڑھوں گی اس لئے کہ ۲۹ تاریخ کا چاند زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتا اور باریک بھی ہوتا ہے۔

اِدھر بیگم صاحبہ اٹھیں بسم اللہ بسم اللہ کی صدائیں ماماؤں خواصوں نے بلند کیں کسی نے مصحف کریم کسی نے آئینہ ہاتھ میں لیا اور یہ حسینوں کی فوج بیگم سپہر آرا کی قیادت میں آفتابی کی طرف خراماں خراماں چلی ایک ہلال کے دیکھنے کو اتنے چاند جمع ہو گئے۔ قمر النساء بلائی گئی کہ بی وہ تمہارے ہمنام کدھر ہیں۔ قمر النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتی ہے مگر چاند دکھائی نہیں دیتا۔ گھبراہٹ سے چہرہ کا رنگ اوڑا جاتا ہے اُدھر یار خواصیں تیار ہی ہیں واہ بی خوب اڑائی قمر النساء تو دن کے وقت تارے دکھائی دیتے ہیں اسے مہینوں سے دیکھا تھا کسی اور نے بھی۔ قمر النساء آنکھیں ملتی ہے اور نگاہیں آسمان سے لگی ہیں ہالوں ہیں دوسروں کی کانوں کا دل کھی پہنچ رہی ہے بولی۔ تم سب نے مل کے مجھے دیوانہ بنا لیا ہے آنکھوں کے نیچے ناک سوجھے کیا خاک۔ سارے شہر میں دھوم مچی ہوئی ہے گولے چل چکے۔ اب آپ لوگوں کو نہ دکھائی دے تو میں کیا کروں!

ایک بولی کہ نہ دکھائی دینے کا الزام تو تم پر بھی آتا ہے۔ اتنا کہنے پائی تھی کہ قمر النساء کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا اور بولی آئے میری آنکھوں سے دیکھئے ایسا کچھ کیا اندھیر ہے کہ ابھی ابھی دیکھے چلی جاتی ہوں اتنی دیر میں ہوا الوپ ہو گیا تم سب کی نوک جھونک نے ذرا مد حواس کر دیا تھا۔ وہ اوپر والا تو اتنا صاف اور نمایاں ہے کہ ہر آنکھوں والا آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ بیگم سپہر آرا مسکرا کے بولیں۔ قمر النساء آج طبیعت بہت بے قابو معلوم ہوتی ہے۔ ایک بات کے جواب میں چار چار سنا رہی ہو چلو ہم سب میں تمہیں آنکھوں والی سہی بقول شخصے اندھوں میں کانے راجہ" قمر النساء نے کہا بیگم صاحبہ میں نے تو ان لوگوں سے کہا تو باتیں بنا رہی تھیں بھلا آپ کی شان میں اور گستاخی بیگم صاحبہ نے فرمایا بی تو کیا میں ان کے تھوڑی کہتی ہوں۔ آنوجی اس مہینہ میں اوپر والا دیکھ کے کیا دیکھنا چاہئے دیکھنا ہر سال ہی ہوتا ہے کہ یاد نہیں رہتا پوچھنا پڑتا ہے۔ توجی نے ایک قلماقنی کو اشارہ کیا کہ نیمچہ پیش کرے اور خود ڈھونڈ کے آئینہ بیگم کے رو دے نگاریں کے روبرو کیا پھر کہا اپنا رخ روشن ملاحظہ کر کے نیمچہ ہلالی دیکھیے" بیگم صاحبہ سے برابر کا مقابلہ تھا۔ ہلال نو سے نگاہیں چار ہوئیں۔ لب لعلیں پر

تخفیف تصور نمایاں ہوا غرضیکہ تھیں بیگم کے دست نگارین آئینہ کے سنے بڑھایا تو آتی سے پیشتر گیا۔ قدما ضمنی سے نیچے نذر گزرانا۔ دہ ہونا تھا ہوئی۔ وہ تھا گھر میں مبارک سلامت کی دھوم مچی۔

نذریں۔ تم سر پر دے کے بعد جو سب نے لونڈی بنائی ہے بیگی۔

آنا میں دو ہی مامائیں خوش نصیب تر گئیں جنہیں تنخواہ فیصد حسب دستور سامنے ہو کے سلامیوں پہ سلامیاں کر رہی ہیں۔ بیگم نے حمد گزار ہے سے فارغ ہو کر تو نصرت کے پڑے دالان میں پہنچیں۔ جہاں چاندنی کے تختوں کا چوکہ لگا ہوا تھا تین طرف ایرانی غالیچوں سے حاشیے اور ایک طرف مسند زرنگار بچھی تھی خاک پاک کی تسبیح ہاتھ میں لئے فتنگان حشر کو جگاتی کبک دری کی طرح طرح خراماں خراماں تشریف لائیں اور زینت محفل ہوئیں سامنے منقل کا سامان اور گنگا جمنی پیچوان بھی ایک طرف لگا دیا گیا۔ اب جوڑوں کے جوڑے پیش ہونے لگے ایک سے ایک اعلیٰ درجہ کا لیکن کوئی پسند نہیں آتا بیگم مسکرا تو رہی ہیں مگر حقیقی مسرت مفقود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نواب حمید حسین خاں صاحب اپنے علاقہ کے بندوبست کے واسطے گئے ہوئے ہیں اور حالانکہ ۲۰۔ ۲۷ رمضان کا وعدہ فرما گئے تھے مگر اب تک نہیں آئے۔ نہ آج تشریف آوری کی کوئی اطلاع تھی۔ ایک مرصع جوڑہ جس میں نورتن جڑے تھے بیگم کو مشکل پسند آیا۔ باقی سامان ہٹا دیا گیا۔ منتظر بلائی گئی مہندی کی فرمائش ہو رہی ہے کہ گھنٹوں کون ہاتھ پاؤں مہندی کے بیٹھے گا نوشابہ نصیرالدین حیدر نے فرمایا اور باغ کی مہندی لگانا نوشابہ نے دو حضور میں کئی ماہ پہلے سے اس انتظام میں مصروف تھی دہلی کے قریب ایک قصبہ ہے فرید آباد وہاں سے بہتر مہندی نہیں ہوتی تھوڑی تھوڑی دو دو ہفتے سے منگا کر جمع کر رکھی تھی اور آج کوئی پندرہ دن ہوئے سب دہلی سے آ گیا ہے بارے پانچ سیر خشک مہندی رہا ہے اور امید ہے کہ عید کے موقعہ پر سوائے بڑی بڑی بیگمات کے پوری نہیں پڑ سکتی۔ بیگم نے مسکرا کے کہا کس وقت آؤگی میرے نزدیک میں تھوڑی دیر میں حاضر ہوتی ہوں اس کے بعد ہی اس سے نپٹ جیسی آج کی بات ہو نا دشواری سے اس لئے کہ تو شہ خانہ کا معائنہ زیوروں کی دیکھ بھال ملبوسات اور انعامات کی ترتیب اور اگر نواب آ گئے تو اور بھی تاخیر ہوگی ابھی یہ جملہ منہ سے نکلا تھا کہ چوبدار نے حاضر ہو کے عرض کیا سرکار تشریف لائی ہیں بیگم کے چہرہ پر فرط مسرت سے سرخی دوڑ گئی اور ایسی تھیں کہ نواب صاحب کا روئے زیبا نظر آیا جو بے قرار ہو کے بالب فرش استقبال کو بڑھیں نواب نے مسکرا کے اپنی شعلہ خواہ بیگم کو دیکھا جس کے حسین چہرہ پر مسرت و شادمانی طاری ہو رہی تھی خوب آئے۔ بیگم نے فرط خوشی سے کہا۔ نہ کیونکر آتا۔ چاہے ملک کا کام خاک ہو جاتا مگر تمہاری ایک گردش چشم۔ تمہارے دل میں یہ صدمے تھے وہ اس سے زیادہ تھا کہ رہ کے عید کا کیا لطف آ سکتا تھا۔ علاوہ کام کی بڑی شدت سے اور کچھ نہ تھا نہیں ہو سکا تمہارے حکم کی تعمیل کو سب پر مقدم خیال کیا اور سب سے آیا۔

بڑی مہربانی۔ بڑی عنایت۔ اچھی نواب یہ مرصع جوڑیوں کا جوڑہ دیکھ آپ کو بھی پسند ہے یا نہیں۔ نواب سبحان اللہ خالی نہ کہدیجئے گا۔ منہ دیکھے کی سند نہیں۔

نواب (قہقہہ لگا کے) ماشاء اللہ تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں خوشامد میں لگا رہتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ مجھ کو تو افسوس ہے کہ تمہاری قدر جیسی ہونی چاہئے مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ خیر خیر اب اسی وقت لباس۔ زیور وغیرہ دیکھ بھال لیا ہے تو بہتر ہے۔ دالان میں نواب و بیگم بیٹھے ہوئے اور فصل کی مناسبت سے نہایت قیمتی ملبوس اپنے اپنے واسطے ایک دوسرے کے انتخاب سے تجویز ہوا۔ خاصہ بردار کو حکم دیا کہ خاصہ چنا جائے انواع و اقسام کے کھانے دسترخوان پر چن دیئے گئے اور حسین جوڑے نے معیت متعدد خواصوں کے تناول فرمایا۔ مہندی لگانے والی بلائی گئی جب تک نواب کچھ علاقہ کا ذکر کریں اتنی دیر میں نوشابہ اپنے کام سے فارغ ہو گئی۔ بیگم کو مسرت ہوئی اور حکم دیا کہ آئندہ سے یہی مہندی استعمال ہوگی۔ شب بیگم کے کمرہ میں بیگم کچھ دیر تک نواب سے ہمکلام رہیں پھر خواب ناز میں مصروف ہو گئیں صبح جس قدر مسرتوں اور دلچسپیوں کو اپنے دامن میں لئے تھی اس کی تفصیل بہت طور آپ رہی ہے مختصراً لکھا جاتا ہے کہ کیا آرائش و زیبائش کیا تزک و احتشام کیا انعام و اکرام ہر چیز میں وہ اہتمام اور وہ انتظام کیا گیا تھا کہ دیکھنے والے محو حیرت تھے سامان سب ہو رہی تھیں جس وقت نماز کے واسطے آخری گولا چلا خبر والے اطلاع کی تو نواب صاحب کی سواری عیدگاہ کی طرف چلی ادھر بیگم صاحبہ محل کی مستورات کو نماز عید پڑھانے کے لئے آ گئیں۔ بعد نماز غول کے غول ملازمین اہل علاقہ ملازمان شاہی منتسبین بیگم صاحبہ و نواب صاحب غرض صبح سے شام تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا اور حسب حیثیت دستور کے مطابق سب کو تحفے اور عطیے مرحمت کئے گئے۔ جس قدر ممکن تھیں وہ سب حاصل کی

گئیں نماز کے بعد عید ملنے والوں کا باہر اور محل دونوں جگہ وقت تھا برابر لوگ چلے آتے تھے۔

آج بیگم سپہر آرا جس فیروزی لباس اور مرصع کار زیور میں ملبوس تھیں اس قدر مناسب تھا کہ ان کے حسن عالم افروز میں چار چاند لگا دیئے۔ نواب نے بھی نہایت بیش قیمت لباس پہنا تھا اور ان کے مردانہ حسن پر لباس پھولا نکلتا تھا۔

یہ کیفیت جس کی تفصیل میں بہت وقت اور فرصت کی ضرورت ہے۔ کوئی والیٔ ملک یا بادشاہ کے یہاں کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک نواب کی محفل کا مختصر خاکہ کھینچا گیا ہے۔ ایسے صدہا گھر خدا کے رکھے شہر میں موجود ہیں کہ جن میں اس سے بہتر ساز و سامان و اہتمام ہے۔ بہر نوع نواب نے بیگم سے اور بیگم نے نواب سے حقیقی جذبات سچی محبت اور تبسم کے ساتھ ہم آغوشی کے لئے ہاتھ پھیلا کے کہا "عید مبارک" اور ان کا جواب محبت کی مہریں تھیں:

اپنی فردوس سے .....

(عالمگیر عید نمبر کے لئے)

گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں پیغام جوانی لائی ہیں — جنت کی ہوائیں آئی ہیں اور مست کر نغمہ چھائی ہیں
اک کیف جہاں پہ طاری ہے اک سیلِ مسرت جاری ہے — اک روح تمنا ساری ہے اک خواب ہے اک بیداری ہے
فطرت نے اُٹھایا سازِ طرب وہ آنے لگی آوازِ طرب — ہر آنکھ بنی غمازِ طرب یہ شانِ طرب اعجازِ طرب
ساون کی پری کچھ گاتی ہے یوں دنیا کو بہلاتی ہے — آوازِ ترنم آتی ہے اور محفل جمتی جاتی ہے
اس بزم میں میں بیگانہ ہوں تیرے جلووں کا مستانہ ہوں — تو شمع ہے میں پروانہ ہوں دیوانہ ہوں دیوانہ ہوں
تو ایسے سمے میں آ پیاری! آ ایسے سمے میں آ پیاری

یہ شام کے رنگیں منظر ہیں کیف آور و شیریں منظر ہیں — گلپوش بہاریں منظر ہیں زرپاش نگاریں منظر ہیں
شب مژدۂ راحت لائی ہے کیا کیف میں ڈوبی آئی ہے — تاروں پہ جوانی آئی ہے اور چاندنی ہر جا چھائی ہے
رنگین فضائیں جنگل کی مستانہ ہوائیں جنگل کی..! — جاں بخش ادائیں جنگل کی فطرت سے وفائیں جنگل کی
یہ عرش کے تارے پانی ہیں یہ نور کے پارے پانی ہیں — موجوں سے اشارے پانی میں پرکیف نظارے پانی میں
ہر فرد بشر کی خاموشی یہ دنیا بھر کی خاموشی — یہ برگ و شجر کی خاموشی یہ پچھلے پہر کی خاموشی
تو ایسے سمے میں آ پیاری! آ ایسے سمے میں آ پیاری

لاہور کی باتیں یاد بھی ہیں ہاں تجھکو وہ راتیں یاد بھی ہیں؟ — وہ داؤ وہ گھاتیں یاد بھی ہیں وہ جیت وہ ماتیں یاد بھی ہیں
کیا یاد ہے شالامار تجھے کیا یاد ہے وہ گلزار تجھے — کیا یاد ہے وہ اصرار تجھے کیا یاد ہے وہ اقرار تجھے؟
راوی کا کنارہ یاد تو ہے وہ شوخ نظارہ یاد تو ہے — وہ حال ہمارا یاد تو ہے وہ خاص اشارہ یاد تو ہے
گر بھول چکی ہے یاد تو کر غمگین ہوں میں دلشاد تو کر — ہر غم سے مجھے آزاد تو کر لاہور کو پھر آباد تو کر!
محفل ہے مگر وہ نور نہیں وہ ڈھنگ نہیں وہ طور نہیں — لاہور میرا لاہور نہیں ہے لب پہ یہی کچھ اور نہیں
تو ایسے سمے میں آ پیاری آ ایسے سمے میں آ پیاری

(غیر مطبوعہ)

(اثر۔ خان شاطر غزنوی)

عالمگیر عید نمبر کیلئے

شہیدوں کی عید!

سحبان الہند حضرت کیفی چڑیاکوٹی

تیغِ عدو گلے پہ بہ طرزِ جدید ہے
اے دوست آج تیری شہیدوں کی عید ہے

اہلِ رضا کیواسطے ہے بیخودیٔ شوق
تیری جو یہ رضا ہے تو ھل من مزید ہے

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لبِ گفتگو ہے بند
یہ راز کھل گیا کہ ہمیں شوقِ دید ہے

اپنے گلے کٹا جو دیئے سرخرو ہوئے
جو راز دل میں تھا وہی رخ سے پدید ہے

بس یہ سمجھ کے جامۂ ہستی بدل دیا
اپنے سے جو قریب ہے تجھ سے بعید ہے

خنجر نہیں پھرا ہے گلے پر شہید کے
دل پر خطِ غلامیِ حق کی کشید ہے

محراب یا ہے شوقِ عبادت کیواسطے
یہ بھی نہیں تو باغِ جناں کی کلید ہے

اپنے جنونِ شوق نے سودا چکا دیا
سر دے کے باغِ خلد کی یعنی خرید ہے

سب کچھ تری رضا ہی ہمارے لئے کریم
ملجائے خلد بھی تو یہ لطفِ مزید ہے

جب دسترس سے روح ہے باہر تو کس لئے
ہستیٔ بے ثبات کی قطع و برید ہے

دامن سے حشر تک نہ چھٹے گا ستم شعار
قسمت کا تیری داغ یہ خونِ شہید ہے

ہم بھی غلام بادشہِ کربلا کے ہیں
کیا غم ہے ہم کو، تو بھی جو رشکِ یزید ہے

دی جان اور بل بھی نہ چتون پہ آسکا
دیکھ اے حریفِ عیش یہ شانِ شہید ہے

کیفی ہیں شانِ حسنِ شہادت کو کیا کہوں
بندہ بھی ہے شہید خدا بھی شہید ہے

طلسمِ البم

از جناب کمال الہ آبادی

پہلی تصویر

شاما دلہن بنی ہوئی ہے۔ بنارس کی ریشمی باریک ساڑی میں گنگا جمنی پھول پتیاں غضب ڈھا رہی ہیں۔ جگہ جگہ سے سڈول جسم کی سنہری رنگت پھوٹی پڑتی ہے۔ چھپا ہوا شلوکہ بتا رہا ہے کہ بدن بالیدگی کے جھولے میں ہے۔ تناسب نشو و نما کے سینہ بہ سینہ ہے اور ہندوستان کی بارہ بہاریں شاما کے لب و ابرو پہ بارہ گرم گرم بوسے دے چکی ہیں گندھی ہوئی چوٹی ناگن بنی ہوئی ہے لہریں لے رہی ہے یا موج شمیم ہے کہ ایک ہی وقت میں متحرک بھی ہے۔ ساکن بھی۔ سرخ موباف کمر پہ کھیل رہا ہے اس کی ہر جنبش رابرٹ فلیشن پہ خندہ زن ہے کہ جب سے یورپ میں لڑکیاں لکھنؤ کے لڑکوں کے سے پٹے رکھنے لگی ہیں نسوانیت کی نزاکتوں میں کچھ کمی سی محسوس ہوتی ہے۔

شاما کی چوڑی پیشانی پہ افشاں چنی ہوئی ہے۔ چاند تارے جڑے ہوئے ہیں۔ صندل اور عبیر کا تلک لگا ہوا ہے جنائی ہے۔ کشادگی ہے ناک میں ہلکی سی نتھ ہونٹوں پر گہرا لاکھا اور کان کے جڑاو جھومر موہے لیتے ہیں

ڈولا رکھا ہوا ہے۔ کہار چست وردیوں اور رنگین صافوں سے لیس ہیں ماں پر جدائی کا اثر ہے کلیجہ مسوس رہا ہے ہجولیاں دلہن کو چھیڑ رہی ہیں چٹکیاں لے رہی ہیں۔

شاما خاموش ہے سکھیوں سے چھوٹنے کا خیال ہے گڑیوں سے جدا ہونے کا ملال ہے بچپن ہے اور بچپن کی سادگی اس کو کیا خبر کہ طفلی اور شباب دو عالم ہیں۔ وہ نہیں جانتی کہ آج اس کی زندگی میں کتنا اچانک کتنا زبردست انقلاب ہونے والا ہے اس کو کیا پتہ کہ بیاہ کا لفظ جادو کی چھڑی ہے۔ کنوارپن دیس ہے۔ بیاہ بدیس ہے چہکتی ہوئی مینا ہوشیار صیاد کے بچھائے ہوئے سنہری جال میں پھنسنے والی ہے۔ گلچین صیاد ہو گئے ہیں

شاما کے لبوں پر تبسم نہیں گمان تبسم ضرور ہے شاید لبوں کی ساخت اس کی ذمہ دار ہو۔ وہ فضا کی نیرنگیوں میں کھوئی ہوئی ہے شباب کی مدہوش [illegible] نہیں۔ طفلی کی بے خبری ہے چہرے مہرے میں سادگی ہے خیالات و جذبات میں سادگی ہے۔ رفتار و گفتار میں سادگی ہے آنکھوں میں سادگی ہے نگاہوں میں سادگی ہے اور ان سادگیوں میں کچھ ہلکی ہلکی سی بے چینیاں ملی ہوئی ہیں کوئی کیا سمجھے خود شاما بھی محسوس تو کرتی ہے مگر جانتی نہیں

دوسری تصویر

ٹھیک بارہ مہینوں کے بعد آج بھی شاما تصویر بنی بیٹھی ہے حسن کی نہیں معصومیت کی نہیں شباب کی نہیں وہ اب بھی تصویر ہے، بربادی کی تصویر، بیماری کا پیکر اور ناتوانی کا مجسمہ کیوں نہ ہو اس کے حسن کے چاند کو چودھویں سے پہلے رسم پرستی کا گہن لگا اور ایسا لگا کہ بدر ہونے سے پہلے ہی ہلال نے جلوہ بیزیاں کر دیں۔ نیا گھر نئے لوگ نئی دنیا وہ بھی سہاگن ہوئی شوہر والی کہلائی مگر طفلی اور طفلی کی تمام شوخی کھو گئی اور لطف شباب نہ ملنا تھا نہ ملا۔ بالیدگی کو صدمہ پہنچا

نشو کو دہکا لگا۔ اور جام لطف نازک لبوں تک پہنچنے سے پہلے ہی کانپتی ہوئی انگلیوں سے چھوٹ کر چور چور ہو گیا۔

فطری توانین اور طبعی آئین کے برعکس وہ یکایک منزل سے جوانی کی کٹھن منزل میں آگئی۔ ہوش نے اچانک بے خبری کی کروٹ بدلوا دی وہ عہد طفولیت میں میٹھی نیندیں سو رہی تھی یکایک لُو کے آتش فشاں جھونکے سے جھلس کر جاگ اٹھی اور ایسی جھلسی کہ پھر ٹھنڈک نہ ملی۔ راحت کی پلک مسرت کی پلک سے نہیں لگی۔

ساون کے دن ہیں ابھی گہرے بادل بھر بھر برس کر کھلے ہیں سنہری شفق چھائی ہوئی ہے ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی ہیں پھر کیسرف آدھی دھنک رنگ رلیاں مچا رہی ہے کائنات رنگین ہے کوئل کی کوکو کلیجہ سے پار ہوئی جاتی ہے۔ پپیہا پی کہاں کی فریاد کرتا ہے، تو شاما بے ساختہ محویت سے چونک کر بیمار پتی کو دیکھنے لگتی ہے۔

ست نرائن اور شاما کی عمر میں پوری پوری پانچ دہائی کا فرق ہے۔ جب وہ بارہ کی تھی یہ ساٹھ کے تھے۔ دھنی ہیں غیور ہیں۔ شاما کو چاہتے ہیں بہت چاہتے ہیں اور شاما بھی ان کی عزت کرتی ہو پرستش کرتی ہے۔ سب کچھ ہے مگر چاہ نہیں سکتی۔ ست نرائن پر آج ۶ مہینے ہوتے فالج گرا ابتک دواؤں کے زور سے چلے جا رہے ہیں نا ؤ منجدھار میں پڑ چکی ہے۔ ڈگمگا رہی ہے اب ڈوبی جب ڈوبی کبھی کبھی نتھنوں تک پانی آجاتا ہے۔

بیمار کے بستر کے پاس ہی ایک چھوٹی سی پلنگڑی پر دو مہینے کی ایک ننھی سی جان پڑی ہوئی۔ یہ ماں کے جگر کا ٹکڑا رتن ہے شاما نے اس کو آدھ موئی ہو کر پایا ہے مگر حالت یہ ہے کہ وہ کمزوری کی اپنا انگوٹھا چوس نہیں سکتا۔ ہڈیوں کا ڈھیر ہے جس پر انسانی جلد منڈھی ہوئی ہے۔

تیسری تصویر

شاما حسرت نصیب شاما، دکھ جلی شاما اپنی گود میں رتن کو لئے بیٹھی ہے۔ ایک ہاتھ نبض پر ہے ایک ہاتھ دل پر ہے ننھے سے دل کی نازک حرکتیں اور ڈوبتی نبض کی ہلکی جنبشیں ماں کی نبض میں غوطے اور قلب میں شدتیں بڑھا رہی ہیں۔

رتن کے پتلے پتلے ہونٹوں پر نیلے نیلے خطوط ہیں۔ آخری ہچکی میں پنکھڑیاں ادھ کھل کر مرجھا گئی ہیں۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ موت کے تبسم میں حیات کی تلخیاں شامل ہیں۔

نبض رک گئی دل سن ہو گیا، ماں جھک گئی۔ شاما کے سوکھے ہونٹ رتن کے گالوں سے ملے ایک آہ سینے سے ابھری اور لبوں میں جذب ہو گئی۔ ایک گرم آنسو پردوں سے ابلا مگر مژگاں میں خشک ہو گیا۔

وہ آہ نہیں کر سکی وہ رو سکی۔ ست نرائن کی حالت بھی بہت نازک ہو چکی تھی شاما کو ہوش نہ تھا وہ خاموش تھی کہ کوکھ کی فریاد مانگ کو نہ جلا دے

ست نرائن کی تمام قوتیں جواب دے چکی تھیں وہ بل نہیں سکتے تھے بول نہیں سکتے تھے۔ مگر بصارت ویسی ہی تھی۔ سماعت ویسی ہی تھی۔ سب کچھ دیکھتے تھے سب کچھ سنتے تھے ممکن ہے کہ فطرت نے اپنا جائز انتقام لینا پسند کیا ہو۔ دیکھنے اور سننے کے اختیار کے ساتھ حرکت اور نطق سے بے اختیاری بڑی گہری اور روح فرسا سزا ہے۔

ست نرائن نے یکایک آنکھیں کھولدیں، نگاہ شاما پر پڑیں جلنی کی ایک مورت دکھائی دی چہرے پر مردنی چھائی ہوئی۔ نظریں رتن پر جمی ہوئیں —— رتن کو دیکھا —— کیا جانے کیا ہوا، جذبۂ پدری نے جوہر دکھائے، شاما کی برباد حالت نے غمازی کی، باحودرتن کی گہری نیند نے باپ کے کان میں کچھ کہ دیا کہ ست نرائن کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اعضا میں چھ ماہ کے کامل سکون کے بعد ایک ہلکی سی تھرتھری پڑی۔ ہاتھ ذرا سے بڑھ کر رہ گئے گویا باپ اپنے بیٹے کو مانگ رہا تھا۔ شاما نے چونک کر چاہا کہ ننھا سا مردہ دیدے۔ مگر ست نرائن کو اس کا رتن پہلے ہی مل چکا تھا۔ شاما نے ایک چیخ ماری گھر کا گھر دوڑ پڑا۔

سب نے دیکھا کہ بے ہوش شاما کا سر پتی کے چرنوں میں ہے پتی برف کی سل اور آنکھوں کا تارا برف کی قاش ہو چکا ہے۔ شاما کی کوکھ بھی اجڑ گئی۔ مانگ بھی جل گئی

چوتھی تصویر

اگربتیاں گلاب کے چھینٹے دے رہی ہیں کوئی لخلخہ سونگھا رہا ہے کوئی تلوے سہلا رہا ہے۔ کوئی پنکھا جھل رہا ہے۔ شاما بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ بے ہوشی کے عالم میں بھی کامل بے خبری نہیں رہتی شاما کی آنکھیں بند تھیں وہ غش میں پڑی ہوئی تھی مگر دل میں پنکھے لگے ہوتے تھے نبض کی جنبشیں تیز تھیں۔ رگیں کسی تکلیف سے کھنچ رہی تھیں چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ کبھی ہلکا بادامی ہو جاتا تھا کبھی سیاہی مائل —— کبھی زرد اور کبھی مٹی کی سی رنگت لب رخسار پر کھنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

آخر آنکھیں کھلیں۔ پتلیاں بے نور تھیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک دنیا تھی مگر وہ کسی چیز کو دیکھ نہیں رہی تھی۔ نظریں کبھی رتن کی طرف جاتی تھیں کبھی پتی کی طرف —— دماغ اپنے پورے کام میں مصروف تھا۔ شادی اور شادی کے بعد کے تمام حادثات، ایک ایک کرکے پورے زور شور سے یاد آ رہے تھے۔

ہونٹ سوکھے ہوئے تھے، آنسو خشک تھے۔ دل رو رہا تھا۔ وہ چپ تھی لوگ شوہر اور بیٹے کو نہلا دھلا کر لے چلے۔ دو دولہا ایک ساتھ بھرے گھر سے روانہ ہوئے باجے بجنے لگے۔ جے ہونے لگی، رام رام ست ہے کے نعرے بلند ہوئے۔ برباد ماں اور دکھیا بیوہ، سہاگن اور دلہن بنکر چلی۔ چال میں لغزش تھی۔ نازکی نہیں، مستی کی نہیں بربادی کی بیکسی کی کمزوری کی —— لڑکھڑاہٹ رکاب میں تھی وہ اب بھی چپ تھی۔

گھاٹ پر پہونچے۔ رسمیں ہوئیں۔ ایک ننھی سی اور ایک پوری چتا بنی۔ خوشبو سلگائی گئی۔ اودی چاندنی کی چادر نے سارے ٹھاٹ کو لپیٹ لیا۔ گھی کا چھڑکا کیا، اشلوک پڑھے گئے باجے اور زور سے بجنے لگے وہ اب بھی خاموش تھی۔

شاما کی نگاہوں میں ان پاک اور وفا پرست دیویوں کی تصویریں پھرنے لگیں جو اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے ستی ہو کر نمائشی تہذیب اور خلاف فطرت بندشوں کے بوجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سبکدوش ہو جاتی تھیں۔ اگر مجبوری، دنیا داری، دکھاوا، اور مکاری کے عناصر سے یہ رسم خالی ہوتی تو شاما کے خیال میں ایسی موت رنڈاپے کی زندگی سے ہزار گنی بہتر تھی۔ دماغ اس قسم کے خیالات کا مخزن تھا۔ مگر آنکھیں چپ تھیں، لب خاموش تھے۔

چتا میں آگ دی گئی۔ پہلا شعلہ بھڑکا۔ شاما تڑپ گئی، لبوں سے دو چیخیں نکلیں اور دونوں آنکھیں ساون بھادوں ہو گئیں۔

پانچویں تصویر

لاشیں جل گئیں، راکھ کا ڈھیر ہو گئیں۔ عناصر نے اپنا اپنا حصہ بانٹ لیا مادہ جتنا تھا اتنا ہی رہ گیا شکلیں بدل گئیں۔ روحوں کو نیا لوک مل گیا۔

شاما کے خرمن ہوش پر بجلیاں کچھ آہ بنکر نکلیں کچھ آنسو ہو کر دھل گئیں کچھ جذب ہو کر دل کی تڑپ بنیں اور کچھ سوز و گداز ہو گئیں۔

فطرت نباض بھی ہے چارہ ساز بھی۔ وقت دمساز بھی ہے تریاق بھی بیمار اور بیکس شاما دن دن سنبھلتی گئی۔ کسی اور کو کیا ہوتی خود شاما کو بھی یہ امید نہ تھی کہ ان زخموں کے بعد وہ زندہ رہ سکے گی مگر وہ زندہ رہی اور ہر نئی صبح فانی دنیا دغا پرور اور کینہ جو دنیا سے دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔

وہ ایک مسافر تھی قافلہ سے چھوٹ گئی تھی حیات کے لق و دق دشت میں اکیلی تھی۔ ہر جگہ دوسرے پاؤں کے نشان تھے کچھ چھوٹے کچھ سچے۔ ہر قدم پر راہوں میں شاخیں تھیں پہلے تو وہ دیوانہ وار دوڑتی پھرتی تھی سنگ راہ سے ٹھوکریں کھاتی تھی ہر پھر کر غلط مرکز پر آتی تھی۔ بالو کے طوفان میں پڑ جاتی تھی۔ تلووں سے بیٹھ بیٹھ کر کانٹے نکالتی تھی اور سوچتی جاتی تھی۔ کہ پر بھو کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ مگر اب نا امیدی نے سکون پیدا کر دیا ہے۔ ضعف سے تسلی ہو گئی ہے، شام غریباں میں صبح وطن کا لطف آنے لگا ہے۔ منزل کا پتہ نہیں ہے۔ نہ ہو۔ اب شاما کو اس کی جستجو بھی نہیں۔ اس کی نگاہ میں نہ تو حیات کا کچھ حاصل ہے نہ مقصود۔ سانس آتی جاتی ہے۔ جئے جاتی ہے

شاما کا بھرا ہوا اپورا جہاز ڈوب چکا ہے۔ تہ نشین ہو چکا ہے طوفان کا زور گھٹتا جا رہا ہے گھنگھور گھٹائیں چھنٹتی جاتی ہیں زندگی کی ناؤ دھارے پر ہے پوری تیزی سے بہی جا رہی ہے بادبان ٹوٹے ہوئے ہیں پال پارہ پارہ ہیں۔ شاما بیٹھی ہوئی ہے نہ ساحل کی آرزو ہے نہ رہائی کی تمنا۔ نہ حیات سے دلچسپی ہے نہ موت کا ڈر۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ تنہا اسی کی کشتی نہیں ان گنت کشتیاں اور بھی ہیں کچھ ڈوبتی ہیں کچھ ابھرتی ہیں مگر سمندر کا جوش و خروش وہی ہے۔ بیکس کو بیکسوں سے تسکین ہوتی ہے۔ مرگ انبوہ بھی ایک جشن ہے۔

شاما کی کشتی اب بھی دس سے بری ہے نو دس سے اچھی کھانے پینے کی چیزیں۔ ضرورت کی اشیا ہر موسم کے لباس اور طرح طرح کے سامان کثرت سے ہیں جن کا اکثر کشتیوں میں پتہ بھی نہیں اگر کوئی نیا طوفان نہ آیا برف کی سلوں سے ٹکر دلگی گرم دھارے نے نہ لپٹا کسی قاتل بھنور نے گود میں نہ لیا تو شاما اور شاما کی کشتی اسی انداز سے بہتی چلی جائیگی۔

ستیہ نرائن وہتی تھے خاندان میں اور کوئی نہ تھا جائداد کوٹھیاں بینک کی جمع جتھا باغ کارخانے اور گاڑی ہوتی تھیں سب شاما کے ہاتھ آئیں۔ کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی ہاں روح کو ایک کمی ضرور محسوس ہوتی تھی اور وہ کمی ان تمام دولتوں سے مٹ نہیں سکتی تھی

چھٹی تصویر

شاما کے رنڈاپے کا چوتھا اور جوانی کا سترہواں سال ہے صدموں کے داغ مٹ چکے ہیں، نشان باقی ہیں۔ زخم بھر چکے ہیں مگر جلد ابھی پختہ نہیں ہوئی ——— ناسور نہیں ہوا اگر ٹھیس برابر لگتی جاتی ہے۔

شادی بیاہ سے وہ خود ہی جان چراتی رہتی ہے بہت کم شریک ہوتی ہے۔ مگر سماج میں رہتی ہے اور زندہ ہے جب کبھی کسی تقریب میں جاتی ہے تو خوشیوں میں حصہ نہیں بٹا سکتی رنڈاپے کی سادگی غضب کرتی ہے۔ سہاگنوں کو جنم جلی کے سایہ سے بچنا آفت ہے۔ بھرے ہوئے زخم انگور ہو جاتے ہیں بھولی ہوئی باتیں نشتر ہو جاتی ہیں

"کیا میں حسین نہیں جوان نہیں میرا جسم سڈول نہیں؟ کیا ریشم مجھ پہ نہیں سجتا ہے بیل بوٹے زیب نہیں دیتے؟ کیا میں جامہ زیب نہیں؟ کیا میرے ہونٹھ اوروں سے گلابی ہیں؟ پھر ان پر لالی کیوں نہیں ہے۔ کیا زیور مجھ پر نہیں سجتے۔ کیا سرمہ کی تحریر میری آنکھ میں خط غبار بن جائیگی؟

آخر میں ان تمام چیزوں سے کیوں محروم ہوں: میری خطا میرا قصور!!

سہاگنیں میرے سایہ سے کیوں بچتی ہیں۔ کیا میں بھی کبھی سہاگن نہ تھی۔ ننھے مجھے دیکھ کر ہمکتے ہیں۔ امنگیں میرے دل میں بھی اٹھتی ہیں۔ میں بچوں کو نہیں لے سکتی میری گود میں نہیں دیے جاتے کیا میرا رتن میرا پھول میرا بچہ نہ تھا؟

اب وہ نہیں ہیں جہاں سے تھے وہیں گئے۔ جس نے دیا تھا اسی نے لے لیا اس بھری پوری دنیا میں ہمیشہ کون رہے گا کس کو اختیار ہے کہ بلایا جائے اور نہ جائے نہ بلایا جائے اور جائے مانگا جائے نہ دے یا دیا جائے نہ لے

پھر میں نے کیا کیا۔ کسی کو زہر دیا، کسی کو مار ڈالا۔ کسی کی چوری کی مجھے کوئی خراب بیماری ہے کہ نہ لگے۔ سب کے سب مجھ سے بچتے کیوں ہیں؟

میں نے سماج کے کارن کیا نہیں کیا؟ جلتی آگ میں کود پڑی پہاڑ سر پر گرے ابرو میلے نہیں ہونے پائے۔ قیامتیں گذر گئیں اُف نہیں کی۔ جو گذری سہ لی۔ لب شکایت کبھی وا نہیں ہوئے۔ اسی سماج کا یہ عالم ہے کہ آج میں قابل نفرت ہوں۔ ایسی کوئی جفا نہیں جو بے قصور بے خطا مجھ پر نہ کی جاتی ہو۔

کونسلوں کے ممبر اسمبلی کے اراکین۔ دردنصیب قومی شاعر نیچ ذات کے ہمدرد، ہند کو غلامی سے آزاد کرانیوالے، ملک میں امن و امان قائم رکھنے والے سوراج کے بھکاری مجھے سب بھول گئے ہیں میری بات

ہیں سب چپ ہیں

یاد رہے جب تک سماج کی غلامی ہے گھر کی حالت برباد ہے۔ سوراج ملے یا آزادی سب بیکار ہے۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے جان بلب مریض جس گھر میں ہیں

سیاسی آزادی کے ہیرے اور موتی اس گھر کو سجا نہیں سکتے جب تک سماجی آزادی نہ ہوگی سدھار نہیں ہو سکتا۔ میل میونی کانفرنس اور ہیضوی میز کی انجمن رنڈاپے کے گھاؤ نہیں بھر سکتی دم توڑنے والے کے لئے آزادی کا جام ہندین زہر کا گھونٹ ہے"

آخری تصویر

شاما کو کچھ کام کاج نہ تھا۔ خالی دماغ میں خیال کے دیو نے قبضہ کر لیا۔ سوچنا سو بیماری کی ایک بیماری ہے پھر سوچ کی بھی حد ہوتی ہے۔ دماغ کہاں تک کام دے۔ کمزوریاں بڑھتی گئیں۔

جسم کا تعلق دماغ سے کتنا ہے کیوں ہے اور کیسے ہے؟ یہ تو ابھی علم النفس والے اور حکمت پرست فلسفی بھی نہیں جان سکے مگر اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ ہے اور بہت گہرا ہے

شاما کو تپ آنے لگی دھڑکن ہوگئی ضعف بڑھتا گیا، بخار ہڈیوں میں سماتا گیا اور چھ مہینوں میں نازنین شاما پہچانی نہ جاتی تھی۔ گالوں کے گلاب مرجھا گئے۔ ہونٹھوں کی پنکھڑیاں کملا گئیں

وعدہ برابر آگیا۔ سماج کی قربانگاہ پر شاما نے دم توڑ دیا۔ دیکھ لیجئے یہ آخری تصویر ہے جو بھارت کی سماجی تاریخ میں آتشین نقش بنکر چمکتی رہے گی۔

صبح کا وقت ہے شبنمی دھندلکے کی چادر پھیلی ہوئی ہے نسیم دبے پاؤں چل رہی ہے۔ شاما کے کمرہ میں ستاٹا ہے مگر نرم تکیوں کے سہارے وہ ایک صاف ستھری اور سفید بستر پر سو رہی ہے بند آنکھوں کے غلاف طلسمی البم ہیں زندگی بھر تصویریں ایک ایک کرکے جلوہ پذیر ہوتی ہیں اور مٹتی جاتی ہیں۔

شاما کئی دن اور کئی راتوں کی جاگی ہوئی ہے آنکھ لگ گئی ہے، نیند ہے یا موت ہے کون جانے کون بتائے۔

سماج کی دلہن اپنی بہار کے شباب میں ہے دنیا کا دھندا ویسا ہی جاری ہے۔ کوئی فرق نہیں رنڈاپے کی جو کلیہ تک شاما کی دمساز تھیں آج اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سماتیں۔

تہذیب کے آنسو نہیں رکتے۔ معاشرت کے دل کی دھڑکن کم نہیں ہوتی۔ مذہب تصویر حسرت ہے اور فطرت کے مجروح دل میں ایک نیا گھاؤ پڑ گیا ہے۔

نگارش مبیل ←

"تیرا تحفہ!" — (بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی ایک مرصّع غزل)

میرے لئے صندلی مہندی مت لاؤ!

میرے محبوب مجھے وہ خاک پاجمع کر لینے دے جسے تو نے شرف خرام بخشا ہو وہ ذرات خاک میرے لئے زر گل سے زیادہ ہیں

مجھے قند و شکر کے سفوف شیریں یا قیمتی پیالے درکار نہیں — تیرے ہاتھوں میں کئے ہوئے جام سفالی کا ایک قطرہ میرے لئے "اولمپس" کی شراب الوہیت سے زیادہ ہے۔

تیرے خوان کرم کے ریزے میرے لئے لذیذ ترین طعام ہیں مجھے کنول کے اس ہار کی ضرورت نہیں جس میں مشک و نیم بدمشک پھول گوندھے گئے ہوں اور جنہیں صبح کے چاند نے بیدار کر دیا ہو!

میرا دل وحشی تیرے نقوش پا سے ایک ایسی سرمدی مسرت محسوس کرتا ہو — ایک ایسی تسکین جو "خواب حیات" کی لذتوں سے زیادہ ہے۔

میرے لئے سمندروں کی تہہ سے نادر الوجود موتی مت لاؤ!

مجھے گوشہ ہائے عالم کے ناممکن الحصول جواہر درکار ہیں!

میرے محبوب! میرے لئے یہ سب سیم و زر ہیچ ہیں — فرقت

— تیرے ایام رفتہ کا سوگ اور گرم گرم آنسوؤں کا راز میرے لئے تیرا بہترین تحفہ ہے۔

(مترجمہ ظفر قریشی دہلوی ﷺ)

ترجمان القرآن

از

مولانا ابوالکلام آزاد

جس کا کئی سال سے انتظار تھا۔ تیار ہے۔

جلد اوّل ساڑھے پانسو صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ ۷۶ صفحات میں مقدمہ اور فہرست مضامین وغیرہ ہیں پھر ۴۱ صفحے سورہ فاتحہ کی تفسیر کے ہیں جو قرآن کے مقاصد و مطالب کیلئے مقدمہ تفسیر کا کام دیتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں و سہل سے سہل پیرایہ میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کی تعلیم اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں نمایاں ہو جائے۔ اب کسی انسان کیلئے جو اُردو میں لکھی ہوئی عبارت پڑھ سکتا ہے یہ عذر باقی نہ رہیگا۔ کہ وہ قرآن کو اس حد تک نہیں سمجھ سکتا جس قدر قرآن چاہتا ہے کہ ہر شخص اسے سمجھ لے۔

کتاب سوپر رائل کی بڑی تقطیع پر چھپی ہے اور ۳۴ پونڈ کا کاغذ لگایا گیا ہے۔

ہدیہ بلا جلد ۴ے مجلد چرمی مع

پنجاب کے ایجنٹ

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

رویت ہلال!

از جناب فضل حق قریشی (دہلوی)

اب سے دور ہماری بڑی بوڑھی عورتوں نے یہ عجیب، رسم بنا رکھی تھی کہ ہر نئی نویلی دلہن پہلا رمضان اپنے میکہ میں کرے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ طریقہ زمانہ حال کی "سایہ پوش خواتین" کی جماعت میں رائج نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس گھرانے میں ایک آدھ بڑھیا ٹھڑیا جس کو عرف عام میں دقیانوسی خیال کی عورت کہا جاتا ہے۔ سلامت ہے اس وقت تک اس رسم کی پابندی کی جائیگی۔ اور یہ سلسلہ قائم رہے گا تا وقتیکہ ممالک مغرب کی حیاسوز تہذیب اس سایہ پوش جماعت کو ایسے "جامہ" میں ملبوس نہ کر دے جس کا کوئی الٹا سیدھا نہیں ہوتا۔ خدا کرے ہمیں وہ تمدن کبھی نصیب نہ ہو۔ جس کے صرف زوال ہی پر تعمیر کردار کا انحصار ہے یہ تھی تانتی جو کچھ بھی کہے کم ہے۔ لیکن یاران نکتہ داں خوب جانتے ہیں کہ ان بڑی بوڑھیوں کی ہر بات میں کچھ نہ کچھ مصلحت ضرور ہوتی ہے —— چنانچہ ہماری "بھابی جان" کو بھی ٹیڑھی مانگ نکالنے اور اونچی ایڑی کا جوتا پہننے کے باوجود ۲۹ ماہ شعبان کو اپنے میکہ جانا پڑا۔ کیونکہ اللہ رکھے ان کے سر پر بھی پندرہ بیس نہیں تو کم از کم تین چار ایسی عورتیں موجود ہیں جن کے سر بگلوں کی طرح سفید ہو چکے ہیں۔ بھابی جان نے مغربی طرز اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن وہ ہندوستانی رسوم کو بھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں اور یہی ان کی "برخوردارانہ ذہنیت" کا ثبوت ہے۔

سارا رمضان اپنے میکہ میں گذارنے کے بعد عید سے دو تین یوم قبل ہر ایک دلہن کو سسرال میں واپس آنا پڑتا ہے۔ تاکہ عید کا چاند ساس نندوں کے ساتھ دیکھے۔ وہ عورت سہاگن ہی نہیں سمجھی جاتی جو خیر سے برس کے برس دن بھی اپنے خاوند کی خوشیوں میں شریک نہ ہو —— لہذا بھابی جان کو بلانے کے لئے چھوٹے دیور کو بھیجا گیا اور تاکید کر دی کہ ڈولی والوں کو ساتھ لے جانا اور بھاوج کو سوار کرکے اپنے ساتھ لے آنا لیکن وہ اللہ کی بندی ہر کام بڑے ٹھسے سے کرتی ہے۔ جب تک غریب کہار دو چار گھنٹے دروازہ پر چیختے چیختے ہلکان نہ ہو جائیں۔ ان کا بناؤ سنگار ختم نہیں ہوتا۔ اس پر اگر ساس نے ذرا زبان ہلائی۔ اور اتنا کہہ دیا کہ آجکل کی لڑکیاں کیسی بے سری ہو گئی ہیں بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ صبح کا بلاوا اور دوپہر کو گھر سے نکلیں۔ زوال کے وقت سسرال جاتے ہوئے دہم نہیں آتا —— تو جناب ہر سننے والا یہی کہے گا کہ ساس بیچاری بیٹی غریب پرائی جائی پر ظلم توڑتی ہے اور بس۔

انتیسواں روزہ تھا۔ بھابی جان دالان میں بیٹھی چھپا چھپ اپنے دوپٹے کی سرگاہ میں کنارہ ٹانک رہی تھیں۔ کہ بارہ بجے کی توپ چلی آواز پران کے کان کھڑے ہوگئے۔ اور باورچی خانہ کی طرف

اس سے پیشتر کئی مضامین "بھابی جان" کی عنوان سے رسالہ ساقی میں لکھے جا چکے ہیں۔ ممکن ہے قارئین کرام کی نظر سے گذرے ہوں گے۔ بہرحال یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

پلٹ کر کہنے لگیں۔ ـــــــ اُٹے آپا جان . . . . . آپا جان؛ تم نے سنا۔ بارہ بج گئے ہیں۔ لاؤ پانی میں چاند دیکھ لیں" . . . . . اری کنیزہ! او کنیزہ! سنتی نہیں مرِدار۔ کہاں مر گئی برس کے برس دن بھی کو سنے کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ دن بھر ٹھُر ٹھُر دِنگے پن کے سوا تجھے اور کچھ ہے۔ ذرا کونڈے میں پانی بھر کر صحن میں رکھ دے ہم چاند دیکھیں گے"!

ملازمہ نے کونڈے میں پانی بھر کر رکھ دیا۔

اس کے بعد بھابی جان۔ انکی نند۔ دیورانی۔ جیٹھانی۔ یہ۔ وہ۔ تو۔ میں۔ چھوٹے بڑے۔ بچے۔ بالے سبھی دوڑ پڑے، اور پلک جھپکاتے میں صحن کے وسط میں "گول کونڈا کانفرنس" کا پہلا اجلاس شروع ہو گیا۔ ہر ایک سر ہی کوشش کر رہا تھا۔ کہ قریب پہنچکر سب سے پہلے میں چاند دیکھوں۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک وقت میں کونڈے پر بہت سارے سروں کا ایک سائبان بن گیا۔ اور اب پانی میں آسمان کا عکس نظر آنا مشکل تھا۔ چاند کا تو ذکر ہی کیا ہے

بھلا بھابی جان سے کس طرح سمائی ہوتی۔ جھلا کر ایک تھپڑ فیضو کے کلے پر رسید کیا جو ان کی نند صاحبہ کا ولیعہد تھا۔ بھلاؤ بھاوج کی اس "دست درازی" کو کب برداشت کرتیں۔ تڑخ کر بولیں۔ بس بی بس۔ آئندہ میرے بچے کو ٹیڑھی نگاہ سے بھی نہ دیکھنا۔ لے دے کے یہی ایک چھونسٹوا نظر آتا ہے وہ بھی لوگوں کی نگاہوں میں خار بنکر کھٹکنے لگا۔ جب تمہارے ہاں بچے ہو جائیں گے تو پیار دلار ان کے ساتھ کرنا۔ ایک کا گلا صبح کو گھونٹنا اور ایک کا شام کو۔ اول تو معصوم بچوں کو مارنا کس خدا نے بتایا ہے۔ پھر وہ بھی دوسروں کے جن پر کسی کا زور واعیہ نہیں ہوتا۔ لیکن تمہارا وطیرہ ہے کہ ہر وقت میرے ہی بچے کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ اٹھتے جھڑتے بیٹھتے لامت۔ کوئی گھڑی چین ہی نہیں ہے۔ میں خرن کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں کہ خواہ مخواہ مفت خدا میں فساد بڑھے گا۔ لیکن تم کو خیال ہی نہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے۔ کہ اگر ہم نے اُف بھی کی تو ایک کے چار چار لگا کے میاں کے کان بھر دیئے جائیں گے۔ اسکے نے یوں کہا تھا۔ ڈھینکے نے یوں کہا تھا

اور . . . . .

نند صاحبہ کی زبان کا توسن بے لگام اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا اور بھابی جان بھیگی بلی بنی بیٹھی تھیں۔ اسی لئے لڑائی بہت پھُس پھُسی رہی کیونکہ صرف ایک طرف سے الفاظ کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور فریق ثانی نے کانوں میں تیل ڈال رکھا تھا گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ یا یہ خیال ہو گا کہ کتیا بھونک رہی ہے۔ بھونکنے دو۔

بس جناب کیسا چاند وائد۔ تمام مزا کرکرا ہو گیا۔ ایک تھوبڑا سوجا کر کونے میں بیٹھ گئیں۔ دوسری اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پلنگ پر دراز ہو گئیں۔ بچوں کو موقع لگا۔ وہ پانی گھنگولنے لگے۔ اس خیال سے کہ شاید ایک آدھ ٹوٹا پھوٹا چاند ہمارے بھی ہاتھ لگ جائے تو کھیلنے میں آئے گا۔

اسی روز شام کے پانچ ساڑھے پانچ بجے میں بھابی جان کے گھر گیا۔ وہ باورچی خانہ میں بیٹھی دہی بڑے بنا رہی تھیں اور ان کی نند صاحبہ گاؤ تکیہ سے کمر لگائے اس طرح سوجی اپھری بیٹھی تھیں کہ گول میز کانفرنس سے گاندھی جی کو کچھ نہ ملنے پر وہ بہت ناراض ہیں۔ اور دل ہی دل میں ہندوستان کے واسطے ایک لائحہ عمل تیار کر رہی ہیں جس سے یہ موٹے فرنگی دو دن میں اپنی لنگوٹی سنبھالتے بھاگتے نظر آئیں۔

رذیلوں کو ہنسا دینے میں مجھے خاص ملکہ حاصل ہے۔ چنانچہ میرے عجیب و غریب طرز سلام ہی پر ان کی ہنسی دُرک سکی۔ لیکن پھر بھی ایک انداز رعونت سے جس کے جراثیم ہر عورت میں پائے جاتے ہیں۔ کروٹ موڑ کر منہ پھیر لیا۔

بھابی جان نے دوپہر کی تمام رام کہانی سنا کر مجھ سے کہا آج تم آپا جان کو مناؤ۔ تو پیٹ بھر کر مٹھائی کھلائیں گے۔ انہوں نے چاند نہ دیکھنے کی قسم کھالی ہے

اب میرا تخاطب بجائے بھابی جان کے ان کی نند صاحبہ کی طرف ہو گیا۔ جو ایک رشتہ سے میری نواسی اور دوسرے لحاظ

سے ممانی ہوتی ہیں۔ میں نے کہا۔ کیوں بی۔ یہ کونسی انسانیت ہے کہ لڑائی ہو بھاوج سے اور چاند نہ دیکھنے کی قسم کھالی۔ اس غریب معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ قسم کھانے والا ہمیشہ دروغ گو سمجھا جاتا ہے۔ پس واجب آیا کہ توڑ ڈالو قسم اپنی کو اور چلو اوپر کوٹھے کے واسطے دیکھنے کے چاند کو۔ ورنہ کرو یقین اے مسلمان بہنوں اور بیٹیوں! کہ ہوگا نازل ایک عذاب شدید اوپر تمہارے سروں کے۔ جو توڑ ڈالے گا۔ گردن تمہاری کو پس سمجھ لو کہتا ہے جو کچھ سمجھانے والا۔ پیشتر اس کے کہ آئے آواز کان میں کہ گذر گئی فلاں عورت اور افسوس نصیب نہ ہوا اس کو دیکھنا چاند عید کا ...."

وہ زیر لب مسکرا رہی تھیں۔

میں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "خیال تو کرو۔ آج بھابی جان جیسی کنجوس عورت نے مٹھائی کھلانے کا وعدہ کیا ہو اس موقعہ کو غنیمت سمجھو۔ ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آدھا سا تمہارا رہیگا۔ ساری مٹھائی میں خود نہیں کھاؤنگا۔ لو چلو تھوک دو غصہ کو۔ جانے بھی دو۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ خطا بے شک بھابی جان کی تھی۔ تم بالکل بے قصور ہو"

غرض اسی قسم کی سینکڑوں باتیں بنا کر ان کو مسلمان کر لیا۔ اور وہ میری خاطر یا لطف مٹھائی کے لالچ میں اوپر چلنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ بھابی جان بھی کڑھائی چھوڑ چھاڑ اوپر جانے لگیں۔ اگرچہ وہ بظاہر خوش معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن یقیناً پچھتا رہی ہونگی کہ آج بیٹھے بٹھائے دو روپے لگ گئے۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آج ان سب کو بے وقوف بناؤنگا چنانچہ اوپر جاتے ہی آسمان پر نظر ڈالکر کہا۔ "اوہ! کس قدر صاف ہے گویا تیس کا ہے" اور یہ کہتے ہی مصنوعی طور پر دعا مانگنی شروع کر دی۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَشْهَدُكَ ...... تم کو نظر نہیں آیا ...... فَلَمَّا رَاَیْتَ الْهِلَالَ بَازِغًا ...... وہ ہے سامنے ...... وَاٰیَةُ اللّٰهُمَّ اللَّیْلُ ...... ہاں۔ ہاں ادھر .... رَبَّنَا عِیْدُ الْفِطْرِ یَوْمُ السَّعِیْدُ ۵ ...... صاف تو نظر آرہا ہے۔ ...... بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔ وہ دیکھو"

مجھے چاند دیکھنے کے بعد کی دعا یاد نہیں تھی۔ جلدی جلدی جملے بناتا جاتا تھا۔ اور زور زور سے کہہ رہا تھا۔ تاکہ وہ بھی سن لیں کہ دراصل چاند ہو گیا ہے۔ اردو کے فقرے بیچ میں اسلئے بولے تاکہ اس وقفہ میں دوسرا جملہ عربی کا تیار کر لوں اور بس۔

بھابی جان کچھ پوچھنا چاہتی تھیں مگر خاموش ہو گئیں۔ اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آخر ممانی صاحبہ نے دریافت کیا "کدھر ہے چاند؟ ہمیں تو نظر نہیں آیا" "مجھے دکھائی دیا" بھابی جان نے تائید کی۔ میں نے لاپرواہی سے جواب دیا "ارے کمال ہو گیا۔ اتنا صاف ہے لیکن آج تک کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ خدا معلوم کیا بات ہے کہ تم لوگوں کو نظر نہیں آتا۔ وہ ہے۔ سامنے۔ میری انگلی کی سیدھ میں۔ دیکھو۔ وہاں چیل اُڑ رہی ہے۔ نہیں نہیں اس طرف۔ یہ گڈی بھی ہٹنا۔ ہاں! اس کے بالکل قریب۔ ذرا اوپر کو۔ اوہو تم تو نیم کی طرف دیکھ رہی ہو۔

"پھر کس طرف؟" دونوں نے تنگ آکر مایوسانہ لہجہ میں کہا۔

لاحول ولا قوۃ! کہہ تو رہا ہوں۔ وہ شیر کی شکل والا بادل کا ٹکڑا ہے نا۔ بس اسے غور سے دیکھو اسی کی دم کے قریب ہے۔ بس وہیں وہیں۔ ذرا اس طرف کو ...... تھوڑا اور ادھر"

بھابی جان ہنسنے لگیں لیکن یہ ہنسی کھسیانی تھی۔

اے نہیں دکھائی دیتا نہ دکھائی دے بھاڑ میں جائے" ممانی صاحبہ نے جل کر کہا "کیا چاند دیکھے بغیر عید نہ ہوگی۔ سو میں سے دو چار ہی کو نظر آتا ہوگا۔ ہم نہ دیکھیں گے تو کیا ہو جائیگا ...... چلو بی چلو نیچے چلیں" اپنی بھاوج کو آستین کھینچتے ہوئے کہا۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہ پرسوں۔ کبھی نہ کبھی خود نظر آجائے گا۔ اس کے بغیر گاڑی تھوڑی ہی اٹکی رہے گی"

"ذرا ٹھیرو تو سہی۔ ایسی بھی کاہے کی جلدی ہے۔ کیا چولہے میں لکڑی دبا کر آئی ہو" بھابی جان نے جواب دیا۔ پھر میری طرف کچھ ایسے انداز سے دیکھا کہ گویا انکی خاموشی زبان گویا سے یہ کہہ رہی تھی کہ "لِلّٰہ خدا کے واسطے! ہمیں بھی چاند دکھا دو۔ تم کو دعائیں دیں گے"

چنانچہ میں نے کہا۔ "اچھا ایک آنکھ بند کر دو" بھابی جان نے

ایک آنکھ بند کرلی تو میں نے اپنا ہاتھ ان کی دوسری آنکھ پر رکھ کر پوچھا —— "اب دکھائی دیا" —— انہوں نے اپنے خاص نسوانی لہجہ میں تنک کر جواب دیا "چل مردار! دور رہو کالا منہ تیرا۔ اتنی دیر سے ہمیں الو بنا رکھا ہے۔ آج چاند نہیں ہوا ورنہ یقیناً نظر آجاتا"

وہ زینہ پر سے اترنا چاہتی تھیں۔ کہ ایک دم "دھائیں" سے گولہ چھوٹنے کی آواز سنائی دی اور ڈنکہ بھی بجنے لگا۔ بیساختہ بھابی جان کی زبان سے نکلا۔ "چاند ہوگیا" اور وہ دوبارہ اوپر آکر آسمان پر نظر دوڑانے لگیں۔ ابھی دو تین ہی لمحہ گذرے ہوں گے کہ انہوں نے چلا کر کہا۔ وہ رہا۔ اسے ٹھیک تو ہے۔ چاند تو ہوگیا ہماری آنکھیں پھوٹ جائیں تو کسی کا کیا قصور ہے۔

تھوڑی سی دیر میں ممانی صاحبہ بھی چلا کر بولیں۔ ہاں! ہاں! مجھے بھی نظر آگیا۔ واقعی ہی کس قدر صاف ہے دونوں نند بھاوجوں نے دعا مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھائے دعا مانگی اور "مبارک مبارک" کہتی ہوئی نیچے چلی گئیں۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا اسرار ہے کیونکہ شروع میں محض ان کا مذاق اڑانے کے لئے میں کہہ رہا تھا کہ چاند ہوگیا۔ ورنہ درحقیقت مجھے چاند نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے بہت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر مطلع صاف نظر آیا وہ تو خدا کا کرنا اچھا ہوا کہ دونوں نند بھاوجیں نیچے جا چکی تھیں ورنہ میری بدحواسی کو دیکھ کر وہ اصلی مطلب تاڑ جاتیں۔ خواہ مخواہ میرا مذاق اڑتا اور واقعات بالکل الٹی صورت اختیار کر لیتے۔ میں نے دیوار کی کنگنی پر پاؤں رکھ کر نیچے بازار میں نگاہ ڈالی۔ بعض لوگ چاند دیکھ کر دعا مانگ رہے تھے اور بعض دوسروں کو انگلی کے اشارے سے چاند دکھا رہے تھے۔ میں نے دوبارہ نظر ڈالی۔ غور سے دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ تمام آسمان پر اندھیرا چھا گیا اور وہ وقت آن پہنچا جبکہ پہلی رات کا چاند غروب ہو چکتا ہے

بھابی جان نے نیچے سے آواز دی۔ "اب اٹاری پر سے اترو گے بھی یا نہیں۔ کب تک چاند کا دیدار کیا جائے گا رات ہونے کو آئی"۔ میں نیچے اتر گیا۔ دو چار ادھر ادھر کی باتیں بنا کر گھر کی راہ لی۔ اور اپنے مطالعہ کے کمرے میں جا کر دم بخود بیٹھ گیا۔

کمرے کی تمام فضا خاموش اور تاریک تھی —— یکایک میری نگاہ دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر پر پڑی۔ حد درجہ اندھیرے کے باوجود اس کے نقش ونگار صاف نظر آرہے تھے۔ دونوں ابرو بہت منور تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دو **ہلال** پہلو بہ پہلو چمک رہے ہیں۔ میں نے اپنے کور چشم دل کو ملامت کی کیونکہ وہ چاند کی تلاش غلطی سے سطح آسمان پر کر رہا تھا۔ درانحالیکہ وہ خود میرے ہیں موجود تھا ع

ہلال عید کیا ہے ایک تصور تیری ابرو کا

آج عید کا دن ہے۔ لوگ زرق برق پوشاک پہن کر شہر کے باہر عید گاہ جا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہیں ہر شخص "مسرور و شاد" نظر آرہا ہے —— اور کیوں نہ ہو۔ سال میں ایک مرتبہ یہ دن نصیب ہوتا ہے

جب تاریک رات خاموش فضائے عالم پر اپنا سکہ جما چکے گی تو میں چپکے چپکے اسکے پائیں باغ میں جاؤں گا۔ لاکھوں حسرت و ارمان سے میرا دل معصوم لبریز ہوگا۔ اور پوشیدہ طور پر سہی لیکن اس سے ملاقات ضرور ہوگی۔ میری تمناؤں کا کنول کھل جائے گا میری مسرتوں کا اندازہ لگانا مشکل ہوگا اور کیوں نہ ہو سال میں ایک مرتبہ یہ دن نصیب ہوتا ہے۔

مجھے عید کی خوشی شام کو باغ کے تاریک کونے میں میسر ہوگی ع

عید گاہ ما غریباں کوئے تو
انبساط عید دیدن روئے تو

نوٹ:۔ بھابی جان نے ابھی تک مٹھائی نہیں کھلائی۔ قارئین کرام فرمائیں کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

خط و کتابت ناظرین کرام



ہلالِ عید سے خطاب

(عید نمبر کیلئے)

اے ہلالِ عید! اے سرمایۂ عیش و نشاط — تُو ہے دُنیا کے لئے وجہِ سُرور و انبساط
لیکے دُنیا کیلئے آیا ہے تو پیغامِ عید — تیرے ہاتھوں میں ہے درہائے مُسرت کی کلید
وا جو تُو نے کر دیئے آج آ کے بابِ انبساط — ہوگیا ہر نقطۂ امکاں کتابِ انبساط
دامنِ دل داغِ حرماں سے معرا ہوگیا! — قیدیٔ زندانِ غم غم سے مُبرا ہوگیا
پڑتے ہی کرنیں تری آج اے آفتابِ انبساط — ذرہ ذرہ ہوگیا صد آفتابِ انبساط
مٹ گئی یُوں ظلمتِ حرماں تری تنویر سے — جیسے ہو معدوم شبنم مہر کی تنویر سے
اک نظر ڈالی جو تُو نے سُوئے سازِ انبساط — ہوگیا نغمہ سرا نغمہ نوازِ انبساط
ان ترنم ریزیوں سے وہ اٹھا جوشِ سُرور — جس کو دیکھو وہ نظر آتا ہے مدہوشِ سُرور
آہ! لیکن میں ہُوں سابق کی طرح باچشمِ تر — ان ترنم ریزیوں کا کچھ نہیں مجھ پر اثر
آج بھی ہے میرے لب پر نوحۂ ادبارِ قوم — آج بھی تڑپا رہا ہے مجھ کو حالِ زارِ قوم!
کُل جہاں ہے شاد میں ہُوں وقفِ ماتم صبحِ عید — یعنی ہے میرے لئے "شامِ محرم" "صبحِ عید"
اے ہلالِ عید! اے سرمایۂ فرح و سُرور! — رہتی ہے میری دُعا بابِ قبولیت سے دُور
بارگاہِ قُدس سے نزدیک ہے مسکن ترا — تُو ہی پُہنچا دے وہاں تک میری اتنی التجا

یا الٰہی قوم کی برگشتہ قسمت پھیر دے!
یا الٰہی! قوم کی گُم گشتہ شوکت پھیر دے!!

محمد امیر اللہ آسی رام نگری

مفتاح العلوم شرح مثنوی مولانا روم

فارسی ادب کی اول تصنیف حضرت مولانا روم کی مثنوی کو جو قبولیت و شہرت دنیا کے ہر حصہ میں ہر مذہب میں حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں مسلمانوں میں اس کتاب کی یہاں تک عزت ہے کہ اسے فارسی کا قرآن کہا جاتا ہے

مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ، عیسائی و دیگر مذاہب میں بھی اس کتاب کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ دنیا بھر کی تمام کتابوں میں یہی ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کو خاص شوق سے مطالعہ کرنے والے ہر ملک و ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ ہر مذہب کے صوفی خیال لوگ اسکی صوفیانہ کلام کو پڑھکر لطف حاصل کرتے ہیں۔ پیر اور بزرگ واعظ اپنے وعظ کو مصنف کی تصنیف کو مثنوی کے پڑھتے ہوئے اشعار سے مزین کرتے ہیں۔ پرانے فیشن کے راسخ العقیدہ لوگ اور نئی فیشن کے آزاد خیال لوگ سب کے لئے مثنوی شریف قابل قدر اور قابل مطالعہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے کہ جس کے عاشق فقیر بھی ہیں درویش و صوفی بھی ہیں۔ عالم و فاضل بھی ہیں۔ امیر و غریب بھی ہیں۔ رئیس و جاگیردار اور نواب بھی ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے شخص بھی ہیں کہ جو خود تو پڑھ نہیں سکتے۔ لیکن کسی سے پڑھوا کر کمال شوق سے سنتے ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں جبکہ فارسی کو پڑھنے اور اس کو سمجھنے اور اسکی تشریح کرنیوالے لوگ خال خال نظر آتے ہیں۔ مشتاقان مثنوی کو مثنوی شریف کے رموز و نکات کو حل کرنے کیلئے کسی لائق شخص کی تلاش میں سرگرداں و حیران ہونا پڑتا ہے۔ ہم نے بصرف زر کثیر

اس کتاب کی شرح کو نہایت عظیم الشان پیمانہ پر

شائع کیا ہے جو ایسی عمدہ اور اعلیٰ طرز پر لکھی گئی ہے کہ جس کو مطالعہ کر کے ہر ایک مطلب سب کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ جسکو ہندوستان کے عالموں فاضلوں صوفیوں لیڈروں اور مشہور اخباروں نے مثنوی کی تمام قدیم و جدید شرحوں سے اعلیٰ و عمدہ و بہترین تجویز کیا ہے۔ شرح کی بیشمار خوبیوں میں سے قلت جگہ کی وجہ سے صرف چند خوبیاں درج ذیل کی جاتی ہیں جنکو پڑھ کر آپ بآسانی اسکی عمدگی کا اندازہ لگا سکیں گے۔

(۱) مثنوی شریف کا اصل فارسی شعر جلی قلم سے نہایت خوشخط بعض بعض اعراب دیکر لکھا گیا ہے۔
(۲) مشکل الفاظ کی لغوی و اصطلاحی تشریح وضاحت کیساتھ لکھی گئی ہے۔
(۳) ہر شعر کی صرفی نحوی ترکیب جامع اختصار کیساتھ لکھی گئی ہے۔
(۴) ہر شعر کے اندر علم معانی، علم بیان، علم بدیع کے جو نکات مضمر ہیں۔ انکو ظاہر کر دیا گیا ہے۔
(۵) ہر شعر کا ترجمہ اس خوبی کیساتھ کیا گیا ہے کہ تحت اللفظی بھی ہے اور بامحاورہ بھی۔
(۶) ہر شعر کا مطلب قرآن و حدیث و اقوال ائمہ کے حوالہ جات سے مفصل و مکمل طور پر لکھا گیا ہے۔
(۷) مثنوی کے ہر شعر کے مطابق تمثیلاً مشہور شعراء کے صوفیانہ اردو اشعار لکھے گئے ہیں۔
(۸) شرح کے حاشیہ پر اکثر اشعار کے مطلب کا خلاصہ لکھ دیا گیا ہے تاکہ کسی مضمون کی تلاش میں وقت ضائع نہ ہو۔
(۹) ہر حصہ کی شرح میں ایک ایسی جامع فہرست مضامین لگائی گئی ہے جسکو مطالعہ سے ہر ایک مضمون کو دیکھا جا سکے۔
(۱۰) لکھائی چھپائی کاغذ بہترین اور اعلیٰ لگایا گیا ہے۔

مندرجہ بالا شرح کی دس خاص خوبیوں میں اصل کتاب دیکھ کر آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکیں گے کہ یہ شرح کس قدر اعلیٰ اور مفید و عمدہ ہے۔

پس آپکا فرض ہے کہ اس شرح کو دیکھنے کیلئے ہر ایک شخص اس کو منگوا کر مطالعہ کرے۔ کسی سکول کی، کسی کالج کی، کسی شہر کی، کسی قصبہ اور کسی گاؤں کی لائبریری اور کسی رئیس و امیر و غریب کی گھر کی لائبریری اس کتاب سے خالی نہیں رہنی چاہیئے **قیمت** جو اس کی خوبیوں کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے درج ذیل ہے۔

حصہ اول بلا جلد ۶؍ حصہ دوم ۶؍ حصہ سوم ۶؍ حصہ چہارم ۶؍ حصہ پنجم ۶؍ **مجلد** جس پر سنہری حروف میں کتاب کا نام درج ہے علیحدہ علیحدہ فی حصہ ۸؍ حصہ اول دوم یکجا **مجلد** چھ روپے (۶) حصہ سوم چہارم یکجا مجلد چھ روپے (۶) حصہ پنجم علیحدہ **مجلد** تین روپے چار آنہ (۳؍۴)

پانچوں حصوں کے خریداروں کو سوانح مولانا روم از مولانا شبلیؒ اور ترانہ اسلام مفت دیا جائیگا۔

منگوانے کا پتہ: محمد حفیظ اللہ قریشی تاجر کتب مالک قریشی بک ایجنسی (ع) کشمیری بازار لاہور

سپاہی عورت کا عیدی خط!

فوجی محبت نامے اپنے

ہم کو گلشن میں گلوں کی دید کیا؟ ہم تو سپاہی ہیں ہماری عید کیا؟

ایک غیر آباد ساحلی مقام سے
عید الفطر کی صبح ۱۹۳۲ء

خوش قسمت بارلی!

عید کا مسکراتا ہوا سلام قبول کرو!

آؤ ——— پہلے میں تمہیں آج کی مبارک صبح، مسلم قوم کی بہترین مسرور اور مقدس صبح، دل کھول کر عیدی دعائیں دے لوں! ——— رب المشرقین المغربین تمہیں ایسی ایسی ہزارہا عیدیں دیکھنی نصیب کرے، تمہارے دل ——— مضبوط، بہادر دل میں خدمت وطن کا خیال اور قوم و ملت کی محبت روز افزوں ہو، تمہاری چمکدار تلوار ہمیشہ غنیم کی تلواروں سے بلند اور درخشاں رہے، اور تمہارے کشادہ سینے پر فوجی تمغوں کی اک لڑی لگ جائے مختصر یہ کہ ؎

اے جان جہاں تجھے مبارک
ہمدم! تجھے عید ہو مبارک!!

مگر پیارے بارلی، ——— ادھر دیکھو! میری طرف ———! مجھ دور افتادہ کی طرف! ——— آج کی صبح ——— آج جبکہ اسلامی گھروں پر اک متبسم راحت، اور دل نشین سرور چھا رہا ہے، روزہ داروں کے پژمردہ چہروں پر کھلی ماندی امید جلوہ گر ہے ——— میں ——— تمہاری مہجور مجبور سہیلی ——— اپنے اداس کمرے میں، دریچے کے پاس مغموم بیٹھی، وطنی یادوں میں گم ہے! ؎

ایک وہ ہیں جو مناتے ہیں خوشی عید کے دن
ایک ہم ہیں کہ بہے آنسو کی جھڑی عید کے دن

صبح سے پھرتی ہے آنکھوں میں وطن کی تصویر
لب پہ آتی نہیں بھولے سے ہنسی عید کے دن

میری روح، میرے دل، میری زبان پر بس اک نالہ ہے یعنی کاش، تم یہاں ہوتے! یا میں خود وطن میں ہوتی! ہائے ؎

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب
عید کے دن، جس کو غربت میں وطن یاد آ گیا!

اک تو وطن سے دوری غضب، اس پر لمحہ دری جدائی ستم! اور عزیزان وطن کی یاد قیامت ہے! آہ ——— آج عید الفطر کی پاکیزہ مسرتوں سے لبریز، اور مقدس خوشیوں سے معمور صبح، تم سب مجھے کس کس طرح یاد آ رہے ہو! میں کس کس کو یاد کروں، کسی پہلو قرار نہیں آتا! کبھی تمہارا خوبصورت وجیہ چہرہ یاد آتا ہے، کبھی جستوتی کی بھولی بھالی شکل نظروں میں پھرتی ہے، کبھی پیارے گھر کے خوبصورت اور آشنائے راز قدیم کمروں کی یاد تڑپاتی ہے، تو کبھی کھلے ہوئے خوبصورت مر بوبر آمدے یاد آ جاتے ہیں ——— مجھے آج کسی پہلو قرار نہیں! ——

کوثر کسی کا قول بجا ہے درست ہے
غربت میں روز عید محرم سے کم نہیں!

آج میں ان ننھے ننھے پرندوں کو بڑی حسرت سے تک رہی ہوں جو میرے دریچے کے باہر ہواؤں میں آزادی سے اڑتے پھرتے ہیں! اگر چند گھنٹوں کے لئے اک خوش رنگ سبک رفتار چڑیا بن جاتی، تو محبت کا راگ گاتی رہتی، کیا تم یقین کرو گے، کہ دوپہر تک وطن پہنچ جاتی؟ تم ——— سب عزیزوں کو گلے لگاتی، اور پھر غروب آفتاب سے پہلے، وطن سے دور کر

گھر جیسے والے سمندروں کو عبور کرتے اونچے اونچے پہاڑوں پر سے ہوتے ہوئے یہاں واپس آجاتی! پر آہ، میرے پر کہاں ہیں ——— آج تم اپنے شیریں گھر میں ہم مذاق رفیقوں اور محبوب دستوں کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا رہے ہوئے جبکہ میں ——— ہجر نصیب میں، سیاحی کی تکالیف سے نالاں، سفر کے مصائب سے پریشان، وطن سے دور گھر سے ہزارہا میل کے فاصلے پر ایک غیر آباد ساحلی چٹان پر اپنی قسمت کو رو رہی ہوں! ہارلی، ہم سیاحوں کی عید ہی کیا؟ ؎

پردیس میں عید آئی تو کیا ہو کوئی دل شاد؟
رہ رہ کے ہر اک گام پہ آتا ہے وطن یاد!
احباب و عزیزوں کی ہے تصویر نظر میں
اتنا کبھی گھر یاد نہ آیا تھا سفر میں
عید آئی ہے اور ہم ہیں غریب الوطن افسر!
کیا خوش ہوں کہ یہ وقت ہے کچھ بوجھ سا دل پر

میں بھی کیسی دیوانی ہوں! مجھے نہیں چاہتے، کہ آج تمہیں مغموم کروں ——— ہارلی، مجھے بھول جاؤ، ایسا نہ ہو، کہ ایک غریب الوطن سیاح کی یاد تمہیں بھی تڑپا دے! آؤ ——— اب کچھ دوسری باتیں کریں!

ہائیں، تم بھی عجب شریر ہو، تم میرے شوقِ سفر کا مضحکہ اڑانے ہو اور گویا قہقہہ لگا کر لکھتے ہو کہ میں ماہ صیام میں سفر محض اس لئے کرتی ہوں کہ روزہ مجھ پر شرعاً معاف ہو جاتے! کیونکہ سفر میں روزہ نہ رکھنے کا مذہبی لائسنس لے! مجھے بھی تمہارے اس فقرے پر بڑی ہنسی آئی! سچ تو یہ ہے۔ کہ آدمی جیسا خود ہوتا ہے ویسا دوسروں کو سمجھتا ہے یہ تو فرمایئے، کہ گزشتہ سال جو آپ عین عید کے ایام میں تبدیل آب و ہوا کا عذر تراش کر جنوبی افریقہ تشریف لے گئے تھے اور گویا روزوں سے چھٹکارا پاکر وطن سے دور چلے گئے تھے اور عین عید کی صبح واپس آگئے تھے تو آپ کب قابل معاف تھے؟ ہارلی، شیشے کے محلوں میں رہ کر دوسروں پر پتھر نہیں پھینکنے چاہئیں! ؎

خوب کرتے ہو بہانے تمہیں ہم جانتے ہیں
کوئی جانے یا نہ جانے تمہیں ہم جانتے ہیں

مگر میرا سفر، تمہارے تفریحی سفر سے بالکل مختلف ہے! چونکہ میں نے پردیس کو دیس، سفر کو گھر بنا لیا ہے اور بارہ مہینے ادھر ادھر موسمی ہواؤں کی طرح پھرتی رہتی ہوں اس لئے میرا خیال ہے کہ میرے لئے روزہ رکھنا فرض ہے اور مجھے سفر میں روزہ نہ رکھنے کا مذہبی لائسنس نہیں مل سکتا! میں تم سی بے چین روح نہیں ہوں، بندہ خدا، تمہیں کیا خبر، کہ ہم نے ریگستانی آتشی گرم ممالک میں تیس تیس روزے کس مزے سے رکھے ہیں! ہارلی ——— سچ تو یہ ہے کہ جو شخص روزہ نہیں رکھ سکتا وہ کبھی "افضال اشغال من الناس" کے زریں اصول کو نباہ نہیں سکتا! ایثار نفسی صبر اور تحمل اس کی فطرت میں پیدا نہیں ہو سکتے! پروردگار سے میری تو دلی دعا ہے کہ وہ تمہیں ایثار نفسی اور غربا نوازی کی توفیق عطا کرے، ویسے تم بہت اچھے آدمی ہو، مگر میری دعا سونے پہ سہاگے کا کام کرے گی!

دیکھو میں نے بہت سا وقت ضائع کر دیا۔ خط ختم کرنا چاہتے! وقت کم ہے اور آج ہی ہوائی ڈاک (ایرمیل) سے یہ خط بھیجا جا رہا ہے تاکہ عین عید کے تیسرے یا چوتھے دن ——— یوں کہو باسی عید دن میں مل جائے!

انشاء اللہ میں یکم مارچ ۱۹۳۲ء کو پورٹ توفیق سے نکلوں گی اور بہت جلد وطن پہنچوں گی تم سب کو دیکھوں گی! فی امان اللہ

جب کسی سے عید ملنا یاد کر لینا ہمیں! "



عید

شگفتہ گلاب ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سالہا سال سے کھلا ہوا ہے اور اس لئے امتداد ایام کے ہاتھوں اپنا رنگ روپ کھو بیٹھا ہے ایک شاخ پر فارسی شاعروں کی محبوب خوش نوا موسیقار بلبل اپنا سر بازوؤں میں دیئے اس ادائے غمناکی سے بیٹھی تھی گویا اس کے لئے دنیا میں دلچسپی کا کوئی سامان ہی نہیں ہے۔ دریا کی روانی کا اندازہ اس ڈوبنے والے کی طرح ہو چلا تھا جو بے پناہ موجوں کے مقابلہ میں اپنے دست بازو کے اعتراف شکست کے بعد بیکسی کے عالم میں بہا چلا جاتا ہو۔ —— الغرض ساری کائنات اپنی یکسالہ جد و جہد کی وجہ سے واماندہ و خستہ ہو گئی تھی، اب ساغر میں بادۂ ابتہاج کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی تھی!

گلاب کے پھول نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا ——

"یک نغمہ روح افزا!" —— نیلگوں آنکھوں والی بلبل چلائی —— "یک جرعہ جان پرور!!" —— موجوں نے ذرا سر اٹھایا اور کہا —— "ہاں ایک نغمہ فسوں انگیز!!" —— زمین کے سینہ سے صدا آئی —— "کیف روح افزا و جان پرور!!" —— دست و جبل صدائے بازگشت سے گونج اٹھے، —— "یک نغمہ روح افزا!" —— "یک جرعہ جان پرور!!" —— "کیف روح افزا و جان پرور!!!"

یکایک —— سلسبیل کی موج اٹھتی ہے، رحمت کا فرشتہ نمودار ہوتا ہے —— طلبگاراں فرخنائی کے "زخم آرزو" پر مژدہ نو کا "مرہم کافوری" رکھتا ہے کشتگان یاس کو نئی زندگی کا نوید دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ

"لطف الٰہی، عالم قدس کے پھولوں کا عطر اور آبحیات کا جام نشاط و شادمانی لئے، عید کے بھیس میں آتا ہے!"

گلاب کا پژمردہ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ دریا کی موجیں از سر نو تنازع للبقا میں سرگرمی دکھانے لگتی ہیں دور سے فاختہ کی پیاری آواز سنائی دیتی ہے —— "انگلیاں سرو اٹھاتی ہیں کہ وہ آتے ہیں!" —— بلبل اپنے پر جھاڑ کر کہتی ہے، —— شوق سے گل کھلے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں!! —— ذرہ ذرہ سے آواز آتی ہے کہ —— "وہ آتے ہیں!!!"

لالہ رخ شفق خیر مقدم میں نچھاور کرنے کے لئے گل حمرا سے بھری ٹوکری لئے سر راہ گذر نمایاں ہوتی ہے آفتاب طلائی بربط کے ترنم سے خواب و خیال کی دلفریب وادی کو مرتعش کرتا۔ اپنی خوبصورت رتھ پر جسے سفید و سیاہ دو حسین پرند کھینچ رہے تھے بیٹھا قوس قزح کے پل سے گذرتا جشن عید منانے کے لئے —— مغربی سمت —— رنگ محل کی طرف —— چلا جاتا ہے۔

اس سرزمین میں جہاں کے پھولوں کا کھلنا تبسم کا منبع، کلیوں کا چٹکنا قہقہہ کا خالق ہے حوران جادو جمال نے اس نشاۃ جمیل کی آمد پر لباس نور رشک طاؤس نگاریں رو کش مرغ زریں بدلے

بہشتی پھول طرۂ شب رنگ لیلتہ المعراج گیسوؤں میں لگائے، سرمگین تحریر کو مار سیاہ بناکر دل رُبا خونین نگاہوں کے ترکش میں تیروں کو زہر آلودہ کرنے کے لئے رکھا ——— ان میں سے ایک نوخیز و طناز سرمست صہبائے ناز تنقید و تبصرۂ حسن و جمال کی غرض سے آئینہ کے سامنے آتی ہے ——— ایک بیخودی ہے جو چھا جاتی ہے! ایک حیرت ہے جو طاری ہو جاتی ہے!! ——— عالم ربودگی میں نورانی سلائی جو ابھی تک سرمگین ہاتھ ہی میں تھی، چھوٹ کر گر پڑتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے، ——— شاید یہی ہو ——— ہلال عید!

چمن زمردیں فلک میں جو داغ خورشید سے سونا پڑا تھا۔ لولیانِ اختر نے خوانِ جواہر الوان لگائے محفل عیش و طرب رچائی ——— بالآخر ——— اطمینان و سکون کا یہ مظاہرہ جمیل سرور کا یہ ہنگامہ نشاط، سرود کی یہ پری بزم "زہرہ" کے سحور کن اور دلکش تانوں پر جاکر ختم ہوئی اور ان مناظر شعری پر دامانِ سحر کا اختتام کن پردہ گرا ——— اس کے ساتھ ہی ایک ایسے نئے باب کا آغاز ہوا جس میں ان سارے گذرنیوالے مناظر کا اعادہ عالم ناسوت سے وابستہ تھا اور یکسر دنیائے تمثیل!

اُفقِ مشرق سے ایک ہلکا سا سیمیں غبار اٹھتا ہے

نکہت نسیم عنبر بار و عطر آگین کے جلو میں "ملک صبح" گیسو میں موتی پروئے آتی ہے مرغان خوش الحان چہچہاتے ہیں، گل تازہ کھلتے ہیں، بلبل اپنی نازک منقار سے اس دور فرحناک پر برگِ گل بکھیر کر گلپاشی کی رنگین رسم ادا کرتی ہے، دماغ کی ساری فضائیں خوشبوؤں سے مست ہو جاتی ہیں اور بے کیف نگاہوں کی سادگیاں رنگینیوں سے مدہوش، زمین جو زمین شعر کی طرح رنگین ہو گئی تھی والہانہ رقص میں مصروف ہو جاتی ہے شاخ گل "دست رقاصہ" کی طرح ایک دل آویز ادا کے ساتھ لرزش و جنبش میں آجاتا ہے، ساری فضا وجد کرنے لگتی ہے، ہر رگِ حیات میں زندگی اور پر مسرت زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے ——— ناگہاں ——— سرمائی آفتاب نورانی عشووں اور لطافت بار جلوؤں کا ایک طوفان لے کر نمودار ہوتا ہے ——— پھولوں کو، ذروں کو، مختصر سارے موجودات کو اپنی دلکشا تنویر سے بارونق غسل دے کر حسن و جمال کا بازار گرم کر دیتا ہے!

پھر ——— انسانی سیلاب رنج و محن کے خس و خاشاک کو بہاتا، کام و دہان بلکہ ہر طلب کو ایک مخصوص اور نئی لذت سے آشنا کرتا بڑھتا ہے، اور ملأ الاعلیٰ کی گندی ہوئی واردات کی رنگینی میں عشرتوں کو گرداب تکمیل میں غرق کر دیتا ہے

اے کہ مصحف رخ تو سجدہ گاہ آتش پرستاں! اے کہ ابروے کج قبلہ کفر گزنیاں ——— فدیت لک! ——— کیا تجھے معلوم ہے، تو اور ساری دنیا ان مناظر کے نقوش قدم پر چل رہی ہیں جو ابھی گذرے ہیں، ہاں ان حرکتوں کے اعادہ میں مصروف ہے جو ابھی ختم ہوئی ہیں؟ ——— یہ صحیح ہے تو ——— میں تجھے بتاؤں ——— ابھی ایک کمی ہے جسے میں اور تو ہی پورا کر سکتے ہیں ——— ذرا اپنے حافظہ کو کہہ تیری نگاہوں سامنے گذشتہ شام کا وہ نظارہ پیش کر دے ——— جب کہ ——— بہار نشاط کی آمد کا قاصد پے خجستہ طائر زریں پر و بال اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلائے اڑتا ہوا فضائے ہدف انظار میں پہنچا تھا! ——— تو نے نہیں دیکھا اس وقت ——— "نور و ظلمت" باہم مصروف معانقہ تھے؟ ——— پھر ——— تجھے اغماض کیوں ہے؟ ——— آ! اس تشنۂ تکمیل حصہ کو انجام سے ملا دیں!! ———

"رسم دنیا بھی ہے موقعہ بھی ہے دستور بھی ہے"!



معرکۂ محبت

باہر! عالم تنہائی۔ شام کی خون آشامی۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں سلسلۂ ہمالیہ کی برف آلود چوٹیوں میں برچھی بھالوں کی طرح منعکس اور درۂ خیبر کی تاریکیوں میں بجلی کے قمقموں کی طرح منور و تاباں —— فضائے افغانستان۔ مائل بہ سکون و آرام۔

اندر! محشرستان شور و غل — بے پروا زندگی۔ آزاد لوگ پلتھیاں مارے۔ گاؤ تکیوں کے سہارے ڈھولک لئے بیٹھے ہیں —— بیٹھے کیا بلکہ شراب۔ کباب۔ حقہ، سگرٹ۔ ہنسی مذاق اور بے سُرے ترانوں کو کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ شمالی ہندوستان کی سرحد کے آوارہ گرد۔ مفسد اور آزاد منش بیفکروں کا مجموعہ۔ افغانی۔ بلوچی۔ اور تاتاری بھلے آدمیوں سے بدمعاشوں کی تعداد زیادہ۔ گذشتہ گناہوں کی توبہ خواہی کے برخلاف جدید گناہوں کے ارتکاب کی طرف مائل اور ان کی جدتِ اختراع میں سرگرداں —— شتربان۔ کاروان سالار۔ چابک سوار۔ گھوڑوں کے سوداگر۔ گرہ کاٹ سب ہی تو جمع تھے۔ ان کے علاوہ انگریزوں کی دیسی فوج کے چند سپاہی بھی —— اور حضرت کرم خان خود بہ نفس نفیس اس کاروان سرائے کے مالک حقیقی، ایک انگریزی ساخت کی بوسیدہ آرام کرسی پر دراز، اپنی توند پر ہاتھ پھیر پھیر کر کھانا تحلیل کر رہے تھے۔

اپنے سرپرستوں کے مجموعۂ خرافات پر ایک بار غنود آلود نظریں ڈالکر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ ان کے احساس تخیل کو گونہ مسرت ہوئی اور ایک غیر اختیاری طور پر ان کے منہ سے نکلا "سبحان اللہ! کس قدر خوشگوار مقام ہے اور کیسی پُر مسرت زندگی!"

اس کو یہ زندگی واقعی پسند تھی —— پسند تھی بھنے گوشت کی خوشبو۔ مصالحہ اور تمباکو کی خوشبو —— پسند تھا چولھے سے اُبلتے دھوئیں کا گھٹاؤ۔ دقیانوسی لیمپ کا متعفن گیس۔ مانس گند کے بھبکے۔ سب کا متفقہ طور پر پیدا ہونا۔ اُٹھنا۔ اور نیچی چھت سے ٹکرا کر وہیں کے وہیں منڈلانا —— پسند تھا مشجر صورتوں کا نظارہ۔ چکنے چپڑے۔ چیچک رو۔ داڑھی منڈے۔ دراز ریش۔ خوبصورت بدصورت۔ سُرخ و سپید اور گندمی —— پسند تھا پُرشور آوازوں کا ترانہ جو مختلف نالیوں۔ بارکوں اور کاروان سڑکوں کی خبروں کے متعلق خوب نمک مرچ لگا کر ایک دوسرے سے بیان کرنے میں ناگوار موسیقی پیدا کر رہا تھا۔

زبانیں دفعتہً بند ہوگئیں جبکہ پوری قوت و جبروت کیساتھ ان ڈراؤنے الفاظ کی آواز سب پر غالب آئی "خاموش! او زبان بے لگام"

کہنے والا اٹھا۔ اور وہیں کھڑا ہوگیا —— پورے چھ فیٹ کا تنومند۔ شہ زور نوجوان۔ سراپا کسرتی رگ پٹھے۔ سُرخ بانا تی وردی سے ملبوس۔ سارا سینہ زرق برق تمغوں سے آراستہ۔ جو فلسطین اور عراق کی معرکہ آرائیوں میں یکے بعد دیگرے حاصل کئے گئے تھے۔ سر کی پگڑی ایک خاص زاویہ پر رُکی ہوئی۔ صورت ڈراؤنی اور کرخت۔ سُرخی مائل داڑھی کا ایک ایک بال کھڑا ہوا —— اس کا نام تھا، ترہ یوسف قوم کا افغانی۔ مگر برٹش راج کا نمکخوار سپاہی ساتویں کنگ ایڈورڈس اون نارتھ وسٹرن فرانٹیر رسالہ میں لینس دفعدار کے عہدہ پر مامور

گالیوں اور مغلظات کا تانتا باندھ کر اُس نے کہا "تیری بہنیں آوارہ ہیں۔ او ملعون! —— تیری ماں ستر خصمی ہے

نابکار!"

ساتھ ہی اس کا سنہرے زنگلوں والا نوں ہاتھ ٹھکا کھچا۔ اور اپنے ساتھ ایک لرزاں اور نالہ کناں تاتاری شتر بان کو اُٹھا لایا۔ جسکی ہر ممکن کوشش پر بھی رہائی نصیب نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ اس نے لجاجت آمیز آواز میں کہا۔ "بندہ پرور۔ میں تو آپ کو جانتا تک نہیں"۔

"او فرزند لعین۔ دیکھ تو ابھی جان جائیگا"

"مگر میرا قصور؟"

"تو نے غیبت کی"۔

"یہ تو محض بازاری تذکرہ تھا۔ میرا مقصد کسی کی دل آزاری ہرگز نہ تھا۔ میں نے بھاڑی پر سُنا تھا —— جانور کے دام اور چارہ ...."

"تو نے ایک خاتون کی بابت بھی تو کچھ کہا تھا" قرہ یوسف نے اس کو خُوب سا جھنجوڑا۔ "ایک نادری خاتون کی بابت —— میری ہم قبیلہ کی نسبت"

"میں نے اس کو بدنام تو نہیں کیا —— ہاں بس اتنا کہا تھا کہ جب میں اس گاؤں ہوکر نکلا تو لوگ تذکرہ کر رہے تھے کہ ...."

خبردار! جو مُنہ سے اب دوبارہ کچھ نکلا" دفعتہً اس نے اپنا فوجی بوٹ والا پاؤں اسکی کمر پر رکھ کر اس زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکتا پڑکتا مجمعۂ خرافات سے گزرتا سامنے والے دروازہ پر جا پڑا۔ تاتاری نے ہوش برجا کئے اور جھاڑتا پُونچھتا کھڑا ہوگیا۔ وہ خوف اور غُصّہ کی وجہ سے بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ مگر دُوری —— اور کہنے کو اسقدر مختصر دُوری نے اسمیں گونہ ہمت پیدا کردی۔ چنانچہ اس نے ایک بار جھنجھلا کر کہا۔ "مگر پھر بھی یہ واقعہ ہے —— سچا واقعہ —— میں نے خاص اپنے کانوں سے سُنا۔ ان آنکھوں سے دیکھا"۔ اس کے الفاظ میں ایک قسم کی دلیری اور تضحیک آمیز ادا مضمر تھی کیونکہ اب وہ بخوبی سمجھ گیا تھا کہ خان کی برانگیختگی کا سبب کیا تھا —— جہانہ کی نازک کمر میں ہاتھ ڈالنے کا فخر حاجی غور کو حاصل ہے —— بس ایک ہفتہ کی دیر ہے کہ لوگ اس کو حاجی غور کی بیوی کہکر پکاریں گے" اس کے بعد اس کے مُنہ سے ایک نیم کشیدہ چیخ نکلی اور وہ خاموش تھا۔ کیونکہ دفعتہً قرہ یوسف کے ہاتھ میں ایک برہنہ خنجر چمکا اور ناچتا پھرتا سامنے والے دروازہ میں دو انچ گہرا پیوست ہوگیا۔ خیریت گذری کہ تاتاری کا سر ایک فطری جنبش کے باعث بال بال بچ گیا۔ اور اسی طرح —— کرم خان —— مالک کاروان سرائے کا بھی "الٰہی خیر" کہکر وہ نیم مدہوش اور نیم غُصّہ کی حالت میں اٹھا اور قرہ یوسف سے دوبدو ہوکر بولا: "او قاتل سفاک۔ یہ کیا حرکت تھی؟"

اس عرصہ میں تاتاری فرار ہوچکا تھا۔

"میں غصہ سے بیتاب ہوگیا"۔

"اور میرا کان جو بال بال بچ گیا" اس نے قرہ یوسف کا شانہ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ "کیا تم بھی سب کی مانند بیطرح پی گئے ہو —— بیشک تمہارے منہ سے بھبکے نکل رہے ہیں"۔

"غلط! میں نے ہاتھ تک سے نہیں چھوئی —— میں اپنے پورے حواس میں ہوں"۔

"مگر خنجر!"

"تم نے یہ نہیں سنا کہ وہ تاتاری کیا بک رہا تھا"

"میں غنودگی میں تھا —— غالباً —— کسی لڑکی کی بابت کچھ ——"

"ہاں جسپر میں فریفتہ ہوں"

"مگر تم تو ہر ایک پر جان دیتے پھرتے ہو"

"میں اس کو سب سے زیادہ چاہتا ہوں اور اب ...."

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا کوئی رقیب —— کوئی مار آستین پیدا ہوگیا ہے"۔

"یہی تو بات ہے"۔

"تو پھر مجھ، اور اس تاتاری بیگناہ پر کیوں غصہ اتارتے ہو —— جاکر اس سے کیوں نہیں نبٹتے"۔

"میں ایسا نہیں کرسکتا۔"

"کیوں"؟

"وہ میرا حقیقی بھائی ہے"۔

قرہ یوسف کاروان سرائے سے چلدیا۔ اثنائے راہ میں وہ جہانہ کی یاد سے بیچین ہوکر اپنے دل سے یوں باتیں کرتا تھا۔

"میں اس کو کیونکر فراموش کرسکتا ہوں ——— اس سراپا ناز وغرور کو ——— اس کی نگینئ ادا کو۔ اس کے جسم کی ملاحیت اس کے بالوں کی سیاہی اور نرماہٹ کو ——— اور اسکی کافرادا ئی خنجریوں کے بے پناہ واروں کو جو نوجوان دلوں پر تو سو سو برچھیاں برساتی اور بڈھے دلوں کے زخموں کے اندمال کا طرح طرح سبب بن جاتی ہیں"

واقعہ بھی یہی تھا کہ اس کو فراموش کرنیکی کوئی صورت ہی نہ تھی اس سے متعارف ہوئے ابھی تقریباً تین ماہ گذرے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ اسکی رخصت کی مقررہ میعاد عین قریب ختم ہونیوالی تھی اس لئے اس نے اپنے وطن مالوف پہنچنے کیلئے افغانی سرحد پر وہ طویل راستہ اختیار کیا تھا جو سیدھا اس کے قبیلہ نادری کے جائے استقرار کو جاتا تھا۔ یہ قبیلہ سلسلۂ کوہی بابا کی ان زرخیز اور خوشنما وادیوں میں آباد تھا جہاں نسیم وصبا کے جھونکوں سے ہردم لطافتیں سرگوشیاں کرتیں۔ جہاں سبزہ زار نخلستان سیب وانگور دانوں سے محشرستان رنگ و بو رہتا۔ اور جہاں کی پہاڑیوں کا چپہ چپہ درختوں سے لدا۔ ابلق آہو اور ہرنوں سے بھرا۔ اور طوطیاں خوشنوا کی لے نوازیوں سے ہمہ نغمہ اور ہمہ موسیقی بنا رہتا۔ اس کے والدین، خدا غریق رحمت کرے اجنت مکین ہو چکے تھے۔ صرف ایک بھائی تھا ——— چھوٹا ——— حاجی غور نام۔ نوعمر بچپن سے متین اور حلیم۔ وہ بھی ایران کی دینیاتی یونیورسٹی میں بغرض حصول علم دینیات گیا ہوا تھا۔ مگر اس پر بھی بہت سے اس کا خیر مقدم کرنے اور خوش آمدید کہنے والے موجود تھے۔ اس کو اپنی بپتی سنانے والے اور اس کی بپتی بشوق سننے والے کہ کس طرح وہ اس عرصہ میں ملک ملک گھوما پھرا۔ اور محض لڑائی کے شوق میں دوسروں کی خاطر لڑائیاں لڑتا رہا۔ اس شام کا ذکر ہے کہ ایک مجمعہ کو مخاطب کرکے اس نے کہا "دیکھنا۔ یہ میرے بازو والے زخم کا نشان ایک جرمن گولی کی یادگار ہے۔ ——— بلا کے لڑاکو ہیں ——— مگر رات گئے جب ہم لوگوں نے سرنگوں سے نکلکر اپنے برہنہ افغانی خنجروں سے شبخون مارا تو پھر بھاگتے ہی بن پڑی اور یہ دیکھنا (سینہ دکھا کر) یہ زخم ایک ترک کی برچھی کی انی کا رہون منت ہے۔ اس موقعہ پر میں نے اپنے کرنل صاحب کی جان بچائی تھی جس کے صلہ میں یہ سائیتہ اور تمغہ عنایت ہوا تھا۔ اب میں بخیریت تمام گھر واپس آگیا ہوں اور غالباً اس وقت تک مقیم رہونگا جبتک کہ میرا تلوار اور خنجر دانی آتیں پھر نہ گھبرائیں۔ دوانی تھاں میں کہیں نرم بستر اور گدار تکئے پر آرام کرتا ہوں ——— پھر دیکھا جائیگا۔

سامعین نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

یہ لوگ صلح کل آشتی پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ دنیا حصول زر وعزت میں دیوانی ہو تو ہو مگر وہ اپنے مویشی۔ اپنے کھیت اور اپنے چراگاہ پر نازاں تھے اور اسی میں مگن۔ پھر بھی وہ قرہ یوسف کے کارنامے سن کر کافی محظوظ ہوئے۔ جو بقول اس کی ماں کے ہمیشہ بھیڑ بکریوں میں شیر ہو کر رہنے کا عادی تھا۔ ان کی دلچسپی کی انتہائی دلیل یہ تھی کہ اس کی خاموشی پر ہر طرف سے بایں الفاظ پر اصرار تقاضے آئے۔ "ہاں دلاور نامدار ہاں کچھ اور سنائے جا"۔

اب دوسرے کارنامۂ نمایاں کا بیان شروع کیا تو فلسطین اور عراق سے متعلق جنہیں بمشکل تمام کوئی صحیح اور سچا۔ مثلاً سنئے کہ اس وقت حاضرین پر ایک فضائے پرغرور طاری وساری ہوگئی جبکہ اس نے نہایت دلیری سے بیان کیا کہ کس طرح اس نے بڑے خان (قیصر جرمن) کو دست بدست لڑائی میں زیر کیا اور نہایت بے آبروئی کیساتھ ٹھوکر لگا کر اس کو قعر مذلت میں یہ کہکر دھکیل دیا۔ "غارت ہوا و ذلیل مصری کتے ——— چلا جا اپنے تھان پر بڑی پگڑی والے"۔

اور پھر ایک ضعیف کے اس سوال کے جواب میں کہ وہ شادی کب کریگا ہنسکر فرمایا۔ "مناسب اور پسندیدہ رُت دیکھنے پر میں بھی ضرور بجاؤنگا۔ مگر اس وقت تک تو دوسروں کی بیویوں کی بوسہ بازی میرا مشغلہ رہیگا"

یہ کوری شیخی نہ تھی بلکہ بہت ممکن تھا کہ ہفتہ عشرہ کے اندر سبزہ زاروں میں نغمہ ہائے شیریں۔ سامعہ نواز اور لبہائے لعلیں بوسہ نواز ہوتے ہوتے کیونکہ اس کی تعمیر میں ایک صورت مضمر تھی۔ عورت کو متوجہ اور جذب کرنیکی ـــــ ایسی صورت جو بقول کابلیوں کے تلوار کو میان میں اور ہل کو میدان میں میسر آتی ہے۔ خیر سے اس کو سامنا بھی ہمیشہ ایسی صورت سے رہا۔ عورتیں۔۔ یہاں یا وہاں لڑائی کے میدان میں۔ یا پُرسکون محلات میں جو بھی اس کی راہ حیات میں پڑیں یا دل میں مقیم ہوئیں اپنی یادگار نہ قائم کرسکیں فلسطین میں ایک یا دو بجیم کسان کی لڑکیاں۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد ایک راہب دوشیزہ۔ دمشق میں فوجوں کے عارضی قیام کے موقعہ پر ایک تُرک خاتون۔ اور اب بھی نہ اس شہر پشاور میں ایک ہندو دیوی سب ہی تو اس کی چشم کرم کی امیدوار تھیں۔

پشاور والی کا نام؟ ـــــ نام تھا چندا دتی ـــــ حسینہ، جمیلہ۔ وفادار، چندے آفتاب چندے ماہتاب اچھا۔ اس کو انتظار کرنے دو۔ بلکہ اس کے ساتھ اور سب کو بھی انتظار کرنے دو۔ فی الحال تو وطن کی ہوائیں۔ وطن کے مشاغل اور وطن کی عورتیں اس کا دامن خیال و تصور اپنے قابو میں کئے ہوئے ہیں:

اس کی واپسی کو ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ایک سہانی صبح کی سیرگشتی میں عبدالرحمٰن طارق، کا نیلا باشی، یا سالار کاروان کی بیٹی جہانہ سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ گو اس کا تعلق بھی قبیلہ نادری سے تھا۔ مگر اس کی پیدائش اور پرورش سلسلۂ کوہِ بابا کے اُس طرف ہوئی تھی جہاں اس کے باپ کے کاروان درانی قبیلہ سے سلسلۂ تجارت قائم کئے ہوئے تھے جہانہ کو یہاں آئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا اس کے آنے کی وجہ اس کی دادی کی علالت تھی جو اپنی ضعیف العمری کے باعث پا بہ رکاب ہو رہی تھی۔

قرہ یوسف نے اس کو اپنے مکان میں اُگلی نوصل سے کچھ اناج چھیڑتے بناتے دیکھا۔ ٹھٹکا۔ اور تخیلات کے سیلاب میں غوطہ زن ہو گیا "سُبحان اللہ۔ کیا صورت پائی ہے ـــــ یہ ہے حُسن مجسم! ـــــ الٰہی خیر! میرا دل تو بُری طرح دھڑک رہا ہے"

با آخر بآواز بلند اس نے پوچھا۔ "اے حُسن مجسم تیرا نام کیا ہے؟"

"میں جہانہ ـــــ عبدالرحمٰن طارق کی بیٹی ہوں"

"اور میرا نام قرہ یوسف ہے"

"مجھے یہاں آئے ہوئے ابھی دو روز گذرے ہیں۔ مگر میں تمہاری تعریف سُن چکا ہوں" اس کے تبسم زیر لب سے غلط نتیجہ نکال کر "سچ پُوچھو تو میری شہرت کا ڈنکہ ہندوستان اور ماورائے ہندوستان چار دانگ بجا ہوا ہے ـــــ تم سے ایک حقیقت کا اظہار کروں؟"

"شوق سے"

"میں تم پر فریفتہ ہوں ـــــ مرتا ہوں"

"سُبحان اللہ! معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ آپ کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں"

"بے معنی تھے یہ الفاظ۔ جبتک تم کو نہ دیکھا تھا۔ مگر اب تمہارے دیدار نظر فروز سے مشرف ہو کر بامعنی ہو گئے حقیقت بن گئے۔ تمہارا سر میرے زانو پر ہو ـــــ تو پھر شہنشاہ برطانیہ کو بھی خاطر میں نہ لاؤں"

اس نے آگے بڑھ کر چاہا کہ اس کو اپنی آغوش شوق میں لیلے ـــــ مگر دفعتہً اس کی نازک مُٹھی کا گھونسہ اس کے گال پر پڑا۔ اور وہ ہنسنے لگا۔ "میں تمہارے اس وحشیانہ اور بے رحم سلوک سے اور ہزار جان سے عاشق ہو گیا"

یہ کہکر وہ رُخصت ہو گیا۔۔۔ رُخصت ہو گیا دوسرے دن آنے کیلئے۔ اور پھر دوسرے دن۔ تیسرے دن۔ چوتھے۔ حتیٰ کہ یُوں ہی ہفتے۔ عشرے گذر گئے۔ اور وہ بلا ناغہ روزانہ اُس سے ملتا۔ اظہار اُلفت کرتا۔ اور طرح طرح کے محبت آمیز الفاظ کام میں لاتا۔ وہ کبھی بچوں کی سی باتیں کرکے اس کا دل لُبھاتا۔ کبھی ایسا متین

اور سنجیدہ بنجاتا گویا کسی بزرگ اور اللہ والے سے مخاطبت کر رہا ہو۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ خوشامد آمیز الفاظ کے استعمال سے بزدل بھی بنا۔ غرض یہ کہ اس کو اپنی طرف مائل کرنے کیلئے کوئی جتن ایسا نہ تھا جو اس نے اٹھا رکھا ہو۔ حتیٰ کہ ایک روز اس کی باچھیں کھلی دیکھ کر یہاں تک پوچھ بیٹھا۔ "تم مجھے پسند کرتی ہو؟"

"پہلے تو مجھے تمہاری صورت سے نفرت تھی مگر ہاں اب اتنا ضرور ہے کہ تم سے بات کرنا گوارا کر لیتی ہوں"۔

"اور تم مجھ سے ...... محبت کرتی ہو؟"

"نہیں"

"میرا خیال ہے کہ تم نے ابھی اقرار کیا تھا کہ ....."

"ہرگز نہیں"

"لیکن ....."

"کبھی نہیں — ہرگز نہیں"

اس کے سر کو ایک بیچین جنبش ہوئی — یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ — وہ اس سے محبت کرتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس کا دم نہیں بھرتی — لیکن اس کو کرنا ہوگا۔ ایک نہ ایک دن ایسا کرنا ہوگا — اور پھر دل ہی دل میں مختلف تجاویز پر غور کرنے لگا میں سمجھتا ہوں یوں کام چلیگا — مجھے یہاں سے کہیں باہر چلا جانا چاہئے — پھر ضرور ہے کہ وہ میری جدائی سے پریشان ہو اور مایوسی پہ بیتاب ہو کر میری آغوش میں آجائے۔ لہذا متاسف انداز انداز میں بولا۔ "تب کل اس پہاڑیوں کو خیرباد کہہ دونگا"۔

"کہاں کا قصد ہے"۔

"ہندوستان"! انگریزی راج کی خاطر لڑنے کیلئے مسکرا کر اگر اب میں نشۂ محبت سے ایسا چور ہوں کہ ہر ہر قدم پر مجھے یہ احتیاط منظور ہوگی کہ مبادا تمہاری محبت کی نزاکتیں مجروح نہ ہوجائیں دفعتہ اس کے فطری جوش وخروش اور احساسات خودداری میں بیداری پیدا ہوئی چنانچہ اب اس نے ذرا تنکر کہا۔ "او ظالم۔ بیرحم میں دو برس کیلئے یہاں سے جاتا ہوں اور اگر اس درمیان میں کسی دوسرے شخص نے تجھ سے رشتۂ حیات ....."

"تو پھر؟"

"میرا خنجر اس کے سینہ کے پار ہوگا — اور جامۂ شادی کی جگہ اس کو پارچۂ کفن نصیب"۔

یہ وجوہات تھے جنکی بناء پر وہ رخصت ختم ہونے سے کئی ہفتہ پیشتر پشاور پہنچ گیا۔ اپنے عہدہ لیس دفعداری کے فرائض انجام دینے لگا۔ اور پھر حسب معمول اپنے فرصت کے اوقات کرم خان کی کاروانسرائے اور چندراوتی کے مختصر مکان پر صرف کرنے لگا۔ مگر جہانہ کی یاد اس کو ہر گھڑی بےچین رکھتی۔ چندراوتی حسین تھی۔ خوبصورت تھی اور وفادار بھی۔ تو وہ یوسف جب کبھی اس کے سامنے جہانہ کا ذکر کرتا تو وہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتی مگر زبان سے یہی کہتی۔ "دیکھو تم کو اس سے محبت ہے اور مجھے تم سے۔ لیکن جب تک تم میرے پاس موجود ہو مجھے کیا تشویش اور فکر ہوسکتی ہے"

چندراوتی صابر وشاکر بھی تھی۔ ایسی صابر وشاکر کہ جب ایک روز تو وہ یوسف نے کرم خان کی سرائے سے واپس آکر اس سے کہا کہ وہ صبح وطن چلا جائیگا تو اس کا جو کچھ جواب اس نے دیا وہ یہ تھا۔

"میرے آقا۔ خوشی سے جاؤ۔ اگر تمہارا جانا ضروری ہے"!

"تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کیوں جا رہا ہوں"!

"جہانہ — اور کیا؟"

"اس کی شادی ایک دوسرے شخص سے ہونے والی ہے"

"تو تم اس شخص کو قتل کر دو گے؟"

"اس سوال کا جواب جو کچھ کرم خان کو دیا گیا تھا وہ ہی پھر دوہرا دیا گیا۔

"میں ایسا نہیں کرسکتا"

"کیوں؟"

"وہ میرا حقیقی بھائی ہے" — پروردگار! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ اس سے کیونکر محبت رکھتی ہے — کیسا کمزور ناتوان۔ غبی۔ کُلّا سے ایک عورت بھلا کیا محبت رکھ سکتی ہے"۔

"تم کو نہیں معلوم کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ ثبوت میں اور سب کچھ

جانے دو یہی دیکھ لو کہ میں "تم سے محبت کرتی ہوں"

ان الفاظ نے چند لمحوں کے لئے اس پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ اپنی موجودہ روش پر خاموش تبصرہ میں مستغرق ہو گیا۔ مگر ان خیالات کو بزدلی و کم ہمتی سے فوراً ہی تعبیر کر کے وہ دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔ چندہ ارتی پیچھے دوڑی اور اس کی گردن میں اپنے دونوں ہاتھ حمائل کر کے بولی "خدا کرے تم اپنے ارادوں میں کامیاب ہو کر جلد واپس آؤ۔ جاؤ خدا حافظ"

وہ چلا گیا۔ وہ وہاں سے سیدھا چھاؤنی کی بارکوں کے قریب کرنل سر جیمس اڈوائر کے بنگلہ پر پہنچا۔ رات آدھی گذر چکی تھی۔ اور ایسے بیوقت بغیر ریا زور کام میں لائے ناممکن تھا کہ بنگلہ کا پنجابی سنتری اپنے آقا کو بیدار کرنے پر رضامند ہو جائے۔

زیادہ عرصہ نہ گذرا کہ کرنل صاحب اپنے بنگلے کے برآمدے میں آموجود ہوئے۔ سرخ و سپید۔ رات والی پوشاک میں ملبوس۔ مگر اس پر بھی بر انداز سپاہیانہ۔ چنانچہ ٹوٹی پھوٹی پشتو زبان میں بولے۔

"دفعدار! کیا ہے جو ایسے بیوقت آکر تم نے ہماری نیند خراب کی ــــ کچھ شراب تو نہیں پی لی ہے"۔

دفعدار نے پتیرہ بدل کر فوجی سلام کیا "صاحب! آپ میرے ماں باپ ہیں"۔

"اظہار مطلب کے لئے یہ تو تعارفی جملہ ہے۔ کہو آخر ہے کیا؟"

"صاحب! مجھے 'رضا' دیدیجئے ــ اور ابھی"

"رضا! جبکہ تم کو رخصت سے واپس آئے ہوئے ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں گذرا ــــــ کیا سمجھتے ہو۔ تم کوئی کمانڈر انچیف ہو گیا؟"

"مجھے کل گھر پہنچنا نہایت ضروری ہے"۔

"اچھا۔ تم نہیں جانے پاؤ گے"

"مجھے جانا چاہئے ــــ مہربانی صاحب"

"اچھا۔ تم کو پھر کسی وقت اجازت دیدی جائیگی"

کرنل کے مزاج کا پارہ بتدریج اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس نے کس کس کر دو چار تھپیڑ اپنے گھٹنے کے اس مقام پر رسید کئے جہاں ابھی کسی مچھر نے کاٹ لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ افغانی سپاہی تو ضرور اچھے ہوتے ہیں۔ مگر کمبخت نہایت ضدی اور ہٹی۔ "اچھا دیکھو میں تم کو اجازت نہ دینے کی وجہ بتائے دیتا ہوں۔ آج تیسرے پہر کو مجھے اطلاع ــــ خفیہ اطلاع ملی ہے کہ دو تین ہفتہ کے اندر ہماری فوج کو برما پہنچنا ہے۔ جہاں کچھ گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ مجھے اپنی فوج کے ایک ایک آدمی کی ضرورت ہوگی۔ اسلئے تم سمجھے کہ تمہارا ٹھہرنا کتنا ضروری ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے ــ حکم ہے"

"صاحب یہ حکم میرے لئے نہیں ہے"۔

"کیا مطلب"

"میں افغان ہوں۔ آزاد ہوں۔ سرکار کی رعایا نہیں"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم نے وفاداری کا عہد کیا ہے۔ حلف اٹھایا ہے۔ تمہاری حالت کیا ہے۔ کیا تم ڈرتے ہو۔ بڑے بزدل ہو۔ اچھا ہو کہ تمہارے منہ پر کوئی جوتیاں لگائے۔ تمہاری ماں۔ تمہاری بہنیں۔ اور تمہاری دوسری رشتہ دار عورتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"صاحب بس۔ ۔ ۔ ۔" افغان جوش خودداری سے آگ بگولا ہو گیا۔

کرنل اوڈائر کو فوراً اس کا احساس ہو کر ندامت ہوئی۔ قطع نظر اپنی حاکمانہ حیثیت کے وہ شریف اور نیکدل تھا۔ اس لئے ایک نیٹس دفعدار تک سے اپنی گستاخی کی معافی مانگنے میں اس کو ذرا تکلف نہ ہوا "میں معافی چاہتا ہوں" وہ یہ کہکر ہنس دیا۔ تو یوسف بھی ہنس دیا۔ دونوں نے ہاتھ ملا لئے۔ "اچھا اب ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ کونسی ایسی سخت ضرورت ہے جو تم خلاف عادت اس قدر عجلت سے کام لے رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی تمہارا زمینداری کا جھگڑا بکھیڑا ہوگا ــــ اچھی بات ہے اس جھگڑے بکھیڑے کو کچھ دن انتظار کرنے دو"۔

"جھگڑا بکھیڑا ملتوی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ معاملہ نہیں رک سکتا"

"تو پھر صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے"۔

"ایک عورت ــــ جسپر میں سو جان سے عاشق ہوں آج سے ساتویں دن ایک دوسرے شخص سے شادی کریگی۔ میں اس وقت روانہ ہو جاؤں تو ساتویں دن وطن پہنچ سکونگا"۔

افغان خاموش تھا۔ رحیم بیں نے اس کو بغور دیکھا۔ دفعتہً اسکے پیش نظر وہ منظر ہو گیا جبکہ فلسطین میں نہایت دلیری اور جان بازی کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے ترکی بھالے کی ضرب اپنے سینہ پر لیکر اس کی جان بچائی تھی۔ چنانچہ اس نے کہہ دیا۔ "اچھا جاؤ۔ رخصت منظور ہے۔ ایک ہفتہ جانے کیلئے۔ ایک ہفتہ وہاں قیام کیلئے۔ اور ایک ہفتہ واپسی کے لئے۔ کل دو مئی تاریخ ہے۔ ۲۲ کو تم یہاں فوج میں حاضر ہو گے" اس نے افغان کے کندھے پر تھپکی دی اور پوچھا "مگر یہ بتاؤ کہ واپسی تنہا ہوگی یا معشوقہ کے ساتھ؟"

"معشوقہ کیساتھ صاحب۔ یقینی بات ہے انشاء اللہ"

تو یوسف کو اب سکون اور اطمینان نصیب تھا۔ چنانچہ علی الصبح وہ وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔ طولانی اور دشوار گذار راستہ کہیں پیدل، کہیں گھوڑے پر اور کہیں اونٹ پر جس طرح ہوا طے کرتا گیا۔

"اس کا بھائی۔ سیدھا سادہ ملا۔ دعا تعویذ سے کام رکھنے والا بھلا کیا ایسے تجربہ کار جانباز سپاہی سے مقابلہ کی تاب لا سکیگا۔ جو چوڑی کلائی اور چکلا سینہ رکھنے پر ساری عمر اسی دشت کی سیاحی کرتا رہا ہو اور جس کو عام طور پر عورتیں پسند کرتی ہوں اور پھر تعجب یہ ہے کہ جہانہ اس ہفتہ کے آخر میں اس سے شادی کر لیگی مگر ناممکن۔ یہ ضرور اسی کی عشوہ گری ہے۔ اسی کا ادنیٰ فریب ہے۔ اس نے سوچ لیا ہوگا کہ یہ خبر وحشت اثر گھر سے باہر۔ باہر سے محلہ۔ محلہ سے گاؤں گاؤں سے پہاڑ۔ میدان بازار اور مسجد دل میں گھومتی پھرتی مجھ تک ضرور پہنچ جائیگی۔ اس کا مقصد محض میرے سینے میں شعلہ ہائے حسد و رقابت بھڑکانا ہے اسلئے تاکہ میری فوری واپسی سے اس کی دل کی مراد بر آئے ہاں یہی بات ہے۔ اس کی یہی تمنا ہے۔ میری جدائی سے بےچین ہے مجھو یاد ہے ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ میں تم سے کبھی محبت نہیں کرتی یہ بھی اس کا کھلا فریب تھا۔ تاکہ اس یقین کی بنا پر میری تمنائیں بیتاب تر ہو جائیں۔ وہ محبوب بننے کیلئے ضرور پیدا ہوئی۔ خاصکر میرے دل اور آنکھوں کی. . . . . . "

اب وہ ایک پشتو غزل گنگنانے لگا۔

"تلوار بنی ضرب لگانے کیلئے۔ بولو بنی یا نہیں!
تمہارے لب بنے لعلین میرے بوسوں کے لئے بنے۔ بولو بنے یا نہیں"

مگر دفعتہً خاموش ہو گیا۔ کیونکہ اس کو وہ وقت یاد آگیا جبکہ سب سے پہلی ملاقات میں چندراوتی کے سامنے اس نے یہی غزل گائی تھی۔ شہر پناہ سے باہر پشاور کی بات تھی جبکہ وہ اور چندراوتی سیر قدمی کیلئے تیمور شاہ والے باغ میں گئے ہوئے تھے۔ اس وقت جو بیقرار الفاظ اسکی زبان سے نکلے۔ وہ آج تک حرف بحرف اس کو یاد تھے۔ اس نے کہا تھا۔ "دیکھو تو تمہاری موجودگی سے پھولوں میں روحانیت پیدا ہو گئی ہے اور چاندنی میں ملاحت" وہ سوچنے لگا کہ اس نے واقعی سچ کہا تھا۔ وہ خوبصورت تھی۔ اس سے محبت کرتی تھی۔ بلکہ اب بھی جان نثار کرتی ہے۔ اور قطع نظر اپنی انتہائی محبت بلکہ غالباً محض اسی کی بناء پر اس نے چلتے وقت مجھے میرے مقاصد میں کامیابی کی پرخلوص دعا دی تھی"

یوں اپنی دھن میں سرمست وہ اس پہاڑی زمین کو عجلت طے کرتا چلا گیا جہاں گنجان درختوں کے سایہ میں ہرن اور چیتل پاسبانی کا کام انجام دیتے۔ اور جہاں پانی کے چھوٹے چھوٹے چشمے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے بہتے۔ شام کے قریب وہ ایک مخصوص پگڈنڈی پہ پڑ لیا جس پر اپنے بچپن کے زمانہ سیاحی میں اس نے ایک محفوظ غار دریافت کیا تھا۔ جو چہار اطراف سے جھاڑیوں اور درختوں کی موٹی موٹی جڑوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ برسوں کی بات ہے کہ جب کبھی اس کے باپ نے کسی خطا یا بیجا حرکت پر سرزنش کی یا ڈرایا دھمکایا تو وہ گھر سے فرار ہو کر سیدھا اسی غار میں پناہ لیا کرتا تھا۔ اس نے سوائے اپنے بھائی کے کسی دوسرے کو اس کا نشان تک نہ دیا تھا۔ بلکہ بھائی کو بھی جبدن غار تک لیگیا تو اس سے حلفیہ اقرار کرا لیا تھا کہ وہ اس راز کو کبھی پر افشانہ کریگا یہ اس وقت کا قول و اقرار تھا جبکہ اس کی عمر تقریباً بارہ سال کی ہوگی اور اس کے بھائی حاجی عور کی کوئی سات سال۔

یہاں سے آگے ایک جسیم پتھریلے ٹیلے کے پاس سے سڑک کا موڑ تھا۔ جہاں پہنچکر وہ یکدم ٹھٹک گیا۔ کچھ دیر ساکت و ساکن

رہ کر اس نے سُنا:— شور وغل۔ چیخ پکار۔ لیجھو ووڈیو کی صدائیں۔ سلامت برکت کی دُعائیں۔

شادی؟— قرہ یوسف کو ایک وحشتناک شبہ گذرا۔ کیا وہ اپنی حماقتوں کا شکار ہو گیا —— کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا بھائی —— اور دوسرے لمحہ میں اس کو معلوم ہو گیا۔ صاف طور پر معلوم ہو گیا جب منادی نواز نے آواز بلند "سلامت سلامت حاجی غور اور جہانہ دختر عبدالرحمٰن طارق سلامت" کی آوازیں لگائیں۔

قرہ یوسف پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کے مُنہ میں جھاگ اور خون کا سا نمکین مزہ پیدا ہو گیا۔ اس کے سینہ کے اندر ایک آگ سی لگ گئی۔ اور جب اس نے سڑک کے موڑ سے ذرا آگے بڑھ کر شادی کا جلوس ہنگامہ اور سامان وغیرہ مشعلوں کی روشنی میں گاؤں سے ٹیلے والی مسجد کی طرف جاتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تب تو اس پر ایک حالت دیوانگی طاری ہوئی

ایکبار پھر صدائیں آئیں: حاجی غور سلامت۔ جہانہ سلامت سلامت سلامت"

شادی کا جلوس بھی کافی لمبا تھا۔ سارا قبیلہ بسر کردگی سردار اور حکماء و علماء شریک تھا۔ مجمع سے نظر بچا کر وہ برابر دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے بھائی کو حالانکہ سالہا سال کے بعد دیکھا۔ مگر پہلے کا سا زرد رُو اور دُبلا پتلا ہی پایا۔ —— وہی معمولی طالب علم کی صورت موٹے موٹے شیشوں والی عینک آنکھوں پر چڑھی ہوئی۔ سڑک پر پتھر سے ٹھوکر کھا نکلنے بعد وُہی بھدے پن کا اظہار —— مسجد کی طرف۔ بے تعداد مشعلوں کی روشنی سے تاریکیٔ شب کا بقعہ نور بنجانا۔ مسجد کا دروازہ کھلنا اور مُلاجی کا با قراءت تلاوت کی دھیمی سُریلی آواز کا آنا —— سارے جلوس کا خاموش اور ہمہ تن گوش ہو جانا —— اور پھر ایک دل ہلا دینے والی صدا کا آنا: "اب کونسی نعمت خداوندی باقی ہے جسکے کفران کی تو ہمت کریگا"

یہ الفاظ قرہ یوسف کے دماغ میں تیر کی طرح چُبھے۔ اس کے پراگندہ اور منتشر خیالات نے مجموعی صورت اختیار کرنا شروع کی —— اس کا بھائی اور جہانہ —— کیا یہ گوارا کیا جا سکتا ہے کہ آج کی رات دونوں ملیں —— حاجی غور کے مکان میں —— حاجی غور اس کا منتظر رہیگا —— آدھی رات کو وہ اس کے یہاں جائیگی —— برقعہ پوش ہو کر —— میاں بیوی ——

پھر دفعتہً اس کے دماغ میں ایک دوسرا خیال موج زن ہوا —— "نہیں —— ابھی میاں بیوی کی حیثیت میں نہیں"

یہ تو ابھی شادی کے متعلق چند ابتدائی رسُومات تھے جو ادا کئے جا رہے تھے۔ اس قبیلہ کے ایک مخصوص قانون کے ماتحت یہ ضروری تھا کہ دلہن رات تنہا۔ آدھی رات کو۔ گاؤں ہو کر دولہا کے مکان جائے اس کے بعد کہیں شادی کا اعلان کیا جاتا تھا۔

وہ اس غار کے قریب سے گذر کر جائے۔ پھر میں دیکھونگا کہ آیا وہ کس طرح خدا اور بندوں کی نظروں میں میاں بیوی تسلیم کئے جاتے ہیں —— بھلا آدھی رات۔ عالم تنہائی۔ راستوں گذرگاہوں کی ویرانگی —— پھر مجھے دیکھنا ہے کہ "اب کونسی نعمت خداوندی باقی ہے جسکے کفران کی تو ہمت کریگا" اس نے اس مخصوص جملہ کو دانت پیس پیس کر ادا کیا۔ اور اس کی رگ رگ میں ایک جوش سا طاری ہو گیا —— "اچھا۔ میں ہمت کرونگا —— دیکھنا۔ میں اپنے بھائی کے لئے ایسے اسباب بہم پہنچاؤنگا کہ وہ 'کفران نعمت' پر مجبور ہو"

اصل مدعا تو یہ تھا کہ جملہ نعمتہائے خداوندی پر وہ خود قابض و متصرف ہو جائے —— جہانہ۔ جہانہ کے لب لعلین۔ اور جہانہ کے بوسہ ہائے اُلفت! یہی وجہ تھی کہ جب کل مجمع مسجد سے باہر آیا اور سارا جلوس پہاڑی کی طرف روانہ ہونے لگا تو وہ ہر طرف سے نظریں بچا کر ایک باغیچہ کی طرف بڑھا۔ اور ایک تنآور درخت کی آڑ میں چھپ بیٹھا۔

وقت بتدریج گذرتا گیا —— اور وہ منتظر بیٹھا رہا۔ متعلقین گاؤں والوں کے مکانوں پر تقسیم ہو گئیں اور ایک ایک کر کے سب گُل۔ اسکے بعد تاریکی چھا گئی۔ اور بالکل خاموشی۔

قرہ یوسف نے اپنی پگڑی آتاری اور ایک ہی جھٹکے میں ٹسری ریشم کی دس گز لمبائی پھیلا دی۔ وہ افغانی قزاقوں کی قدیمی ترکیب سے

واقف تھا اور فلسطین میں متعدد بار اس کو کام میں لاچکا تھا۔ پگڑی کا استعمال یہ تھا کہ دبے پاؤں اپنے شکار کے پیچھے جا کر اس کا پھندا سینہ میں ڈالا اور کس کر باندھ دیا۔ پھر دونوں انگوٹھوں سے اس کا نرخرہ دبا دیا اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

قرہ یوسف کی باچھیں کھل گئیں۔ دور گلی میں کچھ آہٹ سن کر وہ سنبھل بیٹھا اور ہمہ تن گوش بن گیا۔ پھر لمبے لمبے دو چار ڈگ بھر کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ رات کی تاریکی میں اس کو ایک سایہ —— بالکل مدھم۔ دھندلا سا نظر آیا —— جہانہ ؟۔ وہ اسکی طرف دوڑا۔ اس نے آہٹ سنی۔ خوف زدہ ہوئی۔ مڑ کر دیکھا —— مگر بعد از وقت!

قبل اس کے کہ امداد کیلئے وہ اپنی آواز بلند کرسکے پگڑی کا حلقہ ہوا میں اڑا اور دم زدن میں اس کے سینہ پر کس گیا۔

غار بھی یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد اس کو ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنی حالت دیکھی اور اپنے قریب قرہ یوسف کو بھی دیکھا۔ جس کی صورت الاؤ کی روشنی میں صاف طور پر نظر آرہی تھی۔

اس نے اپنا منہ اس کے منہ کے قریب تک جھکا دیا۔

جہانہ چلائی "قرہ یوسف!۔ ۔ ۔ ۔" اس کا حلق خشک تھا تمہاری —— قرہ یوسف! —— میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں"۔

"ابھی تک —— بیوی نہیں۔ تم اسکے مکان تک ابھی نہیں پہنچی ہو"

"میں اس سے محبت کرتی ہوں —— نہ کہ تم سے"!

"تم اس کو جلد بھول جاؤ گی مجھ سے محبت کرنے لگو گی —— جب تم میری دلیری اور طاقت کا لوہا مان جاؤ گی"

"تم اپنی طاقت کا ہر دم کیا دعویٰ کیا کرتے ہو۔ طاقت! طاقت! جب دیکھو طاقت! —— طاقت تو ایک بھینسے میں بھی کافی ہوتی ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ایک بھینسے کو اپنا عاشق تسلیم کرسکتی ہوں"

"پہلا بوسہ میں اپنی طاقت کے زعم پر زبردستی لونگا —— اور

جونہی اس نے چاہا کہ اس کو اپنی آغوش شوق میں بھینچ کر پیس ڈالے دفعتہً دہانِ غار سے آواز آئی۔ "قرہ یوسف"

وہ اچھل پڑا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ غار کے منہ پر حاجی غور کھڑا تھا اور سب سے پہلی شے جس پر قرہ یوسف کی نظر پڑی؛ اس کے ہاتھ کی بے نیام تلوار تھی —— "آہاہ! یہ تن و توش اور یہ ہمت!۔ ایک ملا کا ہاتھ نرکل کا قلم تھامنا جانے یا تلوار کا دستہ!"

حاجی غور نے للکار کر کہا۔ "میں جہانہ کا منتظر تھا۔ ضرورت سے زیادہ دیر گذر جانے پر مجھے تشویش پیدا ہوئی۔ چنانچہ میں اس کی خبر لینے نکلا۔ مگر راستہ میں یہ دیکھ کر (اس نے ایک چاندی کا تمغہ اس کے سامنے پھینک دیا جو جہانہ کی بیہوشی سے پہلے رہائی کی کوشش میں قرہ یوسف کے کوٹ سے ٹوٹ کر گر پڑا تھا) میری سمجھ میں روز روشن کی طرح صاف آگیا کہ اس پر کیا گذری ہوگی۔ تم کو معلوم ہو کہ جہانہ مجھ سے تمہارے اظہار محبت کا تذکرہ کرچکی تھی۔ اور تم جانتے ہو کہ میرے لئے تمہارا یہاں سراغ لگانا بھی کوئی پوشیدہ راز نہ تھا۔

"ہاں۔ غار۔ میرے بچپن کی شرارتوں کے بعد مجھے پناہ دینے والا سزاؤں سے بچانیوالا۔ اور (متعجب ہوکر) تم یہاں اکیلے ہی چلے آئے۔ قبیلے اور گاؤں والوں کو مطلع نہیں کیا"۔

"نہیں۔ اس غار کے راز کو پوشیدہ رکھنا ہمارے تمہارے درمیان بچپن کا معاہدہ تھا"۔

"اس کو تو بہت عرصہ گذر گیا"!

"مگر عہد اور پیمان تو وہی باقی ہے"!

قرہ یوسف نے طنزاً جواب دیا۔ "تم تو قرآن والے لوگ ہونا"!

"جی ہاں اسی صحیفۂ الٰہی کا ماننے والا —— یوسف بھائیجان مجھے اب بھی تم سے محبت ہے"۔

"مولویوں کی سی تمہید خوشامد —— یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمہاری محبت برقرار ہو جبکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی ہاں۔ باوجود تمہاری نازیبا حرکات اور ارتکاب جرم کے مجھے محبت ہے"۔

"اب جو چاہے تم کہو۔ جو ہونا تھا سو ہوگیا"!

"اور جہانہ کو چھوڑ دوں - یہ کیونکر ہو سکتا ہے ۔ میں اس پر فریفتہ ہوں - عاشق ہوں"

"تم کو اس سے محبت اگر ہو گی بھی تو اس نے تمام ... تم خود کے عشق میں دیوانے ہو رہے ہو - اپنی طاقت ۔ اپنے غرور ۔ اور اپنی خواہشات نفسانی پر مٹے ہوئے ہو - افسوس یہ ہے کہ میں تم میں سر مو فرق نہیں پاتا ۔ تم اب بھی وہی قرہ یوسف معلوم ہوتے ہو جس کے مرغ کی ایک ٹانگ - جس کا ٹھینگا سر پہ - اپنی خواہش اور مرضی کے آگے دوسروں کے حقوق کی پامالی میں نہایت دلیر ——— میں جانتا تھا کہ تم جہانہ کو چھوڑنے سے انکار کر دو گے"

"پھر حجت سے فائدہ!"

"میں لفظی حجت کرنے نہیں آیا - بلکہ یہ دیکھو اپنے ساتھ تلوار لایا ہوں"

"تو کیا مجھ سے لڑو گے؟"

"اور میں کیا کر سکتا ہوں"

اس پر جہانہ بیقرار ہو کر بول اٹھی "نہیں میرے پیارے تم ایسا ہرگز نہ کرنا"

اپنا رخ جہانہ کی طرف پھیر کر اس نے کہا "اور میں کر کیا سکتا ہوں" بھائی سے مخاطب ہو کر "چونکہ تمہاری ہٹ دھرمی اور ضدی طبیعت پر محبت اثرانداز نہیں ہو سکتی اسلئے ہم کو اس فیصلہ کیلئے تیار ہو جانا چاہئے جو تلوار کے قبضہ میں ہے"

قرہ یوسف نے اپنا سر ہلا دیا۔

"تم ایک سیدھے سادے مولوی ہو - اور میں جہاندیدہ سینکڑوں مہم سر کئے ہوئے - بڑے بڑے سورماؤں کا زعم باطل کئے ہوئے ہیں وہ جسکے ہاتھ سے سوتے جاگتے عمر بھر تلوار نہ چھوٹی - میں تم سے کیا لڑ سکتا ہوں - تم بھلا اس کے داؤں پیچ کیا جانو - کیا سمجھے"

(گرج کر) "بس خاموش! بہت داؤں کی نہ لو - تم کو دست بدست لڑائی سے شاید ہی کبھی سابقہ پڑا ہو ——— اچھا بس - لے ہوشیار - اے فرزند آدم ہوشیار!"

اس نے بڑھ کر قرہ یوسف پر حملہ کرنا چاہا۔

اب قرہ یوسف کیلئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ بھی اپنی تلوار نیام سے باہر کھینچ لے - چنانچہ تبسم زیر لب کیساتھ اس نے ایسا ہی کیا ۔

"ہوشیار! میرے ٹینی مرغ - ہوشیار" حاجی غور کا وار بچاتے ہوئے "خبردار! ورنہ تلوار سینے کے پار کئے دیتا ہوں"

اس طرح خس و خاشاک کے الاؤ کی مردہ سی روشنی میں دو حقیقی بھائی نبرد آزما تھے ——— ایک نحیف و نازک - دوسرا قوی و ہیکل - نحیف آنکھیں موندے - بے جگر ہو کر اندھا دھند وار پہ وار کئے جاتا ہے - مگر قوی صرف وار روکنے پر اکتفا کئے ہوئے ہے اور دل ہی دل میں کہہ رہا ہے "شاباش - میرے ٹینی مرغے شاباش پھر بھی آخر میرا بھائی ہے"

اور پھر سوچتا ہے "مجھے نہایت ہوشیار رہنا چاہیئے کہیں بھول چوک میں وہ زخمی نہ ہو جائے"

اسلئے وہ نہایت متانت اور مستعدی سے اپنی مدافعت کرتا رہا اس نے اپنی طرف سے کوئی وار نہیں کیا - بلکہ رفتہ رفتہ پیچھے ہی ہٹتا گیا - جہانہ پہلے تو سہم گئی مگر بعد کو اس کے دل میں بھی ایک جوش پیدا ہوا - ہر چند کہ اس کی پرورش اس وحشی علاقہ میں نہ ہوئی تھی پھر بھی اس کی نظروں کے سامنے دو حقیقی بھائی دیوانہ وار جنگ آزما تھے - اور محض اس کے حصول کی خاطر - چنانچہ حاجی غور کی ہمت افزائی کیلئے اس نے باآواز بلند کہا "لڑے جا - اے نیک بندے - میری خاطر لڑے جا"

اور وہ برابر لڑے چلا گیا - مگر اب اس کے قویٰ شکستہ ہو کر جواب دیتے نظر آ رہے تھے - اس نے ایک مرتبہ للکار کر کہا "مجھے تم سے نفرت ہے ——— سخت نفرت ہے"

قرہ یوسف (ہنسکر) "اور مجھے تم سے محبت ہے"

اور پھر جیسا کہ ایک ہفتہ کے بعد لوٹ اور پہنچکر اس نے چند اوقی سے بیان کیا کہ "اس کو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا بڑا ہی عجیب و غریب ا کیونکہ دہی لڑکی جہانہ جسکے **معرکۂ محبت** میں کامیابی پانے کیلئے ہم دونوں تلوار سے فیصلہ کر رہے تھے . . . . مگر مگر میں کیونکر کہوں کہ اس کو اس بازیچہ کی مطلق پر

نہ تھی۔ ہاں بیشک میرا بھائی اس کے فیصلہ کیلئے بے چین تھا۔ میرا پستہ قد مولوی نما اور موٹے موٹے شیشوں کی عینک والا بھائی بیقرار تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ وہ تاحیات پچھتاتا رہیگا ——— مگر میرے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ میں اس کو کیونکر قتل کر سکتا تھا ——— نہ تو میں اس کی خودداری اور غرور کو پامال کر نا گوارا کر سکتا تھا۔ اور نہ شکست کی شرمندگی سے اس کا دل توڑ سکتا تھا۔ بہرحال اس جہانہ نے اس کی زیادہ پروا نہ کی ——— اور چندراوتی۔ وہ حسین ہے اور منتخب روزگار۔ ہزار دل لاکھوں میں ایک ——— ہاں خیر ——— تو بالآخر میں نے دیدہ و دانستہ ایک نہایت بھدا اور غلط وار کیا۔ میرے بھائی کی تلوار کی نوک میری کلائی کو چیرتی پھاڑتی پھسل گئی"۔

خون کے فوارے بہ نکلے۔ حاجی غور نے اپنی تلوار پھینک دی اور میری طرف یہ کہتا ہوا لپکا: "بھائیجان معاف! میرے بھائی۔ مجھے معاف کر دیجئے"۔

"معاف کرنیکی کونسی بات ہے: بہادری سے تم لڑے۔ اور ایمانداری سے فتح یاب ہوئے"۔

چند لمحوں کے بعد جبکہ حاجی غور اس کی کلائی کے زخم کو دھونے کیلئے پانی کی تلاش میں چلا گیا تو جہانہ نے قرہ یوسف سے کہا: "میری نظریں بڑی تیز ہیں"۔

"تمہاری تیز نظروں نے آخر کیا دیکھ لیا"۔

"انہوں نے واضح طور پر دیکھا کہ کس طرح ایک بہادر اور جری آدمی نے خود ہتیار ڈالدیئے اور جان بوجھ کر شکست قبول کر لی"۔

"مگر یہی بہادر اور جری آدمی تم سے درخواست کرتا ہے کہ اس راز کو تاحیات اپنے ہی سینہ کے اندر محفوظ رکھنا۔ وہ آخر میرا بھائی ہے۔ اور پھر اس کا غرور . . . . . ."

"تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود سمجھتی ہوں تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ کیا مجھے اس سے محبت نہیں"۔

اس طرح دوسرے دن علی الصباح قرہ یوسف ناکام و نامراد انہی سرسبز و شاداب راستوں سے واپس جا رہا تھا۔ اس کے کلائی کے زخم میں تکلیف تھی ——— مگر وہ واقعی بہادر اور جری تھا"۔

پشاور پہنچکر پھر وہی شب و روز کے مشاغل میں انہماک پیدا ہو گیا۔ کرم خان کی کاسوان سرائے۔ چندراوتی کا مکان یہی دو مکانات تھے جہاں فرصت کا وقت گذرتا رہا۔

چندراوتی اب اس کی نظروں میں پہلے سے زیادہ حسین۔ پہلے سے زیادہ وفادار تھی۔ اس لئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ کشمیری صراف کی دوکان سے وہ چندن ہار اس کو فوراً خرید دے جس کے حصول کی تمنا کا اظہار وہ متعدد بار کر چکی تھی +

دیوانہ (بریلوی)

مقالا شامی

اے ہمنشیں نہ پوچھ جوانی کدھر گئی
مثل بہار گل اِدھر آئی اُدھر گئی

دل کا لہو جلا دیا سوزِ فراق نے
صد حیف اخونفشانیٔ مژگانِ تر گئی

کیونکر نہ اس عطیۂ فطرت پہ ناز ہو
جب بھی نظر گئی مری انجام پر گئی

بے سود اب ہے کوشش و تدبیر چارہ گر
اس کی نگاہ ناز مرا کام کر گئی

بعد از ستم نگاہِ کرم، کچھ نہ پوچھئے
ایسی پڑی تلافیٔ مافات کر گئی

دستِ جنوں سے شکوۂ بے دامنی ہے اب
رنگینیٔ تراوشِ خونِ جگر گئی

شامی ہے تجھ کو آرزوئے دادِ شعر اب
جب رونقِ دوکانِ متاعِ ہنر گئی

محمد تاج الدین شامی

دریائے معرفت کا ایک مغربی شناور

عالمگیر عید نمبر

از جناب جلالی شاہجہانپوری

کوئی گروہ کوئی مذہب، کوئی جماعت، کوئی قوم اس صفحہ عالم پر ایسی نظر نہیں پڑتی کہ جس میں فطرت نے قابل ستایش اور واجب العزت ہستیاں پیدا نہ کی ہوں ہر قوم میں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، پارسی ہو یا عیسائی، سکھ ہو یا بدھ ہو ایسے ایسے افراد پیدا ہوئے ہیں کہ جن کے دلوں میں آفتاب وحدت کی ضیا پاشیوں اور ضو فشانیوں کا سلسلہ دوامی طور پر جاری رہا ہے۔ جن کا ہر قول و فعل مشیت فطرت کے عین مطابق ہوتا رہا اور جنھوں نے اپنا قدم قدرت کے بتائے ہوئے صحیح مسلک کے خلاف رکھنا حرام اور قطعی حرام سمجھا ہے،

اگر ایسے افراد کی سوانح حیات کو دلچسپ پیرایہ بیان اور سلیس و عام فہم زبان میں بیان کیا جائے تو یہ سعی و کوشش راہ عمل اور عملی خفتگی سے بیداری کا باعث ہو سکتی ہے۔ پاک طینت انسانوں اور خصوصاً ان عارفین کی سوانح حیات جو کہ فی الواقع پاک باطن اور سعید روح تھے بید سبق آموز، نصیحت بخش اور مملو از فوائد ہوتی ہیں، اور دوسروں کے لئے ایک بہترین رہنما، ایک اچھا مصلح اور ایک پر زور محرک اور راہبر کا کام دیا کرتی ہیں، اس چند روزہ دور حیات میں ہماری نظروں کے سامنے بہتر سے بہتر ہستیاں آتی ہیں اور ان کو دیکھکر ہمارے دل میں ان جیسا بن جانے کی امنگیں اور آرزوئیں اٹھتی ہیں۔ لیکن یہ خواہش اس قدر پر زور نہیں ہوتی جتنی کہ سوانح حیات اور قصص و افسانوں کے پڑھنے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ زندہ انسانوں کی زندگی کا بہت تھوڑا سا حصہ ہمارے پیش نظر ہوتا ہے، اور کتاب ہمارے سامنے ان کی زندگی کے تمام واقعات بیان کر دیا کرتی ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر نے بالکل ناموافق حالت میں پرورش پا کر عروس کامیابی سے ہمکناری کی ہے تو ہمارے دل بھی امنگوں اور ولولوں سے بھر جاتے ہیں اور ترقی کی ایک زبردست لہر ہمارے دماغوں سے اٹھکر ہمیں مصروف عمل بنا دیتی ہے۔

دوسرے مشاہیر زمانہ کی سوانح حیات ہمیں بتاتی ہیں کہ ہم بھی اپنی زندگی کو اصلی اور شاندار بنا سکتے ہیں اور مرنے کے بعد زمانہ کی ریگ پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ سکتے ہیں، پس اسی نظریہ اور اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک عارف باللہ مسمی "سینٹ فرانسس" کی سوانح حیات کو جس کی ساری زندگی افادۂ خلق میں گذری ہے اور جس نے انسانی ہمدردی سے دو قدم آگے بڑھکر خدا کی دوسری مخلوق سے بھی وہی ہمدردی اور حسن سلوک روا رکھا ہے ناظرین "عالمگیر" کے سامنے پیش کرتا ہوں، اگر زمانہ کی دست برد اور فلک کی ستم ظریفیوں سے فرصت ملی تو اس قسم کی دوسری سوانح حیات جس سے اولوالعزمی، ثبات، استقلال بلند ہمتی، ہمدردی، محبت اور موانست خلق کے جذبہ میں وفور پیدا ہو پیش کرونگا

نام و نسب اور مختصر کیفیت

فرانسس نام، پیٹر برنا دن ولدیت، اٹلی کے ایک قدیم پہاڑی شہر مسمی اسیسی میں کتم عدم سے عالم وجود میں آیا۔ خاندانی پیشہ تجارت تھا، فرانس اور دیگر دور دراز مشہور و معروف مقامات پر تجارتی ایجنسیاں اور کوٹھیاں قایم تھیں، مال و جاہت، دولت و ثروت کے اعتبار سے ہر قسم کا راحت و سکون حاصل تھا

فرانسس کا والد نہ صرف ثروت وجاہ کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کا مالک تھا بلکہ علم و فضل اور دانش و بینش میں بھی وہ آپ اپنی نظیر تھا، مختلف علوم و فنون کے علاوہ کئی زبانوں پر بھی کافی دستگاہ اور عبور حاصل تھا۔ ہر وقت اس کا دماغ قدیم رسم و رواج اور آثار قدیمہ کی جستجو و تلاش میں مشغول و مصروف رہا کرتا تھا۔

فرانسس سے اس کی نیک روی اور صلح جوئی کے باعث نہ صرف اس کے والد کو بلکہ خاندان کے تمام افراد و انفار کو اس سے ایک خاص قلبی تعلق اور نسبت تھی۔ ہر قسم کی خبر گیری اور ناز برداری کے لئے تمام خاندان ہر وقت تیار رہتا تھا

اگرچہ عالم طفولیت میں وہ بھی اور بچوں کی طرح بہت شریر تھا لیکن اس وقت بھی اس کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ کسی کو ستانا یا تکلیف پہونچانا اس کے مذہب صلح کل میں حرام اور قطعی حرام تھا، شرافت پروری اور انسانی ہمدردی کا مادہ اور جذبہ دست فطرت نے اس کی صلح پسند طبیعت میں بہت کچھ ودیعت کیا تھا۔ کسی شریف انسان کو لاچاری اور بے بسی کی حالت میں دیکھتا تو اس کا نازک دل اس کی حالت کے مشاہدے سے بھر آتا۔

باوجودیکہ اسکو ہر قسم کی آسایش و راحت حاصل تھی لیکن یہ اس کی ایک امتیازی خصوصیت تھی کہ وہ اپنا تمام کام خواہ وہ کیسا ہی دقت طلب اور مشکل ہوتا خود ہی کیا کرتا تھا۔ اور کسی کو اپنے کام کے واسطے تکلیف دینا حرام سمجھتا تھا بلکہ دوسرے مجبور اور لاچار آدمیوں کا کام کرنا اس کا طرہ امتیاز تھا حتی کہ بعض اوقات شفاخانہ وغیرہ جاکر عرصہ تک مریضوں کی تیمارداری بھی کیا کرتا تھا غرض اس کو کسی کے کام میں کوئی عذر نہ تھا بلکہ ہر وقت ایسے موقع کا منتظر رہا کرتا تھا کہ جس کے باعث خدمت خلق سے مشرف ہوسکے۔ یہ قدرت نے جہاں اسمیں اور خصوصیات و خوبیاں ودیعت کی تھیں وہاں اسمیں سخاوت کا جوہر بہت نمایاں تھا۔ غریبوں اور مفلوک الحالوں کے لئے اسکی جیبوں کے منہ ہمیشہ کھلے رہتے تھے

چونکہ یہ ایک مسلم الثبوت کلیہ ہے کہ ترقی وارتقائے عمر کے ساتھ ساتھ خیالات وعزیم۔ تفکرات و مشاغل میں بھی ایک نمایاں انقلاب و تغیر ہوجاتا ہے اور وہ تمام امور جن پر اس سے پہلے انسان کاربند ہوتا ہے رفتہ رفتہ ترک ہوتے جاتے ہیں لہٰذا اسی نظریہ اور کلیہ کے ماتحت جب فرانسس کا دور شباب ختم ہوا تو اس کی افتاد طبع میں بھی انقلاب عظیم رونما ہوگیا چونکہ اوائل عمر ہی سے اس کی طبیع فیض رساں مائل بہ روحانیت تھی اس لئے جب اس عمر میں قدم رکھا تو خواہشات دنیوی سے اس کی توجہ قطعاً ہٹ گئی اور ہر وقت یہی دل میں سمائی ہوئی تھی کہ کسی نوع سے مدارج روحانیت اور توکل علی اللہ حاصل کیا جائے عرصہ تک اسی تگ ودو میں سرگرداں رہا کہ کسی ایسے عارف باللہ سے ملاقات ہوجائے جو اگر ایک طرف دریائے معرفت کا پورا شناور و غواص ہو تو دوسری طرف میدان علم کو بھی اچھی طرح طے کرچکا ہو۔ مثل مشہور ہے کہ "جوئندہ یابندہ" فرانسس نے جب عمر عزیز کا اکثر حصہ ایسے شخص کی جستجو اور تلاش میں صرف کیا تو اس کے لئے بھی قدرت نے اسی مثل کے بموجب ایک ایسا شخص جو اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ مہیا کردیا۔ ایک روز وہ حسب معمول اسیسی کے ایک مسمار شدہ گرجے میں یکہ و تنہا مراقبے میں بیٹھا ہوا تھا علایق دنیوی سے وہ قطعاً بے تعلق تھا کہ یکایک اس کے کانوں نے مندرجہ ذیل جملہ سنا۔

"فرانسس میرے گرجے کو درست کردو"

اس جملے کے سنتے ہی وہ خوف و ہراس کی وجہ سے رعشہ براندام ہوگیا اور اسی تحیر کے عالم میں چاروں طرف جستجوئے آواز میں پھرنے لگا۔ بالآخر جستجو کے حاصل کے بعد اسی گرجے کے ایک گوشہ میں ایک معمر شخص جس کے چہرے سے حسرت و ریاضت کے آثار ہویدا تھے عبادت کرتے ہوئے پایا۔ اس کو دیکھتے ہی فرانسس اس کے قدموں پر گر کر کہنے لگا۔ "جس چیز کی جستجو میں میں ایک عرصہ سے سرگرداں تھا قدرت نے اپنی ذرہ نوازی سے مجھے مہیا کردی" فرانسس اس کی صحبت میں رہنے لگا گھر میں چونکہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ ایک روز وہ اپنے والد کا اعلیٰ درجہ کا ایک گھوڑا اور بہت سا قیمتی سامان لیکر بازار گیا اور تمام سامان فروخت کرکے جو کچھ روپیہ ملا وہ سب گرجے کی مرمت کے لئے دے دیا۔ پادری کو دریافت کرنے پر سبب یہ معلوم ہوا کہ یہ رقم اس طرح لائی گئی ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور اسے ایسے کاموں سے باز رہنے کی سخت تنبیہ کی اور سمجھایا کہ خدا ایسے کاموں سے ہرگز راضی نہیں ہوتا۔ چونکہ فرانسس کے والد کو اس کے انقلاب طبع کے باعث تجارتی معاملات میں بہت نقصان ہورہا تھا۔ اس لئے وہ ایسے لوگوں کی صحبت سے اسے سختی کے ساتھ منع کرتا تھا۔ جب فرانسس نے اپنے والد کی زجر و توبیخ پر کوئی توجہ نہ کی تو اس کے والد نے اس کے پیر و مرشد پر سختی اور سعن و طعن شروع کی۔ جب معاملہ طول پکڑ گیا تو اسکے پیر و مرشد نے اسیسی کے جج کو اسکے فیصلے کیلئے بلایا۔ جج نے اسکے والد کے بیانات سن کر فیصلہ کیا کہ فرانسس کو اس کا تمام سامان واپس کردینا چاہئے فرانسس کو چونکہ دوسری طرف کی لو لگی ہوئی تھی اور اس کا دل علایق دنیوی سے متنفر ہوچکا تھا اس لئے اس نے تمام سامان بے چون و چرا واپس کردیا حتی کہ ان کپڑوں کو بھی جو اس کے جسم پر تھے واپس کرکے کہنے لگا "آج سے بجز خدا کے نہ میرا کوئی یار و مددگار ہے اور نہ کوئی غمگسار و مہربان"

موسم بہار عہد شباب پر آیا ہوا تھا۔ زمین فرش سبزہ سے تختہ زمردیں ہورہی تھی، طائران خوش الحان صناع فطرت کی ثنا و صفت میں نغمہ سنج ہورہے تھے۔ لالہ و

گل کی مہک مشام جان کو معطر کر رہی تھی طبیعتوں میں شگفتگی چھائی ہوئی تھی کہ اتنے میں لوگوں کی نظر فرانسس پر پڑی جو جذبی حالت میں ان مناظر قدرت اور صحیفہ فطرت کے مطالعہ سے لطف اندوز ہو کر مست اور گاتا ہوا جنگل کی طرف چلا جا رہا تھا راستہ میں اسکو جذامیوں کا ایک شفاخانہ ملا جو کچھ روپیہ اسکے پاس تھا وہ سب اسنے انکی دوا وغیرہ میں خرچ کر دیا۔ اور اسکے علاوہ مدتوں تک انکی تیمارداری میں مصروف رہا۔ اس کو سب سے زیادہ گرجا بنانے کی فکر پریشان کر رہی تھی۔ ایک روز وہ خدا کے بھروسے پر گرجا بنانے کیلئے تیار ہو گیا۔ گاؤں گاؤں سے پتھر وغیرہ پیٹھ پر لاد کر لاتا اسکی اس ہمت و جرات کو دیکھکر اور بہت سے خدا کے نیک بندے اسکی امداد و اعانت کیلئے آمادہ ہوگئے غرضکہ اس طرح ایک دوسرے کی اعانت سے چند روز میں گرجا بن کر تیار ہو گیا فرانسس کو خوش پوشاکی وغیرہ سے انتہائی محبت تھی اسکا ہمیشہ کا معمول تھا کہ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی بہت مٹھائی ضرور کھاتا۔ لیکن جب اس نے گرجے میں پادری کی زبانی یہ الفاظ سنے کہ "جب تم میدان معرفت میں قدم رکھو تو سونے چاندی خوش پوشائی اور اسی قسم کی زیبائشی چیزوں سے تعلق منقطع کر لو۔"

ان جادو بھرے الفاظ کے سنتے ہی اسکی طبیعت ان تمام چیزوں سے ایکدم متنفر ہو گئی۔ برہنہ پا اور معمولی لباس میں اکناف ملک میں پند و نصیحت کے درس دینا اس کا شب و روز کا وطیرہ ہو گیا تھا چونکہ حق و صداقت کے سوا اس کے دل میں اور کچھ نہ تھا اس لیے اس کے منہ سے جو لفظ بھی نکلتا تھا وہ اثر میں ڈوبا ہوتا تھا۔ کثرت سے لوگ اس کے وعظ میں شریک ہوا کرتے تھے رفتہ رفتہ اس کے مریدوں اور معتقدوں کی جماعت بھی کافی ترقی کر گئی اس کے مریدوں کا بھی زیادہ وقت مخلوق خدا کو راہ حق بتانے میں گذرا کرتا تھا۔ فرانسس کی بے ریائی اور حق و صداقت کے اثر سے انمیں بھی یہ مادہ اور جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ناداروں اور محتاجوں کا کام مفت کیا کرتے تھے اور بقیہ وقت پند و نصیحت میں گذارتے۔ فرانسس بھی اپنے پیر و مرشد کی طرح اپنے مریدوں سے کہا کرتا تھا کہ "علایق دنیوی سے اپنی توجہ ہٹالو اور ہر وقت غریبوں، یتیموں، و بیواؤں کا خیال رکھا کرو۔"

وہ اور اسکے اکثر مرید اس تکلیف و ناداری کو آرام و خوشحالی پر ترجیح دیا کرتے تھے فرانسس اپنے مریدوں سے کہا کرتا تھا کہ "لوگ اگر غریبی کی حقیقت کو سمجھ جائیں تو یہی چیز ان کیلئے "خدا شناسی" کا باعث بن سکتی ہے" فرانسس صرف انسانوں ہی سے محبت و شفقت کا برتاؤ نہیں کرتا تھا بلکہ پرندوں سے لیکر خوفناک خونخوار درندوں تک اس کا دست شفقت دراز رہتا تھا۔ اور خصوصاً چھوٹے چھوٹے پرندوں سے اسکو خاص تعلق اور لگاؤ تھا چڑیوں کو چھوٹی بہنو کہکر مخاطب کیا کرتا تھا۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ انسان جس سے بہت محبت کرتا ہے وہ چیز بھی ضرور اس سے ایک گونہ مانوس ہو جاتی ہے۔ چونکہ فرانسس کی ہمدردی محبت و انسیت اور روا داری انسانوں اور پرندوں سے گذر کر خونخوار جانوروں تک ترقی کر گئی تھی اس لیے اس سے بھی انسان کے علاوہ چرند پرند اور دوسرے خونخوار جانور مختلف طریقوں سے اپنی محبت و انسیت کے ثبوت پیش کیا کرتے روحانی تصرف کے باعث ہر چیز پر اس کا [illegible]

ایک روز فرانسس وعظ کہہ رہا تھا لوگ نہایت توجہ اور انہماک سے سن رہے تھے چونکہ اس کا وعظ ریا، خودغرضی، خودنمائی اور تملق و چاپلوسی سے خالی ہوا کرتا تھا اسلیے چڑیاں بھی اس سے متاثر ہو کر نہایت زور و شور سے چہچہا رہی تھیں انکے شور و غل کی وجہ سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ فرانسس چڑیوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا "میری چھوٹی بہنو جب تک میں وعظ ختم نہ کر لوں اس وقت تک تمکو بالکل خاموش و ساکت رہنا چاہیے"۔ چڑیاں فوراً خاموش ہو کر نہایت توجہ سے اسکا وعظ سننے لگیں۔ دوسرے روز وہ چڑیوں کے رین بسیرے میں پہنچکر نہایت سنجیدگی سے مخاطب ہوا "اے میری چھوٹی بہنو! تم کو اپنے صانع حقیقی سے بہت محبت کرنا چاہیے اور ہر وقت اسی کی ثنا و صفت میں مشغول و مصروف رہنا چاہیے تمکو وہی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا فراہم کرتا ہے اسی نے تمہارے کھانے کیلئے ہر قسم کا غلہ اور پینے کیلئے ہزاروں چشمے اور دریا پیدا کیے اسنے تمہارے آرام و راحت کیلئے درختوں کو پیدا کیا اسنے تمکو پر دیے جس سے تم اپنے جسم کو چھپا سکتی ہو اور جسکے اندر قوت پرواز بخشی تمکو صرف اسی کی عبادت و تعریف کرنا چاہیے کیونکہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تمہاری حفاظت و نگہبانی کا ضامن ہے"

غرضیکہ فرانسس اور اسکے مریدوں کا یہ ایک وطیرہ و شیوہ ہو گیا تھا کہ وہ ہر ذی روح کو ہر وقت وعظ و نصیحت ہی کے سبق دیا کرتے تھے۔

یہ کلیہ ہمیشہ سے مسلم الثبوت چلا آ رہا ہے کہ جو شخص اپنی ہستی کو خدمت خلق اور راہ خدا میں فنا کر دیتا ہے اسکا نام ہمیشہ کیلئے صفحہ دنیا پر ثبت ہو جاتا ہے اور حیات بعد الموت کا حقیقی مرتبہ جب ہی اسکو حاصل ہوتا ہے اسی نظریہ کو پیش نظر رکھکر سعدی علیہ الرحمہ نے اس مسئلہ کی کس خوبصورتی سے تصویر کھینچی ہے ؎

سعدیا مرد نکونام نمیرد ہرگز ؛ مردہ آنست کہ نامش بہ نکوئی نبرند

فرانسس کی زندگی بھی چونکہ اسی طرح پر گذری تھی لہذا اسکا نام سیکڑوں برس گذر جانے کے بعد آج بھی صفحہ عالم پر ثبت ہے۔ آج یورپ اور خصوصاً اٹلی میں اس کا نام توقیر و عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ابھی تک وہ گرجا جو کہ اس نے خود بنایا تھا یادگار کے طور پر قائم چلی آ رہی ہے اور آثار قدیمہ میں داخل کر لیگئی ہے۔ اسکی زندگی میں وقتاً فوقتاً جو انقلابات رونما ہوئے اسکی مختلف تصاویر معابد اور دوسرے خاص مقامات پر آویزاں ہیں جسکو دیکھتے ہی اسکی زندگی کے تمام ماحول کا نقشہ نظر کے سامنے کھینچ جاتا ہے۔ اٹلی میں ایک نہایت شاندار مجسمہ اسکی یادگار کے طور پر بنا ہوا ہے جسکو دیکھکر فرانسس اور اس کی کارگذاریوں کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ فقط

Regd. L. No. 1691